عزیز بھٹی شہیدؒ

اصغر علی گھرال

Biography

of

the Hero

عزیز بھٹی شہیدؒ

اصغر علی گھرال

روزن پبلشرز
روزن بلڈنگ، ریلوے روڈ گجرات

انتساب

اُن شہیدوں کے نام
جن کا لہو
قوم کی صبحِ زندگی کی شفق
ہے

اصغر علی گھرال

"میں اپنی جاناب سے اور اہلِ پاکستان کی جانب
سے مکار دشمن کے خلاف آپ کی بے مثال شجاعت
اور بہادری کے کارناموں پر آپ کو ہدیہ تبریک پیش
کرتا ہوں۔ آپ نے تاریخ اسلام میں اپنے خون
سے ایک درخشاں باب کا اضافہ کیا ہے۔ ساری قوم
آپ پر فخر کرتی ہے"

صدر محمد ایوب خاں

عنوانات

پیش لفظ — احمد ندیم قاسمی — 16
موت کو شکست — 21
لادیاں اور عزیز کے آباؤ اجداد — 35
محمد عبداللہ بھٹی — 40
ہانگ کانگ کی زندگی — 43
پیدائش اور بچپن — 45
بچپن کے کھیل — 50
سادگی اور ذہانت — 51
پیشین گوئی — 51
"چائی کے لطیفے" — 52
پہلی اور آخری چوری — 54
تعاون کا جذبہ — 55
قوتِ وجدان — 56
اساتذہ، انعامات اور کھیل — 57
سکول کی چاردیواری یا میدانِ کارزار — 58
عسکری زندگی کے لیے موزونیت — 60
ہانگ کانگ پر جاپانی تسلط — 61
نقل مکانی اور مشکلات — 67
معصوم شرارت — 68

’’ریڈیو اناؤنسر‘‘	71
دَورِ آزمائش	73
پرواز سے قفس تک	75
کورٹ مارشل اور سزا	78
بشیر کی ڈائری	79
استقامت کا راز	83
المیہ کے بعد	85
مزید مشکلات	88
مراجعتِ وطن	91
روشنی کا مینار	93
روزگار کے لیے	94
حادثہ	95
شادی	95
فوجی ملازمت	96
ابتدائی ٹسٹ	98
پاکستان ملٹری اکیڈیمی کا کول	99
اکیڈیمی میں پہلا دن	100
اپنے انسٹرکٹر کی نظر میں	102
کمانڈنٹ سے داد	104
ایک ساتھی کی نظر میں	105
میرا دوست	111
زندگی کا ماٹو	113

’’شخصیت‘‘	115
قیادت کے بنیادی تقاضے	118
پاسنگ آؤٹ پریڈ......خان لیاقت علی خاں کا خطاب	123
زندگی کا سب سے بڑا صِلہ	125
ہمارا ہیرو	128
جدوجہد پاکستان	129
اعزازی تلوار اور طلائی تمغہ	130
بحیثیت افسر عسکری زندگی	135
تربیتی کورس کے دوران	136
’’مَیں سو نہیں رہا تھا‘‘	137
کمانڈر کی شانِ قیادت	138
ایک ٹیسٹ	140
بحیثیت اڈجوٹنٹ	141
دوستوں کے لیے اتنا تو کرنا ہی پڑتا ہے	143
آزمائش	145
’’مجھے ولی اللہ نہ سمجھیں‘‘	147
حُریّتِ فکر	149
پاکستان سے محبت	151
جذبۂ حب الوطنی	153
میرے مُحسن	156
’’ہم محنت نہیں کرتے‘‘	157
قوتِ ارادی	159

میری پہلی ملاقات	161
دو عظیم انسانوں کی ملاقات	163
بہترین انسٹرکٹر	165
انکسار	166
پاک باز	167
کنگسٹن کالج کینیڈا میں	169
قومی خودداری	170
کرنل ہیلرڈ	171
شراب سے اجتناب	175
مالکہ مکان کی شکایت	176
جُوس پی لیں	177
شاندار کامیابی	179
وہ صرف صاحبِ سیف ہی نہیں تھے صاحبِ قلم بھی تھے	181
تھنڈر بولٹ۔ اداریہ	183
چین	185
فرض شناس افسر	193
مکان کی تعمیر	194
زبان دانی	196
جرمن کے ترجمان	197
جرمن ٹیچر	200
جرمن بول چال	200
عسکری ضابطہ کی خلاف ورزی	201

سرکشی	203
وہ دوسروں کے کام آتے تھے	204
اخلاقی جرأت	206
شاگردان کے گرویدہ تھے	210
ناقابلِ فراموش کردار	211
روپے پیسے کے معاملات میں	212
شانِ استغناء	217
"ہوسِ دولت ایک نفسیاتی بیماری ہے"	218
سخت محنتی	219
دوسروں کا حق	219
غریب پروری	219
بڑھاپے کا احترام	220
شاپنگ	221
ایک رُوح پرور تقریب	223
شہید کا تحفہ	225
ذوقِ مطالعہ	227
فرسودہ قواعد اور ان کی غلط تعبیر	228
نیند	237
حیرت انگیز	239
سادگی	241
کھانا	242
لباس	244

سواری	247
رہائش	249
جلال و جمال	251
قلوپطرہ کا خواب	252
”......اور وہ رو دیے“	255
کھیل اور موسیقی	258
ڈسپلن کی پابندی	262
پاکیزگی اور شرافت	264
محبت کا لازوال سرچشمہ	265
بچوں کی تعلیم پر اخراجات	271
ظفر کے نام خطوط	273
بھارتی عزائم کا تجزیہ	283
تحفظ وطن ایک عبادت ہے	288
قاتلوا فی سبیل اللہ	289
شوقِ شہادت	290
لائف انشورنس	293
ابُو! بہادری سے لڑنا	294
دعا کیجیے مجھے شہادت کا درجہ نصیب ہو	295
۶ ستمبر............گھر سے روانگی	297
ہم دشمن کو کچل کر رکھ دیں گے	300
معرکۂ جوکی	305
۶ ستمبر	307

۷ر ستمبر	317
۸ر ستمبر	321
۹ر ستمبر	325
۱۰ر ستمبر	329
محاصرہ	334
۱۱ر ستمبر	343
۱۲ر ستمبر	359
آخری سفر	363
آنسو	365
موت کو آخری شکست	366
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن	369
بٹالین کو فخر	374
ساتھیوں میں سب سے آگے	375
داستانِ شجاعت	376
نا قابلِ تسخیر	379
"...... جب تک عزیز بھٹی شہید جیسے لوگ موجود ہیں"	382
کیا بی آر بی نا قابلِ عبور ہے؟	387
نہر کے کنارے	394
ایک منظر چند ملاقاتیں	395
کرنل قریشی	401
صوبیدار میجر محمد شریف	404
قید سے واپسی	406

جنرل ٹکا خاں سے ملاقات	409
بریگیڈیئر امیر عبداللہ خاں نیازی سے ملاقات	413
میجر طفیل محمد شہید	420
آنسوؤں کا خراج	423
''سوانح نگاری اور ہمارے ہیروؔ''......میجر ڈار	426
عزیزوں کے تاثرات	432
میرے ابا جان	433
زرینہ کا خواب	437
عزیز بھائی سے آخری ملاقات	439
زرینہ کے نام طاہرہ کے خطوط	441
بھائیوں کے تاثرات	448
شہید کی والدہ	460
۲۳/ مارچ کی تقریب	464
پشاور سے چٹا گانگ تک عقیدت کے پھول	471
گرامی نامے	482
روایات کا تحفظ	496
کوششِ ناتمام......عرضِ مصنف	502

پیش لفظ

ستمبر 1965ء کی دفاعی جنگ میں وطن کی آزادی اور اہل وطن کی آبرو پر اپنی جانیں بے دریغ قربان کر دینے والے' شہید تو ہیں ہی' مگر ساتھ ہی وہ ہماری تاریخ کے ایک نئے باب کا عنوان بھی ہیں' اور ہمارے مستقبل کی چمک دمک بھی انہی سے وابستہ ہے' یہ وہ لوگ ہیں جن کی یاد سے ہماری نسلیں مشعل راہ کا کام لیں گی اور جن کے دم سے خیالات نکھریں گے اور نظریاتی سنوریں گے' اور ایثار ہمارا محور حیات قرار پائے گا۔ اس لئے نہیں کہ وہ بہادری سے لڑے' بلکہ اس لیے کہ وہ ایک اعلیٰ مقصد کے لئے بہادری سے لڑے ''بہادری'' سے تو وہ بھی لڑ لیتے ہیں جو کسی غیر ملک پر چڑھ دوڑتے ہیں (یہ الگ بات ہے کہ ان کی وحشت اور درندگی کو بہادری کا نام دے کر اس محترم لفظ کو آلودہ کر دیا جاتا ہے) یہ لوگ صداقت و انصاف کی قدروں اور تہذیب و تمدن کی روایتوں کے خلاف لڑتے ہیں۔ یہ لوگ تو دراصل انسانی ضمیر کی بنیادی نیکی پر تلوار چلاتے ہیں' ان کی لڑائی کا بھی ایک مقصد تو یقیناً ہوتا ہے مگر وہ بہت گھناؤنا' بہت گندہ اور بنیادی طور پر حیوانی مقصد ہوتا ہے۔ بہادر تو دراصل وہ ہوتے ہیں جو کسی اعلیٰ مقصد کیلئے لڑتے ہیں' جو اپنے ملک کی آزادی اور اہل ملک کے تحفظ کی خاطر تلوار اٹھاتے ہیں اور جب وہ ایسا کرتے ہیں تو فی الحقیقت وہ پوری دنیا کے تصور آزادی اور پورے عالم انسانیت کے تحفظ کیلئے لڑ رہے ہوتے ہیں' اگر اس ترقی یافتہ اور مہذب دور میں بھی لڑنے کا کوئی جواز ہے تو وہ جواز صرف دفاعی جنگ کا ہے اور پوری دنیا شاہد ہے کہ ستمبر 1965ء میں پاکستان نے جو جنگ لڑی' وہ سراسر دفاعی تھی' وہ جارحیت کے خلاف جنگ تھی اور جارحیت کے خلاف جنگ اتنی مقدس ہوتی ہے' جتنا خود امن مقدس ہے' یہ جنگ کامیابی سے لڑ کر پاکستان نے بظاہر صرف اپنی سرحدوں کا تحفظ کیا مگر دراصل اس نے پوری دنیا کی آزاد مملکتوں کو خود اعتمادی اور

حوصلہ مندی کا درس دیا۔ عالمی تاریخ حریت مرتب کرنے والوں کو آج نہیں تو آئندہ اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ پاکستان نے اپنے سے پانچ گنا طاقتور حملہ آور کے ساتھ اپنے سے دس گنا کمزور دشمن کا سا جو سلوک کیا۔ وہ صرف پاکستانی تاریخ میں ہی کا نہیں بلکہ عالمی تاریخ کا بھی ایک درخشاں باب ہے۔

میجر عزیز بھٹی شہید (نشان حیدر) ستمبر 1965ء کی دفاعی جنگ کے ایک نہایت اہم اور قابل فخر کردار ہیں، ہم سب نے اخباروں میں اور پھر بعض کتابوں میں اُن کے حالات ضرور پڑھے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ انہوں نے محاذ جنگ پر کس بے پناہ حوصلہ مندی اور بے جگری کا مظاہرہ کیا۔ مگر اب تک ہم ان تفصیلوں سے بے خبر تھے جو یوں تو ننھی ہی معلوم ہوتی ہیں مگر جو کسی کے کردار مزاج کو کماحقہ سمجھنے میں بے حد مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

اب تک ہم اپنے اس عظیم قومی ہیرو کے بارے میں یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی تربیت کس ماحول میں ہوئی۔ ان کی دلاویز انفرادیت کیسے نمایاں ہوئی، وہ کیا سوچتے تھے کیا پڑھتے تھے، ان کا انداز گفتگو کیسا تھا، ان کا طرز زندگی کیا تھا، مذہب، وطن اور آزادی کے بارے میں ان کے کیا خیالات تھے اور وہ کن چیزوں سے نفرت اور کن باتوں سے محبت کرتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں، پوری پاکستانی قوم کو اصغر علی صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے یہ کمی بکمال محنت و دیانت پوری کر دی اور ہمارے اس قومی ہیرو کی زندگی کے ایک ایک خط، ایک ایک خم ایک ایک زاویے کو اتنی وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے لانے کا اہتمام کیا کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ میجر عزیز بھٹی شہید سے متعلق کوئی اور صاحب اگر کچھ لکھنا چاہیں گے۔ تو اصغر صاحب کی اس تحقیق میں (میں اسے تحقیق ہی کہوں گا) کون سا اضافہ کر سکیں گے! پھر اصغر صاحب کا طرز نگارش بھی خاص منجھا ہوا ہے، ان کی تحریر میں روانی بھی ہے اور شستگی و سلاست بھی، اور ایک ایسی کتاب کو، جسے پاکستان میں ہر عمر کا قاری پڑھنا چاہے گا، اور جسے آنے والی ہر نسل اپنے سینے سے لگائے گی، معنوی لحاظ سے اتنا ہی دلکش ہونا چاہئے تھا۔

اصغر صاحب کی اس تصنیف کی ملی اور تاریخی اہمیت تو مسلّمہ ہے، ہی مگر میری رائے میں یہ اُردو کے سوانحی ادب میں بھی ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے' اُردو کی بہت کم سوانح عمریوں کو اس حد تک مکمل کہا جا سکتا ہے کہ ان کا موضوع ایک ایسے جیتے جاگتے' سانس لیتے کردار کی صورت میں ہمارے قریب آ جائے کہ ہم اس کے دل کی دھڑکن بھی سن سکیں اور اس کے جذبے کی گرمی بھی محسوس کر سکیں۔

احمد ندیم قاسمی

6 ستمبر 1966ء
(47انار کلی لاہور)

موت
کو
شکست

''موت اکثر قوت مقاومت کے فقدان کا دوسرا نام ہوتی ہے۔''

....نپولین

مارشل لاء ایڈمنسٹریشن زون ''بی'' کے ہیڈ کوارٹر قائم کرنے کے لیے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں فرسٹ کور کا کچھ حصہ لاہور منتقل کر دیا گیا۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں کور ہیڈ کوارٹر جہلم سے چند فوجی افسر لاہور جا رہے تھے ان میں ایک میجر ایک کیپٹن اور ایک انٹیلی جنس این سی او تھے۔ یہ سب لوگ ایک ڈاج ٹرک پر سوار تھے جسے ایک ڈرائیور چلا رہا تھا۔ ان کے علاوہ گاڑی میں کیپٹن کا اردلی بھی تھا۔

ان دنوں لاہور سے ایک لیفٹیننٹ کرنل سنٹو کانفرنس میں شمولیت کرنے والے تھے۔ میجر کے ہاتھ میں کچھ انتہائی خفیہ دستاویزات تھیں جو انہیں لیفٹیننٹ کرنل کے حوالے کرنا تھیں۔ نیز انہیں اس کیس کے لیے مسل تیار کروانا تھی۔ کیپٹن مع سی او اور اردلی کے لاہور پوسٹ ہو کر جا رہے تھے۔ البتہ میجر دو دن بعد جہلم لوٹنے والے تھے۔

جہلم سے یہ لوگ دوپہر کے کھانے کے بعد اڑھائی بجے کے قریب لاہور روانہ ہوئے۔ ڈاج ٹرک کا اسٹیئرنگ بائیں ہاتھ تھا۔ فرنٹ سیٹ پر میجر دائیں طرف کھڑکی کے ساتھ اور کیپٹن درمیان میں بیٹھے تھے۔ صبح معمولی دھند کے سوا موسم بالکل صاف تھا۔ وزیر آباد پہنچ کر انہوں نے گاڑی کھڑی کر کے چائے پی اور پھر روانہ ہو گئے۔ گوجرانوالہ اور لاہور کے درمیان (لاہور سے اندازاً ۱۷ میل کے فاصلے پر) مرید کے منڈی کے قریب ڈرائیور ایک مسافر بس سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ بس سے دو تین سو گز آگے ایک بیل گاڑی سڑک پر کھڑی تھی جس پر سوکھی گھاس لدی ہوئی تھی۔ بیل گاڑی سے آگے سڑک کا منظر آنکھوں سے اوجھل تھا۔ جب ڈاج ٹرک مسافر بس سے آگے نکلنے ہی والا تھا تو اچانک سامنے سے ایک کار نمودار ہوئی جو بیل گاڑی کی وجہ سے پہلے نظر نہ آ سکی۔ اس لمحہ اگر ڈرائیور ٹرک کو فوری بریک لگا دیتا تو ٹرک لازمی طور پر الٹ جاتا کیوں کہ ٹرک کے دو پہیے سڑک سے اترے ہوئے تھے اس نے ایکسلریٹر کو پورا دبا کر بس کو پاس کیا اور سامنے سے آتی ہوئی کار کو بچانے کے لیے بائیں ہاتھ ایک فوری موڑ کاٹا۔ انتہائی تیز رفتاری اور

جھٹکے کے ساتھ موڑ کاٹنے کے باعث ٹرک بائیں طرف لڑھک کر گھاس کی بھری گاڑی سے ٹکرانے ہی والا تھا کہ ڈرائیور نے پھرتی کے ساتھ سٹیئرنگ کو دائیں ہاتھ موڑا اور معجزانہ طور پر بیل گاڑی کے تصادم کو بچا گیا۔ لیکن اب ٹرک دائیں جانب لڑھکنے لگا۔ جب بیل گاڑی سے آگے نکلے تو سامنے سڑک بالکل صاف تھی۔ ٹرک کو واپس سڑک پر لانے کی فکر میں ڈرائیور نے پھر اسے بائیں ہاتھ موڑا مگر ڈرائیور اس واقعہ سے اتنا حواس باختہ ہو چکا تھا کہ اس نے بدحواسی میں ایکسلریٹر سے پاؤں کا دباؤ کم نہ کیا۔ اب جوں ہی اس نے ٹرک کو بائیں ہاتھ موڑا وہ پھسل کر سڑک کے کنارے پہنچ گیا۔ یہاں سڑک کافی اونچی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک عمودی ڈھلوان سے الٹ کر قلابازیاں کھاتا چلا گیا اور تین سو ساٹھ درجے کا زاویہ بنا کر پھر پہیوں پر کھڑا ہو گیا۔ خوش قسمتی سے ونڈ سکرین' ناقابل شکست شیشے کی تھی جو ٹوٹنے کی بجائے غبار بن جاتا ہے ورنہ شیشے کے ٹکڑوں سے افسروں اور ڈرائیور کی خیر نہ تھی۔

این سی او اور اردلی پیچھے بیٹھے تھے۔ ٹرک الٹنے سے وہ دور جا گرے۔ جوں ہی ٹرک اپنے پہیوں پر کھڑا ہو گیا' ڈرائیور دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ کیپٹن انجن کے بانیٹ کے اوپر سے باہر آئے لیکن میجر اپنی سیٹ پر ہی جمے رہے۔ کیپٹن نے میجر سے باہر نکلنے کو کہا تو انہوں نے جواب دیا کہ وہ گردن کے پیچھے درد کی شدت کے باعث اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ چنانچہ انہیں اٹھا کر گاڑی سے باہر نکالا گیا۔ اس وقت وہ ہوش میں تو تھے مگر درد کی شدت کے باعث بول نہیں سکتے تھے۔ دوسرے لوگ تقریباً محفوظ رہے۔ ڈرائیور کی آنکھوں کے اوپر معمولی زخم آیا۔ این سی او اور اردلی کو ٹرک سے گرنے کی وجہ سے ذہنی صدمہ ہوا تھا مگر کوئی چوٹ یا زخم نہیں آیا تھا۔ کیپٹن کے گھٹنے پر معمولی زخم آیا اور چہرہ پر بھی خراشیں آئیں۔ اتنے میں لاہور کی سمت جاتی ہوئی ایک مسافر بس اور لاہور سے گوجرانوالہ آتی ہوئی ایک کار جائے حادثہ پر آ کر رک گئی۔ چونکہ لاہور قریب تھا اور وہاں طبی سہولتیں بھی زیادہ تھیں' اس لیے میجر کو لاہور لے جانا ہی مناسب خیال کیا گیا۔ کار والوں کو کور ہیڈ کوارٹر لاہور کا ٹیلیفون نمبر دے کر کہہ دیا گیا کہ انہیں ٹیلی فون پر حادثہ سے مطلع کر دیا جائے تا کہ وہ

شکستہ گاڑی کو اٹھا کر لاہور لے جانے کا کوئی انتظام کرلیں۔

اس کے بعد میجر کو بس کی فرنٹ سیٹ پر بٹھا دیا گیا اور بس روانہ ہونے لگی تو میجر نے آنکھ اٹھا کر پوچھا کہ وہ خفیہ کاغذات کہاں ہیں جنہیں لے کر وہ لاہور جا رہے تھے۔ کیپٹن کو یاد آیا اور وہ فوراً ٹرک کی طرف بھاگے اور کاغذات لے کر واپس آئے۔ میجر کے لیے اپنی گردن کو سیدھا رکھنا ممکن نہ تھا' چنانچہ انہوں نے سیٹ پر اپنا سر لڑھکایا اور پیچھے بیٹھے ہوئے کیپٹن نے اسے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ راستہ میں انہیں ایک دو دفعہ چائے یا پانی کا پوچھا گیا مگر وہ خاموش تھے اور زیادہ تر نیم بے ہوشی کی حالت طاری رہی۔

مسافروں کو شہر میں اتارنے کے بعد بس انہیں سیدھی سی ایم ایچ لاہور لے گئی۔ کیپٹن نے بس کے ڈرائیور کو کچھ رقم دینا چاہی مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ کیپٹن اس کے جذبہ ایثار پر خوش ہوئے۔ اس وقت تک خاصا اندھیرا ہو چکا تھا' سات بجے کے قریب وقت ہوگا۔ ڈیوٹی پر متعین ڈاکٹر نے میجر کو ایک نظر دیکھنے کے بعد کہا: ''معلوم ہوتا ہے صرف صدمہ کے اثرات ہیں' رات آرام کرنے کے بعد وہ صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ اتنے میں ہیڈ کوارٹر کمپنی کے کمانڈنگ آفیسر میجر گل باز بھی وہاں پہنچ گئے۔

مگر جب ڈاکٹروں نے ایکس رے لیا' تو دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ میجر کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے' گردن کا پانچواں منکہ شکستہ ہے' دایاں بازو اور دائیں ٹانگ مفلوج ہو چکے ہیں اور وہ اپنی گردن کو قطعاً گھما نہیں سکتے۔ ان کے لیے یہ ایک طبی عجوبہ تھا ایک حیرت انگیز معجزہ تھا۔ وہ حیران تھے کہ اس نوجوان نے موت کو کیوں کر شکست دی ہے؟ حادثہ کے بعد اس سفر کی صعوبتیں وہ کس قوت کے سہارے برداشت کرتا رہا ہے؟ وہ بچ کیسے گیا ہے؟ طبی دنیا میں قوت ارادی حیرت انگیز کارنامے سرانجام دیتی ہے یہ وہ جانتے تھے۔ مگر وہ یہ نہیں سوچ سکتے تھے کہ انسانی ارادہ کی قوت اتنا عظیم معجزہ بھی دکھا سکتی ہے۔ حالت بے حد خطرناک تھی مگر وہ آرمی آفیسر بچ گیا' البتہ ساڑھے تین ماہ تک اسی ہسپتال میں بستر علالت پر دراز رہا۔

آپ یقیناً اس نوجوان آرمی آفیسر کو جس نے موت کو شکست دی جسے 'موت مغلوب نہ کرسکی' اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہ ہمارے عظیم قومی ہیرو راجہ عزیز بھٹی تھے' جنہیں لاہور کے برکی محاذ پر ہنوز وہ تاریخی کارنامہ سرانجام دینا تھا' جو سات سال بعد انہوں نے ستمبر کے دوسرے ہفتے بی آر بی نہر کے کنارے اپنی جان پر کھیل کر دیا۔

کیپٹن ایم اختر خان نے جو اس حادثہ میں میجر بھٹی کے ساتھ تھے (اور اب میجر ہیں) حادثے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا: ''اب اس واقعہ کو سات آٹھ سال بیت چکے ہیں۔ مجھے یاد نہیں آرہا کہ ہمارے ساتھ این سی او' اردلی اور ڈرائیور کون کون تھے۔ مگر اس زبردست حادثہ میں میجر عزیز بھٹی نے جس استقلال' قوت برداشت اور احساسِ فرض کا ثبوت دیا تھا' وہ میرے لیے ہمیشہ ناقابل فراموش رہے گا۔

ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جانے کے باوجود اپنے اہم کاغذات کا خیال ان کے دل و دماغ سے

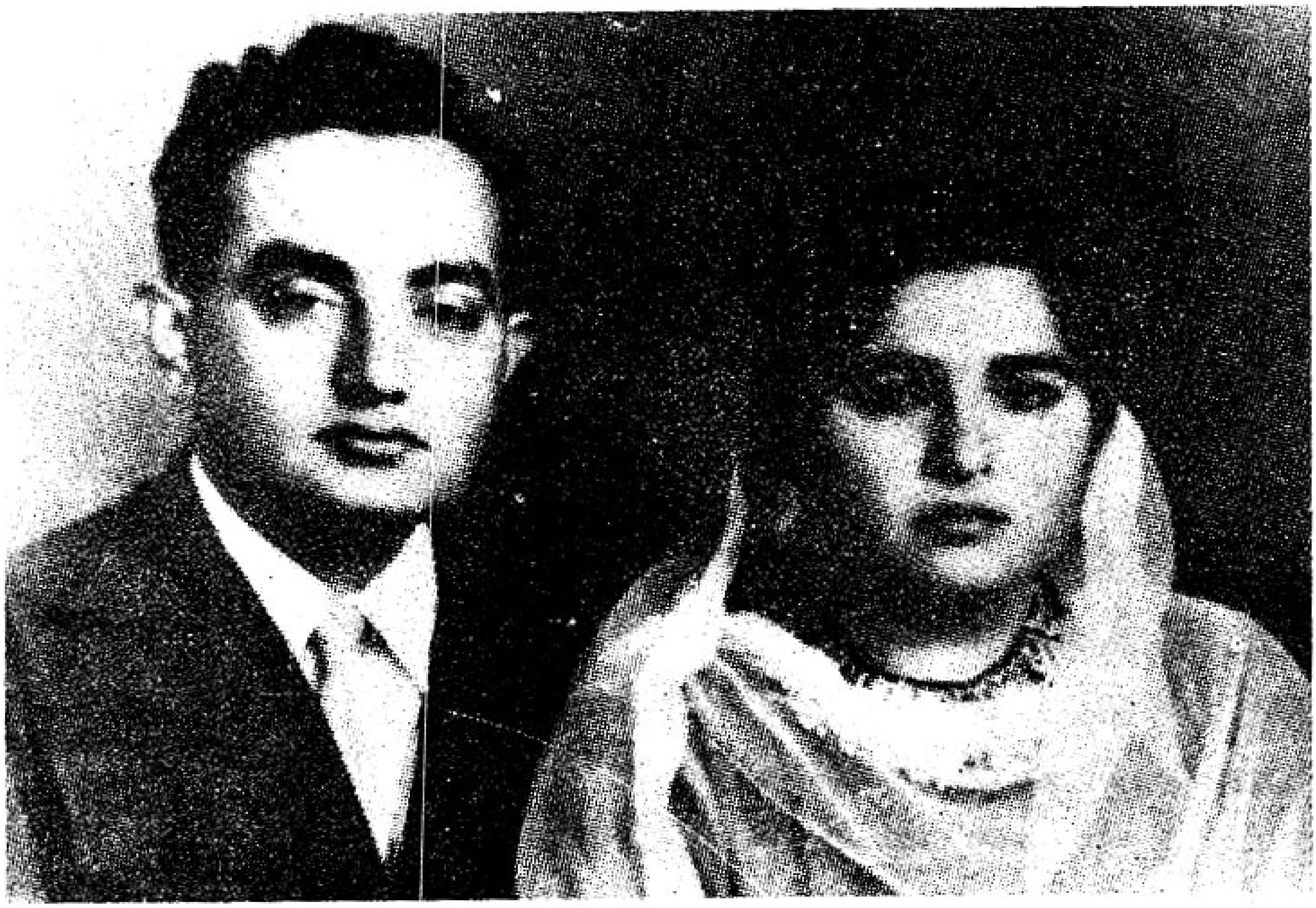

محو نہیں ہوا تھا۔ درد کی شدت کا اندازہ کیجئے‘ مگر تمام راستے ایک بار بھی ان کے منہ سے ”ہائے“ کی آواز نہیں نکلی۔

انہوں نے مطلقاً کسی گھبراہٹ‘ بے چینی‘ پریشانی یا اضطراب کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے زندگی میں اتنے مضبوط اعصاب کا انسان نہیں دیکھا۔ ان کی ظاہر حالت سے اس امر کا احساس ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ ان کی گردن کا منکا ٹوٹ چکا ہے یا بازو اور ٹانگ مفلوج ہو چکے ہیں:

اپنے عظیم شوہر کی زندگی کے ان لمحات کا ذکر کرتے ہوئے ۔زرینہ اختر بھٹی نے بتایا: ”ہم لوگ ان دنوں جہلم کے ایک خوبصورت بنگلہ میں رہتے تھے میجر صاحب وہاں جی ایس او IIاوپریشنز تھے ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جمعرات ۴ دسمبر 1958ء کو پچھلے پہر وہ لاہور تشریف لے گئے اور ہفتہ کو آنے کا وعدہ کر گئے تھے۔ ہفتہ کا دن شام میں تبدیل ہونے لگا تو مجھے تشویش سی ہوئی۔ میں نے لاہور کور ہیڈ کوارٹر میں میجر صاحب کو ٹیلی فون کیا۔ وہاں سے جواب ملا میجر بھٹی یہاں نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ پتہ کر کے مجھے ٹیلی فون کریں کہ میجر صاحب کہاں ہیں؟

وہ آج آنے کا کہہ کر گئے تھے۔ اگر کبھی ان کا قیام طویل ہو جاتا تو ضرور ٹیلی فون پر گھر اطلاع دے دیتے تھے۔ میں نے اپنے اردلی قطب الدین کو ٹیلی فون کے کمرے میں بٹھا دیا اور خود کام میں مصروف ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی قطب الدین نے ریسیور اٹھا کر بات کی۔ میں اندر جانے لگی تو اس سے باہر نکلتے ہوئے مجھے بتایا کہ ٹیلی فون پر صرف یہ اطلاع ملی ہے کہ

"صاحب" آج واپس نہیں آئیں گے بلکہ چند دن اور لاہور میں قیام کریں گے۔

میں نے قطب الدین سے پوچھا کہ ٹیلی فون پر میجر صاحب خود نہیں بول رہے تھے۔ کہنے لگا نہیں، کسی اور نے ہی یہ بتایا ہے۔

میرے دل میں گھبراہٹ سی پیدا ہوئی۔ میں اس مبہم پیغام کا مطلب نہ سمجھ سکی اور ایکس چینج سے کہا مجھے اس نمبر سے ملا دیں جہاں سے ابھی ابھی ہمارے ہاں کال آئی ہے۔ لاہور کے آپریٹر نے بتایا کہ اس نمبر پر تو ابھی ابھی سی ایم ایچ لاہور سے کال گئی تھی۔ اب میری گھبراہٹ پریشانی میں تبدیل ہوگئی۔ اور میں نے کہا مجھے جلدی اس نمبر سے ملا دیجیے۔ آپریٹر نے بلاتاخیر مجھے ہسپتال سے ملا دیا۔ دوسری جانب سے سی ایم ایچ لاہور کے ڈاکٹر نے.......... جو ایک کرنل تھے، مجھے بتایا کہ "میجر صاحب کو حادثہ پیش آیا ہے مگر انہوں نے ہمیں تاکید کر دی تھی کہ گھر میں آپ لوگوں کو اس کی اطلاع نہ دی جائے تاکہ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ ان کو اب آرام ہے آپ زیادہ فکر نہ کریں"

میں نے ریسیور رکھ دیا اور اسی وقت ایک آدمی موضع لادیاں اپنے شوہر کے والد صاحب کو بلانے کے لیے بھیج دیا۔ وہ رات کو تشریف لے آئے۔ وہ رات میں نے بڑے کرب میں گزاری۔ صبح بچوں کو قطب الدین کے حوالے کر کے ہم لاہور روانہ ہوئے۔ لاہور پہنچ کر ہم سیدھے ہسپتال گئے۔ جونہی میں

اپنے راجہ کے چہرہ' گردن اور بازو کو پلستر اور پٹیوں میں دیکھا تو میری چیخ سی نکل گئی۔ وہ بول نہیں سکتے تھے۔ البتہ انہوں نے بڑی مشکل سے چند الفاظ بڑبڑائے جو میں عمر بھر فراموش نہیں کرسکوں گی۔

کہنے لگے "زرینہ! تم نے یہاں آنے کی کیا حماقت کی ہے میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں"۔ مگر میں اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکی اس پر بابو جی...... ان کے والد صاحب...... نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا زرینہ! یہ رونے کا مقام نہیں ہے' اظہار تشکر کا موقعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر بجالانا چاہیے' کہ اتنے خوفناک حادثہ کے باوجود ہم اپنے راجہ کو زندہ دیکھ رہے ہیں۔ بابو جی نے اسی لمحہ پانی منگوایا اور وضو کرکے وہیں شکرانہ کے دو نفل ادا کیے۔ بابو جی کی اس بات کا میرے دل پر بھی گہرا اثر ہوا۔ میں نے سوچا واقعی اس حادثہ میں ان کا بچ جانا کتنا بڑا معجزہ ہے اور اس کے لیے اللہ پاک کا ہم جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ چنانچہ میں بھی وہیں نفل شکرانہ ادا کیے۔ اس رات ہم گجرات کے میجر شبیر بخاری کے ہاں آرڈیننس اسٹیٹ کے بنگلہ نمبر ۱۲ میں ٹھہرے تھے۔

ساڑھے تین ماہ تک وہ ہسپتال میں رہے۔ میں نے یہ معمول بنالیا کہ ہفتہ کے دن لاہور چلی جاتی تھی اور اتوار کے دن ان کے پاس رہتی تھی۔ اپنی والدہ کو بچوں کی خبر گیری کے لیے جہلم چھوڑ آتی۔ لاہور میں ہم زیادہ تر بریگیڈیئر امیر عبداللہ خان

نیازی کے ہاں قیام کرتے تھے' جن سے کوئٹہ میں قیام کے دوران ہمارے خانگی تعلقات ہو گئے تھے۔

حادثہ کے بعد میجر صاحب کا داہاں بازد اور دائیں ٹانگ مفلوج ہو گئے تھے۔ ٹانگ کچھ دنوں بعد ٹھیک ہو گئی۔ البتہ دایاں بازو بالکل مفلوج تھا۔ اس کو تو ہلا بھی نہیں سکتے تھے۔ اور وہ ہر وقت ایلومینیم کے فریم میں لٹکا رہتا تھا۔ پلاسٹر کی ٹوپی نے ان کا سر اور چہرہ یوں محیط کر رکھا تھا کہ وہ جبڑا تک بھی ہلا نہیں سکتے تھے اس کے باوجود وہ ہر وقت خوش رہتے تھے۔ میرے لیے یہ نظارہ بڑا ہی روح فرسا تھا۔ میں ان کو مل کر کبھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس بات سے وہ ضرور آزردہ خاطر ہوتے تھے۔ ایک دن مجھے کہنے لگے ''آؤ زرینہ! آج تمہارا اپنے ایک ایسے دوست سے تعارف کراؤں جس کی ٹانگ بھی کٹ چکی ہے لیکن اس کے باوجود وہ کتنا خوش ہے' پھر تمہیں بھی صبر آجائے گا ۔'' چنانچہ انہوں نے گجرات کے کیپٹن احسان الرحمٰن بخاری کو اپنے کمرے میں بلایا۔

کیپٹن بخاری کوئٹہ میں تھے کہ جیپ کے ایک حادثہ میں ان کی ٹانگ مجروح ہو گئی تھی۔ وہ کئی ماہ سے ہسپتال میں تھے۔ ان کی ٹانگ کاٹنا پڑی۔ وہ وجیہہ نوجوان ایک ٹانگ کے بغیر عجیب سے لگتے تھے۔ انہیں دیکھ کو کوئی انسان ہمدردی کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا' مگر میں نے دیکھا وہ ہمدردی سے بالکل بے نیاز تھے۔ انہیں ایک ٹانگ سے محرومی کا قطعاً کوئی احساس نہیں تھا۔ جیسے ان

سے چھیننے کی بجائے قدرت نے انہیں کچھ عطا کر دیا ہے۔ انکی اس زندہ دلانہ کیفیت کو دیکھ کر میں دیر تک کچھ سوچتی رہی اور پھر مجھے جیسے صبر سا آ گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس کے بعد جب بھی میں اپنے راجہ کو ملنے ہسپتال گئی مجھ پر پہلی سی کیفیت طاری نہیں ہوتی تھی اور نہ کبھی آنکھوں سے آنسو ہی جاری ہوئے۔

محترمہ زرینہ اختر بھٹی جب یہ باتیں سنا رہی تھیں تو قوم کا وہ عظیم ہیرو جو کئی دن اور کئی راتیں بھوک اور نیند سے بے نیاز اپنے فرض کی ادائیگی میں محاذ پر سینہ تانے کھڑا رہا' اپنے گھر کے سامنے خوبصورت باغیچہ میں ابدی نیند سو رہا تھا۔

محترمہ زرینہ کہنے لگیں: میں اب وہ لمحات یاد کرتی ہوں' تو مجھے یوں لگتا ہے کہ اس حادثہ میں ان کے بچنے کا معجزہ صرف اس لیے ظہور میں آیا کہ انہوں نے وہ عظیم الشان کارنامہ سرانجام دینا تھا جو سات سال بعد انہوں نے وطن عزیز کی حفاظت کرتے ہوئے داتا کی نگری لاہور کو بچاتے ہوئے دیا۔ ورنہ اس حادثہ میں زندہ بچ جانے کے باوجود یہ امر تو یقینی تھا کہ اگر میجر صاحب کا بازو اور گردن ٹھیک بھی ہو جائیں تو بھی وہ اب فعال کمان کے قابل نہیں ہیں۔ ان کی صلاحیتوں سے واقف ساتھیوں' دوستوں اور جاننے والوں کے لیے یہ ایک بہت بڑا صدمہ تھا۔ مگر نہ جانے میرے راجہ کو یہ اطمینان اور یقین کیونکر تھا کہ یہ سب کچھ جلد ٹھیک ہو جائے گا اور وہ فعال کمان کے ضرور قابل ہو جائیں گے"۔

حادثہ کے متعلق تفصیل بتاتے ہوئے ایک دن میجر صاحب کہنے لگے:

"زرینہ! جب گاڑی الٹی اور میری گردن کی ہڈی ٹوٹی تو درد کی

شدت سے مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ میرا آخری سانس ہے۔اس خیال کے ساتھ ہی کلمہ شہادت میرے لبوں پر آ گیا۔مگر دوسرے ہی لمحے نہ جانے کون سی قوت میرے اندر پکار اٹھی ''بھٹی! تجھے ابھی نہیں مرنا''۔معاً مجھے یقین ہو گیا کہ میں حادثہ سے بچ نکلوں گا'' وہ اکثر کہتے زرینہ!تم دیکھو گی کہ یہ میرا بازوئے شمشیر زن انشاء اللہ پہلے سے زیادہ طاقتور ہو جائے گا۔ میں ان کے اس یقین اور معصومانہ انداز پر مسکرا دیتی تھی۔مگراس کی ظاہری صورت دیکھ کر میں کبھی یہ باور نہیں کر سکتی تھی کہ اس بازو میں پہلی سی قوت لوٹ آئے گی۔

تھوڑے دنوں بعد میں جہلم میں تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی میں نے ریسیور اٹھایا' وہ حسبِ معمول پر مسرت موڈ میں تھے مگر آج وہ کچھ زیادہ ہی خوش معلوم ہو رہے تھے۔ کہنے لگے ''زرینہ! آج میں نے اپنے بازو کو خود ہلایا ہے''۔اسے ''یوں یوں'' تو گھما سکتا ہوں مگر ابھی ''یوں یوں'' نہیں گھما سکتا۔ساتھ ہی ٹیلی فون پر بخاری کے قہقہوں کی آواز آ رہی تھی کہ بھابی کو ''یوں یوں'' اس طرح بتا رہے ہو گویا یہ ٹیلی فون نہیں ہے ٹیلی ویژن ہے۔پھر بخاری سے بات کرنے لگے۔ بخاری کہہ رہے تھے کہ بھٹی یہ تو دونوں طرح ہل رہا ہے' کس طرح نہیں ہلتا؟ پھر میجر صاحب مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے زرینہ! بخاری کہتا ہے یہ تو دونوں طرح ہل رہا ہے؟اس پر بخاری کے قہقہے کے ساتھ آواز آئی کہ بخاری کہتا ہے!'' میں دوسرے دن لاہور پہنچی تو بازو کی صحت یابی

کی اس رفتار کو دیکھ کر مجھے انتہائی خوش گوار حیرت ہوئی۔اب میں بھی ان کے اس یقین میں شریک ہوگئی کہ انشاء اللہ بازو بہت جلد ٹھیک ہو جاوے گا۔صحت یابی کی رفتار حیرت انگیز تھی ۔ میں سمجھتی ہوں اس میں ان کی زندہ دلی اور قوت ارادی کو بڑا دخل تھا ۔ورنہ ڈاکٹر تو اس سے مایوس تھے اور ان کا کہنا تھا انگلستان میں جا کر آپریشن کرانا پڑے گا''۔

ان کے دوست میجر ایس ایم زیدی نے ایک ملاقات میں بتایا:

ایک دن جب میں ہسپتال میں گیا تو میجر بھٹی کیپٹن احسان الرحمٰن بخاری کے ساتھ باہر لان میں بیٹھے تھے۔ابھی جسم پر پلاسٹک جیکٹ پہن رکھی تھی۔مگر آج وہ پہلے سے کچھ زیادہ خوش نظر آرہے تھے۔پوچھا'اب بازو کا کیا حال ہے؟ کہنے لگے یار'ڈاکٹر نہیں مانتے وہ یہی کہتے ہیں کہ اس کی جو رگ حادثہ میں ضائع ہوگئی ہے'وہ بغیر آپریشن کے ٹھیک نہیں ہوگی اور آپریشن بھی پاکستان میں نہیں ہوسکتا' بلکہ اس کے لیے انگلستان جانا پڑے گا۔ورنہ بازو آگے پیچھے تو ہوسکے گا'البتہ یوں گھمایا نہیں جاسکے گا۔اس کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے بازو کو حرکت دی' مجھے حیرت اور تعجب ہوا تو کیپٹن بخاری نے کہا: کہ یہ پہلی دفعہ نہیں ہے۔ابھی گھر ٹیلی فون کرتے ہوئے انہوں نے بازو یوں ہلایا تھا۔

میجر بھٹی ڈاکٹروں کے اس تجزیہ سے متفق نہ تھے کہ بازو بغیر آپریشن کے ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ کہتے تھے یہ ڈاکٹر لوگ مجرد مادی اسباب کے پیش نظر نتائج اخذ کرتے ہیں۔حالانکہ جہاں تک اعصابی امراض کا تعلق ہے'ان کے شفایات ہونے میں قوت ارادی کا بے پناہ دخل ہے۔میرا یہ یقین ہے اور میرا یقین یوں ہی تو نہیں ہے کہ میرا بازو بغیر آپریشن کے ٹھیک ہوجائے گا۔

میرے اس سوال کا جواب دیں کہ اگر محض اتفاقیہ یا قوت ارادی کے بل پر بازو کی گردش ممکن ہے اسی اساس پر مستقلاً کیوں ممکن نہیں؟

ان کا یقین درست تھا اور یوں ان کی قوت ارادی ڈاکٹروں کے مشوروں پر غالب آئی اور حادثہ کے صرف ایک سو گیارہ دن بعد میجر صاحب جام صحت پی کر ہسپتال کو خیر باد کہہ چکے تھے۔

لڈوگ (Ludwig) نے نپولین کی سوانح حیات میں ایک ایسے ہی واقعہ کا ذکر کیا ہے جس میں نپولین، میٹرنک کے نام ایک خط میں اپنی قوت مقاومت کا تذکرہ بڑے فخر کے ساتھ ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

" Sometimes death only comes from lack of energy. Yesterday, when I was thrown out of my carriage, I thought I was done for. But I had just time to say to myself that I would not die. Anyone else in my place would have been killed."

....Napoleon

"بعض اوقات موت صرف قوت مقاومت کے فقدان کا دوسرا نام ہوتی ہے۔ کل مجھے جب گاڑی سے گرنے کا حادثہ آیا تو میں نے خیال کیا کہ بس میں اب گیا۔ مگر مجھے اپنے آپ سے یہ کہنے کا وقت مل گیا کہ میں نہیں مروں گا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس حادثہ میں موت کے سامنے سپر ڈال دیتا"

....نپولین

موت کیساتھ میجر عزیز بھٹی کا آخری مقابلہ ستمبر ۱۹۶۵ء کے دوسرے ہفتے میں ہوا۔ یہ دلچسپ سین دیکھنے سے قبل اس عظیم انسان سے متعارف ہو لیں۔

لادیاں
اور عزیز
کے آباؤ اجداد

گجرات کو ایک شاہراہ بھمبر (آزاد کشمیر) سے ملاتی ہے جو بھمبر روڈ سے موسوم ہے۔ یہ سڑک زمیندار ڈگری کالج گجرات کی عظیم الشان عمارت کے پاس سے سیدھی شمال کو چلی جاتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف جا بجا چھوٹے بڑے دیہات اور لہلہاتے کھیت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ دولت نگر کے پرانے قصبے سے آگے سڑک کے مغربی کنارے پر جدید طرز کی ایک خوش نما بستی حال ہی میں آباد ہوئی ہے۔ یہ ضلع میر پور کے ان باہمت فرزندوں کا مسکن ہے جنہیں منگلا بند کے باعث اپنی پرانی بستیوں کو خیر باد کہنا پڑا...... انہوں نے اپنی نئی بستیوں کے لیے اسی خوبصورت خطے کو منتخب کیا ہے۔

اس سے آگے گجرات سے سولہویں میل پر موضع صبور کے قریب سے ایک زیر تعمیر پختہ سڑک سیدھی مغرب کو مڑتی ہے۔ یہ پونے دو میل پر ایک چھوٹے سے گاؤں ...... لادیاں ...... لے جاتی ہے جہاں اس کا ایک عظیم فرزند اور پاکستان کا عظیم ہیرو محو خواب ہے۔ گاؤں سے باہر جنوب مشرقی کونے پر دور سے ہی ایک بلند پختہ عمارت اور کے پہلو میں ایک خوش نما باغیچہ نظر آتے ہیں۔

یہ مکان شہید کی رہائش گاہ تھی اور باغیچہ ان کی آخری آرام گاہ ہے۔ بھمبر روڈ سے آنے والی پختہ سڑک اور بجلی کے کھمبوں کی قطار کا رخ اسی عمارت اور باغیچہ کی طرف ہے۔ اس وسیع خطہ میں کھمبوں کی قطار دور سے یوں نظر آتی ہے جیسے کسی شہنشاہ کے استقبال کے لیے اہل دربار دست بدستہ کھڑے ہوں۔

۱۱۵ گھروں پر مشتمل یہ چھوٹی سی خوبصورت بستی جسے اب پاکستان کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے' آج سے پونے چار سو سال قبل سلطنت مغلیہ کے عظیم فرماں روا شہنشاہ اکبر اعظم کے عہد میں آباد ہوئی تھی۔

سب سے پہلے لدھیانہ (مشرقی پنجاب) کی طرف سے آنے والے بزرگ محمد نامی قوم گوجر' گوت ''لادی'' نے اس مقام پر ڈیرا جمایا۔ انہی دنوں اس کے سات آٹھ میل مغرب کی

طرف ایک گاؤں کھاریاں (جو اب تحصیل ہیڈ کوارٹر اور پاکستان کی عظیم فوجی چھاؤنی ہے) سے ایک شخص نیک محمد گوجر، گوت کھادی بھی اپنے مویشی لے کر اس جگہ چلا آیا۔ یہ مقام بالکل ویران تھا۔ لوگ زیادہ تر مویشی پال کر گزارہ کرتے تھے اور جنگل صاف کر کے تھوڑی بہت کاشت کاری بھی کر لیتے تھے۔

یہ دو ڈیرے بتدریج دو خاندانوں میں تبدیل ہونے لگے اور ویران جنگل میں رفتہ رفتہ ایک چھوٹی سی بستی کا ناک نقشہ ابھرنے لگا۔ ''لادی'' گوت کے افراد اس بستی کا نام ''لادیاں'' رکھنا چاہتے تھے اور گوت ''کھاری'' کے ''کھاریاں''۔ قرعہ فال پر یہ مسئلہ طے ہوا۔ قسمت نے ''لادیاں'' کے نام کی یاوری کی اور یہی نام تجویز ہوا۔ گاؤں پھلا پھولا اور ایک عرصہ تک آباد رہا۔ مگر جب عہد مغلیہ کی عظمت وسطوت زوال پذیری ہوئی تو طوائف الملوکی کے دور میں اس چھوٹی سی بستی کو لوٹ کر اجاڑ دیا گیا۔ لوٹ مار ان دنوں روزمرہ کا معمول تھی۔ اس کے باسیوں نے اردگرد کے قریبی بڑے دیہات میں پناہ لی اور وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ اس زمانے میں ضروریات زندگی مختصر اور مکانات بالکل سادہ سے ہوتے تھے۔ ہاتھ سے مٹی کی گول اینٹیں دھوپ میں خشک کر کے دیواریں بنا لیتے تھے۔ جنگل کی لکڑیوں، گھاس پھوس اور سرکنڈوں سے اسی پر چھت ڈال لیتے تھے۔

لادیاں کے باشندوں نے وہاں سے کوچ تو کیا مگر اپنی آباد کردہ زمینوں پر بدستور متصرف رہے۔ لوگ گائے، بھینسوں اور بھیڑ بکریوں کے علاوہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے رکھتے تھے۔ رات کو ڈیروں کی حفاظت کے لیے بڑے بڑے کتے پالنے کا رواج تھا۔

۱۸۲۲ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں گاؤں پھر آباد ہوا۔ لادیاں کے تمام سابق باشندے (یا ان کے ورثاء) اپنے گاؤں واپس آ کر بسنے لگے۔ گاؤں کا نام بدستور ''لادیاں۔'' رہا۔

۱۸۳۲ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے یہ گاؤں ایک ہندو فقیر انند دیوا داسی کو جاگیر میں دے دیا۔ انند دیوا داسی گورو برہم دیوا داسی کا چیلا تھا اور بھمبر نالہ کے مغرب میں لادیاں سے چار میل دور

موضع کوٹلی کے پاس اس کا ڈیرہ تھا۔

مہاراجہ کی طرف سے اسے دھرم ارتھ معاف تھا۔ کاشت کاروں کو پیداوار کا ایک تہائی حصہ جاگیردار کو دینا پڑتا...... کپاس کی فصل پر مزید ڈیڑھ روپیہ فی بیگھہ مالیہ لیا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ساری بستی، دروبست کے نذرانہ کے طور پر ۴۵ روپے سالانہ جاگیردار کو ادا کرتے۔

اس زمانے میں نقل مکانی عام سی بات تھی۔ لوگ قحط، خشک سالی یا دیگر وجوہات کے باعث اکثر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر آباد ہو جاتے تھے۔ لادیاں میں بھی اکا دکا لوگ باہر سے آتے رہتے تھے۔

ریاست جموں وکشمیر اور پنجاب ایک ہی حکومت کے زیرنگین ہونے کے باعث ان میں کوئی خصوصی امتیاز نہ تھا اور اوراِدھر آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ۱۸۴۴ء کے لگ بھگ بارہ مولا اور سری نگر کے درمیان واقع ایک بستی دیودر گڑ کے کچھ لوگ بھی کشمیر کے کوہساروں سے پنجاب کے میدانوں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ بیشتر افراد نے اپنے قیام اور کاروبار کے لیے مشرقی پنجاب کے مشہور شہر اور سکھوں کے متبرک مقام امرت سر کا رخ کیا۔ البتہ ان میں سے ایک بزرگ مولوی عبدالشکور نے شہر کی بودوباش پر گاؤں کی سادہ زندگی اور کھلی فضا کو ترجیح دی۔ انہوں نے اپنی لڑکی کا رشتہ تو وہیں امرتسر میں اپنے خاندان میں کیا، البتہ خود بیٹوں کے ہمراہ پنجاب کے خطہ یونان...... گجرات کے اس چھوٹے سے گاؤں کا اپنا مسکن بنالیا۔

مولوی عبدالشکور اس وقت عمر رسیدہ تھے۔ وہ بڑے خداترس اور پرہیزگار تھے۔ ان کے فرزندوں عبدالسلام اور لسا نے کاشتکاری اختیار کی۔ ان دنوں چراگاہیں زیادہ ہوتی تھیں اور وسیع رقبے غیر آباد پڑے تھے۔

۱۸۴۹ء میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دوسری جنگ بمقام چیلیانوالہ (ضلع گجرات) ہوئی جس میں سکھوں نے خوب داد شجاعت دی۔ مگر گجرات کے مقام پر پھر لڑائی ہوئی، تو وہ شکست کھا گئے اور یہ علاقے انگریزی عملداری میں شامل ہو گئے۔

۱۸۵۷ء کے بندوبست تک یہ گاؤں صرف ۴۷ گھروں پر مشتمل تھا۔ دیہات میں زندگی بہت ہی سادہ تھی۔ لوگ ایک' دو یا زیادہ سے زیادہ تین کمروں کے مکانات میں رہتے تھے۔ مکانات کے ساتھ کھلے پلاٹ ہوتے تھے۔ مسجدوں کے سوا تمام مکانات کچے ہوتے تھے۔ ضروریات زندگی مختصر تھیں۔ مزدور کی روزانہ اجرت ۲ آنے سے ۲ آنے تک تھی۔ اچھے سے اچھے کاریگر معمار کی اجرت ۵ آنے سے ٦ آنے روزانہ تھی۔ ضروریات زندگی سستی تھیں۔ گندم ایک روپے من بکتی تھی۔ لوگوں کے پاس روپیہ بہت کم تھا۔ البتہ سکون قلب اور فراغت زیادہ تھی۔ لوگ اناج کم کھاتے تھے۔ دودھ دہی مکھن اور گھی زیادہ استعمال کرتے تھے۔ کھیلوں اور نیزہ بازی کے عام مقابلے ہوتے تھے۔ جا بجا زیارت گاہوں پر پُررونق میلے منعقد ہوتے تھے۔

اس زمانے میں جب کسی بستی میں کوئی نیا خاندان آ کر آباد ہوتا تو بستی والے اس کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔ اس سے ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا تھا۔ بھٹی خاندان کے افراد لادیاں میں آئے تو گاؤں والوں کی طرف سے کئی دن تک دعوتیں دی جاتی رہیں۔ مولوی عبدالشکور ایک صاحب علم بزرگ تھے۔ دیودرگڑھ میں یہ لوگ کاشت کاری کرتے تھے۔ عبدالشکور کے دادا نمبردار تھے۔

ان کے بعد ان کے تایا نمبردار تھے۔ ان کے والد محمد جعفر فوت ہو چکے تھے۔ خاندانی روایات میں بہادری اور شجاعت کی داستانیں تھیں۔ یہ خاندان پھلنے پھولنے لگا اور گاؤں کی زندگی میں رس بس گیا.......... عبدالسلام کے پانچ لڑکے تھے۔ انہوں نے جلد ہی اپنی شرافت اور محنت سے نئی جگہ پر بھی اپنی عظمت و وقار کا سکہ بٹھا لیا۔ ان میں سے منجھلے لڑکے نوردین کے ہاں خدا نے پھر پانچ فرزند عطا کیے جن میں سے ایک صاحبزادے محمد عبداللہ بھٹی ہمارے ہیرو.......... راجہ عزیز بھٹی.......... کے والد تھے۔

عزیز بھٹی کا خاندان شروع ہی سے بڑا خدا ترس اور پرہیزگار مشہور ہے۔ ان کے کردار میں اسلامی رنگ ہمیشہ نمایاں رہا۔ عزیز کے دادا مولوی نوردین ایک متقی انسان تھے۔ ان کا زیادہ

وقت گاؤں کی مسجد میں یادِ خدا میں گزرتا تھا۔ عزیز کی دادی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کبھی نماز قضا نہیں کی تھی۔ وہ زندگی بھر تہجد گزار اور شب بیدار رہیں۔

عزیز کے دادا مولوی نورالدین ۱۹۳۶ء میں اس جہان سے کوچ کر گئے' دادی زندہ تھیں۔ جب ہانگ کانگ پر جاپان کا تسلط ہوا تو جاپانیوں کی طرف سے ہندوستانی باشندوں کو معین وقفوں کے بعد چند الفاظ پر مشتمل مختصر خطوط گھر بھیجنے کی اجازت تھی۔

عزیز کی دادی لادیاں سے قریبی ایک موضع سیدہ میں اپنی بیٹی کے پاس رہتی تھیں۔ عزیز کے پھوپھی زاد بھائی بشیر نے بتایا کہ ماموں جان (ماسٹر عبداللہ بھٹی) ہانگ کانگ سے جو بھی خط لکھتے تھے' اس میں تاکید سے یہ لکھتے تھے کہ بیشک میری زمین اور مکان تک بک جائے مگر میری والدہ کو کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ ۱۹۴۵ء میں ہانگ کانگ سے واپس لوٹنے سے پہلے وہ فوت ہو چکی تھیں۔

محمد عبداللہ بھٹی

۱۸۸۹ء میں لادیاں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں وہ اپنے عزیزوں کے ہاں امرت سر چلے گئے' جہاں گاؤں کی نسبت تعلیم حاصل کرنے کے زیادہ مواقع میسر تھے۔ ۱۹۰۸ء تک وہ سات سال امرت سر رہے۔ اس دوران میں صرف موسم گرما کی تعطیلات میں موضع لادیاں آتے تھے۔ ماسٹر جی کے والدین ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ والدین کی خوبیوں کا عکس ماسٹر جی کے کردار میں شب سے زیادہ نمایاں ہے۔

امرتسر میں قیام کے دوران انہیں اپنے والد کے پھوپھی زاد بھائی میر فقیر محمد کی صحبت میسر ہوئی۔ میر فقیر محمد اسم بامسمٰی تھے۔ وہ ایک فقیر منش انسان تھے۔ ماسٹر جی بیان ہے کہ انہیں اس درویش منش انسان کی بدولت استغناء اور قناعت کی دولت نصیب ہوئی اور یہ اسی استغناء اور قناعت کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے زندگی میں بڑے مشکل مراحل کو بڑے صبر و سکون سے عبور کیا۔

۱۹۰۸ء میں واپس آ کر انہوں نے چرچ آف سکاٹ لینڈ مشن ہائی سکول گجرات میں داخلہ لیا۔ جہاں سے ۱۹۱۱ء میں انہوں نے میٹرک کا امتحان امتیازی شان سے پاس کیا وہ شروع سے

ہی بڑے ذہین تھے۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد امرتسر میں انہوں نے وظیفہ حاصل کیا اور میٹرک تک وظیفہ حاصل کرتے رہے۔ میٹریکولیشن اس زمانہ میں تعلیم کی معراج سمجھا جاتا تھا۔

پرانے دیہاتی رواج کے مطابق ۱۸ سال کی عمر میں ہی نوجوان عبداللہ کی شادی اپنے خاندان کی ایک نیک سیرت خاتون آمنہ بی بی سے ہوئی۔ شادی کے وقت آمنہ بی بی کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ ماسٹر محمد عبداللہ تسلیم کرتے ہیں کہ بچوں کی تربیت میں ان کا ماں کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ وہ اس لحاظ سے اپنے آپ کو بے حد خوش قسمت تصور کرتے ہیں کہ ان کو زندگی کا ساتھی ان کی آرزو اور تصورات کے مطابق ملا۔ بچوں کی اعلیٰ تربیت میں اس جوڑے کی خوشگوار اور قابل رشک ازدواجی زندگی کا بہت بڑا حصہ ہے۔

حصول تعلیم اور شادی کے روزگار کے لیے تگ و دو کرنے کا زمانہ تھا۔ ان کے دو بڑے بھائی امام دین اور احمد دین ہانگ کانگ پولیس میں تھے۔ ایک چچا علم دین وہاں کافی عرصہ رہنے کے بعد ۱۹۰۹ء میں واپس آچکے تھے۔ نوجوان محمد عبداللہ کو بھی ہندوستان سے باہر حصول روزگار میں کشش محسوس ہوئی' چنانچہ عزیز کی پیدائش سے پورے بارہ سال قبل اگست ۱۹۱۱ء میں عزیز کے والدین تلاش روزگار میں ہانگ کانگ روانہ ہوئے۔

ہانگ کانگ
کی
زندگی

ہانگ کانگ میں نوجوان محمد عبداللہ بھٹی نیول پولیس میں بھرتی ہو گئے۔ وہاں کچھ عرصہ تک ملازمت کی مگر پولیس کی ملازمت ان کی طبیعت کو راس نہ آئی۔ ان کی طبیعت کا رجحان درس وتدریس کی طرف تھا۔ چنانچہ انہوں نے لدھیانہ کے ایک ٹیچر سردار بشن سنگھ کے ساتھ مل کر ہندوستانی بچوں کے لیے ایک پرائیویٹ سکول کھول لیا۔ ان دنوں ہندوستانی بچوں کے وہاں تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ ہندوستانیوں نے ان سے ایک علیحدہ سکول کھولنے کے لیے امداد چاہی۔ عارق علی کھاتا پیتا عرب تھا مگر اتنا زیادہ دولت مند نہ تھا' اس نے امداد کا وعدہ کرلیا۔

اس سلسلہ میں اس نے اپنے ایک اسرائیلی دوست اور تاجر ایلس کدوری سے بھی بات کی 'ایلس کروڑ پتی تھا۔ اس نے کہا کہ میں دونوں سکولوں کی تعمیر کے لیے ساری رقم اپنی جیب سے دے دیتا ہوں' مگر یہ سکول میرے نام سے منسوب ہونے چاہئیں۔ چنانچہ اس یہودی کی توجہ سے ہندوستانی بچوں کے لیے Sir Ellis Kadoorie School For Indians اور چینی بچوں کے لیے Sir Ellis Kadoorie School For Chinese تعمیر ہوئے' جو بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں۔ ہندوستانی سکول کے اولین اساتذہ میں ماسٹر محمد عبداللہ اور ماسٹر بشن سنگھ بھی شامل تھے۔ محکمہ تعلیم سے منسلک ہونے کے بعد ماسٹر محمد عبداللہ نے خود بھی مزید تربیت حاصل کی اور کوئینز کالج سے تین سالہ تدریسی تربیتی کورس پاس کرلیا۔

وہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کی پہلی جنگ عظیم میں تعلیم وتدریس کے علاوہ رضا کار پولیس ریزرو میں کراؤن سارجنٹ کے عہدہ پر بھی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ سرایلس کدوری سکول میں ٹیچر کی معزز آسامی پر انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز ایک سو روپیہ کے مشاہرہ سے کیا اور ۱۹۴۱ء میں جاپان کے ہانگ کانگ پر قبضہ تک ساڑھے بارہ سو روپے ماہوار کی تنخواہ سے بڑے آرام سے آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

۱۹۱۸ء میں ان کے ہاں پہلا بچہ نذیر احمد تولد ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم کے بعد وہ پہلی دفعہ موضع لادیاں آئے۔ دوسری دفعہ ۱۹۲۶ء میں جب موضع لادیاں آئے تو عزیز تین سال کا تھا۔ اس سے تین بہن بھائی بڑے تھے۔

اس کے بعد یہ سارا خاندان آٹھ ماہ کیلئے ۳۴-۱۹۳۳ء میں لادیاں آیا۔ یہاں انہوں نے گاؤں کے باہر اپنا ایک الگ دومنزلہ خوبصورت مکان تعمیر کیا۔

پیدائش

اور

بچپن

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر کز دام ودد ملولم وانسانم آرزوست

زہمرہان ست عناصر دلم گرفت شیر خدا ورستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم

گفت آں کہ یافت می نشود آنم آرزو است

..........................رومیؒ

•

۱۹۲۳ء میں اگست کا مبارک مہینہ تھا۔ سورج برج اسد میں تھا۔ سوموار ۶ اگست صبح کے تین بجے تھے۔ نیم براعظم پاک و ہند میں لوگ گہری نیند سو رہے تھے' مگر دور ہانگ کانگ کے چھوٹے سے جزیرے میں باران رحمت ہو رہی تھی اور آفتاب طلوع ہو چکا تھا' وہ افتاب جو ہر روز ساڑھے تین گھنٹے پہلے اس سرزمین کو روشن کرتا ہے۔ مگر آج دوان چائی کے ایک چار منزلہ مکان کی آخری منزل پر وہ آفتاب طلوع ہوا جس کی کرنوں سے ۲۴ سال بعد سرزمین پاکستان روشن اور تاریخ پاکستان میسر ہونے والی تھی۔

مشیت ایزدی کے سربستہ راز کون جان سکتا ہے۔ کون یہ اندازہ کرسکتا تھا کہ ہانگ کانگ کے چھوٹے سے جزیرے میں ہندوستان سے تلاش روزگار میں آئے ہوئے ایک سکول ٹیچر کے ہاں آج اس بچے نے جنم لیا ہے جو ایشیا میں دس کروڑ انسانوں کے ایک ایسے ملک کا ہیرو بننے والا ہے جو ربع صدی بعد دنیا کے نقشے پر ابھرے گا۔ یہی وہ مبارک مہینہ ہے جس میں ۲۴ سال بعد پاکستان نے جنم لیا۔

عزیز کی والدہ نے بتایا کہ بچپن میں اس کا نام "عزیز احمد" رکھا گیا۔ عزیز احمد نام رکھنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہنے لگیں: ان دنوں ماسٹر جی (محمد عبداللہ بھٹی) سے ایک طالب علم اردو زبان سیکھنے آیا کرتا تھا۔ وہ ایک ایرانی سوداگر کا لڑکا تھا' جو ایران سے ترک وطن کے بعد ہندوستان کے مشہور

شہر بمبئی میں آباد ہو چکے تھے اور کاروبار کے سلسلہ میں اکثر ہانگ کانگ میں بھی رہتے تھے۔اس لڑکے کی ماں چین کی رہنے والی۔لہاسہ کالج کا یہ طالب علم بڑا خوبصورت اور بھولا بھالا تھا۔اس کی عادات بہت پیاری تھیں۔وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتا تھا۔وہ چینی اور انگریزی کے علاوہ فارسی اور تھوڑی بہت اردو بھی جانتا تھا۔ہمارے بچے اس سے بہت مانوس تھے اور وہ بچوں سے بہت پیار کرتا تھا۔وہ صحیح معنوں میں اسم بامسمی تھا.........عزیز احمد

جب نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو ماسٹر جی نے مجھے پوچھا: نومولود کا نام کیا رکھیں؟ بڑے لڑکوں کے نام نذیر احمد اور بشیر احمد ہیں۔کہنے لگے: عزیز احمد کیوں نہ رکھ دیں؟ میں نے اسے بہت پسند کیا ۔اور بچوں کو بھی یہ نام بہت پسند آیا۔چنانچہ یہ نام طے پایا۔

ہانگ کانگ میں قیام تک ان کا نام عزیز احمد ہی رہا۔ان کی طلائی انگشتری پر بھی اسی نام کے پہلے حروف AA کندہ ہیں۔

ان کی والدہ بتانے لگیں: عزیز احمد کو پیار سے ہم راجہ' بھی کہتے تھے۔اس کی عادات واطوار میں ایک طرح کا شاہانہ پن تھا۔اس کے کردار میں شہزادوں اور راج کماروں کی سی بلندی تھی ۔وہ دل کا بے پناہ سخی اور دوسروں کی امداد کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتا تھا۔اس لیے گھر میں اور باہر ہم جولیوں میں بڑا ہر دلعزیز تھا۔کیونکہ میں اسے راجہ کے سوا کسی اور نام سے نہیں پکارتی تھی' اس نے ''راجہ'' کو نام کا حصہ بنالیا۔قبیلہ کے امتیاز کے طور پر اس نے اپنے نام کے ساتھ ''بھٹی'' کے لفظ کا اضافہ کیا تو نام لمبا ہو جانے کے باعث صرف راجہ عزیز بھٹی لکھنا شروع کر دیا۔اور یہی نام آج زبان زد خاص وعام ہے۔

وان چائی محلّہ میں اس چار منزلہ عمارت کے ایک طرف پہاڑیاں تھیں جن کی چوٹیوں تک خوبصورت بنگلے بنے ہوئے تھے۔ان کی روشنیاں رات کو آسمان میں تاروں کی مانند جگمگاتی تھیں۔ دوسری طرف تاحد نظر نیلا سمندر تھا۔یہ وہ ماحول ہے جس میں عزیز نے آنکھ کھولی یہ شہر اپنی صفائی اور نفاست کے لحاظ سے پورے مشرق میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ماحول بڑا پرسکون تھا۔پھر وہاں

سے قریب ہی خلیج کازوے Causesay Bay کے بالکل سامنے لاؤسن سٹریٹ Lausin Street میں آ گئے۔

اب تو لاؤسن سٹریٹ اوران کے قرب وجوار میں بڑی بڑی تبدیلیاں آچکی ہیں مگر اس زمانہ میں ہانگ کانگ میں اونچے سے اونچا مکان چار منزلہ سے زیادہ نہ تھا۔اب تو عمارتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور چالیس منزلہ عمارتیں بھی ایستادہ ہیں۔ البتہ یہ عجیب بات ہے کہ لاؤسن سٹریٹ کا وہ مکان جس میں عزیز نے بچپن گزارا تھا' آج بھی جوں کا توں ہے۔اس کے سامنے اے آرپی کے چھپروں کی جگہ خلیج کازوے میجسٹریسی کی ایک عالی شان عمارت کھڑی ہے۔اے آرپی کے چھپر ۱۹۳۹ء میں ان کے گھر کے سامنے بنائے گئے تھے اور سین کین ٹاریس کی جگہ پندرہ منزلہ رفیع الشان عمارت کھڑی ہے۔

چند سال بعد لاؤسن سٹریٹ سے یہ خاندان تائی ہانگ (جسے تنگلو وان بھی کہتے ہیں) منتقل ہوا۔ یہ مقام شہر کا خوبصورت ترین حصہ تھا۔کوئنز کالج اور سرایلس کدوری سکول قریب تھے۔یہ ماحول پہلے سے بھی زیادہ پرسکون تھا۔عمارت سے سمندر کی جانب کوئنز کالج کی وسیع گراؤنڈ تھی۔ اس کے بائیں طرف پھروسیع پولو گراؤنڈ...... فرنچ ہسپتال بھی وہاں سے نزدیک تھا۔دوسری طرف پہاڑ اور قدرتی مناظر تھے۔سبزہ زار اور پھول تھے۔

ہانگ کانگ کی ساری زمین پتھریلی پہاڑیاں ہے جنہیں کاٹ کاٹ کر اور اس کی مٹی اور پتھروں کو سمندر میں پھینک کر حضرت انسان نے اپنی رہائش کے لیے جگہ بنالی ہے اور اسے خوب صورت گلستانوں اور سبزہ زاروں میں یوں تبدیل کر دیا ہے کہ یہ مطلق احساس نہیں ہوتا کہ کسی زمانہ میں اس جزیرہ میں خشک اور بھیانک پہاڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

(اقبالؒ)

اس قدرتی ماحول میں آنکھیں کھولنے اور پرورش پانے والے بچے کے دل ودماغ پر جو اثرات مرتسم ہوں گے' ان میں وسعت قلب' جفاکشی' محنت اور نفاست کو بالخصوص دخل ہوگا۔

وسیع سمندر' وسیع میدان اور اونچے اونچے پہاڑ اس کے دل و دماغ کو وسعتیں عطا کر رہے تھے۔ ان پہاڑوں کو کاٹ کر اور سمندروں کو پاٹ کر انسان نے محنت اور جفاکشی کی جو مثال قائم کردی تھی وہ اس کے دل میں عزم و ہمت' جرأت اور حوصلہ مندی کے جذبات کو ابھارتی تھی۔ ہانگ کانگ کی صفائیت اور خوبصورتی' جہاں گرد و غبار کا نام و نشان تک نہ تھا اس کی طبیعت کو نفاست اور پاکیزگی عطا کر رہی تھی۔

ہانگ کانگ ایک بین الاقوامی فری ٹریڈ (Free Trade) شہر تھا' ساری دنیا کی تجارتی منڈی جہاں دنیا بھر کے لوگ آتے جاتے تھے۔ سرزمین اور مقامی آبادی چینی تھی۔ کالونی برطانوی' چینیوں اور انگریزوں کے علاوہ ہندوستانی' جاپانی اور دیگر مشرقی اور مغربی اقوام کے باشندے بکثرت رہتے تھے۔ اس کاسموپالیٹن (Cosmopolitan) شہر میں پروان چڑھتے ہوئے انسان کے دل و دماغ میں تنگ نظری اور تعصبات کو بہت کم جگہ ملتی ہے۔

بچپن کے کھیل

بچپن میں عزیز بڑا نازک اندام تھا۔ کھیلتے ہوئے اکثر اس کے جوڑ ٹل جاتے تھے اور پھر کئی کئی دن گھر میں پریشانی رہتی ۔عزیز کی بڑی بہن طاہرہ نے بتایا کہ عزیز کو بچپن میں دو کھیلوں سے خاصی دلچسپی تھی ۔ ہم سب بہن بھائی دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر اکثر سکول کا ڈرامہ کرتے تھے۔ اس میں ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل کا رول ہمیشہ بڑے بھائی نذیر احمد ادا کرتے تھے۔ وہ ہم سب سے بڑے ہی نہیں ہیں' یوں بھی ان کی شخصیت میں تحکم غالب ہے۔ میں ٹیچر بنتی تھی لیکن بچوں میں سکول کی گھنٹی بجانے والے چپڑاسی کے رول پر ضرور جھگڑا ہوتا۔ کوئی بچہ از خود اس رول کر لینے پر تیار نہ ہوتا' لیکن عزیز اسے سب سے زیادہ پسند کرتا تھا۔ بچپن سے ہی انکسار پسندی اسمیں بدرجہ اتم موجود تھی' چنانچہ وہ سکول کی گھنتی بجا کر بڑی خوشی محسوس کرتا تھا۔ دوسرا کھیل جس میں عزیز کو بہت زیادہ دلچسپی تھی اور اس دلچسپی میں اس کے مستقبل کے حقیقی رول کے آثار بھی ملتے ہیں' جنگ کا ایک کھیل ہوتا تھا۔ بچوں کے کسی انگریزی رسالہ میں اس نے ٹینکوں کی لڑائی کا ذکر پڑھا جو اسے بہت پسند آیا' وہ اسے عملاً کھیلتا تھا۔ اس کھیل کے اجزاء مجھے اب تک یاد ہیں ۔ وہ کچھ الاسٹک اور کچھ موم لیتا تھا۔ پھر سوراخ والے پیسہ کی شکل کا ایک سکہ ہوتا تھا' اسے مضبوط دھاگے سے ایک سرے سے باندھ دیتا تھا۔ جب اسے پوچھتے کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ تو خوش ہو کر کہتا کہ ''میں ٹینکوں کی لڑائی لڑ رہا ہوں' میں ٹینک کی لڑائی لڑ رہا ہوں۔''

سادگی اور ذہانت

عزیز سکول میں داخل ہوا تو اس کے اساتذہ کو اس کی بے پناہ ذہانت پر خوش گوار حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ بظاہر وہ بالکل سادہ اور بھولا بھالا تھا۔ وہ ذہین تھا مگر چالاک اور ہوشیار نہ تھا۔ موٹی موٹی نشیلی آنکھوں، کشادہ پیشانی، گھنگریالے بالوں اور باریک ہونٹوں کے ساتھ اس کے خوبصورت چہرے پر بے پناہ سادگی اور معصومیت کھیلتی تھی۔ اس کی سادگی اور بھولپن کے بہت سے واقعات ہیں، لیکن یہ بھولپن ذہانت سے عاری نہ تھا۔ اس کی مثال روایتی بھولے بھالے جان کی مانند تھی جسے ایک مل مالک نے پوچھا تھا۔ بتاؤ جان! تم کیا جانتے ہو؟

''جان نے جواب دیا'' میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ فلور مل کے مالک کے مرغے اور مرغیاں بہت موٹے تازے ہوتے ہیں۔'' اس پر فلور مل کے مالک نے کھسیانے ہو کر پوچھا'' اچھا تو تم کیا نہیں جانتے؟''

''تو جان نے کہا۔ البتہ میں یہ نہیں جانتا، کہ وہ غلہ کس کا کھاتے ہیں؟''

پیشین گوئی

چنانچہ بچپن میں ایک دفعہ جب ایک چینی نجومی نے عزیز کی ہارو سکوپ (Horoscpe) بنا کر یہ پیش گوئی کی تھی کہ وہ نہ صرف زندگی میں بڑا نام پیدا کرے گا بلکہ جب اس دنیا سے رخصت ہو گا تو اس کی شہرت دور دور تک پھیل جائے گی، تو اس کے والد اور اساتذہ کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔

''چاپائی'' کے لطیفے

سات آٹھ سال کی عمر تھی۔ عزیز اپنے ایک ہم عمر دوست عبدالوہاب کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ وہاب بمبئی کے ایک سلک مرچنٹ کا لڑکا تھا۔ کھیلتے کھیلتے وہ کسی بات پر لڑ پڑے۔ اتفاق سے عزیز کے سر پر چوٹ آئی۔ بظاہر چوٹ کا کوئی نشان نہ تھا' لیکن وہ بولتا نہیں تھا۔ اسے قریبی مشہور فرانسیسی ہسپتال میں لے جایا گیا۔ ڈاکٹر بنجے (Doctor Bunje) نے اس کا طبی معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ ایک نس ہوتی ہے جس پر چوٹ اور صدمہ سے گویائی عارضی طور پر معطل ہو جاتی ہے' یہ جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ عزیز کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا اور اس کی بری بہن طاہرہ اس کے پاس رہی۔ مگر تین دن گزر گئے اور عزیز کوئی بات نہ کر سکا۔ ویسے جسمانی طور پر وہ بالکل تندرست تھا اس پر گھر والوں کی تشویش بڑھی۔ ڈاکٹر نے کہا ویسے تو ٹھیک ہے البتہ نفسیاتی طور پر اس کی گویائی واپس لانے کے لیے اسے کسی نہ کسی طرح ضرور بولنے پر مجبور کیا جائے۔ اس پر طاہرہ کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے نہایت بھولے پن سے پنجابی میں عزیز سے پوچھا ''عزیز ویر سچی مچی دس تیرے کولوں بولن نئیں ہوندا؟'' (عزیز بھائی سچ سچ بتاؤ کیا تم بول نہیں سکتے؟'') یہ اس کی انا پر براہ راست ایک چوٹ تھی۔ وہ اسے برداشت نہ کر سکا۔ اس کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی اور مشکل کے ساتھ ہکلاتے ہوئے بول اٹھا ''سونہہ قرآن دی آپا بولن ای نئیں ہوندا'' (قرآن کی قسم آپا بولا ہی نہیں جاتا) اس کی آپا خوشی سے اس کے بھولے پن پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ عزیز کو اپنی سادگی کا احساس ہوا۔ اس کے بعد پھر وہ خاموش ہو گیا' مگر اب اس کی زبان کھل چکی تھی۔ ڈاکٹر نے مطمئن ہو کر کہا: اب بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگ گیا۔ اس کے گھر والے مدت تک اس بھولے بھالے بچے سے مذاق کرتے تھے کہ ''سونہہ قرآن دی آپا بولن ای نئیں ہوندا''۔

دوسرا لطیفہ

ابلے انڈوں سے بچے نکالنا

تعلیم ذہانت کے باوجود عزیز' نو دس سال کی عمر تک دنیاوی معاملات میں اتنے بھولے اور سیدھے سادے تھے کہ ایک دن خادمہ ان کا بستر درست کرنے لگی تو تکیہ کے نیچے سے دو ابلے انڈے نکلے۔ خادمہ حیران ہوئی اور بلا کر پوچھا "چائی" (بچپن میں عزیز کو اسی نام سے زیادہ پکارتے تھے' یہ چینی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چھوٹا معصوم بچہ ہیں)۔ یہ انڈے کیسے ہیں؟ چائی نے انڈے خادمہ کے ہاتھ سے لیتے ہوئے معصومیت سے کہا "میں نے یہ انڈے اس لیے تکیہ کے نیچے رکھے ہیں کہ ان سے بچے نکلیں گے"۔ جب خادمہ کی زبانی باقی گھر والوں کو یہ معلوم ہوا کہ عزیز نے تکیہ کے نیچے ابلے انڈے بچے نکالنے کے لیے رکھے تھے تو مارے ہنسی کے گھر والوں کا برا حال تھا اور ابلے انڈوں کا لطیفہ تو دہرا کر اکثر ان سے مذاق کیا جاتا۔

پہلی اور آخری چوری

عزیز نے بچپن میں کبھی چوری نہیں کی تھی اور جھوٹ تو وہ چاہیں تو بھی نہ بول سکتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا جو ان کو ہمیشہ یاد رہا۔ ہوا یوں کہ سب بھائی شاپنگ کے لیے جاپانیوں کی ایک دکان پر گئے' یہ کھلونوں کی ایک بہت بڑی دکان تھی۔عزیز نے کھلونے دیکھتے ہوئے ایک چھوٹی سے پلاسٹک کی خوبصورت بندوق چپکے سے اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا جاپانی دکان دار دیکھ رہا تھا' مگر وہ خاموش رہا۔ جب کھلونے خریدنے کے بعد سب بھائی دکان سے جانے لگے تو عزیز کے پاس سے گزرنے پر جاپانی دکاندار نے آہستہ سے اور نہایت شائستگی کے ساتھ کہا ''ننھے میاں وہ بندوق کہاں ہے؟'' عزیز نے چپکے سے بندوق جیب سے نکال کر اس کے حوالے کی اور خاموشی سے باہر آ گیا۔ گھر پہنچ کر خود اپنے والدین کو یہ قصہ سناتے ہوئے کہا ''جب اس دکان دار نے مجھے پیار سے یہ پوچھا کہ ننھے میاں بندوق کہاں ہے؟ تو خدا کی قسم اتنی شرم آئی کہ بیان نہیں کر سکتا' مجھے پسینہ آ گیا۔ پہلی دفعہ مجھ سے غلطی ہوئی اور وہ بھی پکڑی گئی۔ میں نے دل میں پکا ارادہ کر لیا کہ زندگی میں بھولے سے بھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔''

تعاون کا جذبہ

بچوں کو روزانہ جو جیب خرچ ملتا تھا اس میں سے وہ کچھ پس انداز بھی کر لیتے تھے۔ عزیز اور اس کے چھوٹے بھائی سردار احمد اکٹھا حساب رکھتے تھے اور عموماً اکٹھے خرچ بھی کرتے تھے۔ ان میں بعض دفعہ اختلاف رائے بھی پیدا ہوتا مگر عزیز کی ایثار و تعاون پسند طبیعت نے کبھی تعلقات میں خلل اور برہمی نہیں آنے دی تھی۔

سردار احمد کی طبیعت کا رجحان ذرا کفایت شعاری کی طرف تھا۔ اس کے برعکس عزیز کی طبیعت روپیہ پیسہ کے معاملہ میں شروع ہی سے بڑی فراخ واقع ہوئی تھی۔ وہ روپے کو جمع کرنے کے کبھی قائل نہیں ہوئے۔ چنانچہ جب کچھ پیسے جمع ہو جاتے تو عزیز کا مطالبہ یہ ہوتا تھا کہ ان سے کوئی اچھا سا کھلونا لے لیا جائے یا کوئی اچھی سی پکچر دیکھ لی جائے۔ مگر سردار کئی دفعہ اڑ جاتا اور جب عزیز اصرار کرتا تو سردار ہمیشہ یہ الٹی میتم دے دیتا کہ اگر تم نہیں مانتے تو اپنے اپنے پیسے بانٹ لو۔ اس پر عزیز مصالحت کر لیتا وہ ایک خوبصورت کھلونے یا اچھی سی پکچر سے محرومی کو تو برداشت کر لیتا مگر چھوٹے بھائی کے ساتھ تعاون اور بہترین تعلقات کی فضا کو مکدر نہ ہونے دیتا۔ عزیز ساری عمر اپنے بہن بھائیوں' عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ تعلقات میں یوں ہی ایثار اور تعاون سے کام لیتا رہا اور اس نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ہمیشہ مقدمہ رکھا۔

قوت وجدان

ان کا ایک چچازاد بھائی نذیر احمد بھی ہانگ کانگ میں ان کے پاس رہتا تھا۔ نذیر احمد کے والد احمد دین فوت ہو چکے تھے۔ وہ بھی ہانگ کانگ رہ چکے تھے۔ ماسٹر جی اسے تعلیم دلانے ساتھ لے گئے' اس نے میٹرک وہیں سے کیا۔ وہ اپنے چچیرے بہن بھائیوں کے ساتھ بالکل بھائیوں کی طرح رہتا تھا' لیکن عزیز کو اس کے ساتھ خاص انس تھا' وہ عموماً اس کے ساتھ ہی رہتا اور اسے کبھی احساس نہیں ہونے دیا کہ ان کے والدین مختلف ہیں اور بعد میں بھی زندگی بھر اس کے ساتھ یہ تعلق خاطر قائم رہا۔

نذیر احمد فوج میں نائب صوبیدار رہے۔ ایک ملاقات میں اس نے بتایا کے اس نے عزیز کو کبھی غصہ میں آپے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا......وہ طبعاً خاموش' کم گو اور شرمیلا تھا۔

نذیر احمد نے بتایا کہ عزیز ایک دن سائیکل پر اکیلا سکول جا رہا تھا اور ایک سکول ٹیچر اس کے پیچھے آ رہے تھے' عزیز نے پیچھے نہیں دیکھا۔ کئی لوگ سائیکلوں پر ادھر ادھر گزر رہے تھے لیکن

جب ماسٹر جی سائیکل پر اس کے قریب آئے تو اس نے کہا۔ ''گڈ مارننگ سر!'' ماسٹر جی بڑے حیران ہوئے۔ پوچھا تمہیں بغیر دیکھے کیسے پتہ چلا کہ میں آ رہا ہوں۔ کہنے لگا: یونہی احساس ہوا اور نہ جانے اتنے وثوق سے دل نے کیونکہ یقین کرلیا۔

ماسٹر جی کہتے تھے کہ عزیز احمد کی قوت وجدان بڑی تیز ہے۔ اور بھی کئی ایسے واقعات ہوئے جن میں عزیز یوں یقین کے ساتھ بات کہہ دیتے تھے جیسے وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں اور وہ بات بالکل سچ نکلتی تھی۔

عزیز کے ________
اساتذہ انعامات کھیلیں

سرایلس کدوری سکول کی انتظامیہ سکول کے لیے اساتذہ کا انتخاب بڑی محنت اور توجہ سے کرتی تھی۔ عزیز کے زمانہ میں ہیڈ ماسٹر ہملٹن (انگریز تھے جن کا نظم وضبط مثالی تھا اور جو درس وتدریس میں بھی کافی دسترس رکھتے تھے۔ دوسرے اساتذہ میں خان میر عالم خاں انگلش ماسٹر' ماسٹر محمد عبداللہ بھٹی مسٹر سی سی ٹونگ (چینی) اور ماسٹر بشن سنگھ قابل ذکر ہیں۔ یہ اصحاب نہ صرف اپنے اپنے مضامین کے ماہر تھے' بلکہ طلباء ان کی شخصیتوں سے روحانی فیض بھی حاصل کرتے تھے۔ ان کے علاوہ مسٹر فونگ' مسٹر پن' ماسٹر ہروت سنگھ اور ماسٹر چن سنگھ بھی بڑے محنتی اور ذہین اساتذہ تھے۔ بعد میں میر عالم خان کالج چلے گئے۔ عزیز ان کے ہونہار شاگرد تھے وہ سکول میں ہمیشہ وظیفہ لیتے رہے۔ امتحانات کے نتائج پر سب سے زیادہ انعامات لاتے تھے۔ بعض دفعہ ان کے کمرے میں انعامات اور کپ رکھنے کی جگہ نہیں رہتی تھی۔ عزیز کھیلوں میں خوب حصہ لیتے تھے' بچپن میں لکن میٹی 'رات گئے تک کھیلتے رہتے تھے۔ سکول میں کرکٹ' ہاکی' ٹینس اور فٹ بال کھیلتے تھے۔

عزیز کو موسیقی سے بچپن سے ہی بے حد شغف تھا اور اس کی یہ دلچسپی عمر بھر قائم رہی۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے ماؤتھ آرگن سے مختلف دھنیں بجانا سیکھا۔ وہ زیادہ انگلش اور چینی سروں کو پسند کرتا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ماؤتھ آرگن وہ ساری عمر بجاتے رہے۔

ہانگ کانگ میں سکول کی تعلیم صرف ساتویں درجے تک تھی۔ اس کے بعد تین سالہ کورس کو کالج کی تعلیم کہتے تھے...... جو ہمارے ہاں ہائی درجہ یا میٹریکولیشن کہلاتا ہے۔

اس سے اعلیٰ تعلیم جو یہاں ہمارے ملک میں کالج کی تعلیم کہلاتی ہے' ہانگ کانگ میں اسے یونیورسٹی تعلیم کہتے تھے۔

سکول کی چار دیواری یا میدان کارزار

عزیز بھٹی کے استاذہ اس کی ذہانت اور اطاعت شعاری سے بے حد متاثر تھے۔ سر ایلس کدوری سکول میں صرف مڈل تک تعلیم دی جاتی تھی میٹرک کے کوئنز کالج (Queen,s College) کی تعلیم مکمل کر چکا تھا اور یونیورسٹی میں داخلہ لے چکا تھا۔ اس کا بڑا بھائی بشیر احمد یونیورسٹی میں اس سے ایک سال آگے تھا...... پرنسپل کوئنز کالج کی سفارش پر برطانوی حکومت نے عزیز کے لیے یہ پیش کش کی کہ وہ سرکاری خرچ پر برطانوی یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ کورس کرے اور مطلوبہ تربیت حاصل کرنے کے بعد واپسی پر ہانگ کانگ میں اسے محکمہ تعلیم میں اعلیٰ عہدہ پر فائز کیا جانا مطلوب تھا۔ ان کے والد بڑے معزز استاد تھے اور بڑے بھائی نذیر احمد بھٹی کالج سے فارغ التحصیل ہو کر اسی ایلس کدوری سکول میں ٹیچر بن چکے تھے۔ اس خاندان کی اس سے زیادہ کیا آرزو ہو سکتی تھی کہ ان کا فرزند انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہانگ کانگ میں کالج کا پروفیسر یا محکمہ تعلیم میں افسر بن جائے۔

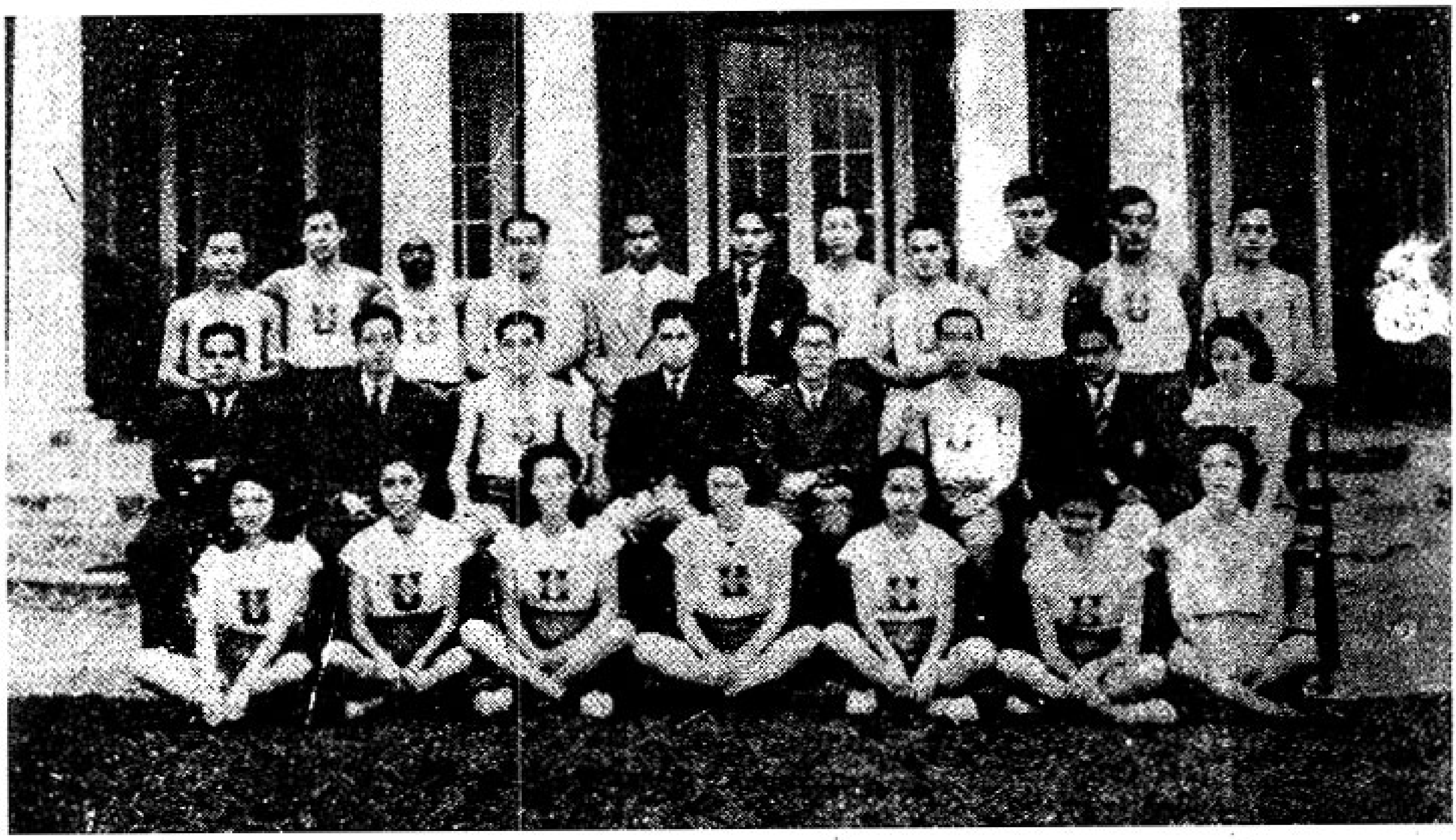

مگر قدرت نے عزیز کو سکول کی چار دیواری میں مقید کرنے کی بجائے میدان کارزار کے لیے منتخب کر رکھا تھا اور وہ ابھی میٹرک ہی کر پائے تھے کہ جاپان کے ہانگ کانگ پر تسلط کے باعث ان کی آئندہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

عسکری زندگی کے لیے موزونیت

البتہ انہوں نے عزیز کی عسکری زندگی کے رول کے لیے کبھی نہیں سوچا ہوگا۔ اول تو گھر کا ماحول ہی درس وتدریس کا تھا' دوسرا یہ اس وقت تک عزیز کے جسم میں وہ مضبوطی اور جفاکشی نہیں آئی تھی جو بعد میں اس کا خاصہ بنی۔ اس وقت تک وہ نرم ونازک' سیدھا سادہ' بھولا بھالا اور اطاعت شعار نوجوان تھا' جس کی عسکری زندگی کے لیے موزونیت مشکوک تھی۔ حالانکہ اسی زمانہ میں جرمنی کے ایک سکول ٹیچر کا ایسا ہی ایک نازک اندام' شرمیلا' خاموش طبع' سیدھا سادہ اور اطاعت شعار فرزند فوجی زندگی کے لیے اپنی عظمت کا لوہا منوا چکا تھا اور دوسری جنگ عظیم میں دنیا کا ایک نامور جرنیل بننے والا تھا۔ آپ نے بھی یقیناً اس المانوی افسانوی جرنیل کا نام سنا ہوگا......"وہ فیلڈ مارشل رومیل تھا"۔

ہانگ کانگ
پر
جاپانی تسلط

عزیز
افرادِ خاندان
کے
ہمراہ

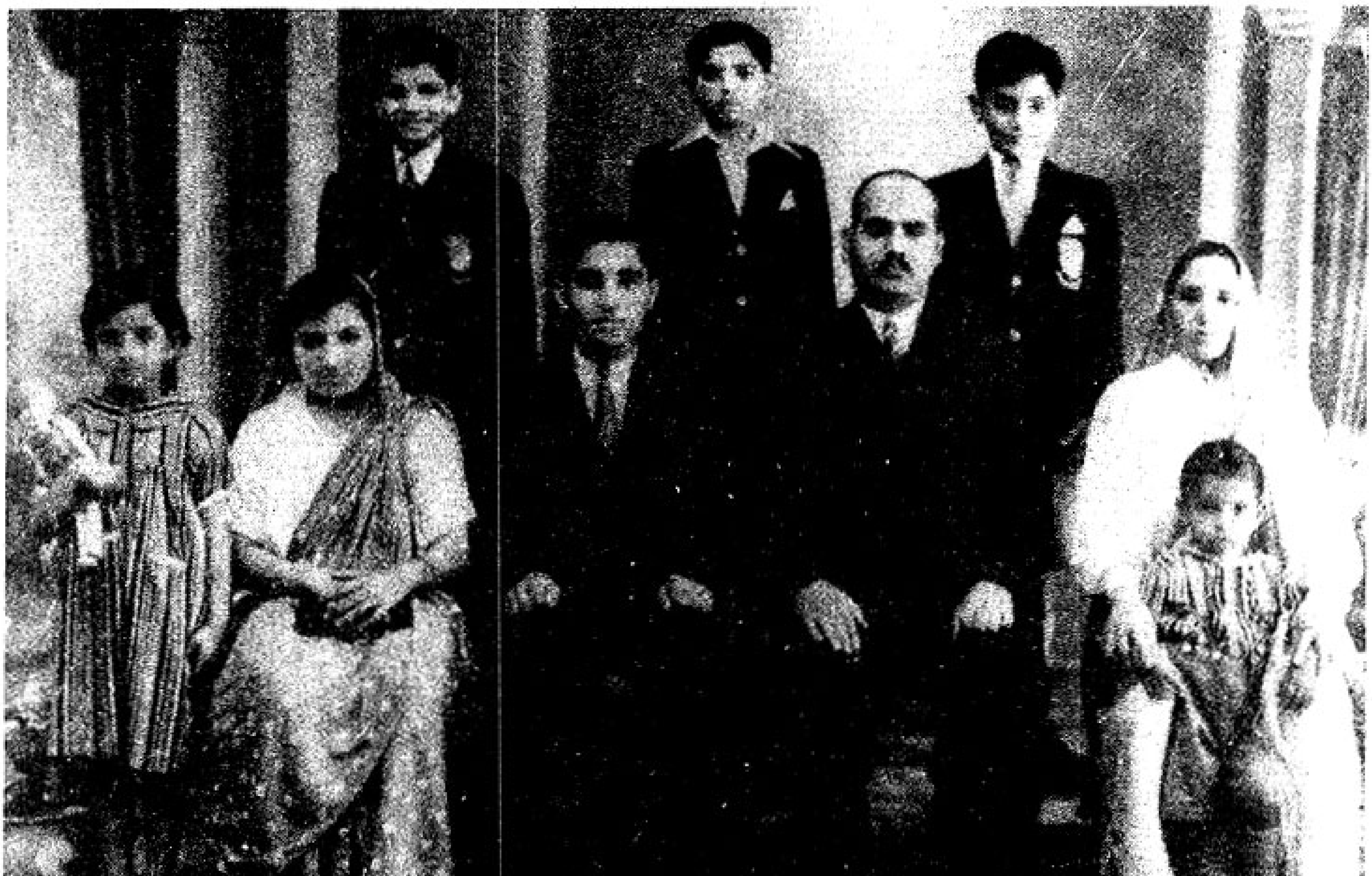

دائیں سے بائیں (کرسیوں پر) والدہ ننھے رشید کو گود میں لیے۔
ماسٹر محمد عبداللہ بھٹی، نذیر احمد، طاہرہ، رشیدہ گڑیا پکڑے ہوئے
دائیں سے (پیچھے کھڑے) عزیز، سردار، بشیر

برگ گل پہ رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
______ اقبالؒ

ہانگ کانگ میں یہ خاندان بڑی خوش حالی اور آرام وآسائش کی زندگی گزار رہا تھا۔ ماسٹر محمد عبداللہ سر ایلس کدوری سکول فار انڈین میں ایک باوقار ٹیچر تھے۔ ان کا بڑا صاحب زادہ نذیر احمد بھی گریجوایشن کے بعد اسی سکول میں درس وتدریس پر مامور ہو گیا۔ دوسرے بچے زیر تعلیم تھے اور سب کے سب ذہین تھے۔

عزیز کو انگلستان میں یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کے وظیفہ کی پیش کش بھی ہو چکی تھی۔ مگر

من درچہ خیالم وفلک درچہ خیال

۱۹۳۹ء میں ماسٹر جی ایک بچی کی شادی کے سلسلے میں وطن آ گئے تھے۔ جب وہ واپس ہانگ کانگ پہنچے تو تھوڑے دنوں بعد دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو گئی۔

۱۹۳۹ء میں یورپ میں جنگ شروع ہو چکی تھی۔ اس سے جاپان کو مشرق بعید میں خاصا موقعہ مل گیا۔ فرانس اور برطانیہ خود جنگ میں مصروف تھے۔ جب ۱۹۴۱ء میں ہٹلر نے روس پر حملہ کر دیا تو جاپان کے توسیعی ارادوں کو روکنے والا امریکہ کے سوا کوئی نہ تھا۔

شروع ۱۹۳۹ء میں جاپان نے جزیرہ ہینان کو روند ڈالا اور جنوب میں بڑھتے ہوئے 'جزائر سپاٹلے پر قبضہ کر لیا۔ یہ ۱۹۴۰ء کا وہ زمانہ تھا جب فرانس اور ہالینڈ میں ہٹلر کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ جاپان اب فرانسیسی ہند چینی (جس میں ویٹ نام کمبوڈیا اور لاؤس شامل ہیں) اور ولندیزی جزائر شرق الہند کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

چین کی مالی امداد جاپانی حملے کے متوقع شکار ممالک کے ساتھ فوجی نوعیت کی گفت وشنید اور جاپان کو فوجی اہمیت کا سامان دینے سے انکار کے بعد جاپان کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ امریکا کے

ساتھ جنگ کا خطرہ مول لیے بغیر مشرق میں اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

ابتدا میں جب ہٹلر کو روس پر حملے میں کامیابیاں ہوئیں تو جاپان کو شمال میں روس کی طرف سے حملے کا خطرہ ٹل گیا۔

چنانچہ جاپان نے امریکا کے ساتھ جنگ کا خطرہ مول لیتے ہوئے ۷ دسمبر ۱۹۴۱ء کو پرل ہاربر پر حملہ کر کے امریکی بحری بیڑے کو ناکارہ بنا دیا۔

پرل ہاربر پر جاپان کا حملہ ہانگ کانگ پر حملے کا پیش خیمہ ثابت ہوا کیونکہ دوسرے دن صبح ۸ بجکر ۵ منٹ پر جاپان نے دریائے لاؤ پو کو عبور کر کے اور کائی ٹک ہوائی اڈہ پر گولہ باری سے ہانگ کانگ پر حملے کا آغاز کر دیا۔

جاپانی فوج نے چار ہی دنوں میں مین لینڈ (Main Land) لے لیا۔ اور ۱۳ دسمبر کو برطانوی فوج سے جزیرہ پر ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کر دیا۔

ہانگ کانگ میں مقیم برطانوی فوج دو بریگیڈ سے زیادہ نہ تھی۔ جاپان اس اہم محاذ پر اپنی دو ڈویژن فوج لے آیا۔ برطانوی دفاع شروع ہی سے کمزور تھا۔ جاپانی فوج جنگی چالوں' فوجی تربیت اور ڈسپلن ہر لحاظ سے بہتر تھی۔ رات کی لڑائی کے لیے جاپانیوں کو بالخصوص تربیت دی گئی تھی۔ وہ اپنے ہلکے پھلکے سامان کے ساتھ پھرتی سے نقل و حرکت کرتے تھے۔ ان کے محکمہ جاسوسی نے اہم کردار ادا کیا۔

جاپانیوں نے ۱۸ دسمبر کو رات کے وقت لے مون سے نارتھ پوائنٹ تک مختلف مقامات پر اپنی فوج اتار دی۔ مقصد یہ تھا کہ ہے پی ویلی (وونگ نے ای چونگ گیپ) کے راستے جنوب کی طرف سے خلیج ری پلس تک زبردست پیش قدمی کر کے برطانوی دفاع کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

جنگ کے آغاز سے ہی ہانگ کانگ یونیورسٹی نے یونیورسٹی طلبا پر مشتمل ڈس پیچ رائڈرز (Despatch Riders) کا ایک جانباز دستہ منظم کر رکھا تھا' جسے حملہ کے دن سے خطرناک مقامات تک پیغام رسانی کا مشکل کام کرنا پڑتا تھا۔

عزیز احمد کا بڑا بھائی بشیر احمد بھی اس رضا کار دستے میں اہم خدمات سرانجام دے رہا تھا ۔ جاپانیوں کے ۱۸ دسمبر کے حملے میں وہ شدید زخمی ہو گیا۔ ۱۹ دسمبر کو نازک حالت میں اسے ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ وہ نیلی آنکھوں والا بشیر احمد' خاندان کا سب سے خوبصورت نوجوان تھا۔ بڑا ذہین' مستعد اور پھرتیلا تھا۔ اس کے زخمی ہونے سے سارے گھر والے انتہائی پریشانی میں مبتلا ہوئے۔ ہسپتال میں ۲۸ جنوری ۱۹۴۲ء تک زیر علاج رہنے کے بعد وہ صحت یاب ہو گیا۔

برطانوی افواج نے ۱۸ سے ۲۵ دسمبر تک ایک ہفتہ اور مقابلہ کیا۔ بالآخر ۱۹۴۱ء کے کرسمس کے روز ہانگ کانگ پر ایک سو سالہ بلا شرکت غیرے تسلط کے بعد اسے جاپانیوں کے حوالے کر دیا۔

یہ جنگ اس خاندان کے لیے بہت سے مصائب اور مشکلات لائی۔ جب جاپان نے ہانگ کانگ پر قبضہ کر لیا تو تمام سول کاروبار بند ہو گیا۔ سکولوں اور کالجوں کو تالے لگ گئے۔ جاپانیوں نے ہندوستانیوں کی تمام فوجی اور نیم فوجی تنظیموں کو توڑ کر انہیں قید کر لیا اور ان سے باقاعدہ مشقت لیتے تھے۔ غیر فوجی آبادی کو شروع میں یہ اجازت تھی کہ وہ پرتگیزی کالونی مکاؤ چلے جائیں ورنہ ہانگ کانگ میں حکومت جاپان کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں میں زندگی بسر کریں۔ بہت سے لوگ مکاؤ چلے گئے۔ ان کے علاوہ ہمت آزما اور جانباز قسم کے لوگ جان جوکھوں میں ڈال کر خشکی کے راستے پہلے اندرون چین چلے جاتے تھے' پھر وہاں سے فرانسیسی ہند چینی (موجودہ ویٹ نام' لاؤس اور کمبوڈیا) سے ہوتے ہوئے ہندوستان کو نکل جاتے تھے۔

اس خاندان نے ہانگ کانگ میں بڑے اچھے دن گزارے تھے۔ دوران جنگ ایک سال تک وہ اپنا اندوختہ کھاتے رہے اور کام چلتا رہا' مگر اب وہ سرمایہ بھی قریب قریب ختم ہو چکا تھا اور پیٹ پالنے کا اہم مسئلہ درپیش تھا۔

اس دوران ماسٹر جی نے ایک سکول جاری کرنے کی اجازت حاصل کی' جہاں جاپانی اور اردو کی تعلیم دی جایا کرے۔ ان کے ساتھ ایک اینگلو جاپانی استانی مسز سمتھ بھی تھیں' مگر جاپانی انتظامیہ نے سکول کو جلد بند کر دیا۔ اب وہ پھر بے کار ہو گئے۔ سردار احمد نے واچ مین کی معمولی سی

ملازمت اختیار کرلی۔

عزیز بھی شروع میں جاپانی نیوی میں واچ اینڈ وارڈ کی ڈیوٹی پر لگا۔ وہ جلد ہی ہیڈ واچ مین بنا دیا گیا۔ پھر جاپانیوں نے اس کی غیر معمولی ذہانت سے متاثر ہو کر اسے Mid (Shipman Cadet بحریہ میں کپتانی کے کورس) کی ایک کلاس میں داخل کرلیا' جس میں وہ اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت سے جاپانیوں کی کلاس میں اول آیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ کورس جاپانی زبان میں تھا اور اسے جاپانی زبان پر ابھی کچھ ایسا عبور حاصل نہیں تھا' مگر اس نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس کورس کی انگلش میں متبادل تمام کتابوں کو پڑھ ڈالا اور اس طرح اپنے مضمون پر دوسروں کی نسبت جلد حاوی ہو گیا۔

نقل مکانی اور مشکلات

جنگ کے باعث انہیں تایہانگ میں اپنے گھر کو خیر باد کہنا پڑا اور وہ براڈوے روڈ (Broadway Road) پر دوسرے گھر میں آ گئے۔ مگر جنگ میں ایک دن شدید گولہ باری کے باعث براڈوے روڈ پر دوسرے کا دروازہ بھی اڑ گیا اور انہیں وہ گھر بھی چھوڑنا پڑا۔ اب انہیں پہاڑی کے اوپر سٹینلے روڈ (Stanley Road) پر اپنا گھر بنانا پڑا۔ جنگ کا زمانہ تھا' مقامی چینی آبادی گھروں کو چھوڑ کر مین لینڈ پر بھاگ گئی تھی۔ گھروں کے گھر خالی پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے کسی خالی گھر کو دیکھ کر اس میں ڈیرہ ڈالنا ہوتا۔ کوئی کرایہ نہیں تھا' مگر کھانے پینے کی اشیاء کی بے حد گرانی تھی۔ سامان خوراک ہانگ کانگ سے ایک سو میل دور کنٹاں (Canton) سے درآمد کرنا پڑتا تھا۔ پھر ان اشیاء کو لے کر پہاڑی پر چڑھنے کے لیے بڑی مشکل پیش آتی تھی۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے ایک دستی گاڑی بنا رکھی تھی۔ ناز و نعمت میں پلے اور محنت و مشقت سے ناآشنا بچے شروع میں بڑے پریشان ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اور جسم درد کرتے تھے۔ مگر اس گاڑی کو دھکیل کر پہاڑی پر چڑھ جاتے تھے۔ جنگ کے بعد چاول اور مچھلی کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ جو کچھ انہیں محنت مزدوری سے حاصل ہوتا تھا' وہ ان کے گزارہ کے لیے ناکافی تھا۔ چنانچہ اکثر انہیں سخت پریشانی سے دوچار ہونا پڑتا۔ خاندان کے سبھی افراد کو اب تک یاد ہے کہ کس طرح ایک دفعہ آبنوس کی بنی ہوئی ایک خوبصورت اور قیمتی الماری دو وقت کے چاولوں کے عوض فروخت کرنا پڑی تھی! (یہ واقعہ بشیر کی ہندوستان روانگی کے بعد کا ہے)

مصائب میں مسکرانے والا ______

___ عزیز کی معصوم شرارت ______ سردار جی کی شیخی

عزیز بچپن میں بالکل سیدھا سادہ اور بھولا بھالا تھا' مشکلات اور مصائب میں پڑ کر خاصا ہوشیار اور جہاں دیدہ بن چکا تھا۔ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی پریشانی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتا تھا' بلکہ اس دوران میں اس کی طبیعت میں شوخی اور ظرافت آ چکی تھی ۔اس نے تاریک سے تاریک حالات میں اپنی خوش طبعی کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ وہ اپنے مزاج سے دوسروں کو خوب ہنساتا تھا۔ ان دنوں کی اس کی ایک معصوم شرارت یا لطیفہ قابل ذکر ہے۔

عزیز کے چھوٹے بھائی سردار احمد بھٹی (جو آج کل پاکستان ایئر فورس میں وارنٹ آفیسر ہیں) جاپانیوں کے ایک گیراج میں واچ مین کی حیثیت سے ملازمت کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ نانک سنگھ نامی ایک چوکیدار بھی تھا۔ نانک سنگھ بڑا لمبا دھڑنگا اور مضبوط جسم کا تھا مگر ویسے بزدل تھا ۔البتہ اپنی بزدلی پر پردہ ڈالنے کے لیے ہر وقت اپنی بہادری اور شجاعت کے فرضی قصے سناتا رہتا تھا ۔سردار بھی اس کی ڈینگیں اور شیخیاں سن سن کر تنگ آ چکا تھا۔ اس نے عزیز سے بھی اس کا ذکر کیا۔ عزیز کو فوراً ایک شرارت سوجھی ۔ کہنے لگا: چلو آج ہی تمہارے نانک سنگھ کی بہادری کا امتحان لیتے ہیں۔ اس نے ایک سکیم سوچ کر سردار احمد سے کہا' جس وقت رات کو وہ تمہارے پاس اوپر آ جائے تو مناسب وقت پر تم Swan Song گانے کی ٹیون بجا کر مجھے اشارہ کر دینا ۔ میں تمہارے سامنے قبرستان میں چھپا ہوں گا۔

حسب معمول دونوں "سردار پہرے پر آئے ۔ سردار احمد بھٹی اوپر کی منزل پر تھے اور سردار نانک سنگھ نچلی منزل پر۔ بلیک آؤٹ کی وجہ سے نیچے تو گھپ اندھیرا تھا' البتہ چاندنی کے

باعث اوپر ہلکی ہلکی روشنی تھی ۔ نانک سنگھ بلاناغہ سردار احمد کے پاس اوپر کی منزل میں چلا جاتا تھا۔ اس رات بھی وہ اوپر سردار احمد کے پاس بیٹھ کر اپنی بہادری کے فرضی افسانوں سے اس کا دماغ چاٹنے لگا۔ آدھی رات کے قریب سردار احمد نے مخصوص گانے دھن میں منہ سے سیٹی بجائی (یہ اشارہ اپنا کام کر چکا تھا)۔

جب دونوں چوکیدار خوش گپیوں میں مشغول تھے تو سنسان قبرستان کی طرف سے ان کو ایک سفید براق سی شے حرکت کرتی ہوئی نظر آئی۔ دونوں ہی اسے دیکھ کر ٹھٹک سے گئے۔ سردار احمد نے نانک سے (بظاہر) گھبرا کر پوچھا وہ کیا ہے؟ نانک کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ آدھی رات کے وقت قبرستان سے یہ کونسی بلا نمودار ہوئی ہے۔ ''بلا'' کے منہ سے ''زوں زوں'' کی آواز نکل رہی تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ یہ آواز اور بھی خوفناک معلوم ہوتی تھی۔ اس بلا نے آہستہ آہستہ ان دونوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اب تو نانک سنگھ بہت گھبرایا۔ کچھ دیر دم بخود دیکھتا رہا۔ پھر سردار احمد سے کہنے لگا: چلو بھاگ چلیں'' سردار احمد اسی لمحے کا منتظر تھا۔ وہ یہ سنتے ہی سیڑھیوں کی طرف لپکا' مگر نانک سنگھ کب اسے آگے نکلنے دیتا تھا۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ ابھی وہ آدھی سیڑھیاں نیچے اترے ہوں گے کہ نانک سنگھ کا پاؤں پھسل گیا۔ وہ دھم سے فرش پر گرا۔ گھٹنے پر چوٹ آئی۔ پاؤں کی انگلی سے خون بہنے لگا۔ مگر اس نے اس کی پرواہ نہ کی اور پھر اٹھ کر بھاگنے لگا۔ حتیٰ کہ گھر جا کر دم لیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک جاپانی سینئر آفیسر گشت لگاتا ہوا موقعہ پر پہنچ گیا اور نانک سنگھ کو غیر حاضر پا کر اس کے خلاف رپورٹ مرتب کرنے لگا۔ سردار احمد نے نیچے آ کر اسے سارا واقعہ من وعن سنا دیا۔ وہ جاپانی افسر بھی محفوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسنے اسی وقت نانک سنگھ کو گھر سے بلوایا۔ نانک آیا۔ بخار سے اس کا جسم پھنک رہا تھا۔

''بلا'' بھی وہاں پہنچ کر مذاق کی حقیقت سے پردہ اٹھا رہی تھی۔ نانک بے حد شرمندہ ہوا۔ دوسرے دن سب لوگ سردار نانک سنگھ بہادر کی شجاعت و مردانگی کے قصے دہرا رہے تھے' لیکن

نانک سنگھ کسی سے آنکھ ہی نہیں ملاتا تھا۔ نہ اس کے بعد نانک کو کسی نے شیخی بھگارتے سنا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ سفید "بلا" ہمارا ہیرو عزیز بھٹی تھا' جس نے لمبا سفید چوغہ پہن رکھا تھا اور سر پر انسانی کھوپڑی رکھ کر منہ سے زوں زوں کی آواز نکال رہا تھا۔

ریڈیو اناؤنسر

جاپان کے ہانگ کانگ پر تسلط کے دوران اس خاندان پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سرمایہ بھی ختم ہو چکا تھا اور کوئی کام بھی نہیں ملتا تھا۔ جاپانی ہر ایک سے اپنی مرضی کے مطابق زبردستی کام لیتے تھے۔ ماسٹر محمد عبداللہ کے متعلق ان کو معلوم تھا' کہ وہ سر ایلیس کدوری سکول وار انڈیز میں استاد تھے۔ انگریزی' چینی' جاپانی اور اردو زبانوں پر انہیں عبور حاصل ہے۔ ان سے ریڈیو اناؤنسر کا کام لیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انہیں ریڈیو اناؤنسر کی خدمت پر مجبور کیا گیا۔ ماسٹر جی نے سوچا کہ برطانوی حکومت کی تیس سال ملازمت کی ہے اور معقول پنشن پانے کا مستحق ہو چکا ہوں۔ ہندوستان میں جائیداد بھی ہے۔ اگر میں نے یہ ڈیوٹی دی تو دونوں سے محروم ہونا پڑے گا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب مسٹر سبھاش چندر بوس جرمنی سے کسی طرح جاپان پہنچ گئے تھے۔

ماسٹر جی نے سخت پریشانی کے عالم میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر ویئر سے مشورہ کرنے کے لیے تنہائی میں اس کے ساتھ ملاقات کی۔ پہلے تو ماسٹر جی نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ آخر یہ کیا بات ہے کہ باقی انگریزوں کو تو کیمپ میں نظر بند رکھا جاتا ہے اور آپ آزاد پھرتے ہیں۔ ڈاکٹر ویئر نے بتایا میں آئرش ہوں۔ آئرلینڈ اس جنگ میں غیر جانبدار ہے اس لیے مجھے یہ آزادی حاصل ہے پھر ڈاکٹر نے ماسٹر جی سے بے وقت آنے کی وجہ دریافت کی۔

ماسٹر جی نے اپنی پریشانی کی کہانی سناتے ہوئے مشورہ طلب کیا' کہ اس ریڈیو اناؤنسری کی "بلا" کو کیسے ٹال سکتے ہیں؟ ڈاکٹر ویئر کہنے لگے "چونکہ ہم غیر جانب دار ہیں ہمیں سیاسی مسائل پر زبان کھولنے کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ بطور پیشہ ور ڈاکٹر یہ سٹرٹیفکیٹ دے سکتا ہوں کہ یہ شخص اتنا بوڑھا ہے کہ ریڈیو اناؤنسری کے لیے موزوں نہیں۔ اگر اس سے آپ کا کام چل جائے۔"

"That he is too old become a Radio Announcer".

دوسرے دن صبح سویرے ماسٹر جی کو یہ پیغام ملا کہ وہ آزاد ہند فوج کی سپیشل کونسل کے روبرو پیش ہوں۔ ماسٹر جی کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ کونسل کے روبرو پیش ہوئے تو اس کے چیئرمین مسٹر نیڈو نے پوچھا "کل تم ڈاکٹر ویئر سے ملے تھے اور اس سے تم نے کیا مشورہ کیا تھا؟"

ماسٹر جی نے اعتراف کر لیا۔ مسٹر نیڈو کہنے لگے۔ دیکھو اب تو تم کو معاف کیا جاتا ہے آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔ چپکے سے ریڈیو اسٹیشن پر ڈیوٹی کے لیے پہنچ جاؤ۔

"مسٹر نیڈو ایک مدراسی ہندو تھے اور ایک بہترین انسان۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ بعد میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور عبداللطیف نیڈو اسلامی نام رکھا۔"

ماسٹر جی نے سمجھا کہ بلا ٹل گئی ہے۔ مگر دوسرے دن ایک جاپانی انٹیلی جنس آفیسر نے انہیں بلا لیا۔ اب تو ماسٹر جی گھبرائے کیونکہ جنگ میں جاپانیوں کی سختی اور ڈسپلن ضرب المثل تھے۔ اس افسر نے بھی وہی سوال دہرایا۔ ماسٹر جی نے یہاں بھی سچ سچ بتا دیا اور اس نے شدید قسم کی وارننگ دے کر انہیں چھوڑ دیا۔ ماسٹر جی نے سکھ کا سانس لیا۔ "جان بچی سو لاکھوں پائے۔"

مگر وہ سمجھنے سے قاصر رہے کہ ڈاکٹر ویئر سے ان کی ملاقات کا جاپانیوں کو کیسے علم ہوا۔

ماسٹر عبداللہ کچھ عرصہ ریڈیو پر جاپانی اور انگریزی اعلانات کا اردو ترجمہ پڑھ کر سناتے رہے۔ مگر ان کو یہ خدمت بہت مہنگی پڑی۔ اس کی پاداش میں ان کو برطانوی حکومت کی تیس سالہ ملازمت کے تمام حقوق اور پنشن سے محروم ہونا پڑا۔

دورِ آزمائش

''جو شخص بھی تاج مصر سر پر رکھنے کا طلب گار ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے زنداں مصر کے طوق و زنجیر کو اپنے دست و گریبان کا زیور بنا لے''

...............ابوالکلام آزاد

جاپان کے وسیع زندان میں اس مجبوری اور مقہوری کی زندگی سے تنگ آ کر نوجوان بشیر احمد نے سارے خاندان کو یہ مشورہ دیا کہ ہانگ کانگ سے مکاؤ چلے جائیں یا جزیرہ سے بھاگ ہی چلیں۔ ماسٹر محمد عبداللہ اس صورت حال سے پریشاں خاطر تھے' مگر وہ زمانے کے گرم و سرد چشیدہ تھے۔ انہوں یہ مشورہ قبول نہ کیا اور مزید صبر و انتظار کی تلقین کی۔ مگر بے حد حساس اور پر جوش نوجوان بشیر احمد کے لیے پابندی اور ذلت کی یہ زندگی ناقابل برداشت ہو گئی۔ وہ طائر آزاد قفس کی تیلیاں توڑ کر ایک بار پھر آزاد فضاؤں میں چہچہانا چاہتا تھا۔ اس نے تنہا ہانگ کانگ سے نکل جانے کا منصوبہ بنا لیا۔ گھر والے اس کے اس پر خطرناک اقدام سے متفق نہ تھے۔ وہ کہتا تھا کہ قید و بند کی موجودہ زندگی پر وہ موت کو ترجیح دے گا اس کی مستعدی' ولولہ اور اس شوق بھری خواہش کے پیش نظر بالآخر گھر والے بھی راضی ہو گئے۔

اکا دکا آدمی کا وہاں سے نکل جانا یوں بھی زیادہ مشکل نہ تھا۔ اکثر لوگ وہاں سے بچ بچا کر بھاگتے رہتے تھے۔ بشیر احمد بلا کا ذہین اور بڑا تیز طرار نوجوان تھا۔ گھر والے اپنے مستقبل کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہاں سے کب چھٹکارا حاصل کر سکیں گے یا ان کا کیا حشر ہو گا؟ بشیر کے بچ کر نکل جانے کے تصور سے ان کو کم از کم یہ اطمینان ہو گیا کہ ان کا ایک بچہ تو بچ کر واپس وطن پہنچ جائے گا۔

پرواز سے قفس تک

۳ دسمبر ۱۹۴۲ء کو بشیر احمد نے ہندوستان اپنے وطن واپس جانے کے ارادے سے ہانگ کانگ کو الوداع کہا۔

۱۶ فروری ۱۹۴۳ء کو جبکہ وہ مکاؤ میں تھے' ان کی ملاقات ایک ہندوستانی نوجوان محمد صادق سے ہوئی۔ وہ ہانگ کانگ یونیورسٹی میں چوکیدار رہ چکا تھا۔ بشیر احمد پروگرام کے مطابق دوسرے دن مکاؤ سے کوانگ چاؤوان رخصت ہونے والے تھے۔ محمد صادق نے انہیں متنبہ کیا کہ اگر وہ کوانگ چاؤوان گئے تو وہ جاپانیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جائیں گے۔ اس نے رازداری سے بتایا کہ اس نے دو ہندوستانیوں کو ان کے بارے میں باتیں کرتے سنا ہے۔ اور دونوں جاپانیوں کے جاسوس ہے۔

مکاؤ اگرچہ پرتگیزی تو آبادی تھی لیکن عملاً اس پر بھی جاپان کا قبضہ ہو چکا تھا اور ان کے ایک پرتگیزی دوست نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ جلد از جلد مکاؤ چھوڑ دیں۔ ہانگ کانگ تو وہ واپس نہیں جا سکتے تھے انہوں نے کوانگ چاؤوان کے راستے ہی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔

۱۷ فروری ۳ بجے وہ جہاز پر سوار ہوئے اور ۱۸ فروری کی صبح مکاؤ جاپانی جنڈارمری' کے ایک آفیسر نے جہاز پر ہی انہیں گرفتار کر لیا۔ اور ۲۰ فروری کو انہیں واپس مکاؤ لے گیا۔

گرفتاری کے جاپانیوں نے ان سے قیدیوں کا سا سلوک روا رکھا جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ آٹھ ماہ سے زیادہ عرصہ جاپانیوں کی قید میں رہے۔ جاپان کی قید کے شروع شروع میں ایک دفعہ ایسا موقعہ بھی آیا کہ وہ ان کی قید سے فرار ہو سکتے تھے۔ ہوا یوں کہ ۴ مارچ کو پستولوں کا بیوپار کرنے والے تین آدمیوں کو گرفتار کر کے ان کی ساتھ والی کوٹھڑی میں بند کیا گیا۔ سب

نے مل کر بھاگ نکلنے کا منصوبہ بنایا۔ اتفاق سے ۶ مارچ کو بشیر احمد کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا رہ گیا اور انہوں نے باہر نکل کر ایک جرمن پستول اور اسّی گولیاں اپنے قبضہ میں کر لیں۔ ۸/۷ مارچ کی رات کو بھاگ نکلنے کا پروگرام تھا۔ مگر ۷ مارچ کی دوپہر کو ہی وہ تینوں قیدی پھانسی پر چڑھا دیے گئے اور بشیر احمد پھر اکیلے رہ گئے۔ لیکن انہوں نے اس تجویز کو عمل میں لانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ تجویز یہ تھی کہ پہرے دار کو پستول سے دھمکا کر اسے کوٹھڑی میں بند کر دیں گے۔ اس کے بعد اپنی تمام چیزیں موٹر گاڑی میں ڈال کر آزاد چین کے علاقے میں چلے جائیں گے۔ کیونکہ جنڈارمری (جاپانی ملٹری پولیس) کی گاڑی کو کوئی روک نہیں سکتا تھا۔

البتہ بعد میں بشیر احمد نے رات کو فرار کی پہلی تجویز میں ترمیم کر کے ۸ تاریخ صبح تین بجے فرار ہونے کا پروگرام بنا لیا۔ لیکن ؎

ماندم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

۸/۷ مارچ کی درمیانی رات مکاؤ سے دو سپاہی بشیر احمد کو اس کوٹھڑی سے نکال کر ہانگ کانگ لے جانے کے لیے پہنچ گئے۔

ہانگ کانگ کا نام سن کر انہیں اپنی تجویز کو عمل میں نہ لا سکنے کا زیادہ افسوس نہ ہوا۔ وہ "لنگ" نامی جہاز پر واپس پہنچے۔

بشیر احمد ۲۹ دن ہانگ کانگ سے دور رہنے کے بعد ۸ مارچ کو دو بجے دوپہر پھر ہانگ کانگ پہنچ رہے تھے۔ مگر حالات کی ستم ظریفی تھی کہ آزادی کی جس فضا میں سانس لینے کے لیے وہ پریشان ہوئے تھے، نہ صرف وہ ابھی بہت دور تھی بلکہ ان سے رہی سہی آزادی بھی چھین کر انہیں قفس میں پھڑپھڑانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔

ہانگ کانگ جیل گارڈ میں ہندوستانی سپاہیوں کی کثرت تھی۔ وہ سب کے سب بشیر اور اس کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے۔ بشیر کی گرفتاری کی روح فرسا خبر چند لمحوں کے بعد گھر والوں تک بھی پہنچ گئی۔

جاپانی' قیدیوں کے ساتھ بڑی سختی کرتے تھے اور ان کی سخت نگرانی کرتے تھے۔ یہ دن اس خاندان پر انتہائی بے بسی کے دن تھے۔ ہانگ کانگ پر جاپانی تسلط سے ان پر مصائب کا ایک مسلسل دور شروع ہوا۔ ماسٹر جی کو مجبور کر کے ان سے ریڈیو اناؤنسر کی خدمات لی گئیں۔ جس سے وہ اپنی ملازمت کے تمام حقوق و مراعات سے محروم ہو چکے تھے۔ عمر بھر کا تمام اثاثہ یوں قید و بند کی نذر ہو چکا تھا۔ ایک طویل عرصہ فارغ البالی اور آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے کے بعد وہ نان جویں تک کے محتاج ہو چکے تھے۔ مگر بشیر کی گرفتاری اور آخری فیصلہ کے خوفناک انتظار میں انہیں یہ محسوس ہوا کہ پہلے مصائب اور مشکلات تو کوئی مشکلات ہی نہ تھیں۔ انسان کی اصل پریشانی جسمانی بھوک یا جسمانی تکلیف نہیں ہے بلکہ انسان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ امر تو اس کا ذہنی سکون چھن جانا ہے۔

نیلی آنکھوں والے خاندان کے اس خوبصورت نوجوان کی ابتلاء نے خاندان کے ہر فرد کا ذہنی سکون چھین لیا۔ ان کے حساس دلوں پر اس کا کتنا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں اور زندگی کے تلخ حقائق سے ناواقف نوجوانوں پر یہ حادثہ کیا اثرات مرتسم کر رہا تھا؟ امید و بیم اور انسانی بے بسی کی ان گھڑیوں میں انہوں نے کیا کچھ سیکھا ہو؟ حیات و ممات' قضا و قدر' انسان کی سعی اور بے بسی کے فلسفہ کی کتنی گرہیں ان کے سامنے کھلی ہوں گی؟ اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔

"پنجیری" یا "دوا"؟

ہانگ کانگ جیل گارڈ میں ہندوستانی سپاہی پیغام رسانی میں بشیر احمد کی امداد کرتے تھے۔ ایک دفعہ بشیر احمد کے لیے ان کی والدہ نے کچھ پنجیری بنا کر بھجوائی جو تلاشی میں پکڑی گئی۔ لیکن جیل گارڈ کے ہندوستانی سپاہی نے ان کو یقین دلایا کہ قیدی بیمار ہے۔ اس کے لیے ایک دیسی دوا بنا کر لایا ہوں۔ چنانچہ وہ ان تک پہنچ گئی۔

۲ جولائی ۱۹۴۳ء کو ساڑھے نو بجے بشیر احمد کو جاپانی ملٹری پولیس ہیڈ کوارٹرز سے سٹانلے لے گئے۔

کورٹ مارشل اور سزا

آٹھ ماہ کی صبر آزما قید کے بعد جاپانیوں نے دیگر ڈیڑھ درجن ہندوستانی قیدیوں کے ساتھ بشیر کا بھی کورٹ مارشل کیا۔ دوسرے قیدیوں میں حیدر آباد دکن رائفلز کے کیپٹن قریشی اور ہانگ کانگ شنگھائی بنک کے مینجر بھی شامل تھے۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء سے یہ کاروائی شروع ہو کر دس دن جاری رہی۔

جاپانیوں کا کورٹ مارشل کیا تھا؟ کسی دلیل، وکیل، اپیل کی گنجائش نہ تھی اور ان کے نزدیک ایک ہی سزا تھی۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء کا سیاہ دن

آہ! وہ گھڑی بھی آن پہنچی جس دن جاپانی سرکار نے ان کا آخری فیصلہ سنانا تھا۔ وہ فیصلہ کیا تھا، لکھتے ہوئے قلم لرز جاتا ہے۔ سارے ہندوستانی قیدیوں کو ایک ہی سزا دی گئی۔

اس نوجوان نے موت کا جس ہمت و استقلال اور شجاعت و مردانگی سے مقابلہ کیا وہ ایک الگ داستان ہے۔ اور اس خاندان کی شجاعت و جانبازی کی عظیم روایات کی امین ہے۔ موت تیزی کے ساتھ اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ لیکن اس کی تحریر سے کسی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں ہوتا۔ اس کا سکون قلب حیرت انگیز ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سقراط نے زہر کا پیالہ ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے اور

افلاطون کو وصیت لکھوا رہا ہے۔اسے آزادی کا سانس لینے کی خواہش کے جرم بے گناہی میں سزائے موت دی جا رہی تھی۔مگر وہ یہ تلخ گھونٹ بڑی مردانگی سے پی گیا۔

بشیر کی ڈائری

بشیر احمد کی شہادت کے بعد ان کا سامان انہی ہندوستانی سپاہیوں کی معرفت والدین کو مل گیا۔اس میں بشیر احمد کی ایک کتاب "بک آف نیریٹوورس" بھی شامل تھی۔جس کے حاشیوں پر انہوں نے باریک الفاظ میں قید و بند کے واقعات تاریخ وار درج کیے تھے۔

اس ڈائری کے ایک ایک لفظ سے ان کے کردار کی عظمت اور استقامت کا ثبوت ملتا ہے۔ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہاں میری مصیبت کا اور کوئی حصہ دار نہیں ہے۔پچھلی رات میرے دل میں خیال آیا۔اگر میرے ساتھ یہاں عزیز یا سردار ہو تو کیا ہی اچھا ہو۔لیکن

عزیز اور بشیر شطرنج کھیل رہے ہیں

پھر میں نے اپنی خودغرضی پر لعنت کی۔ اے اللہ! مجھے موت منظور ہے بجائے اس کے کہ میرے بھائی کوئی تکلیف اٹھائیں۔ اگر میرے بہن بھائی اور ماں باپ صحیح سلامت ہیں تو مجھے اپنی قسمت سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں تو اپنے موجودہ حالات پر ''چلن کے قیدی'' کے عنوان کی نظم پڑھنے کے بعد قانع ہوگیا ہوں۔ میں نے غمگینی اور ناامیدی کو اپنا دوست بنالیا ہے۔ جب میں سونے لگا تو خدا کی تعریف کے راگ گانے لگا۔ مجھے عجیب مسرت تھی۔ میں نے وہ انگریزی نظمیں ترنم سے پڑھیں جو مجھے یاد تھیں۔ جاپانی بھی میری حرکات پر حیرت زدہ ہوئے۔''

''میرے خیال میں میرے گھر والے نہیں جانتے ہوں گے کہ میں کہاں ہوں کیونکہ میرے اپنے سوا انہیں اور کون بتا سکتا ہے؟''

گھر والوں کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میرا باپ جو میرے ساتھ اتنا اچھا سلوک کرتا تھا لیکن جن کی نصیحت کو ان کی ہمدردی کی بجائے ایک زبردستی سمجھتا تھا۔ میری ماں مجھ سے کتنا پیار کرتی تھیں۔ وہ کون سا لاڈ ہے جو وہ مجھے نہیں لڈاتی تھیں۔ جب میں ایک سال پہلے ہسپتال سے واپس آیا تھا تو میری ماں نے آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ کہا تھا کہ بیٹا اب مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ وہ مجھ سے پوچھتی تھیں: بیٹا! تجھے یہاں کس چیز کی کمی ہے۔ لیکن مجھ پر ایک دھن سوار تھی اور میں نے ان کی کوئی بات نہ سنی۔ نہ میں نے اپنے بڑے بھائی کی سنی۔ جنہیں ۲۱ جنوری کو الوداع کہتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

میرا پیارا عزیز جو گھر میں اور یونیورسٹی میں میرا ساتھی تھا۔ ہم دونوں یونیورسٹی میں بیتے ہوئے دنوں کی باتیں کرتے تھے۔ اے میرے پیارے دوست! اب تو کہاں ہے۔

(بہشت کسی کسی نہر کے کنارے دونوں بھائی اب پھر بیتے ہوئے دنوں کی باتیں کرتے ہوں گے) سردار احمد جس کے ساتھ میرے اتنے جھگڑے ہوا کرتے تھے لیکن جس کو میں دل سے چاہتا تھا۔ باوجود اس کے کہ اکثر دفعہ قصور اس کا ہی ہوتا تھا۔ میں اس کو معاف کردیتا تھا۔

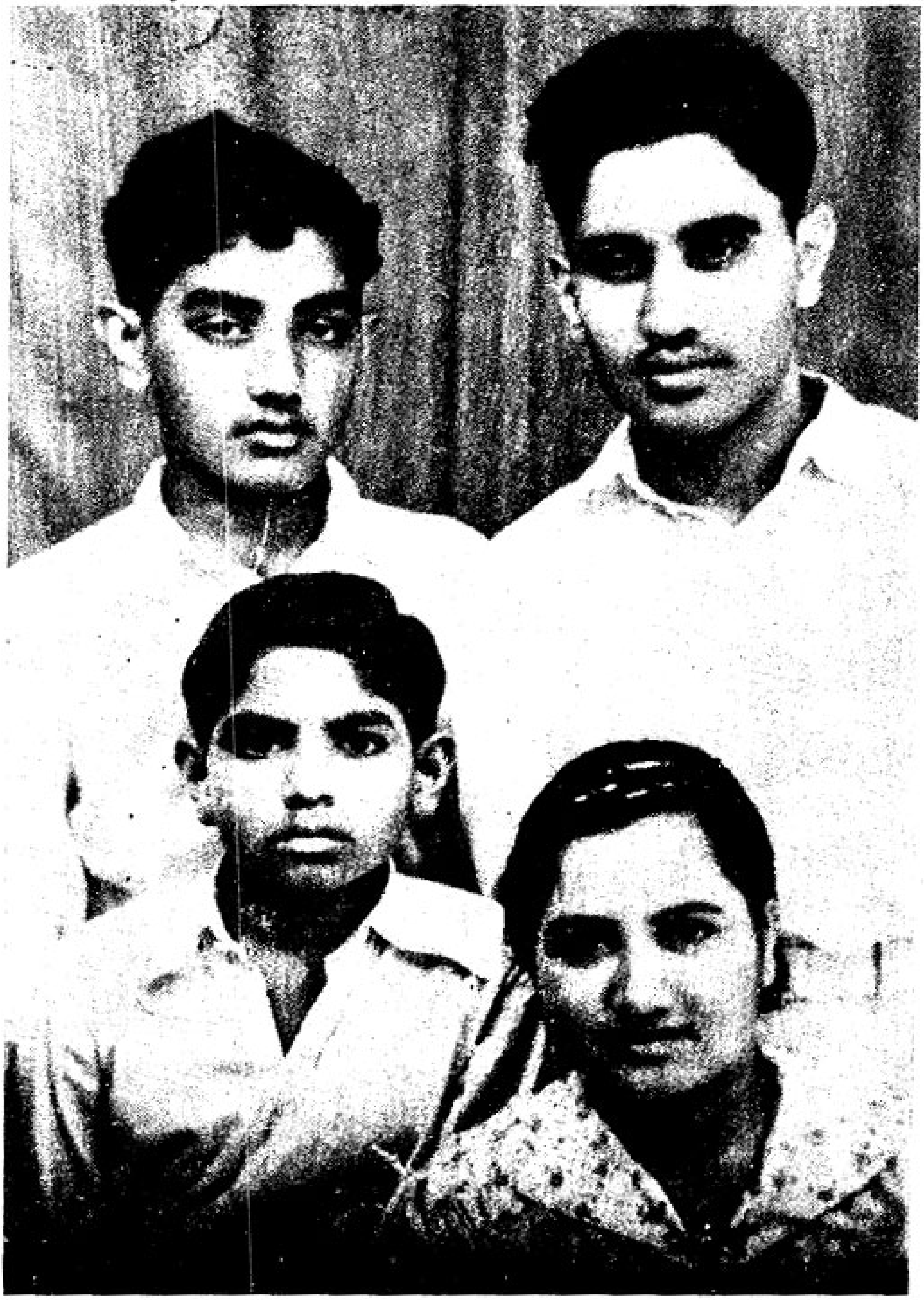

عزیز، نذیر، سردار اور طاہرہ

چھوٹا رشید، میرے دل کا پیارا، وہ مجھے یاد رکھتا ہے یا بھول گیا ہے۔ وہ معصوم چستی اور پھرتی سے بھرا ہوا، ہر بات میں میری طرف داری کرتا تھا۔ اس کو کیا علم تھا کہ ۳۰ دسمبر کو جب میں نے گھر چھوڑا تو وہ مجھے پھر کبھی نہیں دیکھ سکے گا اور میں اس کا پیارا چہرہ کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔

رشیدہ اور عزیزہ کے بارے میں کیا لکھوں۔ امید کرتا ہوں، وہ مجھے ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ میرے لیے اپنی نمازوں میں دعائیں کرتی رہیں۔ میں ان کے لیے دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ جب میں اس دنیا سے کوچ کر جاؤں تو میری روح کو ایصال ثواب کے لیے دعائیں کیا کریں۔

میری ننھی بھتیجی جو کبھی یہ نہ معلوم کر سکے گی کہ میرا چہرہ کیسا تھا۔ ہندوستان میں میری جو بہن ہے اللہ تعالیٰ اسے آرام دے اور لمبی زندگی دے۔ اس کے بچوں اور شوہر کو خدا آلام سے محفوظ رکھے۔

عزیز کی آخری نشانی..........''گھڑی''

بشیر احمد کو اپنے بھائی عزیز احمد کے ساتھ سب سے زیادہ پیار تھا۔ اس مہم جویانہ سفر پر روانگی کے وقت وہ عزیز احمد کی خوبصورت گھڑی بطور یادگار ساتھ لے گئے تھے۔ قید ہونے سے پہلے ان کے پاس ساڑھے پانچ ہزار چینی ڈالر تھے۔ لیکن قید میں جاپانی سپاہیوں نے اس ساری رقم پر ہاتھ صاف کیے۔ بشیر احمد کے پاس کوئی نقدی نہ تھی تو ایک دفعہ چند اشیاء کی خریداری کے لیے اس گھڑی کو بیچنے کا ارادہ کیا۔ لیکن جب یہ خیال ہوا کہ یہ اس پیارے بھائی کی نشانی ہے تو اس ارادے کو ترک کر دیا۔ اس موقعہ پر ڈائری میں لکھتے ہیں ''آج باورچی آیا اور کچھ میٹھی چیز بنا کر لایا۔ ۷ افروری کے بعد قید میں پہلی میٹھی چیز چکھی۔ آج کچھ چینی خریدنے کے لیے میں نے عزیز احمد کی گھڑی بیچنے کا اردہ کیا۔ لیکن یہ میرے پیارے بھائی کی آخری نشانی ہے جسے شاید میں اب پھر کبھی نہ دیکھ سکوں۔ خدا تعالیٰ مجھے معاف کرے کہ کیا غلط خیال میرے دماغ میں آیا..........''

حالات کی ستم ظریفی یہ ہے کہ انہیں اس یادگار سے محروم ہونا پڑا۔ مگر اسے فروخت نہیں کیا۔ اس دن لکھتے ہیں:

''آج صبح اس نے مجھے تاش دی تاکہ میں اپنا وقت گزار سکوں۔ باورچی نے مجھے چاولوں کے ساتھ کچھ ترکاری بھی دی۔ میں اس کے اس رویہ پر اتنا خوش ہوا کہ میں نے اس کے عوض اسے کچھ دینا چاہا تو میں نے اسے اپنے بھائی کی گھڑی دے دی۔

اے عزیز! مجھے معاف کرنا۔ میں گھڑی رشوت کے طور پر نہیں دی۔ البتہ اس کی مہربانی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس اور کچھ نہیں تھا۔''

استقامت کا راز

بشیر احمد کی بے مثال استقامت وعزیمت کا راز بھی اس ڈائری سے آشکار ہوتا ہے جوان کی المناک آپ بیتی کا نچوڑ ہے۔اپنی ڈائری میں نمایاں الفاظ میں ذاتی تجربوں کے حاصل کے طور پر لکھتے ہیں:

انسان اپنی زندگی میں سب کچھ کھودے۔مال' پیسہ' دولت تو کچھ مضائقہ نہیں ۔ جب تک وہ اپنے رحیم وکریم اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ کھوئے۔"

انسان کو خلوت اور یک سوئی نصیب ہوتو اکثر اس کی روح کو بالیدگی ملتی ہے۔جس سے زندگی کے اسرار کھلتے ہیں۔اور اس پر کتاب فطرت کے عمیق مطالعہ کا ردعمل حیرت انگیز ہوتا ہے۔

بشیر احمد اکیس سال کے ایک سلیم الفطرت نوجوان تھے ۔وہ بے حد ذہین تھے ۔قید تنہائی اور جبری یک سوئی نے ان کی روحانی قوتوں میں اور اضافہ کردیا۔اپنی ڈائری میں وہ قدرت کی ایسی ایسی نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں جن کا عام حالات میں ہم کبھی نہیں سوچتے۔

چھوٹی چھوٹی باتوں اور روزمرہ کے معمولی واقعات میں وہ زندگی کے عمیق حقائق پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ حقائق روز روشن کی طرح واضح ہوکر سامنے آجاتے ہیں۔واقعات اتنے فطری اور تحریر میں اتنا بے ساختہ پن ہے کہ وہ خود بخود دل میں کھب جاتی ہے۔

والدین' بہن بھائیوں اور دوستوں سے دور ایک جابر حکومت کی قید تنہائی میں ایک نوجوان موت کی آنکھو میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکران الفاظ میں ادا کرتا ہے:

نیند

لکھتے ہیں: بظاہر میں بالکل بے بس ہوں مجھے اپنے گھر والوں سے ملنے کی اجازت نہیں۔ قید تنہائی ہے اور عذاب ہے مگر اللہ تعالیٰ کے قادر مطلق ہونے کا ہر لمحہ احساس ہوتا ہے۔ ہر لمحہ اظہار ہوتا ہے۔ میں چوبیس گھنٹوں میں زیادہ وقت سو کر گزارتا ہوں میں بلاناغہ سارے گھر والوں سے ملتا ہوں۔ والدہ مجھے اسی طرح پیار کرتی ہیں۔ عزیز بھائی میرے ساتھ یونیورسٹی جاتا ہے۔ یہ نیند کی نعمت کس نے عطا کی ہے؟ مجے اکثر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جو نیند میں دیکھتا ہوں وہ حقیقت ہے اور جو بیداری میں دیکھتا ہوں یہ ایک بھیانک خواب ہے۔ جو جلد ٹوٹ جائے گا۔

کھانا

کھانے کے متعلق لکھتے ہیں: گھر میں مجھے اچھی سے اچھی نعمتیں میسر تھیں۔ کھانے کی چیزوں کے بارے میں میری پسند اور ناپسند بڑی شدید تھی۔ مگر کبھی گھر میں پر تکلف کھانوں سے بھی یوں لطف نہیں اٹھایا تھا جو یہاں ان کھانوں میں ملتا ہے جنہیں میں گھر میں دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔

ایک عرصہ میٹھی چیز سے محروم رہنے کے بعد گڑ کی ایک ڈلی پا کر یوں محسوس ہوا کہ مجھے دنیا کی بہت بڑی نعمت مل گئی ہے اور جس شخص نے مجھے گڑ دیا' اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میری آنکھوں آنسو آ گئے۔

سردی

ایک مقام پر لکھتے ہیں: گذشتہ رات ساتھ کی کوٹھڑی میں سردی کے مارے ان تینوں قیدیوں کی چیخیں بلند ہوتی رہیں اور میں رات بھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہا کہ میرے پاس سردی سے بچاؤ کے لیے کمبل تو ہیں۔

دھوپ

شاید اس دنیا میں سے عالی شان محل میں زندگی کی تمام آسائشوں کے ساتھ رہنے والے شہنشاہ کو بھی ساری عمر میں وہ خوشی نصیب نہ ہو جو مسلسل تین ہفتے تنگ و تاریک کوٹھڑی میں گزارنے کے بعد آج دھوپ میں بیٹھ کر میں حاصل کر رہا ہوں۔ یہ خوب صورت دھوپ میرے جسم پر چمک رہی ہے۔ میں نے میلے کپڑے اتار دیے ہیں۔ مجھے ان کے دھونے کی اجازت مل گئی ہے۔ میں آج کتنا خوش ہوں۔ میری خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟

اطمینان اور بے اطمینانی کے پیمانے بھی عجیب ہیں۔ بعض لوگ اس وقت بھی شکوہ بہ لب ہوتے ہیں جب ان کی زندگی خوبصورتی سے گزر رہی ہو اور حالات کا مطلع منور ہو اور یونہی کہیں کوئی ابر پارہ کسی افق سے گزر جائے۔ اور بعض لوگ اس وقت بھی شکر گزار ہوتے ہیں جب ان کی پر الم سیاہ راتوں میں، رحمت ربانی کی کوئی خاموش کرن چپکے سے مسکرا جائے۔

ایک حسرت

اس رجائیت اور اطمینان کے باوصف نوجوان بشیر احمد کی ایک شدید آرزو یہ تھی:

”اے خدا! مرنے سے پہلے میں صرف ایک لمحہ کے لیے اپنے گھر والوں کو دیکھ لوں تو تیری حمد و ثناء کے راگ الاپتا ہوا خوشی خوشی تختہ دار پر چڑھ جاؤں گا۔ اے خدا! تو رحم کرنے والا ہے۔“

مگر آہ! اس کی یہ معصوم آرزو ایک حسرت ہی رہی ....

المیہ کے بعد

اس المیہ کو گھر کے ہر فرد نے شدت سے محسوس کیا اور یہ سانحہ ان سب کے لیے ایک مستقل درد و غم بن گیا۔ مگر بشیر احمد کی والدہ اور اس کے چھوٹے بھائی عزیز نے اسے سب سے زیادہ محسوس کیا۔ عزیز اور بشیر قریباً ہم عمر تھے۔ سکول، کالج اور یونیورسٹی میں دونوں اکٹھے پڑھتے اور

اکٹھے کھیلتے رہے تھے۔ آپس میں وہ یک جان ودو قالب تھے بشیر احمد کی قید تنہائی اور پھر ڈراپ سین سے بیس سالہ نوجوان عزیز کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہوگئی۔ زندگی اس کی نظر میں بے حقیقت ہوگئی۔ وہ ازحد آزردہ اور دل گرفتہ رہنے لگا۔ گھر والوں کو اس صورت حال کا علم ہوا تو وہ اور پریشان ہوگئے۔ معلوم ہوا کہ عزیز اس کھوج میں ہے کہ اس سانحہ کے لے سب سے زیادہ ذمہ دار کون ہے تاکہ اس سے بشیر احمد کا انتقام لے سکے۔ اسے اپنی جان کی مطلقاً پروانہ تھی۔

ایک دن والدہ نے عزیز کو بلا کر کہا: عزیز! تم جانتے ہو کہ تم سب بھائی بہن مجھے کتنے پیارے ہو۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں بشیر کو اور تمہیں سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔ وہ تو مجھے ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے کر چلا گیا ہے' کیا تم بھی اپنی اماں کو...... اور ماں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

عزیز سے ماں کا یہ حال دیکھا نہ گیا۔ کہنے لگا ''مہاماں جی! نہ روئیں۔ یہ حقیقت ہے کہ پیارے بشیر کے بعد مجھے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ مگر اب! اب میں آپ کے لیے زندہ رہوں گا!''

....

اس کے بعد عزیز نے اس غم کو فراموش کرنے کی کوشش کی تاکہ ماں کا دل آمزردہ نہ ہو آہستہ آہستہ اسے صبر آ گیا۔ مگر اس غم کو وہ زندگی بھر بھلا نہ سکا۔ اس نے اسے شعور کی نچلی تہوں میں چھپا دیا۔ مگر یہ غم اس کے خوابوں اور خیالوں میں آکر شعور کے دریچوں سے جھانکتا رہا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جہاں اس کی والدہ اکثر بشیر احمد کا ذکر کر کے اور آنسو بہا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلیا کرتی تھیں' عزیز نے کبھی کسی کے روبرو اس کا تذکرہ تک نہیں کیا تھا۔ عزیز کے عزیز ترین دوستوں تک کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ ہر وقت دوسروں میں خوشیوں اور شادمانیون کے موتی لٹانے والا انسان خود کتنا دکھی ہے۔ عزیز نے اپنے غموں کو صرف اپنے تک محدود رکھا تھا' وہ دوسروں کو ان میں حصہ دار نہ بناتے تھے۔

بھائی جان زندان میں
عزیز جیل جاتے جاتے رہ گیا

جاپان ۳ سال ۸ ماہ تک ہانگ کانگ پر قابض رہا۔ یورپی باشندوں کو اس دوران سٹانلے میں نظر بند کر دیا گیا۔ چینی آبادی جنگ سے پہلے کے مقابلے میں صرف تیسرا حصہ رہ گئی۔ ان کو ناخوش گوار طریقوں سے وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی باشندوں کو اپنے مقاصد کے لیے آلہ کار بنانے کی کوشش کی جاتی۔ جو لوگ جاپان کی جنگی پالیسی میں ان سے تعاون کرتے تھے انہیں بہتر سلوک کا مستحق گردانا جاتا تھا۔ ورنہ دوسرے ہندوستانی باشندوں سے ان کا سلوک ناگفتہ بہ تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر انہیں جیل کی کوٹھڑی میں پھینک دیا جاتا اور احکام کی معمولی سی نافرمانی کے الزام میں گردن اڑا دی جاتی تھی۔ جنگ کے باعث سڑکوں' ہسپتالوں سکولوں اور عمارتوں کا برا حال ہوا۔

جاپانی چھوٹی چھوٹی باتوں پر قید و بند کی سزائیں دے دیتے تھے۔ کسی بات پر نذیر احمد بھٹی عرف بھائی جان کو قید کی سزا ہو گئی۔ اتفاق سے جیل میں اسے اسی کوٹھڑی میں بند کیا گیا جہاں اس کا بھائی بشیر احمد مرحوم قید رہ چکا تھا۔

اس نے دیکھا تو دیواروں پر ناخنوں سے بشیر احمد نے پرسوز اشعار اور مقولے لکھ رکھے تھے۔ اس نے دیواروں پر جگہ جگہ زندگی کی اہم یادداشتیں بھی تاریخ وار نوٹ کر رکھی تھیں۔

زندان میں مرحوم بھائی کے ہاتھ کی یہ تحریریں دیکھ کر وفور جذبات سے نذیر کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ وہاں تنہائی میں جی بھر کر روتا رہا۔

عزیز بھٹی ایک دن جیل میں جاتے جاتے رہ گیا۔

جاپان کے تسلط کے دوران یوں تو سامان رسد کی سبھی اشیاء بے حد گراں تھیں بلکہ

دستیاب ہی نہیں تھیں' کھانے پینے کی چیزیں کستان سے جا کر لانا پڑتی تھیں جو بہت گراں پڑتی تیں' مگر جلانے کی لکڑی کی ازحد کمیابی ہوگئی۔

نتیجتاً لوگ خالی عمارتوں کی کھڑکیاں اور دروازے توڑ کر کام چلانے لگے۔ جاپانیوں کے نزدیک یہ بہت بڑا جرم تھا اور اس کا وہ سخت نوٹس لیتے تھے۔ مگر حالات ایسے تھے کہ اس کے سوا وہاں چارہ نہ تھا۔ ان کو بھی کبھی یہ کرنا ہی پڑتا تھا۔

ایک دن ایک جاپانی نے عزیز سے پوچھا: کیوں بھئی' تم ایندھن کا کام کیسے چلاتے ہو۔ آج کل تو لکڑیاں ملتی ہی نہیں ہیں؟

کہنے لگا ''بس ان دنوں تو کھڑکیوں اور دروازوں سے کام چلتا ہے۔ اس اعتراف کا کم سے کم نتیجہ جاپانیوں کے نزدیک طویل قید ہوسکتا تھا۔ مگر وہ جاپانی اس کی اس بے ساختہ سچی بات سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے چھوڑ دیا۔ اور کہا آئندہ کبھی ایسا کام نہ کرنا۔

اپنے انتہائی سخت ڈسپلن کے باوجود جاپانی سچی بات سے بے حد متاثر ہوتے تھے اور اکثر بہت کچھ معاف کر دیتے تھے۔

عزیز کے لیے جھوٹ بولنا ایک بے حد دشوار کام تھا۔ اسے جھوٹ بولنے کی کوئی مشق ہی نہ تھی۔ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ وہ تلخ سے تلخ حقائق کو بڑی سادگی' بڑے بھولے پن اور بڑی بے ساختگی سے دوستوں کے منہ پر کہہ دیا کرتا تھا۔

مزید مشکلات

مشکلات و مصائب الگ الگ نہیں آتیں بلکہ ہمیشہ اکٹھی ہو کر آتی ہیں۔ اس انتہائی پریشانی کے دنوں میں خاندان پر ایک نئی آفت آئی۔

عزیز بھٹی کا سب سے چھوٹا بھائی...... رشید احمد...... حسب معمول ایک دن بھائیوں کے

ساتھ ایک پہاڑی پر چڑھ رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے کھڈ میں جا گرا ۔ وہ جان سے تو بچ گیا مگر اس کے دونوں پاؤں کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا مسلسل علاج کے باوجود وہ صحت یاب نہ سکا۔

یہ جنگ اور افراتفری کا زمانہ تھا۔ خاندان کے افراد کو کبھی یہاں' کبھی وہاں جانا پڑتا تھا۔ وہ بچہ نہیں تھا کہ اسے کندھوں پر اٹھایا جا سکتا۔ وہ ۹/۱۰ سال کا تھا۔ راستے پہاڑی تھے' نشیب وفراز تھے۔ بالآخر بھائیوں نے اس کے لیے ہاتھ سے کھینچنے کی ایک سپیشل گاڑی بنوائی جس پر بٹھا کر اسے اپنے ساتھ ساتھ لے پھرتے تھے۔ پاؤں کے طویل علاج کے بعد قریب قریب مایوس ہو چکے تھے کہ قدرتی طور پر وہ ٹھیک ہو گئے اور وہ چلنے پھرنے لگ گیا۔ ان دنوں روزی کمانے اور سامان رسد دور سے لانے کے لیے بے حد مشکلات تھیں۔ ان دشوار گزار حالات نے عزیز احمد اور اس کے بھائیوں کو جو جاپانی تسلط سے پہلے بڑے آرام اور آسائش کی زندگی کے عادی ہو چکے تھے' سخت محنتی اور جفاکش بنا دیا۔ ہانگ کانگ پر پونے چار سال تک جاپانی تسلط رہا۔

جاپانی تسلط کے آخری دنوں میں یہ لوگ مکان تبدیل کرتے کرتے گیپ رود کے ایک مکان میں رہنے لگے۔ اس عمارت کے ایک طرف دان چائی سکول تھا' دوسری طرف سکھوں کا گوردوارہ تھا۔ اور قریب ہی ایک ورکشاپ تھی ۔ یہ ورکشاپ اکثر گولہ باری کا ہدف بنتی تھی اور گولے کئی دفعہ نشان چوک کر اردگرد کی عمارتوں کو بھی نقصان پہنچاتے تھے ایک دفعہ اس عمارت کے اوپر بم گرا۔ اس کی دوسری منزل (جس میں یہ خاندان رہتا تھا) کے سارے دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹ گئیں۔ البتہ اہل خانہ بال بال بچ گئے۔

وہ سوچتے تھے۔

گفتند شب سحر شود اما سحر نشد
ویں شام تیرہ تر شود وتیرہ تر شود

جاپان کی شکست اور وطن کو واپسی

۱۹۴۵ء میں جاپان کی سرزمین پر انسانی بربریت کا سب سے بڑا مظاہرہ ہوا۔ اور ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو ہیروشیما اور ۹ اگست کو ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے گئے اور جاپان نے قیام پاکستان سے پورے دو سال قبل ۱۴ اگست ۱۹۴۵ء کی اپنی شکست تسلیم کر لی۔ مگر ہانگ کانگ میں اس کی فوجوں نے ۳۰ اگست تک ہتھیار نہ ڈالے۔ یہ عجیب دو عملی اور بے انتظامی کا زمانہ تھا۔ بالآخر بحرالکاہل سے ریئر ایڈمرل سر سیسل ہارکورٹ کی سرکردگی میں برطانوی بحری بیڑہ پہنچنے پر ہانگ کانگ میں بھی جاپانی فوج نے ہتھیار ڈال دیے۔

جاپانی تسلط کے خاتمہ کے باوجود نظم نسق کا مسئلہ حل نہ ہوا۔ ہانگ کانگ پر برطانوی تسلط کی بحالی چیلنج ہو چکی تھی۔ امریکہ اپنی سیاسی حکمت عملی کے تحت اس نو آبادی کو قوم پرست چین کو واپس دلانا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب سیسل ہارکورٹ کی سرکردگی میں برطانوی بحری بیڑہ جاپانی فوجوں سے ہتھیار ڈلوانے اور اس نو آبادی پر برطانوی اقتدار کا اعلان کرنے کے لیے ہانگ کانگ روانہ ہونے والا تھا، تو چیانگ کائی شیک نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ چنانچہ سر سیسل نے برطانوی اور چینی دونوں حکومتوں کی طرف سے جاپانیوں سے ہتھیار ڈلوائے۔

نظم نسق کی بحالی کے لیے فوج استعمال کی گئی۔ پبلک سروسز بحال کر دی گئیں۔ اور کھانے پینے کی اشیاء کا انتظام کرنے کی طرف بھی توجہ دی گوی۔ عوام بڑی مشکلات میں مبتلا تھے۔ جاپانی سکے اور جاپانی نوٹوں کو کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ لوگ ٹوکریاں بھر بھر کر بازار لے جاتے تھے، مگر اس سے کوئی چیز نہیں ملتی تھی۔ وہ سکے کوڑیوں سے بھی سستے تھے۔ عبوری طور پر انہیں استعمال میں لانے کے لیے ان پر دوبارہ مہر لگائی جاتی تھی، مگر پھر بھی ان کی کوئی قدر نہ ہوتی۔ بالآخر ۱۲ ستمبر ۴۵ء کو ہانگ کانگ کے اپنے نوٹ آ گئے اور جاپانی سکے کا استعمال روک دیا گیا۔ سامان رسد کی کمیابی کے باعث قیمتوں میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ عوام کے لیے یہ انتہائی مصیبت اور مشکل کے دن تھے۔ مصیبت و مشکلات کے دن گزار کر دسمبر ۱۹۴۵ء میں یہ خاندان ہانگ کانگ سے واپس اپنے آبائی وطن...... لادیاں...... گجرات پہنچ گیا۔

مراجعت وطن

☆ سرزمین گجرات میں روشنی کا مینار

☆ روزگار

☆ شادی

☆ فوجی ملازمت

ہانگ کانگ سے واپسی

ہانگ کانگ کے ایک وسیع زندان سے رہا ہو کر عزیز اور اس کے خاندان کے افراد دسمبر ۱۹۴۵ء میں واپس اپنے گاؤں......لادیاں...... گجرات آ گئے۔

ہانگ کانگ کے قیام کے دوران مادی طور پر انہوں نے جو کچھ کمایا تھا' وہ سب کچھ لٹا چکے تھے۔ البتہ وہ قلب وجگر کے گہرے زخموں اور تجربات وحوادث کی صورت میں جو کچھ ساتھ لائے تھے وہ ان کی زندگیوں کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ثابت ہوا۔

دنیا کے ہر خطہ زمین کی مخصوص آب وہوا اور اس کے اثرات سے مخصوص روایات جنم لیتی ہیں۔ کسی سرزمین کی قابل فخر روایات اس کے باسیوں کے عزم وہمت کو بڑھاتی' پریشان اور شکستہ دلوں کی ڈھارس بندھاتی اور انہیں عظیم کارنامے سرانجام دینے کی ترغیب دیتی رہتی ہیں۔

گجرات کی تاریخ جرأت وشجاعت' دلاوری اور مردانگی کی بے مثال روایات کی امین ہے' اور یہ روایات اہل گجرات کی ہمتوں کو بلندیاں عطا کرتی ہیں۔ ریاست کشمیر کے پہلو میں یہ خطہ زمین (جس کی لمبائی ۶۰ میل اور چوڑائی ۳۰ میل کے قریب ہے) ۲ ہزار مربع میل اور ۳۳ لاکھ کی آبادی پر مشتمل ہے۔

اس کے شمال میں کشمیر' خطہ جنت نظیر اور ہمالیہ کی سربفلک چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ جنوب مشرق میں دریائے چناب رومانی نغمے فضا میں بکھیرتا ہوا مست خرام ہے' تو شمال مغرب میں جہلم کی تندوتیز موجیں' سکندر رومی اور محمود غزنوی کی رزمیہ داستانیں سناتی ہیں۔

روشنی کا مینار

راجہ عزیز بھٹی کو تاریخ کے مضمون سے بے پناہ شغف تھا۔ عزیز بھٹی کے دوستوں نے بتایا کہ وہ سکندر اور پورس کے درمیان تاریخی معرکہ میں وطن کے دفاع کے لیے راجہ پورس کے عظیم کردار اس کی حب الوطنی اور خودداری کے از حد مداح تھے۔ وہ اس کی سپاہ کی شجاعت، بے جگری اور جانبازی پر فخر کرتے تھے۔ اور اس نسبت اور قرب سے کہ راجہ پورس اور اس کے جانباز سپاہی بھی اس سرزمین کے نامور فرزند تھے۔ ان کے احساس افتخار و ناز میں اضافہ ہوتا تھا۔

روزگار کے لیے

وطن میں واپس آنے کے بعدان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ حصول روزگار تھا۔ ہانگ کانگ پر جاپان کے تسلط کے دوران وہ اقتصادی طور پر بالکل تباہ ہو چکے تھے۔ ماسٹر محمد عبداللہ بھٹی وطن واپس آنے کے فوراً بعد اپنے قریب موضع بزرگوال کے مڈل سکول میں انگلش ٹیچر لگ گئے۔ ان دونوں بھائیوں.........نذیر احمد بھٹی اور عزیز بھٹی......نے بھی عارضی طور پر اسی پیشہ کو اپنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ وہ چند دن دولت نگر ہائی سکول جاتے رہے۔ انہوں نے ہانگ کانگ میں سکولوں کا جو معیار دیکھا تھا اس کے مقابلے میں یہاں کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے سکولوں کی حالت از حد ابتر تھی۔ پھر ان سکولوں کے اساتذہ کا معاشرہ میں کوئی خاص مقام نہ تھا۔ اس صورت حال پر وہ اور بھی حیران ہوئے۔ چنانچہ چند یوم بعد ہی دونوں بھائیوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور اپنے والد سے کہہ دیا کہ ان سکولوں میں پڑھانے کی نسبت بھوکے رہنا کم تکلیف دہ ہے۔

عزیز
اور
نذیر

حادثہ

انہی دنوں ایک حادثہ بھی ہوا۔ جس کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ دونوں بھائی ایک سائیکل پر دولت نگر جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک ہندو لڑکا سڑک عبور کرتا ہوا سائیکل سے ٹکرایا اور بری طرح زخمی ہوگیا۔ اس کے سر پر شدید چوٹ آئی۔ دونوں بھائی سائیکل سے اتر پڑے اور بچے کو اٹھا کر دولت نگر ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹر نے طبی معائنہ کے بعد بتایا کہ اس کے لیے ایک ایسی دوا چاہیے جو میرے شفاخانے میں نہیں ہے' البتہ لالہ موسیٰ سے مل سکتی ہے۔ انہوں نے پیش کش کی وہ اسی وقت لالہ موسیٰ جا کر مطلوبہ دوا لے آتے ہیں۔ چنانچہ عزیز بھٹی سائیکل پر لالہ موسیٰ گیا اور نذیر احمد بچے کے پاس تیمارداری کرتا رہا۔ چودہ میل کچی اور سخت خراب سڑک کے باوجود جس میں بھمبر نالہ بھی پڑتا ہے' عزیز بعجلت واپس آ گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور تھا۔ ڈاکٹر ان بھائیوں کے حسن کردار پر بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا: افسوس ہمارے ملک میں ایسے حادثات کے بعد اکثر لوگ مضروب یا زخمی کو چھوڑ کر ہی بھاگ جاتے ہیں۔

شروع میں بچے کو خاصہ افاقہ ہوا لیکن بعد میں اس کی حالت پھر بگڑ گئی اور وہ ایک ہفتہ بعد چل بسا۔ یہ بچہ دولت نگر کے ایک دکاندار لالہ دولت رام کا لڑکا تھا۔ اس کا بڑا بھائی خیراتی لال دولت نگر سکول میں ٹیچر تھا۔ وہ لوگ اپنے صدمہ کے باوجود ان دونوں بھائیوں کے حسن اخلاق اور ہمدردی کے بڑے معترف تھے۔

لالہ دولت رام اور خیراتی لال تقسیم کے وقت اپنے کنبہ سمیت بھارت چلے گئے۔ خیراتی لال وہاں جا کر فوج میں بھرتی ہوگیا۔ سترہ روزہ پاک بھارت جنگ میں وہ صوبیدار تھا اور قید ہو کر قیدیوں کے تبادلے تک پاکستان میں رہا۔

شادی

جون ۱۹۴۶ء میں عزیز کی شادی اپنے گاؤں...... لادیاں...... میں اپنے ہی خاندان میں نائب صوبیدار کرم دین بھٹی کی صاحبزادی...... زرینہ اختر سے ہوئی۔

عزیز بھٹی
دیہاتی لباس
میں
☆
(بیٹھے ہوئے)
عزیز فضل کریم

(کھڑے ہوئے)
نذیر احمد (دائیں)
اور سردار احمد (بائیں)
(درمیان میں)
چچیرا بھائی محمد بشیر

شادی کے وقت عزیز کی عمر ۲۳ سال اور زرینہ کی ۱۴ سال کے قریب تھی۔ منگنی اور شادی کے درمیان بہت تھوڑا وقفہ تھا۔ شادی دیہاتی رواج کے مطابق پوری شان وشوکت سے منعقد ہوئی۔

فوجی مُلازمت

لیفٹیننٹ کرنل فیض احمد نے ایک ملاقات میں بتایا کہ میرا گاؤں سدھ لادیاں سے بالکل قریب ہے۔ جب ۴۶۔۱۹۴۵ء میں یہ لوگ ہانگ کانگ سے واپس آئے تو میں ان دنوں آرمی میں کیپٹن تھا۔

ایک دن ماسٹر محمد عبداللہ بھٹی ہمارے ہاں تشریف لائے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے نوجوان عزیز بھی ان کے ہمراہ تھا۔ عزیز کے آئندہ کیریئر کا مسئلہ زیر بحث آیا تو میں نے قدرتی

طور پر فوج کا ہی مشورہ دیا۔ اس وقت عزیز کی عمر بائیس تئیس سال ہوگی۔ بڑا صحت مند نوجوان تھا۔ مجھے یاد ہے عزیز نے فوجی ملازمت کا خیال بہت پسند کیا۔

۱۹۴۶ء کے آخر میں عزیز انڈین ایئر فورس میں بطور ایئر مین بھرتی ہو گئے۔

ان کے دونوں بھائی......نذیر احمد اور بشیر احمد بھی ایئر فورس میں بھرتی ہوئے۔ وہ زیادہ تر آرکم (مدراس) رہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم سے قبل عزیز کارپورل تھے۔

یہاں سے تینوں بھائیوں نے انڈین آرمی میں کمیشن کے لیے درخواستیں دیں۔ انہیں ٹیسٹ کے لیے بریلی بلالیا گیا اور انٹرویو بھی لیا گیا۔ عزیز اور نذیر دونوں بھائی سلیکٹ ہوئے' سردار منتخب نہ ہو سکے۔ دونوں بھائیوں کو انڈین ملٹری اکیڈیمی ڈیرہ دون میں تربیت کے لیے بلاوا آنے والا تھا کہ تقسیم ملک کے باعث یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا اور وہ بلائے نہ جا سکے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم سے کچھ عرصہ قبل عزیز دو ماہ کی رخصت پر گھر آئے ہوئے تھے کہ ملک میں فرقہ ورانہ فسادات کے باعث ادھر ادھر جانا مشکل ہو گیا۔ مگر ان کے احساس فرض کا یہ عالم تھا کہ بھائی جان کو خط لکھا کہ گاڑیاں بند ہو گئی ہے' اب میں یہاں سے کس طرف آرکسم (مدراس) پہنچوں؟

بھائی نے جواب میں ان کی سادگی کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا کہ ہمیں تو یہاں سے نکلنے کی فکر لگی ہوئی ہے اور آپ کو ادھر آنے کی پڑی ہوئی ہے۔

اپنڈے سائٹس Appendicitis

انہی دنوں کی بات ہے کہ ایک دائیں رن پہلو میں شدید درد ہوا۔ گھر والوں سے کہنے لگے: ''مجھے گھوڑی پر بہت جلد سڑک تک پہنچا دو' جہاں سے کوئی ٹرانسپورٹ مل جائے گی۔ مجھے خدشہ ہے یہ اپنڈے سائٹس کا درد نہ ہو' اس صورت میں آپریشن کرانا پڑے گا''۔ والد نے کہا میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں مگر انہیں یہ کہہ کر منع کر دیا کہ میں انجان تھوڑا ہی ہوں' خود ملٹری ہسپتال جا کر آپریشن کروالوں گا۔

چنانچہ صبور سے جہلم گئے۔ درد کی شدت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اتفاق سے جہلم ہسپتال میں وہ داخل نہ ہو سکے اور انہیں سی' ایم' ایچ راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ جب ہسپتال پہنچے تو درد کی شدت سے حالت غیر تھی۔ ڈاکٹر نے آپریشن کیا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ التہاب زائدہ کے پھٹنے میں کوئی کسر باقی نہ تھی اور اس کا پھٹنا بڑا خطرناک

تھا۔ خدا نے آپ کو بچا لیا ہے۔

پاکستان بننے کے بعد ان کے دستے راولپنڈی میں آ گئے جہاں سے انہوں نے ۱۹۴۸ء میں پاک آرمی میں کمیشن کے لیے درخواست دی۔

ابتدائی ٹیسٹ

عزیز کے پھوپھی زاد بھائی بشیر حسین نے بتایا:

مجھے اب بھی اچھی طرح یاد ہے۔ اس نے ایئر فورس کے کارپورل کی وردی پہن رکھی تھی۔ ریگولر کمیشن کے لیے ابتدائی ٹسٹ ہو رہا تھا۔ رینکس Ranks سے جو لوگ دوسرے امیدواروں کے ہمراہ امتحان میں بیٹھیں، انہیں ایک طرح کا احساس کمتری ہوتا ہے۔ مگر اس کے چہرہ سے کوئی ایسا احساس ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ وہ جیکٹ اور ایئر فورس کی ٹوپی میں خوب سج رہا تھا۔ امیدواروں کے مابین گروپ مباحثہ شروع ہوا، موضوع تھا:

"Should women in Pakistan ovserve purdah or not."

''کیا پاکستانی عورت کو پردہ کرنا چاہیے یا نہیں؟''

ہم سب بڑی گرم جوشی کے ساتھ موضوع بحث کے حق اور مخالفت میں دلائل کے انبار لگا رہے تھے، مگر وہ بالکل خاموش تھا۔ جب اس کی باری آئی اور اس نے بولنا شروع کیا تو ہم سب دم بخود رہ گئے۔ اس کے خالص انگریزی لب و لہجے، طرز بیان کے سحر، بے نظیر دلائل اور بے پناہ خود اعتمادی نے ہم سب کو حیران کر دیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس نے رسمی پردے اور برقعہ کے خلاف تقریر کی تھی۔ حالانکہ زیادہ تر لڑکوں نے ممتحن حضرات کو خوش کرنے کے لیے پردہ کے حق میں تقریریں کیں۔

بحث کے خاتمہ پر چیئرمین نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''نوجوان! تم تو ابھی سے کاکول کی تیاری کرو۔''

''جناب! ابتدائی اور آخری ٹسٹ کے درمیان ابھی بڑے کٹھن مراحل ہیں۔''

''نوجوان! تمہاری راہ میں کسی رکاوٹ کے پیدا ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔''

چیئرمین کرنل گل نواز کی یہ پیش گوئی کتنی درست نکلی۔ اس نوجوان کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہوئی۔ وہ کاکول کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ نہ صرف کاکول بلکہ اپنی عسکری زندگی کے ہر میدان میں اولیت کا سہرا اس کے سر رہا۔ وہ ہمیشہ مشکلات کے پتھروں کو ترتیب دے کر ترقی کے زینہ کا کام لیتا رہا۔ اس کی راہ میں تو موت بھی حائل نہ ہو سکی۔ اس نے موت کو شکست دی اور زندہ جاوید ہو گیا۔

پاکستان ملٹری اکیڈیمی
کاکول

اکیڈیمی میں پہلا دن

میجر محمد بشیر ریٹائرڈ نے بتایا:

ہم انڈین ملٹری اکیڈیمی ڈیرہ دون میں زیر تربیت تھے کہ ۱۹۴۷ء میں برصغیر کو آزادی ملی اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

ایبٹ آباد کے قریب کاکول میں رائل انڈین سروسز کور کے پرانے سکول اور بارکوں میں عارضی طور پر پاکستان کی نئی ملٹری اکیڈیمی قائم کی گئی۔ اس پرفضا مقام پر باقی عمارتیں بعد میں تعمیر ہوئیں۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو وہاں ہماری باقاعدہ تربیت شروع ہوگئی۔ ہم ڈیرہ دون سے خاصی تربیت حاصل کر کے آئے تھے۔ ہمارے کورس کو آئی ایم اے / پی ایم اے کورس کہتے تھے۔

ہمیں اپنی نئی اکیڈیمی میں نئی روایات قائم کرنا تھیں۔

جنوری ۱۹۴۸ء کے آخری ہفتے سے فرسٹ ریگولر پی ایم اے لانگ کورس شروع ہوا۔ اس کے علاوہ فرسٹ پی ایم اے گریجوایٹس کورس (ڈگری) بھی جاری ہوا۔

پہلے دن بہت سے کیڈٹ آئے' ہم ان کے استقبال کے لیے گئے۔ کالجوں کی طرح نئے آنے والوں کو یہاں بھی فرسٹ ایئر فول بنایا جاتا ہے۔ ہم نے ڈیرہ دون کی روایات کو یہاں بھی قائم رکھا۔

نئے کیڈٹوں میں عجیب عجیب صورتیں تھیں۔ کچھ تو بڑے اپ ٹو ڈیٹ تھے۔ مگر کچھ سادہ سے بھی تھے۔ وہ اپنا سامان وغیرہ خود اتار رہے تھے۔ ان میں سے ایک سادہ سا نوجوان ہم سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس نے اکیڈیمی میں تربیت کے لیے انتخاب کے باوجود ابھی تک ایئر فورس کے کارپورل کی وردی پہن رکھی۔ یہ بڑی تعجب انگیز بات تھی۔ ہم سوچتے تھے یہ درست ہے کہ وہ ایئر

فورس میں ایک کارپورل تھا' مگر یہاں تو اسے اس حقیقت کو چھپانے کا احساس ہونا چاہیے تھا' مبادا اس کا مذاق اڑایا جائے۔ مگر اس کی یہی بے نیازی اس کی بے پناہ خوداعتمادی کی غمازی بھی کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ مذاق کا کسی کو حوصلہ نہ ہوا۔

دیکھنے میں وہ قدرے شرمیلا اور خاموش تھا۔ عمر کے لحاظ سے وہ کہیں زیادہ تجربہ کار اور ذہنی طور پر پختہ محسوس ہوتا تھا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ اس نوجوان کا نام راجہ عزیز بھٹی ہے۔ اور وہ پہلے ہی ٹیسٹ میں اول رہا ہے۔ ہمیں اس پر تعجب سا ہوا۔ دیکھنے میں وہ اتنا تیز طرار نہیں لگتا تھا بلکہ بڑا خاموش سا تھا۔

اپنے انسٹرکٹر کی نظر میں

''ہمیں عزیز سے اس سے کم کی توقع نہیں تھی۔ یہاں وہ ہر میدان میں سرفہرست تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ وطن عزیز پر دشمن حملہ ہو اور عزیز اس کے محافظوں کی صف اول میں نہ ہوتا۔ ہمیں یقین تھا کہ عزیز جس محاذ پر بھی ہوا جنگی بصیرت اور قائدانہ صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کرے گا ''۔ یہ الفاظ پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول میں شعبہ تاریخ کے سربراہ ڈاکٹر خواجہ عبدالحی نے ۱۷دسمبر ۱۹۶۵ءکو کاکول میں ایک ملاقات میں کہے کاکول سٹاف میں وہ سب سے پرانے لیکچرار ہیں۔

انہوں نے بتایا: یہاں تربیتی کورس کے دوران واضح ہوگیا تھا کہ نوجوان دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ وہ سادگی پسند اور تکلفات سے بے نیاز تھا۔ اس میں انکسار اور قدرتی شرم وحیا تھی' اس کے باوجود اس کی شخصیت بارعب تھی۔ وہ کمپنی سینئر انڈر آفیسر اور بٹالین سینئر انڈر آفیسر رہا۔ اس حیثیت سے اس نے اپنے فرائض بڑے باوقار طریقے سے نبھائے۔ اس کا نظم ضبط مثالی تھا' مگر کیڈٹ اس پر بے حد خوش تھے۔ وہ نہ کسی سے رعایت کرتا تھا اور نہ کسی کا مخالف تھا۔ عملی کام کے وقت وہ اپنے ساتھیوں سے بڑھ کر کام کرتا تھا۔ دوسروں سے کام لینے کے لیے وہ ہمیشہ اپنا نمونہ پیش کرتا تھا۔

جب اسے بٹالین سینئر آفیسر کا عہدہ دیا گیا۔ تو یہ امر یقینی سا تھا کہ وہ شمشیر فاخرہ حاصل کر لے گا۔ علمی میدان میں گریجویٹ اور ڈبل گریجویٹ کیڈٹوں کی موجودگی میں ایک میٹرک کے لیے نارمن گولڈ میڈل حاصل کرنا مشکل تھا۔ مختلف ٹرموں کے امتحانات کے مجموعی نتائج سے البتہ ہمیں یہ واضح ہو چکا تھا کہ اس تمغہ کا واحد حق دار بھی عزیز بھٹی ہے۔ انہوں نے کہا امتحانات کے پرچے

دیکھتے ہوئے ہم کیڈٹ کی دماغی قوت' قوت استدلال اور علمی قابلیت کو مدنظر رکھتے ہیں اور عزیز بھٹی ہر معیار میں اپنے ساتھیوں سے بہت آگے تھے۔

عزیز کو تاریخ کے مضمون سے بالخصوص دلچسپی تھی۔ وہ تاریخی واقعات کے پس منظر اور ان کی علت و معلول پر خاص نظر رکھتا تھا۔ اور جب تک کون؟ کیوں؟ اور کیسے؟ کے سوالات حل نہیں کر لیتا تھا اسے چین نہیں آتا تھا۔

ڈاکٹر عبدالحی نے ایک پر لطف واقعہ سنایا کہ کیونکر ایک دن پروفیسر احسان اللہ خان' جو اسلامیہ کالج پشاور میں شعبہ فلسفہ کے سربراہ تھے اور اس وقت پی ایم اے میں حالات حاضرہ پر لیکچر دیتے تھے' اپنا پیریڈ بھول گئے۔ اور ایس جی سی بھٹی نے ان کا پیریڈ لیا تھا اور بریگیڈیر الیگل سے داد پائی تھی۔

ڈاکٹر عبدالحی خواجہ کے ہمراہ ہم نے وہ کمرہ بھی دیکھا جہاں راجہ عزیز بھٹی نے لیکچر دیا تھا
۔

کمانڈنٹ سے داد

سینئر جنٹلمین کیڈٹ دروازے پر کھڑا اپنے پرفیسر کا انتظار کر رہا ہے۔ پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور کے شعبہ فلسفہ کے سربراہ جناب احسان اللہ خان ہے جو اب کاکول اکیڈیمی میں حالات حاضرہ Current Affairs پر لیکچر دیتے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب اپنا پیریڈ بھول گئے ہیں۔

ایس۔جی۔سی نے کلائی پر گھڑی کو دیکھا۔ پیریڈ شروع ہوئے پانچ منٹ گزر چکے تھے۔ وہ اندر داخل ہوا اور سٹیج پر چڑھ کر لیکچر دینا شروع کر دیا۔ اتنے میں اکیڈیمی کے فاؤنڈر کمانڈنٹ جناب بریگیڈیئر اینگل معائنہ کرتے ہوئے آتے ہیں اور کلاس میں پچھلے دروازہ سے داخل ہو کر پیچھے بیٹھ جاتے ہیں۔ جب پیریڈ ختم ہوتا ہے کمانڈنٹ اینگل بڑھ کر نوجوان کے کندھوں پر تھپکی دے کر کہتے ہیں:

"شاباش! مسٹر بھٹی! بہت خوب! بریگیڈیئر اینگل سے یہ داد وصول کرنا معمولی بات نہ تھی۔

کلاس کے لڑکے ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان کو ایک لمحہ کے لیے بھی کلاس میں یہ احساس نہیں ہوا کہ ان کو حالات حاضرہ پر لیکچر ان کے پروفیسر نے نہیں بلکہ اپنا ایک ساتھی دے رہا تھا۔ یہ نوجوان سینئر جنٹلمین کیڈٹ ہمارے ہیرو عزیز بھٹی شہید کے سوا کون ہو سکتا ہے؟

ایک دفعہ ایک انسٹرکٹر چین کے موضوع پر لیکچر دے رہے تھے۔ عزیز بھٹی نے ایک دو سوالات کیے تو انسٹرکٹر نے کہا: اس موضوع پر عزیز بھٹی مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، بہتر ہو کہ وہ سٹیج پر آ کر آپ کی معلومات میں اضافہ کریں۔ چنانچہ عزیز بھٹی نے چین پر لیکچر دینا شروع کیا، تو دو پیریڈ تک ان کا لیکچر ختم نہ ہوا۔ انسٹرکٹر اور کیڈٹس نے ان کو بڑی داد دی۔

ایک ساتھی کی نظر میں

میجر یوسف علی کاکول میں میجر عزیز بھٹی کے ہم عصر تھے۔ دونوں خالد کمپنی میں تھے۔ عزیز بھٹی کمپنی انڈر آفیسر تھے اور یوسف علی پلاٹون انڈر آفیسر...... بھٹی بعد میں بٹالین سینئر آفیسر بن گئے۔ یوسف علی کاکول کے زمانے میں ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش تھے۔ وہ پی ایم اے میں بزم ادب و مباحثہ کے صدر بھی تھے اور عزیز بھٹی کے ایک دوست جہانزیب بنگش اس بزم کے سیکرٹری تھے۔

میجر یوسف علی لکھتے ہیں:

جنوری ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے۔ پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول کے خالد میس میں کچھ نووابط جنٹلمین کیڈٹ جمع تھے۔ ان ہی میں ایک نوجوان تھا جو دوسروں سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ اکیڈیمی کی روایت کے مطابق ہر کیڈٹ نے اپنا اپنا تعارف کراتے ہوئے اپنی زندگی کے پس منظر اور تجربات سے مجمل طور پر آگاہ کیا۔ یہ منفرد اور ممتاز نوجوان راجہ عزیز بھٹی تھے۔ وہ اپنا تعارف کرنے اٹھے تو ہم سب نے یوں محسوس کیا کہ اس شخصیت میں عجیب سی جاذبیت تھی جو سب کی نگاہوں کو کھینچ رہی تھی۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے انہوں نے کہا:

"میرا تعلق ضلع گجرات میں لادیاں گاؤں کے اوسط درجے کے گھرانے سے ہے۔ میری بیشتر تعلیم ہانگ کانگ میں ہوئی ہے، میری تعلیم میٹرک تک ہے۔ میرا کوئی خاص مشغلہ نہیں۔ ہاں مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ میں کھیلوں کا بہت دل دادہ ہوں۔ میں اپنے لیے یہ بڑی سعادت کی بات سمجھتا ہوں کے مجھے اپنی آرمی میں قیادت کی تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں آپ سب کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں"

راجہ عزیز بھٹی کا قد درمیانہ اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ طبیعت میں سادگی اور انکسار نمایاں تھا۔ وہ اکثر خاموش رہتے۔ ان کی ظاہر شخصیت میں دو چیزیں نمایاں تھیں ...... ان کا بڑا سر اور مخمور آنکھیں ...... وہ اکثر کھوئے کھوئے رہتے تھے۔ ان کی یہ طبیعت اکیڈیمی میں کیڈٹ کی حیثیت سے اور بعد میں دوسرے اداروں میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کی حیثیت سے تربیت کے دوران میں بڑی پریشان کن ہوتی تھی۔ جب کوئی اسٹرکٹر انہیں یہ کہہ کر چوکنا کرنے کی کوشش کرتا ''بھئی! تصور و خیال کی دنیا سے نکلو'' تو ہمارے لیے خوب تفریح کا سامان مہیا ہو جاتا۔

بھٹی فوراً جواب دیتے ''سر! میری توجہ آپ ہی کی طرف ہے''۔

اسٹرکٹر کا ردعمل عام طور پر ہوتا ''جی سی بھٹی! حجت بازی نہ کرو اچھا یہ بتاؤ ابھی کیا کہہ رہا تھا''۔

بھٹی ایک ایک بات اسی تسلسل اور ترتیب سے سنا دیتے جس تسلسل اور ترتیب سے اسٹرکٹر نے کہی تھی۔ وہ ان پر تبصرہ بھی کرتے اور بعض نکات پر انسٹرکٹر کے خیالات سے اختلافات کا اظہار بھی کرتے۔

غیر معمولی ذہانت

عزیز بھٹی غیر معمولی ذہانت اور گوناں گوں صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اس کا اندازہ ان لیکچروں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو ہر کیڈٹ کو اکثر دینے ہوتے تھے۔ لیکچر کا موضوع صرف دو منٹ پہلے ایک پرزہ کاغذ پر لکھ دیا جاتا تھا۔ مقرر کو اس موضوع پر دس منٹ بولنا ہوتا تھا۔ ایسا ہی ایک موقع تھا' بھٹی سٹیج پر آئے اور حاضرین سے یوں خطاب کیا: ''حضرات! مجھے آج جس موضوع پر تقریر کرنی ہے وہ ہے............ بادل!''

کیا موضوع تھا! ہم بے چینی سے اپنی نشستوں پر پہلو بدلنے لگے کہ اس موضوع پر کیا کچھ کہا جاسکتا ہے۔ مگر جب انہوں نے لیکچر شروع کیا تو بادل پیدا ہونے کے اسباب' بادلوں کی قسمیں اور ان کی مختلف تہوں کے اثرات اس شرح و ربط سے بیان کر ڈالا کہ سب حیران رہ گئے۔ دوسرا کوئی اس موضوع پر اتنا مفصل اور اتنا فاضلانہ لیکچر شاید کئی دنوں کی تیاری کے بعد بھی نہ دے سکتا۔ انہوں نے تقریر ختم کی تو انسٹرکٹر نے بس اسی قدر کہا کہ ''اس موضوع پر اس سے بہتر تقریر ممکن نہ تھی''

ہم میں سے بیشتر یونیورسٹی گریجوایٹ تھے اور سب کا گمان یہ تھا کہ فوجی مضامین میں اپنی امتیازی حیثیت کی بدولت بھٹی شمشیر اعزاز تو جیت جائیں گے لیکن ان کی علمی قابلیت ایسی نہیں کہ وہ نارمن میڈل پر بھی ہاتھ مار سکیں گے۔ لیکن اب کوئی بھی یقین اور وثوق کے ساتھ بات نہیں کر سکتا تھا۔ پاس آؤٹ ہوتے ہوئے انہیں شمشیر اعزاز کے ساتھ نارمن میڈل بھی ملا' وہ دونوں کے حقدار تھے۔

ایک اور موقع پر فوجی تاریخ پر لیکچروں کے دوران پیدا ہوا۔ جب انہوں نے اپنی

خداداد ذہنی استعداد کا مظاہرہ کیا۔ ہمارے ایک ہم جماعت تھے .... ''جو بنگش'' ...... (اب میجر جہاں زیب بنگش، فرنٹیر فورس) انہیں جنگ کے بعض اصولوں کی تشریح میں تقریر کرنے کو کہا گیا ''جو'' کو سخت الجھن ہوئی۔ اس لیے کہ ان کے پیش نظر کوئی ایسی فوجی کارروائی نہ تھی جس وہ ان اصولوں کی وضاحت کر سکتے۔ بھٹی نے ان کی مشکل حل کر دی۔ انہوں نے ایک خیالی جنگ کا نقشہ تیار کیا۔ اس کے تفصیلی خاکے بھی مرتب کیے۔ ''جو'' نے تصور و خیال کے اس نقشے پر مبنی لیکچر تیار کیا۔ سننے والوں میں سے کسی کو ہلکا سا شبہ بھی نہ ہوا کہ یہ ساری فرضی جنگ تھی۔

بھٹی میں یہ بڑی خوبی تھی کہ ہر مسئلہ سے پوری یک سوئی اور سنجیدگی کے ساتھ نمٹتے تھے اور جن نتائج پر پہنچتے تھے ان پر وہ یقین محکم کے ساتھ ثابت قدم رہتے تھے۔ وہ جب بھی کسی موضوع پر بولتے' کلاس میں یا میس میں ہر لفظ تول کر منہ سے نکالتے۔ ان کی طبیعت میں شگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی' مگر ان کے مذاق میں طنز کے نشتر کبھی نہ بولتے تھے۔ کوئی ان سے سوال پوچھتا تو وہ اس کا صحیح صحیح جواب دیتے۔ اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد وہ جو رائے قائم کر لیتے اس پر وہ ثابت قدمی سے جمے رہتے۔

ایک دفعہ جنگی چالوں کے موضوع پر چیف انسٹرکٹر لیفٹیننٹ کرنل (اب میجر جنرل) فضل مقیم خان کے ساتھ ان کی بحث جو چلی تو چلتی ہی گئی۔ یہاں تک چیف انسٹرکٹر نے اپنی طبعی شگفتگی کے ساتھ کہا ''بہت اچھا راجہ عزیز بھٹی۔ اگر کسی وقت میں بٹالین کمانڈر کی حیثیت سے آپ کے علاقہ میں آ جاؤں اور آپ سے کہوں کہ جس طرح میں کہتا ہوں ایسے کریں تو آپ کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے مجھے بیشک کہہ دیں .... آپ اپنی فکر کیجئے مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیجئے .... اور میں وہاں سے چلا جاؤں گا''۔ دونوں کا اس بات پر اتفاق تھا کہ جنگی چالوں کے سلسلہ میں پیدا ہونے والے کسی مسئلہ کا ایک نہیں کئی حل ہو سکتے ہیں اور اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے۔

دیانت

بھٹی کی دیانت کا مظاہرہ اکیڈیمی کی زندگی کے اوائل میں ہو ہو گیا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ہم میں سے کچھ لڑکے ایک سبق سے متعلق ایک پمفلٹ لانا بھول گئے۔ اسٹرکٹر نے سینئر کیڈٹ سے کہا کہ اس طرح کے تمام کیڈٹوں کے نام لکھ لو' اس مہینے کے سینئر کیڈٹ بھٹی تھے۔ انہوں نے ناموں کی فہرست تیار کی اور چپکے سے اسٹرکٹر کے ہاتھ میں دے دی۔ انسٹرکٹر اسے ایک نظر دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس میں سرفہرست بھٹی کا اپنا نام ہے۔ انہیں اپنا نام لکھنے کی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ ان کا کام صرف نگرانی کرنا تھا۔ مگران کی دیانت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اپنا قصور چھپا کر نہ رکھیں۔

بھٹی بعد میں بٹالین سینئر انڈر آفیسر مقرر ہوئے۔ اس حیثیت سے انہوں نے اپنے فرائض منصبی بڑے باوقار طریقے سے انجام دیے۔ وہ اپنی سرکاری حیثیت سے کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ اس معاملہ میں دوستوں تک کی پروانہ کرتے۔ کیمپوں اور مشقوں کے دوران وہ اپنے فرائض کی حدود سے نکل کر دوسروں کے ساتھ تعاون کرتے اور ان کی مدد کرتے۔ جنگی چالوں کی مشق ''قیادت'' میں جبکہ کیڈٹ ہفتہ بھر کے لیے اسی میل باہر چلے جاتے اور انہیں پلک سے پلک لگانے کی بھی مہلت نہ مل سکتی تھی' وہ کھانا پکانے میں ان کا ہاتھ بٹاتے' پیغام رسانی کا کام کرتے اور اس طرح کے دوسرے مشکل کام اپنے ذمہ لے لیتے۔ وہ بھاری ہتھیار اور سامان اپنی خوشی سے کندھے پر اٹھا کر ادھر ادھر لے جاتے۔

سپورٹس مین

ذہنی استعداد رکھنے کے علاوہ وہ ایک عمدہ کھلاڑی بھی تھے۔ وہ بڑے اچھے تیراک اور غوطہ زن تھے۔ اکیڈیمی میں کرکٹ اور ہاکی بھی کھیلتے تھے۔ اکیڈیمی سے فارغ التحصیل ہونے تک ہر انسٹرکٹر کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اس کی بٹالین میں آجائیں۔ ہمارے پلاٹون کمانڈر کیپٹن (اب لیفٹیننٹ کرنل) علی زمان نقوی کے زیر اثر انہوں نے سولہ پنجاب رجمنٹ کا انتخاب کیا۔ کیڈٹوں کے لیے رجمنٹوں کا انتخاب بڑا مشکل تھا۔ اس لیے کہ ہمارے سارے انسٹرکٹر بڑے اچھے تھے۔ سولہ پنجاب رجمنٹ خوش قسمت تھی جس کا انتخاب بھٹی نے کیا تھا۔ بعد میں اپنے انسٹرکٹروں کے ساتھ گفتگو سے پتہ چلا کہ انہیں شمشیر اعزاز کی لیے کیڈٹ کے انتخاب میں قطعاً کوئی وقت نہیں ہوئی۔ گریجوایشن کی تاریخ سے بہت پہلے تمام متعلقہ لوگ متفقہ طور پر اس اعلیٰ اعزاز کے لیے اپنا انتخاب کر چکے تھے۔ سوچ بچار کی ضرورت صرف یہاں پر پڑی کہ دوسری اور تیسری حیثیت کس کیڈٹ کو دی جائے۔

میرا دوست

•

اتوار ۲۵ ستمبر ۱۹۶۶ء کا دن تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل جہاں زیب بنگش سے سیالکوٹ چھاؤنی میں ان کے بنگلہ پر ملاقات ہوئی۔ تعارف کے بعد تپاک سے ملے اور کہنے لگے میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ آج آپ کے پاس گجرات جاؤں یا اگلے اتوار؟ آپ کا خط مجھے کل ہی ملا ہے' ایڈریس مکمل نہیں تھا اس لیے پورے پندرہ دن تاخیر سے ملا ہے۔

ڈرائنگ روم میں میجر بھٹی کے ساتھ کوئٹہ اور کاکول کے زمانہ کی فوٹو آویزاں تھیں چار گھنٹے تک اس دلچسپ موضوع پر باتیں کرتے رہے۔

کاکول میں ہم ایک ہی کورس میں' ایک ہی کمپنی میں' ایک ہی پلاٹون میں بلکہ ایک ہی سیکشن میں تھے۔ ہم K-1 بلاک میں رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے ان کا کمرہ نمبر ۷ اور میرا کمرہ نمبر ۱۰ تھا

۔

مجھے آغاز الفت کا لمحہ تو یاد نہیں مگر ہم جلد ہی ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ حامد حسین شگری اور یوسف علی بھی ہمارے حلقہ احباب میں شامل تھے۔

پہلے مہینے ہی ہم سب پر ظاہر ہو گیا تھا کہ یہ نوجوان ہم سے بہت آگے ہے لیکن عزیز بھٹی کہا کرتا تھا کہ یار مجھے تو کمیشن مل جائے تو خدا کی بڑی مہربانی ہے۔

ہمارا کورس سب سے پہلا لانگ ٹرم ریگولر کورس تھا۔ لیکن ہندوستان کی ملٹری اکیڈیمی ڈیرہ دون سے آئے ہوئے زیر تربیت مسلمان کیڈٹ یہاں آئی ایم اے / پی ایم اے کورس میں تھے۔ ہماری دوسری ٹرم کے آخر میں ان کی پاسنگ آؤٹ پریڈ ہو گئی اور وہ آفیسر بن کر چلے گئے۔ پھر...... ہم سینئر ہو گئے۔

ایک ٹرم میں دو امتحان ہوتے تھے' مڈ ٹرم اور فائنل۔ دو ہی ٹیسٹوں کے بعد یہ امر یقینی ہو گیا کہ عزیز بھٹی فوجی تربیت اور تعلیم دونوں میں اول رہے گا۔ یوسف علی انہیں کہا کرتے تھے: بھٹی

شمشیر فاخرہ تو تمہارے لے تھالی میں پڑی ہے' مگر بھٹی ہمیشہ انکساری کے جواب دیتے۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے یہ اعزاز عطا کر دے۔

پی ایم اے کی زندگی بڑی سخت ہوتی ہے اس زمانہ میں عزیز کا معمول یہ تھا کہ وہ بہت سویرے اٹھتے۔ نماز باقاعدگی سے ادا کرتے اور فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن مجید کرتے تھے۔ کاکول کے قیام میں دو دفعہ رمضان شریف آیا۔ بھٹی نے پورے روزے باقاعدگی سے رکھے۔ حالانکہ ان دنوں ہمیں تربیتی مشقوں پر باہر سفر پر جانا ہوتا تھا اور سخت گرمی پڑتی تھی۔

کرنل جہاں زیب بنگش نے بتایا: پی ایم اے کی مشقوں کے دوران ایک دفعہ ہم کاکول سے ہری پور ہری پور سے ٹیکسلا' وہاں سے ٹریٹ (مری) اور پھر حویلیاں گئے تھے۔ ہم تھک ہار کر جب آرام کرتے تھے تو یہ خوش نصیب انسان وضو کر کے خدا کے حضور میں کھڑا قضا نمازیں ادا کر رہا ہوتا تھا۔

حویلیاں کیمپ کے دوران مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک رات اتفاق سے میری اور عزیز بھٹی کی سنتری پہرہ کی ڈیوٹی تھی۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ رات کے دو بجے کے قریب ایک مسافر گاڑی اسٹیشن پر آئی۔ وہ اپنی جگہ سے میرے قریب آئے اور کہنے لگے ''جو'' (میرے دوست مجھے جہاں زیب کی بجائے ''جو'' کہتے ہیں) مجھے بتاؤ یہ گاڑی واقعی ہماری ہے؟

میں نے کہا' ہاں بھئی ہماری ہے اس میں شک کی کیا بات ہے؟

بالکل معصوم بچوں کے اشتیاق سے کہنے لگے ''یار وہ سبھی چیزیں جن پر انگریز کی ملکیت تھی ہماری ہو گئی ہیں! ہم کتنے خوش نصیب ہیں' جنہیں آزادی کی اتنی بڑی نعمت ملی ہے''

پاسنگ آؤٹ پریڈ پر بھٹی کے والد' بیگم نہا اور دونوں برادر نسبتی بھی آئے تھے۔ بھٹی نے ان کے ساتھ ہمارا تعارف کرایا۔ ان کو اپنے والدین' بال بچوں اور عزیزوں کے ساتھ بڑی محبت تھی۔

زندگی کا "ماٹو"

☆ "قدرت ہر لمحہ ہمارے اعمال کی تشخیص کرتی ہے"

☆ "درجہ بندی وہ جو خدا کرے!"

کاکول میں کیڈٹس کی تنظیم بالکل فوج کے مطابق ہوتی ہے۔ بتالین' کمپنیوں' پلاٹونوں اور سیکشنوں میں تقسیم ہوتی ہے اور کیڈٹوں میں سے ان پر عہدہ وار سینئر انڈر آفیسر اور جونیئر انڈر آفیسر چنے جاتے ہیں۔ بھٹی اپنی خداداد لیاقت اور عسکری صلاحیتوں کی وجہ سے پوری بٹالین کے سینئر انڈر آفیسر چنے گئے۔ ان کے قریبی دوستوں میں یوسف علی' حامد حسین شگری اور جہاں زیب بنگش تھے۔

جہاں زیب بنگش سے انہیں سب سے زیادہ پیار تھا' مگر بنگش صرف ایک کیڈٹ تھا۔ یعنی یوں جیسے وہ ایک سپاہی ہو اور بھٹی بٹالین کمانڈر ہوں۔

ایک دن بنگش نے بھٹی سے کہا "یارا! اب ہماری دوستی جچتی نہیں۔ آپ بہت بڑے آفیسر ہیں اور میں ایک کیڈٹ"

"کہنے لگے دوست تو ہر حال میں دوست رہتا ہے۔ ویسے بھی ان کی درجہ بندیوں کا کیا؟ میں انسانوں میں ان درجہ بندیوں کا تو قائل ہی نہیں ہوں۔ یہ سب عارضی باتیں ہوتی ہیں' نہ جانے جس کو ہم حقیر خیال کریں وہی خدا کے حضور میں کتنا مقبول ہو"

بنگش کہتے ہیں میں ان کی باتوں سے بے حد متاثر ہوا اور میں نے دیکھا کہ ہماری دوستی میں ساری عمر کوئی فرق نہیں آیا۔

بنگش کہنے لگے: مجھے زمانہ طالب علمی سے ایک خبط تھا۔ میں نے ایک آٹوگراف بک رکھی ہوئی ہے جس پر اپنے مخلص ترین دوستوں کے آٹوگراف لیا کرتا تھا۔

۱۲ جنوری ۱۹۴۹ء کو میں وہ آٹوگراف بک بھٹی کے پیش کی' تو انہوں نے اس مختلف رنگوں کی کتاب میں سبز رنگ کے صفحے پر قلم برداشتہ یہ الفاظ لکھے:

میرے پیارے دوست جہاں زیب!

پی ایم اے میں تمہاری زندگی تو ایک عارضی مرحلہ ہے۔ یاد رکھو کہ خدا کی درجہ بندی (ہمارے) انسٹرکٹروں کی درجہ بندی سے زیادہ عادلانہ اور منصفانہ ہوتی ہے۔ تمہارے اعمال کا سلسلہ امتحان زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہے گا۔

اگر تم یہ بات ذہن نشین کرلو گے تو تمہیں کسی ناصح کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

....

جہاں زیب بنگش کی ۳۸ صفحے کی آٹوگراف بک یہیں ۲۵ صفحے پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد انہیں یہ کتاب دنیا کے کسی اور شخص کے روبرو پیش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔

کرنل بنگش نے کہا: یہ پیغام عزیز کی زندگی کا ماٹو تھا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا کبھی کسی کو اپنا محتسب نہیں سمجھا تھا۔ انہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت تھی۔ وہ زندگی کے لمحات یوں گزارتے تھے گویا ان کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہو۔

عزیز اور جہاں زیب

شخصیت

جون ۱۹۴۹ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول کے ترجمان ششماہی جریدہ موسومہ ''رائیزنگ کریسنٹ'' کا اجراء ہوا۔ اس کے پہلے ہی شمارہ میں راجہ عزیز بھٹی نے شخصیت (پرسنیلٹی) کے موضوع پر ایک مضمون لکھا جو بہت سراہا گیا۔ مضمون میں راجہ عزیز بھٹی کی اپنی شخصیت کا عکس نمایا ہے۔

الفاظ کا صحیح استعمال ہمیشہ وسیع مطالعے ہی سے آتا ہے لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے اکثر جنٹلمین کیڈٹ لفظ ''شخصیت'' کا استعمال بے محل اور بے موقع کرتے ہوئے سنے جاتے ہیں۔ چنانچہ روزمرہ کی گفتگو میں عموماً ہمارے کانوں میں ایسے فقرے پڑتے رہتے ہیں۔

''جنٹلمین کیڈٹ فلاں اتنی بڑی شخصیت کا مالک ہے کہ اسے کم سے کم ہمارے سینئر انڈر آفیسر ہونا چاہیے تھا............'' یا ''جنٹلمین کیڈٹ فلاں نہایت اچھا کیڈٹ ہے لیکن بدقسمتی سے اس کی شخصیت کوئی نہیں''

جنرل گریسی نے اکیڈمی کے پہلے معائنہ کے دوران کہا تھا۔

''شخصیت سے مراد یہ نہیں کہ اپنی وردی میں خوب چاق و چوبند دکھائی دو اور تمہارے ہاتھ میں بید ہو جسے تم بار بار اپنے ران پر مارتے رہو۔ شخصیت اس سے کہیں زیادہ معنویت رکھتی ہے''۔ یہ زیادہ معنویت دراصل کیا چیز ہے؟ حقیقی شخصیت آخر کیا ہوتی ہے؟ اور لوگ شخصیت کے اصل مفہوم کے بارے میں کیوں غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں؟

لغت کے اعتبار سے بھی ''پرسنیلٹی'' Personality (شخصیت کا لفظ بڑا دلچسپ ہے۔ یہ لفظ لاطینی زبان کے لفظوں کا مجموعہ ہے 'پرسونا (Persona)(Per) کا مطلب ہے

''بذریعہ'' اور سونا (Sona) کا مطلب ہے ''آواز''...... ''پرسونا'' ایک خاص نقاب کا نام تھا جسے کلاسیکی ایکٹر سٹیج پر پہنتے تھے اور اسی نقاب میں سے بولتے تھے اور اس نقاب میں سے بولنے ہی سے ان کے منفرد کردار کا اندازہ ہوتا تھا۔ اور اس میں اور دوسرے کرداروں میں امتیاز کیا جاتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس نقاب کو پہننے والے کی ایک مخصوص شخصیت بن جاتی تھی۔ اسی طرح کسی فرد کی ''پرسنیلٹی'' اس فرد کی ان عادات اور رجحانات کا دوسرا نام ہے جن کا مظاہرہ اسے زندگی بھر کرنا ہے۔

کسی فرد کی شخصیت کا اندازہ کس طرح لگایا جاسکتا ہے؟ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ کسی فرد کی شخصیت کی تشکیل میں اس کے ماحول کا اتنا ہی دخل ہے جتنا کہ اس کے ورثے میں آئی ہوئی عادات و خصائل کا دخل ہوتا ہے۔ قدرت ہم میں پیدائشی طور پر بعض صلاحیتیں، خواہشات، شعور اور رجحانات ودیعت کر دیتی ہے اور زندگی میں مختلف حالات سے نمٹنے کیلئے ہماری یہ جبلی عادات و خصائل عامل ہوتی ہیں۔ انسان اور اس کے ماحول میں ایک مستقل عمل اور ردعمل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور موروثی خصائل اور ماحول کی یہ باہمی کشمکش ایک ایسی نفسیاتی خودشناسی کی تخلیق کرتی ہے جو اسے ایک مکمل شخصیت کا مالک بنا دیتی ہے۔

جن دو چیزوں پر شخصیت کی عمارت استوار ہوتی ہے وہ یہ ہیں:

(ا) ذہانت کا ایک خاص معیار

(ب) بعض جذباتی اور عملی رجحانات

اس اعتبار سے محض گوشت پوست کے ڈھانچے ہی کو انسان نہ سمجھ لینا چاہیے۔ اصل انسان یعنی روح انسانی تو اس ڈھانچے کے اندر چھپی ہوتی ہے۔ کسی کی شخصیت کا اندازہ اس کی روحانی قوت، نیز قوت فکر و عمل ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک توانا اور طویل القامت اور خوبرو آدمی بہت بھلا معلوم ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے کافی حد تک جاذب نظر ہوتا ہے اور اس کی یہ ظاہری جاذبیت ہی اس کے متعلق دوسروں کے اندازوں کا معیار بن جاتی ہے۔ لیکن اس قسم کے

Personality ?

اندازے جو اس کے ظاہری حسن، متناسب اعضا اور جنس مخالف کے لیے اس کی پرکشش شکل وصورت سے لگائے جاتے ہیں اکثر و بیشتر غلط ہوتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ محض ظاہر حسن کو ”شخصیت“ کا نام دینا بے معنی ہے چنانچہ یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ ایک ایسا فرد جس کی چال ڈھال بڑی بھدی ہے یا اس کا جسم بے ڈھنگا سا ہے لیکن اس کی شخصیت کے دوسرے (باطنی) محاسن ان ظاہری عیوب پر چھائے رہتے ہیں، تو میں کہوں گا کہ وہ قابل صد ستائش ہے۔

(سنئیر انڈر آفیسر آر۔ اے۔ بھٹی)

قیادت کے بنیادی تقاضے

☆ جرأت ☆ قوت فیصلہ ☆ وسیع معلومات ☆ جذبہ ایثار

اس دوران میں جن تاریخی شخصیتوں نے پی ایم اے کاکول میں کیڈٹوں سے خطاب کیا' ان میں فیلڈ مارشل سرولیم سلم کا خطاب نہایت اہم اور فکر انگیز ہے۔

(فیلڈ مارشل سرولیم سلم' جی بی ای' کے سی بی' ڈی ایس او' ایم سی' ایل ایل ڈی' چیف آف دی امپیریل جنرل سٹاف نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو پاکستان ملٹری اکیڈیمی کی رسمی پریڈ کے موقع پر افسروں اور کیڈٹوں سے جو خطاب کیا اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

انڈر آفیسرز اور کیڈٹ صاحبان!

میں آپ کو اس پریڈ کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں جو آپ نے ابھی ابھی کی ہے۔ میں نے آج تک جتنی پریڈیں بھی دیکھی ہیں' آپ کی آج کی پریڈ ہر اعتبار سے معیاری پریڈ تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ میں وہ تمام لازمی صلاحتیں موجود ہے جو ایک سپاہی میں ہونا ضروری سمجھی جاتی ہیں یعنی آپ ثابت قدمی کا بھی مرقع ہیں اور قومی تمکنت کا بھی۔

آپ سب جلد فوجی افسروں کے عہدے سنبھالیں گے۔ میں آپ کو دعوت فکر دیتا ہوں کہ اس حقیقت کی اہمیت پر غور کیجئے اور دل میں سوچئے کہ افسر بننے کا مطلب کیا ہوگا۔ اس کا مطلب سب سے پہلے یہ ہے کہ آپ کے وطن نے آپ کو سب سے بڑے اعزاز سے نوازا ہے۔ آپ کے

وطن نے آپ کو میدان جنگ میں اپنے ہم وطن نوجوانوں کی قیادت کے لیے منتخب کیا ہے اور اس سے بڑھ کر اور کوئی بڑی عزت نہیں ہو سکتی۔ دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک نئی مملکت کی فوج کی قیادت کریں گے۔ آپ ایک عظیم الشان کام کی ابتداء کر رہے ہیں۔ خدا نے آپ کو ایک بہت بڑا موقع دیا ہے کیونکہ اب پاکستان کی فوج ہو یا برطانوی فوج یا کوئی فوج۔ ہم ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس فوج کے یونٹ اچھے یا برے ہیں۔ یونٹ بذات خود اچھے یا برے نہیں ہو سکتے بلکہ ہمیشہ افسر اچھے یا برے ہوا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر میں آپ کی فوج کے ایک بہترین یونٹ پر بدترین افسر مسلط کر دوں تو وہ یونٹ بھی جلد ہی بدترین یونٹ بن جائے گا۔ اسی طرح اگر ایک بدترین یونٹ کو بہترین افسر میسر آ جائیں تو وہ اسے بہترین یونٹ بنا دیں گے۔

آپ کے جوان ہمیشہ آپ ہی سے رہنمائی حاصل کریں گے۔ قیادت کے لیے چار چیزیں حد درجہ ضروری ہیں۔

(ا) جرأت

(ب) قوت فیصلہ

(ج) وسیع معلومات

(د) قربانی کا جذبہ

آپ کے سامنے میں جرأت اور دلیری کی وضاحت ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ آپ ایسی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی جرأت و شہامت دنیا بھر میں مشہور ہے۔ میں قریب قریب ہر طرح کی سرزمین میں جنگ لڑ چکا ہوں، جہاں فتح بھی پائی اور شکست بھی اٹھائی، لیکن میں نے آپ کے ملک کے جوانوں سے بہتر سپاہی اور کسی ملک میں نہیں دیکھے۔

دوسری اہم بات جو آپ میں افسروں کی حیثیت سے بہت ضروری ہے وہ قوت فیصلہ ہے۔ قوت فیصلہ کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ آپ چپ چاپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کسی چیز کا انتظار نہ کریں کہ وہ کب ہوتی ہے، بلکہ افسروں کی حیثیت سے اپ کے لیے یہ امر ازبس ضروری ہوگا

کہ آپ کی نگاہیں بڑی دوررس ہوں۔ بحیثیت افسر آپ کا کام یہ ہے کہ آپ اپنے جوانوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ دوراندیش ہوں۔ آپ پیش آنے والے حالات کے ہمیشہ پہلے سے تیار ہوں اوراسی صلاحیت کا نام قوت فیصلہ ہے۔

اس کے علاوہ آپ کا صاحب علم ہونا بھی بہت ضروری ہے یعنی آپ کی معلومات اپنے جوانوں کی معلومات سے لازماً زیادہ ہونی چاہئیں۔ خواہ آپ کتنی ہی لمبی مدت تک خدمات انجام کیوں نہ دیتے رہیں، سیکھنے کا شوق کبھی ترک نہ کیجیے گا اور یہی اپنے جوانوں کے حق میں آپ کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ دور حاضر کی جنگ ایک نہایت پیچیدہ اور مشکل کاروائی کی حیثیت اختیار کرچکی ہے، اس لیے آپ کی معلومات افسروں کی حیثیت سے ہمیشہ وسیع اور مکمل ہونی چاہئیں۔

آخر میں قربانی اور ایثار کی خصوصیت کے متعلق مجھے آپ کو محض یہ نصیحت کرنی ہے کہ اولین ترجیح اپنے ملک کی عزت و آبرو کو دیجیے، بعد میں اپنے جوانوں کے بچاؤ اور آرام کا خیال رکھیے اور اپنی جان اور اپنے آرام کا خیال قطعاً سب سے آخر میں کیجئے گا۔ اگر آپ ایسا طرز عمل اختیار کریں گے تو آپ اپنے جوانوں کو جدھر لے جانا چاہیں گے وہ بغیر حیل وحجت ادھر چل پڑیں گے۔

ان چار اوصاف کو ہمیشہ یاد رکھیے

جرأت، قوت فیصلہ، علم اور قربانی وایثار

اور جب آپ اپنے جوانوں کی قیادت کے لیے یہاں سے جانے لگیں تو ان خواص کو خاص طور پر یاد رکھیے گا کیونکہ آپ انہی سے پاکستانی فوج کو دنیا کی بہترین افواج کی صف میں کھڑا کرسکیں گے۔

نصیب آپ کا یاور ہو!

محنت اور محنت

۳۰ جولائی ۱۹۴۹ء کو پاکستان ملٹری اکیڈیمی کاکول میں گورنر جنرل کی دوسری پریڈ منعقد ہوئی۔ میجر جنرل اے‘ وائٹ ماسٹر جنرل آف آرڈیننس نے کیڈٹوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں عسکری زندگی میں سخت محنت پر زور دیا۔ انہوں نے قائد اعظم مرحوم کے فرمان کی یاد دلاتے ہوئے کہا: مرحوم نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کی تلقین کرتے تھے اور اب وزیر اعظم نے اپنے عید مبارک کے پیغام میں قائد اعظمؒ کے اسی فرمان کا اعادہ کیا ہے۔

میجر جنرل وائٹ سائڈ نے ”محنت“ کے متعلق اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ کسی کام کو سرانجام دینے کے لیے صرف واجبی محنت پر ہی اکتفا نہ کریں‘ بلکہ ہمیشہ اتنی سی زائد محنت بھی ضرور کریں جس سے آپ کو یقین ہو جائے گا کہ کام کی بطریق احسن تکمیل اور انجام دہی کے لیے جو کچھ آپ کے بس میں تھا‘ اس میں کوئی سر نہ اٹھا رکھی گئی۔

نئے گریجوایٹس کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے: کمیشن کا حصول تعلیم و تربیت کی انتہا نہیں ہے‘ یہ تو زندگی بھر جاری رہنی چاہیے۔

تقریب کے خاتمہ پر بٹالین سینئر انڈر آفیسر راجہ عزیز بھٹی کی قیادت میں بٹالین پریڈ گراؤنڈ سے آرمی سروس کور کے بینڈ کے ہمراہ واپس ہوئی۔

....

ان کے علاوہ اس دوران میں جن ممتاز شخصیتوں نے مختلف موضوعات پر وقتاً فوقتاً اکیڈیمی میں تقریریں کیں‘ ان میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم نے ”اردو“ کے موضوع پر تقریر کی۔ ان دنوں پی ایم اے لائبریری میں اردو سیکشن کا اضافہ ہوا۔

امریکن مبصر کیپٹن مشائیل فیلڈنگ نے حالات حاضرہ پر روشنی ڈالی۔

میجر جنرل اے آر ٹن (پاک آرمی) نے ”کمیونزم اور ۵۱ بریگیڈ ارکان“ کے موضوعات پر خطاب کیا۔

بریگیڈیئر اکبر خان ڈی ایس او نے اپنی تقریر میں مسئلہ کشمیر پر سیر حاصل بحث کی۔

خاتون پاکستان محترمہ مس فاطمہ جناح ۲۳ مئی ۱۹۴۹ء کو کاکول تشریف لائیں۔ اکیڈمی کے عملہ اور زیر تربیت کیڈٹوں نے اسے اپنے لیے بہت بڑا اعزاز قرار دیا۔

جن دیگر ممتاز مہمانوں نے اس دوران میں اکیڈمی کا دورہ کیا ان میں پاک آرمی کے کمانڈر انچیف جنرل سر ڈگلس گریسی' سرحد کے گورنر ہز ایکسی لنسی سر امبروس ڈنڈاس' ایئر مارشل آر ایل آر ایچرلے' جنرل آر ایم آر لوکھاٹ (یو کے)' لندن۔ میجر جنرل کیمس (وار آفس لندن) پاکستان آرمی کے میجر جنرل ناصر علی خان و شیر خان۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر عمر حیات ملک اور پبلک سروس کمیشن کے مسٹر ایم افضل حسین اور مسٹر شاہد سہروردی بھی شامل ہیں۔

مبارک

شہید ملت　　　　　　　　عزیز ملت

☆ پاسنگ آؤٹ پریڈ
☆ راجہ عزیز بھٹی کے اعزازات

۴ فروری ۱۹۵۰ء کو پی ایم اے کے فرسٹ ریگولر کورس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ ہوئی، جس سے خان لیاقت علی خاں مرحوم (وزیراعظم پاکستان) نے خطاب کیا۔ انہوں نے راجہ عزیز بھٹی بٹالین سینئر انڈر آفیسر کو عسکری تربیت اور تعلیمی قابلیت دونوں لحاظ سے بہترین کیڈٹ کے طور پر شمشیر فاخرہ اور نارمن طلائی تمغہ عطا کیے۔

وزیراعظم خان لیاقت علی خاں کا خطاب

"ہمارے پاس بہترین جوان موجود ہیں۔ ہمارے پاس اسلام کے اعلیٰ نمونے اور روایات موجود ہیں۔ ہماری تاریخ قربانیوں، بہادری اور شجاعت کے کارناموں اور بے شمار عسکری روایات سے بھرپور ہے۔ ہمیں اس پر بجا طور پر فخر ہے کہ تاریخ عالم کے عظیم سپہ سالاروں خالدؓ، طارقؒ، صلاح الدینؒ اور محمد بن قاسمؒ کی مثالیں ہم میں روح پھونکنے، خود اعتمادی پیدا کرنے، ملک وقوم اور اسلام کی خدمت کرنے اور ان کے راستے پر گامزن ہونے کے لیے موجود ہیں۔"

۴ فروری ۱۹۵۰ء کو کاکول کی خنک فضاؤں میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت

علی خاں کی آواز گونج رہی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے:

''یہ امر میرے لیے باعث مسرت ہے کہ میں پاکستان ملٹری اکیڈیمی کی تیسری پاسنگ آؤٹ پریڈ کے موقعہ پر آپ حضرات کے درمیان ہوں۔ یہ بات میرے لیے وجہ شادمانی ہے کہ میں پہلی مرتبہ سرکاری طور پر آپ کو جھنڈا پیش کرنے کے لیے اکیڈیمی میں آیا ہوں۔ میں نے یہ جھنڈا حفاظت کے ساتھ رکھنے لیے آپ کو سونپا ہے۔ آپ اسے اپنے مستقبل کے لیے ایک علامت اور متاثر کرنے کے لیے ذریعہ بنالیں۔ پاکستان ملٹری اکیڈیمی نے گذشتہ ہفتے دو سال کی مدت پوری کی ہے اور ہم دنیا کی دوسری اکیڈیمیوں کا مقابلہ کریں تو ہماری اکیڈیمی کی حالت ایک شیر خوار بچے کی سی ہے۔ لیکن ہماری ابتداء شان دار ہے' ہم نے ٹھوس بنیادوں پر کام شروع کیا ہے' ہمارے پاس بہترین جوان ہیں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں طریق جنگ

سلامی لے رہے ہیں

میں اس اسلامی روح اور اسلامی نمونوں کو اعلیٰ درجے کے پیشہ ورانہ علم وفن میں تبدیل کرنا چاہیے۔ تا کہ آپ اپنے ملک کی عزت کا تحفظ کر سکیں۔''

زندگی کا سب سے صلہ

وزیراعظم نے نوجوان افسروں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''ریگولر آفیسر اور پاکستان کے لیڈر کی حیثیت سے آپ کی تربیت نہایت اعلیٰ ہونی چاہیے اور آپ کو ہر ایک صرت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس کام کے لیے مسلسل تیاری اور اپنے آپ کو عملی

تاریخی پریڈ

پریڈ دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں

طریقے پر پاکستان کی خدمت کے لیے وقف کر دینے کی ضرورت ہے۔ یاد رکھئے کہ علم حاصل کرنے اور اپنے اندر ترقی کے جوہر پیدا کرنے کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوا۔ زندگی کی جدوجہد میں آپ کسی مقام پر نہیں رک سکتے۔ آپ محسوس کریں گے کہ آپ کو بہت پیچھے چھوڑ دیا گیا ہے۔ جن حضرات کو آج کمیشن مل رہے ہیں میں انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں' کیونکہ ملک نے آپ کو سب سے بڑا اعزاز عطا کیا ہے۔ آپ کو دنیا کے بہترین سپاہیوں کی کمان کرنے کی تربیت دی گئی ہے۔ آپ اس مقام پر قناعت نہ کریں' یہ آپ کی ترقی کا پہلا قدم ہے۔ آپ اپنے حاصل کیے ہوئے علم سے کام لینا شروع کیجئے اور اپنے علم میں اضافہ کیجئے۔ اب آپ اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کر رہے ہیں۔ راستے میں آپ کو مشکلات اور تحریص کا سامنا کرنا ہوگا۔ مشکلات آپ کے حوصلوں پر اثر انداز ہوں گی۔ اور تحریص آپ کو راہ

شاندار پریڈ

راست سے بھٹکانا چاہے گی۔

یہ آپ کا کام ہے کہ اس طرح کام کریں کہ جب بھی گزرے ہوئے زمانے کی جانب نظر اٹھے تو اطمینان ہی اطمینان نظر آئے کہ آپ نے اپنا فرض بدرجہ اتم پورا کیا ہے۔ زندگی کا سب سے بڑا صلہ وہ اطمینان ہے جو انسان کو اپنی ذمہ داریاں پورا کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔"

تعارف

ہمارا ہیرو

پی ایم اے کے ریگولر کورس کے تمام نئے افسران اور مہمان پوری محویت سے یہ الفاظ سن رہے تھے۔ ہمارا ہیرو راجہ عزیز بھٹی آج ایک نئی شان قیادت کے ساتھ اعزازی تلوار اور طلائی تمغہ حاصل کیے ان سب میں نمایاں تھا۔ وزیراعظم لیاقت علی خاں کے الفاظ اس کی صاف وشفاف لوح دل پر کندہ ہوئے جارہے تھے۔ وہ ان الفاظ کو عملی جامہ پہنانے کے لے عملی زندگی کا شدت سے منتظر تھا۔

خان لیاقت علی خاں نے مزید فرمایا:

"کسی ملک کو اسی وقت برتری اور عظمت حاصل ہوتی ہے جب اس کے باشندے اپنا کام پوری محویت، محنت اور مشقت کے ساتھ سرانجام دیں۔ اس امر کا مطلق کوئی لحاظ نہیں رکھنا چاہیے کہ کون شخص کس قسم کا کام انجام دیتا ہے۔ اگر وہ اپنے کام کو پوری دیانت داری کے ساتھ پایہ تکمیل کو

پہنچاتا ہے تو وہ اپنے دوسرے بھائیوں کی بھلائی کے لیے اپنا پورا حصہ ادا کرتا ہے"۔

جدوجہد پاکستان

پاکستان کی جدوجہد اور نصب العین کا ذکر کرتے ہوئے وزیراعظم نے ارشاد فرمایا:

"ہم نے پاکستان کے لیے جدوجہد کی اور پاکستان حاصل کرلیا۔ صرف اس لیے نہیں کہ ہم اپنے آپ کو آزاد کہہ سکیں، بلکہ ہمارے سامنے ایک خاص مقصد تھا۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی سوسائٹی قائم کی جائے جس میں نہ صرف انسان کی مادی ضروریات پوری ہوں بلکہ روحانی طور پر بھی اسے تسکین قلب نصیب ہو سکے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سب حضرات اس مقصد کی تکمیل کے لیے اپنی انتہائی کوشش صرف کریں گے"۔

قابل فخر

وزیراعظم نے نوجوان افسروں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"یاد رکھیے آپ کو فرسٹ پاکستان بٹالین (قائداعظم زون) میں تربیت حاصل کرنے کا فخر حاصل ہے اور اس اکیڈیمی کی روایات اور شہرت کے نہ صرف آپ بانی ہیں بلکہ اس کے محافظ بھی ہے۔ آپ کی قابلیت اور حسن سلوک سے مستقبل میں ان کے متعلق رائے قائم کی جائے گی۔ آخر میں میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس میراث کو جس کلی کی بنیاد اسلام کے اعلیٰ اصولوں پر قائم ہے اور اپنے ملک کو اور اپنے محبوب قائداعظم اور اپنی بٹالین کے اس نصب العین کو ہمیشہ ذہن میں رکھیے: اتحاد، یقین محکم اور تنظیم"۔

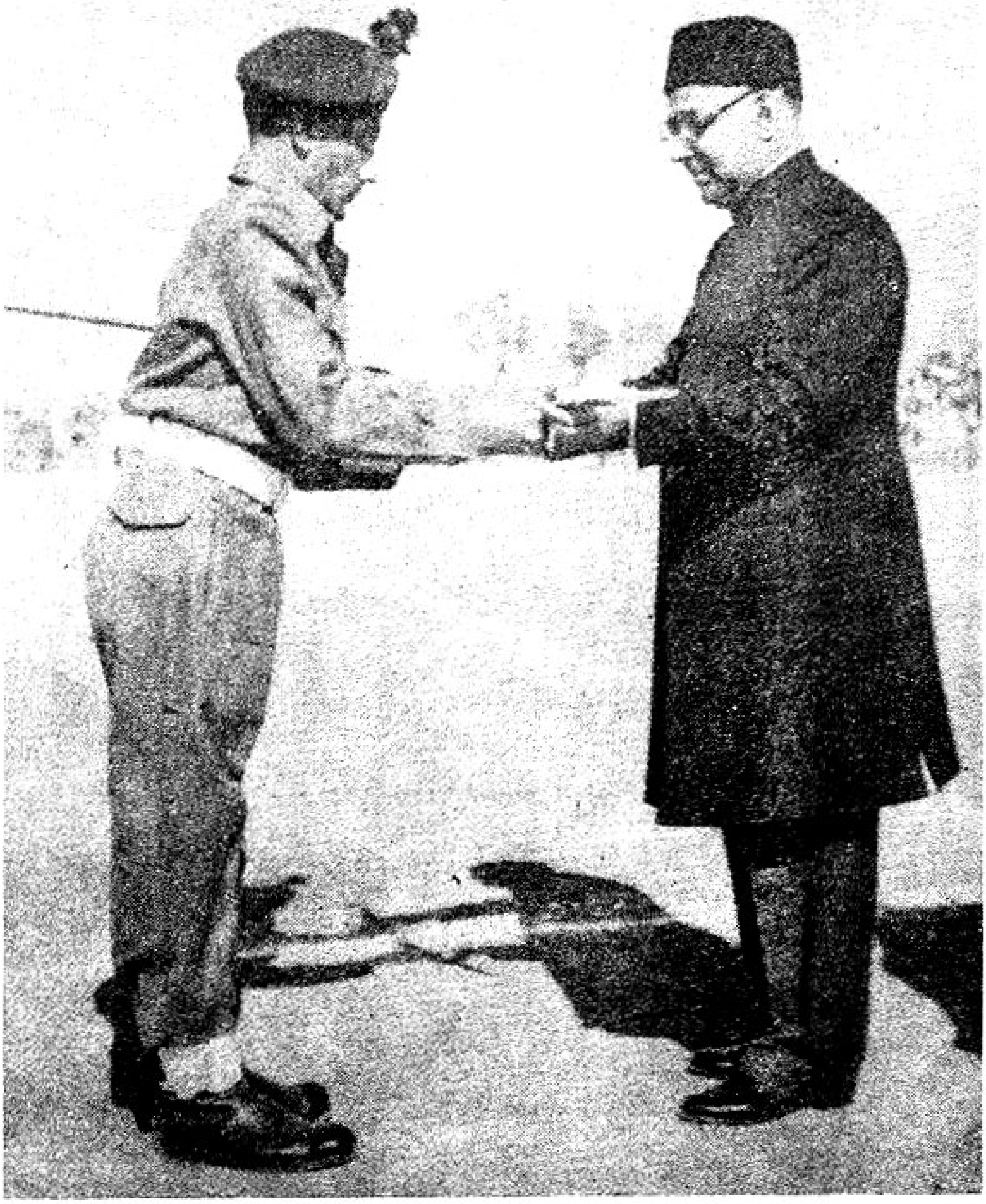

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اعزازی تلوار اور طلائی تمغہ

مسٹر لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان نے اکیڈیمی کے انعامات بھی تقسیم کئے اکیڈیمی کے دو سالہ کورس میں بہترین کیڈٹ اور تعلیمی اعتبار سے سب سے زیادہ قابل ہونے کے لحاظ سے جنٹلمین کیڈٹ راجہ عزیز بھٹی کو انہوں نے اپنے دست مبارک سے اعزازی تلوار اور طلائی تمغہ عنایت کیا۔ قائداعظمؒ کا جھنڈا عزیز بھٹی کی خالد کمپنی (چیمپئن کمپنی) نے حاصل کیا

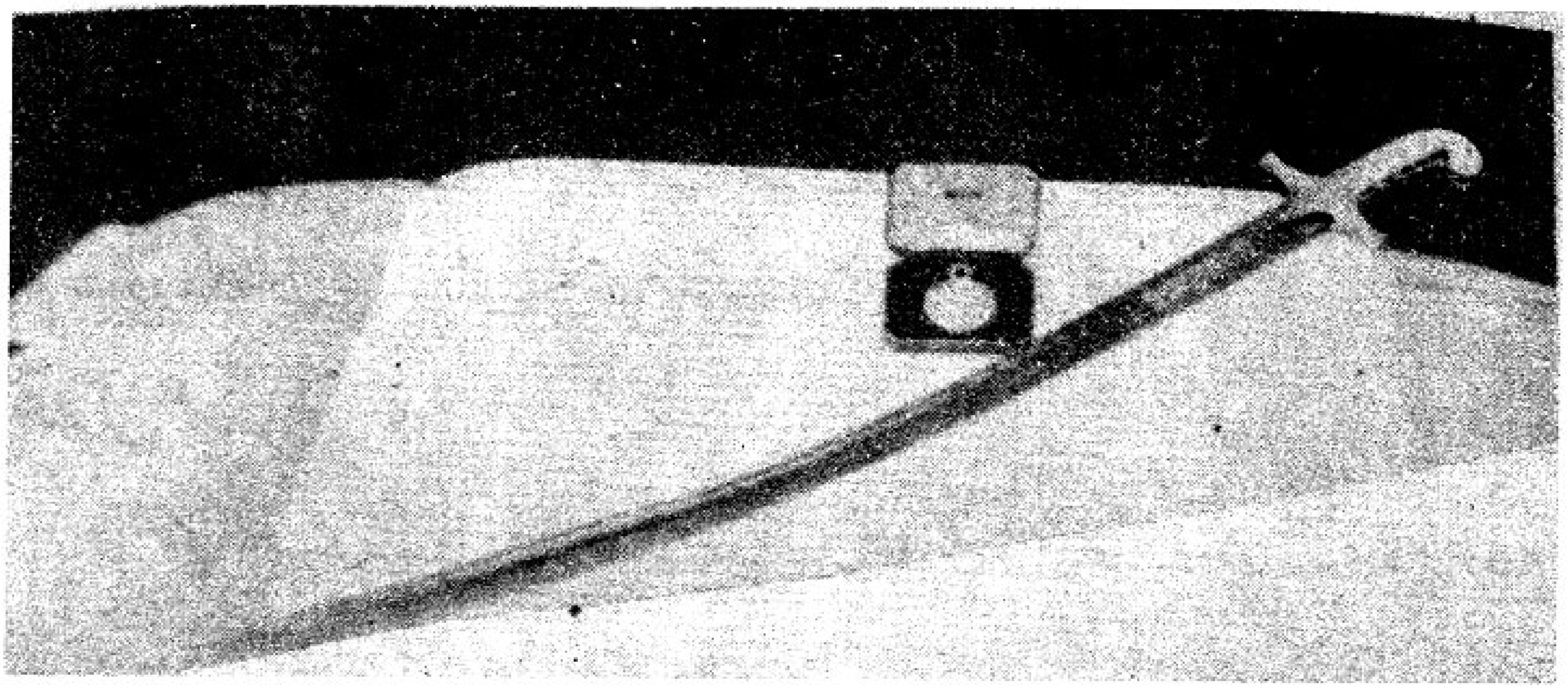

شمشیرِ اخرہ اور نارمن طلائی تمغہ

۔جھنڈا عطا کرنے کی رسم ادا کرتے ہوئے وزیر اعظم نے فرمایا: ''یہ جھنڈا اس اکیڈیمی کی عزت واحترام کا شان نشان ہے اور اسکے پیچ وخم ہیں اس اکیڈیمی کی روح محفوظ ہے۔ ہر جنٹلمین کیڈٹ جسے اس اکیڈیمی میں تربیت حاصل کرنے کا موقعہ ملا ہے' بذات خود اس کا ذمہ دار ہے کہ اپنے اعلیٰ ترین حسن سلوک اور کارگزاری کے ذریعے ملک اور اس اکیڈیمی کے ساتھ وفاداری قائم رکھے''۔

طارق کمپنی نے کھیلوں میں بہترین ہونے کی حیثیت سے کمانڈر انچیف کی ٹرافی حاصل کی۔ پریڈ کا آغاز بینڈ باجوں کے مظاہرے اور پاکستان قائد اعظم اون بٹالین کی مارچنگ سے ہوا ۔وزیر دفاع اور کمانڈر انچیف کی آمد سے تھوڑی دیر قبل پی ایم اے کے کمانڈنٹ بریگیڈیئر اینگل سلامی کے جبوترے پر آئے ۔مسٹر لیاقت علی خان نے کمانڈر انچیف جنرل سر ڈگلس گریسی اور بریگیڈیئر اینگل کے ہمراہ پریڈ کا معائنہ کیا۔

بینڈ باجے کے ڈھولچی پھرتی سے مارچ کرتے ہوئے اپنی فارمیشن سے آگے بڑھے اور سلامی کے چبوترے سے کچھ فاصلے پر اپنے ڈھول رکھ دیے۔ جہاں نیا رجمنٹل کلر اکیڈیمی کو پیش

کرنے سے قبل مقدس بنانے کی غرض سے رکھا گیا تھا......کلر......کی تقدیس کا فریضہ اکیڈیمی کے لیفٹیننٹ کرنل ایم ایم احمد نے ادا کیا اور اپنے خطبہ کے دوران وہ واقعہ یاد دلایا جب جنگ خیبر میں حضرت علیؓ کو رسولِ خدا نے اپنے دست مبارک سے جھنڈا عطا فرمایا تھا۔

مقدس عہد

اس خطبہ میں کیڈٹوں کی طرف سے یہ مقدس عہد بھی شامل تھا کہ وہ خدا کے احکام' اسلام کی عظمت' اپنی مملکت اور حکومت کی خدمت قانون وامن امان اور اچھی حکومت کے تحفظ کے لیے اپنی خدمات وقف کر دیں گے۔

ورڈ آف کمانڈ

کلر کی تقدیس کے بعد وزیراعظم نے اسے ملٹری اکیڈیمی کو دیا۔ بریگیڈیئر اینگل نے اسے قبول رکھتے ہوئے وزیراعظم کو یقین دلایا کہ پاکستان ملٹری اکیڈیمی اس کلر کا احترام کرے گی اور اپنی روایات برقرار رکھے گی۔ اسکے بعد قائداعظمؒ کا جھنڈا چیمپئن کمپنی (یعنی خالد کمپنی) کے سپرد کر دیا گیا جس نے اس جھنڈے کو بٹالین میں سے گزارا۔

بٹالین انڈر آفیسر اور بہترین کیڈٹ راجہ عزیز بھٹی پریڈ کے سیکنڈ ان کمانڈ تھے۔ اس موقعہ پر پی ایم اے پریڈ گراؤنڈ جس کے چاروں طرف برف پوش پہاڑ تھے' انتہائی شاندار منظر پیش کر رہا تھا۔

> کہتے ہیں: پاکستان میں آج تک جتنی شاندار پریڈس ہوئی ہیں یہ پریڈ ان میں سے ایک تھی۔ راجہ عزیز بھٹی کے ورڈ آف کمانڈ میں وہ ہیبت اور جلال تھا کہ مہمانوں کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی اٹینشن ہو جاتے تھے اور وہ اس نوجوان کی کارکردگی پر عش عش کر اٹھتے تھے۔

لیاقت اور عزیز ۔ بریگیڈیئر اینگل اور دوسرے افسران

بحیثیت افسر
عسکری زندگی

تربیتی کورس کے دوران

کوئٹہ......۱۹۵۰ء

لیفٹیننٹ کرنل رشید الدین خاں (آر۔ڈی۔خاں) ایڈمنسٹریٹو کمانڈنٹ لاہور کینٹ نے ایک ملاقات میں بتایا:

بھٹی سے میری ملاقات ۱۹۵۰ء میں کوئٹہ میں ہوئی۔ میں وہاں انفنٹری سکول میں انسٹرکٹر تھا' وہ تیرہ ہفتے کا ویپن کورس کرنے آئے تھے۔ مجھے شروع سے ہی بھٹی سے انس ہو گیا۔ وہ باقی شاگردوں سے بڑا ممتاز اور منفرد تھا۔ وہ سادگی پسند تھا۔ اس میں بناوٹ نام کو نہ تھی۔ وہ اپنے اظہار خیالات میں بڑا بے باک تھا۔ آہستہ آہستہ ایک استاد شاگرد کی بجائے ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے سچی بات تو یہ ہے کہ اگرچہ وہ فوج میں نو وارد اور عہدہ میں سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا۔ مگر اپنی عسکری صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ ایک میجر سے کم نہ تھا اور بلاشبہ کورس کے خاتمے تک میں عسکری معلومات میں اسے اپنے سے برتر تصور کرتا تھا۔

ہمارا یہ تعلق خاطر ہمیشہ قائم رہا۔ وہ میرا انتہائی بے تکلف دوست تھا۔ اس کی موجودگی میں مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ میں اس سے سینئر ہوں۔"

''میں سو نہیں رہا تھا!''

کوئٹہ......۱۹۵۱ء

کوئٹہ میں ایک دوسرے تربیتی کورس ''انٹیلی جنس'' میں انسٹرکٹر کرنل احسان لیکچر دے رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان آنکھیں بند کیے اونگھ رہا ہے۔ انہوں نے ہاتھ سے چاک کی ڈلی ادھر پھینکتے ہوئے کہا ''نوجوان! تم سو رہے ہو؟'' نوجوان نے آنکھیں کھول کر کہا: ''سر! سر میں سو نہیں رہا ہوں۔'' انسٹرکٹر نے پھر کہا کہ میں خود دیکھا ہے تم سو رہے تھے''۔ مگر نوجوان بضد تھا کہ وہ سو نہیں رہا تھا بلکہ لیکچر پوری توجہ سے سن رہا تھا۔ اس پر انسٹرکٹر نے کہا۔

''بھلا تم یہ بتا سکتے ہو کہ میں کیا پڑھا رہا تھا؟''

نوجوان نے کہا ''سر! ضرور بتا سکتا ہوں مگر یہاں کھڑے ہو کر نہیں۔ اجازت ہو تو وہاں سٹیج پر آ کر بتا سکتا ہوں۔'' انسٹرکٹر نے اُسے سٹیج پر بلایا' تو اس نے شروع سے لے کر آخر تک آج کا لیکچر اس طرح دہرایا کہ خود انسٹرکٹر کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

انٹیلی جنس کورس کا فائنل ہوا تو یہی نوجوان آفیسر کلاس میں بھی اول رہا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ نوجوان آفیسر عزیز بھٹی تھے جن کی موٹی موٹی نشلی آنکھیں ہمیشہ نیم وا رہتی تھیں اور اگر وہ کوئی بات توجہ سے سن رہے ہوں تو یوں احساس ہوتا کہ نیم خوابیدہ ہیں۔

کمانڈر کی شانِ قیادت

نوجوان عزیز بھٹی نے کمیشن کے بعد فوجی زندگی کا آغاز یکم اکتوبر ۱۹۵۰ء کو کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے کیا۔ اگرچہ پندرہ سال کے دوران وہ سٹاف آفیسر' انسٹرکٹر اور رجمنٹ کے سیکنڈ ان کمان کے فرائض بھی انجام دیتے رہے' لیکن ۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کو بی آر بی نہر پر ان کی تاریخ ساز عسکری زندگی کا ڈراپ سین کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے ہی ہوا۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ عزیز کی پہلی پوسٹنگ ۱۶/۴ پنجاب رجمنٹ۔ موجودہ ۱۷ پنجاب میں ''بی'' کمپنی کے کمانڈر کے طور پر ہوئی۔

کرنل محمد اکبر کمانڈنگ افسر تھے۔ عزیز کا کاکول سے ہی بڑا شہرہ تھا اور میجر جنرل اختر ملک نے اسے پنجاب رجمنٹ میں لانے کے خاصی تگ و دو کی تھی۔ کرنل محمد اکبر نے ان دنوں کا ایک واقعہ سناتے ہوئے کہا:

ان دنوں اٹک کے پل کے پاس دفاعی مشقیں ہو رہی تھیں۔ نمبر دس بریگیڈ کو سڑکیں بنانے کا کام ملا تھا۔ عزیز بھٹی کی کمپنی اس پتھریلی زمین میں مورچے کھودنے پر مامور تھی۔ میں ایک دن اس نئے آفیسر کا کام دیکھنے آگے چلا گیا۔

میں نے دیکھا کہ اس کی کمپنی بڑے انہماک سے اس سنگ لاخ زمین کو کاٹ کاٹ کر مورچے بنا رہی ہے۔ البتہ عزیز بھٹی مجھے وہاں نظر نہ آئے۔ ایک دو چکر لگانے کے بعد میں نے ایک نوجوان سے پوچھا: ''بھئی! آپ کے بھٹی صاحب کہاں ہیں؟''

''جناب! وہ دیکھیں، گینتی لیے مورچہ کھود رہے ہیں!''

میرے لیے یہ نظارہ بڑا ہی عجیب تھا۔ میں نے چند دن پیشتر جس خوبصورت اور خوش

کرنل محمد اکبر

لفٹیننٹ عزیز بھٹی

پوش آفیسر کو دیکھا اس نئے روپ میں میں اس کو پہچان ہی نہ سکا۔ سر کے بال صفاچٹ ہیں۔ سر سے پاؤں تک پسینہ بہہ رہا ہے۔ صرف بنیان اور نیکر میں ملبوس اپنے کام لگا ہوا ہے دوسرے نوجوانوں سے اگر کوئی چیز اسے ممتاز کرتی تھی تو وہ یہ کہ اس کا مورچہ ان سے زیادہ گہرا تھا۔ میرے لیے اسی دن یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ عزیز بھٹی بلا کا انسان ہے۔

عزیز بھٹی قیادت کا صحیح اصول سمجھ چکے تھے۔ وہ دوسروں سے کام لینے کے لیے انہیں تلقین اور وعظ کی بجائے اپنا نمونہ ان کے سامنے پیش کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ایک زندہ مثال ہزار وعظ سے زیادہ مؤثر ہے۔ ان کے جوان ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ وہ ان پر جان چھڑکتے تھے۔ عزیز بھٹی زندگی میں کبھی باس Boss نہیں بنے۔ انہوں نے دوسروں سے کبھی رعب یا تحکم سے کام نہیں لیا۔ وہ اپنے سپاہیوں کے بہترین رہنما' بہترین دوست' بہترین مشیر اور بہترین ہمدرد تھے۔

عزیز بڑے صاف گو تھے۔ ان میں احساس کمتری مطلق نہ تھا۔ ایک دن میں نے باتوں میں پوچھا: بھٹی! پی ایم اے میں تمہارا گزارہ کیسے ہوتا تھا؟۔ وہاں تو عموماً خاصے کھاتے پیتے

گھروں کے بچے ہوتے ہیں' جو گھروں سے بھی خرچ منگواتے رہتے ہیں۔ پھر تم تو شادی شدہ بھی ہو۔ گھر سے خرچ منگوانے کا سوال نہیں تھا۔ بھٹی نے بڑی بے تکلفی سے کہا: "مجھے تو پی ایم اے میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ نہ سگریٹ' نہ سینما' نہ فضول چیزیں کھانے کا شوق' خوراک' وردی اور علاج سرکاری' شادی شدہ ہونے کی وجہ سے الاؤنس پونے دو سو ملتا تھا۔ جس میں پچاس کے قریب بیگم اور اتنے ہی والد صاحب کو بھی بھیج دیتا تھا۔"

ٹسٹ

ان کی کمان کی صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کرنل محمد اکبر نے ایک اور واقعہ سنایا۔ ایبٹ آباد میں Efficiency Test ہو رہا تھا۔ جنرل حیاء الدین مرحوم' جی او سی ے ڈویژن تھے۔ رجمنٹ کی ڈی کمپنی کی کمان عزیز بھٹی کر رہے تھے جو ایکسپلائے ٹیشن پر مامور تھی۔ جونہی (فرضی) جنگ کے دوران جی او سی نے کہا کہ دشمن اب Jittery ہے' تو میں نے بھٹی کی کمپنی کو حکم دیا۔ بھٹی کی کمان میں کمپنی نے مثالی مستعدی کی مظاہرہ کیا اور دشمن کی سنبھلنے تک وہ اپنا کام کر چکے تھے۔

جنرل حیاء الدین مرحوم (جو حادثہ قاہرہ میں جاں بحق ہوئے تھے) عزیز بھٹی کی اس مستعدی سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے نوجوان کمانڈر کو بلا کر اس کے کام کی بہت تعریف کی اور ٹسٹ کے بارے میں لکھتے ہوئے اس کی اعلیٰ کارکردگی کو بہت سراہا۔

بحیثیت اڈجوٹنٹ

”۱۹۵۰۔۵۱ء میں ہمارے پاس کمشنڈ افسروں کی خاصی کمی تھی۔ یوں تو اچھے خاصے تجربہ کار کیپٹن کو رجمنٹ اڈجوٹنٹ مقرر کیا جاتا ہے‘ لیکن میں نے سیکنڈ لیفٹیننٹ عزیز بھٹی کی ذہانت دیکھ کر اسے رجمنٹ کا اڈجوٹنٹ مقرر کر دیا۔ ایک نووارد اور نو آموز افسر کو اس اہم عہدہ پر متعین کر کے مجھے قدرے تشویش تھی‘ مگر دس دن کے بعد میری یہ خلش مکمل طور پر دور ہو چکی تھی اور مجھے اپنے اس انتخاب پر خوشی محسوس ہوئی۔“

لیفٹیننٹ کرنل محمد اکبر نے بتایا ”میں نے اپنی تمام سروس میں اتنا کامیاب اڈجوٹنٹ نہیں دیکھا۔ اتنی کم سروس میں اتنے اہم عہدہ کو اتنی کامیابی سے نباہنا‘ ملٹری ہسٹری میں بلاشبہ ایک ریکارڈ ہے“

لیفٹیننٹ کرنل محمد نے مزید بتایا: جب وہ جہلم میں تھے تو عزیز بھٹی کور ہیڈ کوارٹر میں سٹاف افسر تھے۔ چنانچہ بطور سٹاف آفیسر بھی ان کا کام دیکھا ہے۔ وہ زندگی کے ہر پہلو میں منفرد اور ہر ڈیوٹی میں نہایت ہی کامیاب تھے۔ میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ سٹاف ڈیوٹی بہتر تھے یا کمان میں۔ بہرصورت بہت کم افسروں میں یہ ساری خوبیاں یکجا ہوتی ہیں۔

''مہا ماں جی''

''ماں صدقے! میرے راجہ کو اپنے خوب صورت
بالوں سے محروم ہونا پڑا''

دوستوں کے لیے..........

''اتنا تو کرنا ہی پڑتا ہے!''

جن دنوں عزیز کی کمپنی اٹک کے پل کے پاس جنگی مشقوں میں مصروف تھی، عزیز کی والدہ کو کسی طرح یہ اطلاع ملی کہ عزیز نے اپنے بال استرے سے صاف کروادیے ہیں تو انہوں نے اپنے بیٹے کو ایک خط لکھا تھا۔

ایک ملاقات میں محترمہ نے اس واقعہ کو تصور میں یاد کیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو موتی بن کر گرنے لگے۔ فرمانے لگیں:۔

''عزیز کے بال چمکیلے گھنگریالے تے اوراس کے ذرا بڑے سر پر بے حد خوبصورت لگتے تھے۔ مجھے جب ایک فوجی جوان نے یہ بتایا کہ عزیز نے وہاں ''ٹنڈ'' کرادی ہے تو میں ضبط نہ کرسکی اور بہت روئی میں سوچتی تھی نہ جانے وہاں کن حالات میں رہ رہے ہیں۔ ممکن ہے نہانے کے لیے پانی ہی نہ ملتا ہو یا بیچاروں کو نہانے کی فرصت نہ ملتی ہوگی۔ ہوسکتا ہے بالوں میں جوئیں پڑگئی ہوں اور مجبوراً کٹوانے پڑے ہوں۔ ماں صدقے! میرے راجہ کو اپنے خوبصورت بالوں سے محروم ہونا پڑا ہے۔ چنانچہ میں نے اسی وقت خط لکھا کہ راجہ تمہیں کون سی مصیبت پڑی ہے جو تمہیں اپنے چمکیلے بالوں سے ہاتھ دھونا پڑا ہے!۔

واپسی ڈاک عزیز کا جواب ملا مہاماں جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ یہاں پانی بھی بہت ملتا ہے اور نہاتے بھی بلاناغہ ہیں۔ بالوں کے متعلق

یوں ہوا کہ یہاں میرے ایک دوست راجہ لہراسپ ہیں' ان کے سر میں سکروی ہوگئی۔ اس کے علاج کے لیے ڈاکٹر نے یہ تجویز کیا پہلے تمام بال استرے سے صاف کروادیے جائیں۔ مگر راجہ لہراسپ "ٹنڈ" کروانے سے شرماتا تھا ۔اس کو بہتیرا سمجھایا کہ بال کٹوانے سے برے نہیں لگیں گے اور اگر ذرا برے لگیں بھی تو علاج کے لیے یہ ضروری ہے' مگر وہ مانتا ہی نہ تھا۔ آخر میں نے پہلے اپنے بال کٹوادیے اور اسے کہا کہ اب تنہا تمہارے برے نہیں لگیں گے ۔پھر تو اسے بھی بال کٹوانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ مہاماں جی! دوستوں کیلئے اتنا تو کرنا ہی پڑتا ہے کوئی بات نہیں' بال پھر برابر بڑھ رہے ہیں' ویسے ہی گھنگریالے ہیں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں انشاءاللہ جب گھر آؤں گا تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گی کہ ان کی چمک اور خوبصورتی میں سرمو فرق نہیں پڑا ہے"۔

ایک آزمائش

چوہدری محمد الیاس مینجر نیشنل بنک آف پاکستان کھاریاں چھاؤنی نے ایک ملاقات میں بتایا: جب دو سال قبل میں نے یہاں چارج لیا تو عام فوجی افسروں کے بارے میں ذہن میں ایک مخصوص تاثر تھا اور یہ تاثر قیام پاکستان سے پہلے کا ہمارے ذہنوں میں چلا آتا ہے۔

مگر چھاؤنی میں فوجی افسروں کے درمیان رہتے ہوئے مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ان میں انگریز کے عہد کی وہ روایات (جو میرے مخصوص تاثر کا پس منظر تھیں) بسرعت تمام معدوم ہو رہی ہے اور فوجی افسروں میں اسلامی شعائر کی پابندی کا احساس تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں اور اس کے بعد عام لوگوں کو فوجی افسروں کے قریب آنے موقعہ ملا۔ تو انہوں نے خود اس خوشگوار تبدیلی کو محسوس کیا۔ فوجی افسروں میں اس روحانی و ذہنی تبدیلی کو ستمبر کی جنگ میں اپنے فروغ اور ظہور کا موقعہ ملا۔

مگر جس زمانے میں عزیز بھٹی کو کمیشن ملا۔ وہ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بالکل قریب کا زمانہ تھا۔ انگریز نے ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران میں فوجی افسروں کو بالخصوص اپنے تہذیبی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی تھی اور ان کے دلوں سے ان کی روایتی قدروں کا احترام ختم کرنے کی سعی کی تھی۔

۵۲-1951ء تک یہ اثرات خاصے مستحکم تھے۔

یہ ذکر ہو چکا ہے کہ عزیز بھٹی کو اسلامی اقدار سے بڑی محبت تھی۔ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ان کے پیش نظر رہتی تھی۔ اور وہ خدا کے سوا کسی کو اپنا محتسب نہیں سمجھتے تھے

نوجوان افسر کی حیثیت سے انہیں جلد ہی ایک آزمائش سے گزرنا پڑا۔

میس میں ''آفیسرز پارٹی'' تھی۔ایک پرتکلف ضیافت ہورہی تھی۔ ہر افسر سے دعوت میں بطور میزبان حصہ لینے کے لیے رائے اور مشورہ لیا جاتا ہے' مگر عموماً بڑے افسر کی مرضی کے مطابق سبھی ''ہاں'' کہہ دیتے ہیں۔نوجوان لیفٹیننٹ عزیز بھٹی نے لکھ دیا کہ وہ پارٹی میں خوشی سے حصہ لیں گے لیکن شراب کے بل میں حصہ نہیں لیں گے۔اگرچہ وہ ایسا کہنے کے مجاز تھے اور فوج میں یہ کوئی پہلا واقعہ نہ تھا' بہرحال فوج کے ایک نوجوان لیفٹیننٹ کی یہ بہت بڑی جسارت تھی جو معاف نہ ہوسکی۔

زندگی کے کسی شعبے میں بھی ابھی ہم نے اختلاف رائے کا احترام کرنا نہیں سیکھا ہے۔ فوج اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اسے ذاتی وقار کا مسئلہ بنالیا گیا۔

چنانچہ عزیز بھٹی کو اس مسئلے میں خاصی پریشانی اٹھانا پڑی مگر ان کے پائے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہ آئی۔

اپنے چچازاد بھائی کیپٹن فضل کریم کے نام خط میں وہ اسی تلخ واقعہ کا ذکر کررہے ہیں۔

من آنم کہ من دانم

مجھے "ولی اللہ" نہ سمجھیں

۴ بٹالین، پنجاب رجمنٹ، کیمپ
۱۰/مئی ۱۹۵۲ء

مائی ڈیئر فضل کریم!

آج ہی آپ کا خط موصول ہوا اور ابھی میں اس اس کا جواب لکھ رہا ہوں۔

آپ یہ نہ سمجھیں کہ ڈار صاحب یہ نہیں جانتے کہ آپ کون ہیں؟ وہ آپ کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ حقیقت میں انہوں نے ہی مجھے اگلے دن لکھا تھا کہ آپ کو انہوں نے میس میں بیئر سے شوق فرماتے دیکھا ہے۔ یہ نہ خیال کریں کہ وہ میری طرف سے آپ کی جاسوسی کر رہے تھے۔ ان کی اس اطلاع کی وجہ یہ تھی کہ کسی زمانے میں میں نے ان سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ شراب کو کبھی ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ (بقول ان کے) وہ اب تک اس عہد پر قائم ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آپ کے معاملے میں بھی مجھے ویسی ہی کامیابی ہوگی۔

میں اس بات کو سخت ناپسند کرتا ہوں کہ مجھے لوگ ولی اللہ سمجھنے لگیں۔ من آنم کہ من دانم۔ میں جانتا ہوں کہ خود میں کیا ہوں! اس لحاظ سے مجھے آپ کو یا کسی اور کو کچھ بھی کہنے کا حق نہیں ہے۔ <u>پھر شراب کے مسئلہ پر میں پہلے ہی کافی پریشانی اٹھا چکا ہوں۔ میں اس مسئلہ کو از سر نو چھیڑنا نہیں چاہتا۔</u>

میں گذشتہ سارا مہینہ گھر نہیں گیا ہوں۔ امید ہے اگلے ہفتے جاؤں گا۔

میں نے آپ سے شیداں کے ایبٹ آباد جانے کی اطلاع کی تصدیق چاہی تھی۔ اچھا ہوا کہ پروگرام منسوخ ہو گیا تھا ورنہ مشکلات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ میں زرینہ کو عنقریب ایبٹ آباد لے جاؤں گا۔

اب خط کو ختم کرتا ہوں۔ انشاء اللہ مزید آپ کا جواب آنے پر۔

آپ کا پیارا بھائی......عزیز

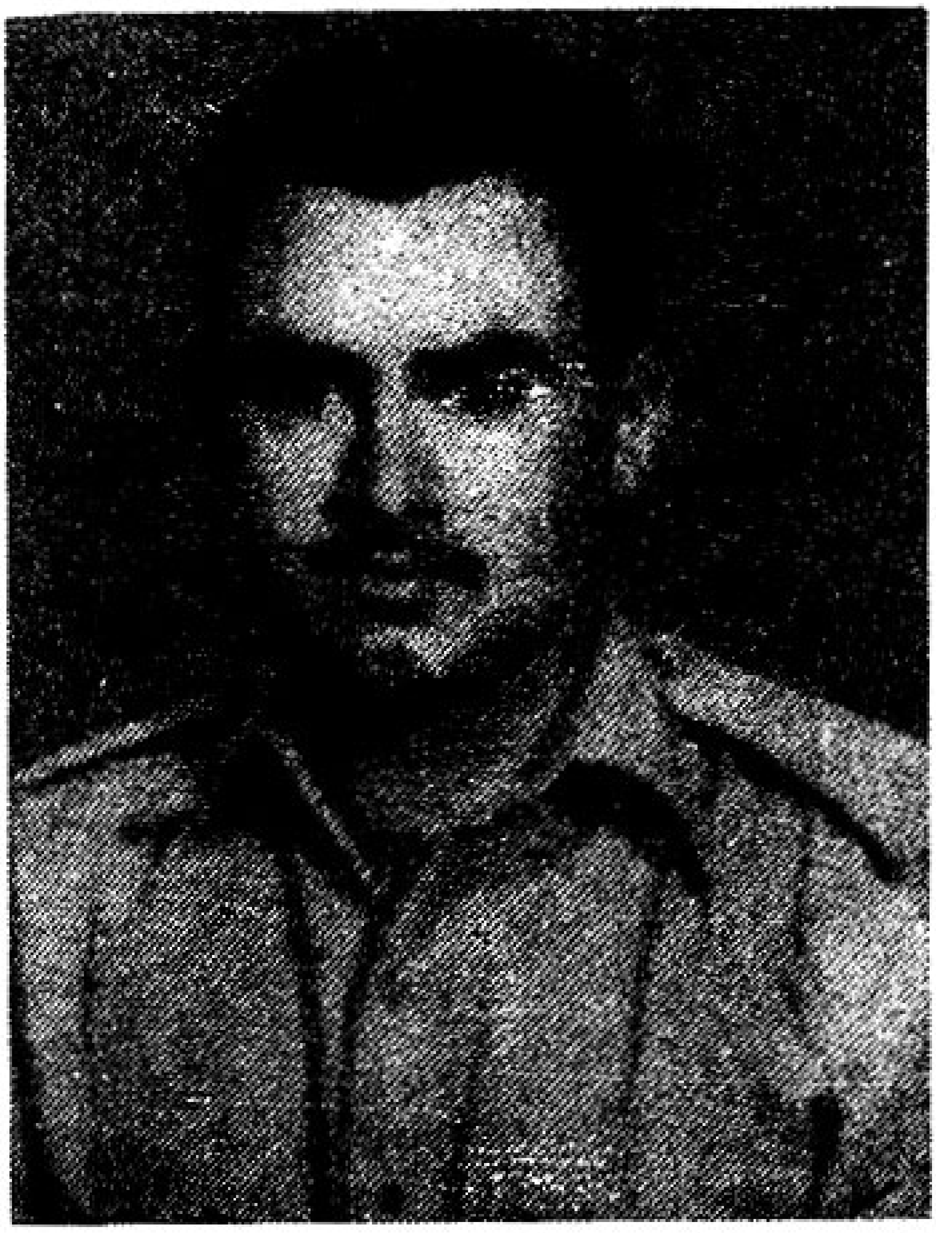

کیپٹن فضل کریم (جنہوں نے کمال وسعت قلبی سے یہ خط ہمیں اشاعت کے لیے دے دیا) نے بتایا کہ اس موضوع پر بھائی عزیز کا پہلا خط بڑا ہی فکر انگیز اور روح پرور تھا۔ مگر افسوس کہ وہ خط ضائع ہو چکا ہے۔

اس خط میں عزیز نے اس نازک موضوع پر لکھتے ہوئے نہ تو میری عزت نفس کو مجروح ہونے دیا نہ ناصحانہ انداز اختیار کیا۔ نہ مذہب کا واسطہ دیا' بلکہ بڑے ہی پیارے اور دلنشین انداز میں یہ بات میرے دل میں بٹھادی۔ مجھے انہوں نے ہماری خاندانی روایات بھی یاد دلائیں کہ ہمیں ہمیشہ اسلامی اقدار کی پابندی پر فخر حاصل رہا ہے۔

کیپٹن فضل کریم نے کہا: میں شہید کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس لغزش سے بچالیا۔ انکا یہ دوسرا خط آنے تک تو میں توبہ کر چکا تھا اور اس خط کے جواب میں انہیں اس کی اطلاع دے دی تھی۔

''حریت فکر''

ان کے چچیرے بھائی اور برادر نسبتی کیپٹن فضل کریم نے بتایا:

ایک دفعہ ہم دونوں بھائی بیٹھے تھے کہ باتوں باتوں میں کمیونزم اور کیپٹل ازم پر بحث چھڑ گئی۔ ہم دونوں اس بات پر تو متفق تھے کہ اسلام کا نظام حیات مکمل اور فطرت کے عین مطابق ہے اور ان دونوں سے مختلف ہے' البتہ ہمارا موضوع بحث یہ تھا کہ روسی اشتراکیت اور مغربی نظام سرمایہ داری میں کون سا نظام بہتر و برتر ہے؟

عزیز ارتکاز دولت کے سخت مخالف تھے اور غریبوں کے بڑے ہمدرد تھے' مگر مجھے سخت تعجب ہوا کہ بحث میں انہوں نے اشترکیت پر مغربی نظام سرمایہ داری کو ترجیح دی اور اپنے موقف کے حق میں خوب دلائل دیئے۔ عزیز کے دلائل میں اشتراکی نظام حیات کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ تھی (جسے ان کے دلائل کا محور کہنا چاہئے) کہ اس سے حریت فکر کی نفی ہوتی ہے۔ وہ کہتے تھے انسانی افکار پر پابندی یا ان کی جمعیت بندی فرد کی آزادی' اس کی نشو ونما' اس کی عزت نفس ......خودداری حتیٰ کہ اس کی روح کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ اس لیے نظام سرمایہ داری کو اپنی تمام تر برائیوں کے باوجود اشتراکیت پر ترجیح حاصل ہے۔

میں نے جب مغربی نظام سرمایہ داری کے تاریک اور گھناؤنے پہلوؤں پر روشنی ڈالی کہ چند ہاتھوں میں ارتکاز دولت کس طرح قوت و اختیارات کے ارتکاز کا پیش خیمہ بنتی ہے اور جن نام نہاد جمہوری روایات بلند افکار کی سرمایہ دارانہ نظام میں قولاً حمایت کی جاتی ہے' ان کی نہ صرف عملاً نفی ہوتی ہے بلکہ زندگی کی ان اعلیٰ قدروں کو ایک ایک کر کے قدموں تلے روند دیا جاتا ہے۔

میں ان کو مغربی سرمایہ دارانہ نظام کی استبدادیت اور استعماریت کی مثالیں دیں تو

مسکرا کر کہنے لگے: آپ کے دلائل بھی خاصے وزنی ہیں۔ لیکن اگر مباحثہ میں میں نظام سرمایہ داری کے خلاف بولتا تو اس سے بھی بڑھ کر اس کے پرخچے اڑاتا۔ اچھا پھر کبھی سہی!

پھر شہید دیر تک اس موضوع پر اپنے زریں خیالات کا اظہار کرتے رہے کہ اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں نظام ہائے حیات یکساں طور پر غیر فطری اور انسانیت کے لیے ایک جیسے ہی تباہ کن ہیں۔ بلاشبہ انسانیت کی فلاح اسلام اور صرف اسلام کا نظام حیات اپنانے میں ہے۔

پاکستان سے محبت

عزیز بھٹی کو جاننے والے جس شخص سے ملو وہ اور باتوں کے علاوہ ان کی بردباری اور تحمل کی ضرور تعریف کرے گا۔ان کے دوست آر۔ڈی خاں (ایڈمنسٹریٹو کمانڈنٹ لاہور کینٹ) نے ایک ملاقات میں بتایا: میں نے اپنی زندگی میں کسی انسان کو اتنا بردبار نہیں دیکھا۔ان کو تو جیسے غصہ اتا ہی نہیں تھا۔ان کے اعصاب بڑے مضبوط تھے۔وہ کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے تھے۔البتہ میں نے زندگی میں صرف ایک دفعہ انہیں ضرور شدید غصہ کی حالت میں دیکھا ہے۔وہ ایک ناقابل فراموش اور خوفناک نظارہ تھا۔اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ ایسے لوگوں کو اگر غصہ آجائے تو کتنے غضب ناک ہوجاتے ہیں۔

واقعہ بیان کرتے ہوئے کہنے لگے: سارے دوست میس میں بیٹھے تھے۔معمول کے مطابق بڑی بے تکلف باتیں ہورہی تھیں۔میسوں میں دنیا جہان کے موضوعات پر بحثیں ہوتی ہیں۔

باتوں باتوں میں ایک کیپٹن جو ایک مہاجر تھے اپنے ذاتی حالات کا شکوہ کرنے لگے باتیں وہ میرے ساتھ کررہے تھے' بھٹی اور دوسرے دوست پاس بیٹھے تھے۔

(بھٹی اس زمانہ میں لیفٹیننٹ تھے) کیپٹن کہنے لگے۔پاکستان میں آکر ہمیں کیا ملا ہے؟ میں وزیراعظم لیاقت علی خاں سے بھی مل چکا ہوں۔انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا مگر ابھی تک کہیں مکان تک نہیں مل سکا۔وہ جذبات میں ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔

میں انہیں دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ ایسے انفرادی واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔میری اپنی مثال آپ کے سامنے ہے۔مگر اس میں پاکستان کے خلاف گلہ کرنے میں تو ہم حق بجانب نہیں ہیں۔میرے دلائل کا ان پر کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔جذبات کی رو میں ان کی زبان سے

پاکستان کے خلاف ''گستاخی'' کا لفظ نکل گیا۔

عزیز بھٹی جو پاس خاموش بیٹھا ہماری بحث سن رہا تھا اپنی جگہ پر اچھل پڑا اور کڑک کر کہنے لگا۔ ''شٹ اپ۔ سٹاپ نان سنس''

میں نے دیکھا تو عزیز کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ کیپٹن کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کچا ہی چبا جانا چاہتا ہو۔

کیپٹن نے اپنے الفاظ واپس لیے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ سبھی دوستوں نے کیپٹن کے ریمارکس کو برا سمجھا تھا۔ مگر بھٹی کا ردعمل حیرت انگیز حد تک شدید تھا۔

ہم سب نے اسے پہلی بار آپے سے باہر ہوتے دیکھا تھا' ورنہ اس نے زندگی میں کسی دوست یا ساتھی آفیسر کو تو کیا اپنے کسی ادنیٰ ملازم کو بھی شٹ اپ نہیں کہا تھا' کبھی گالی نہیں دی تھی اور کسی کے ساتھ ''ٹمپرلوز'' نہیں کی تھی۔

> ہم جس سمندر کو ہمیشہ پرسکون دیکھنے کے عادی تھے اسے پہلی بار تلاطم میں دیکھا تو بلاشبہ وہ ایک خوفناک طوفان تھا۔ وطن کی محبت بھٹی کا جزو ایمان تھی' اس کے عقائد کا حصہ بن چکی تھی۔ اسنے کیپٹن کے الفاظ کو یوں محسوس کیا گویا اس نے مسجد کا مینار گرانے کی جسارت کی ہو۔
>
> وہ پاکستان پر حملے کا تصور بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات اس کے بس سے باہر تھی۔ وہ حملہ دشمن کی مسلح فوجوں سے ہو یا کسی دوست کے الفاظ سے۔

جذبہ حب الوطنی

وطن کی محبت کے سب سے گہرے اثرات انسان کی سرشت میں ملتے ہیں۔ بچے کے ابتدائی ماحول اور ماں باپ کی محبت ان جذبات کی پرورش کرتی ہے۔ مادر وطن کی محبت' ماں کی محبت کا ہی ''سمبل'' ہوتی ہے۔

عزیز بھٹی کے خاندان میں ماں باپ کی محبت اور احترام بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔عزیز بھٹی کو اپنے والدین بالخصوص والدہ سے بے حد جذباتی محبت تھی۔

ان کا ابتدائی ماحول اور بچپن ہانگ کانگ میں گزرا۔ انگلش سکولوں میں تعلیم پائی۔ وطن پرستی اور قوم پرستی انگریزوں کا جزو ایمان ہے۔شروع ہی سے بچوں کے قلب ونظر میں وطن کی محبت عقیدے کی طرح رچ بس جاتی ہے۔

جوانی میں جاپانی قوم کے عقائد سے واسطہ پڑا۔ جاپانیوں کی وطن پرستی اور قوم پرستی کا جذبہ بڑا شدید ہے۔

مگر پاکستان کے ساتھ شہید کی بے پناہ محبت کا ایک سبب ان اسباب سے بھی بلند تر تھا' گہری محبت کی اساس صرف جذبہ حب الوطنی نہ تھا' پاکستان ان کے نزدیک کچھ اور بھی تھا۔ وہ پاکستان کو دارالاسلام اور حصار دین وملت سمجھتے تھے۔ پاکستان' اسلام کے ساتھ ان کے جذب وعشق اور گہرے ملی احساسات کا ایک حسین وجمیل مظہر تھا۔

ایبٹ آباد میں____________

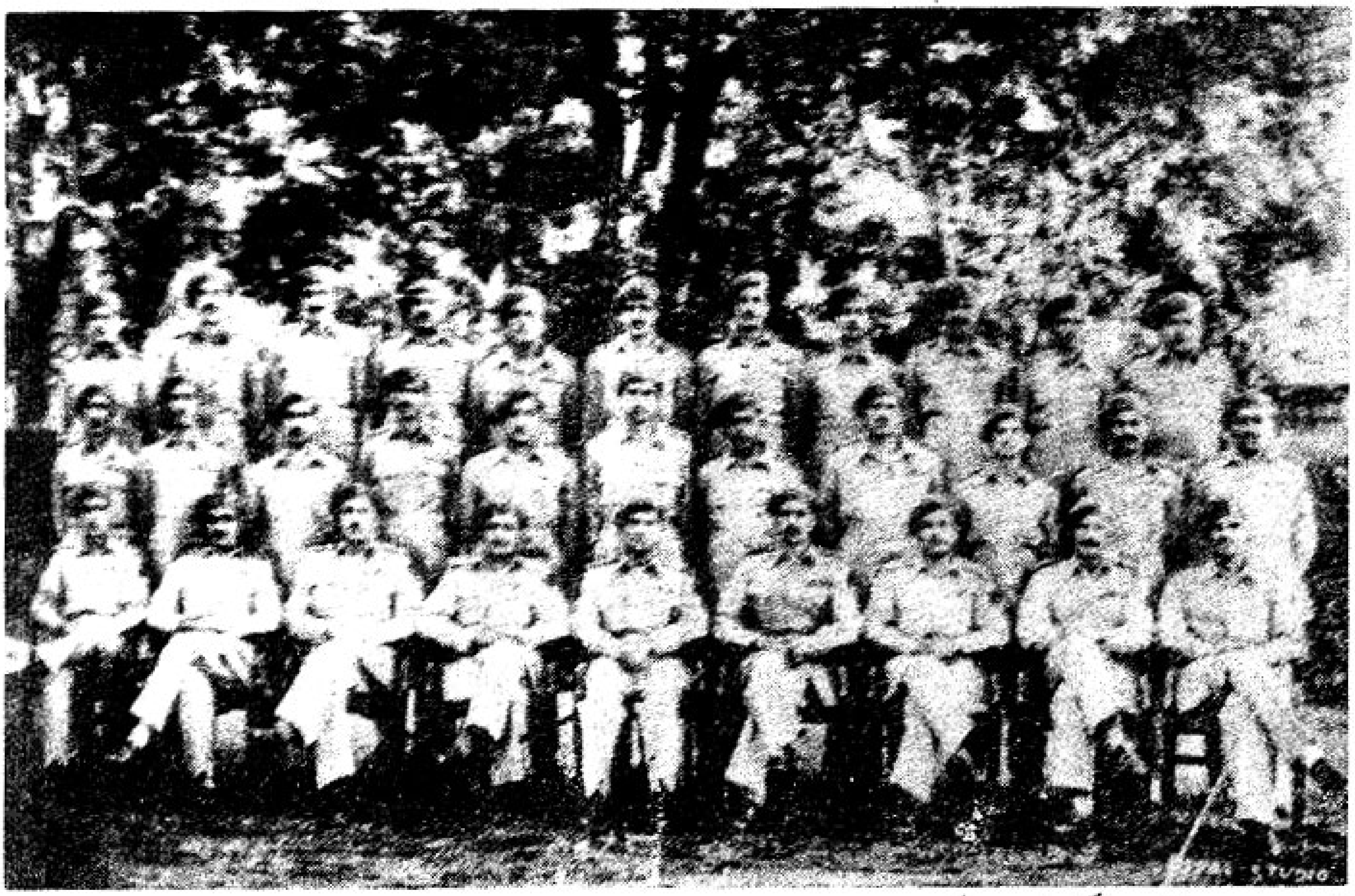

دائیں سے بائیں: کیپٹن محمد گلزار خاں، صوبیدار محمد یعقوب، میجر ایم عثمان، صوبیدار محمد حسین، لفٹنٹ کرنل ای آر آئی کارڈوز آنریری کیپٹن محمد قاسم، میجر غلام رسول، صوبیدار گل شیر، کیپٹن امیر زمان۔

(دوسری لائن) صوبیدار غلام حسین، صوبیدار محمد خاں۔ لیفٹننٹ ایس ایم زیدی، صوبیدار محمد اعظم، لیفٹننٹ جنجوعہ، جمعدار سرور، لفٹننٹ آر اے بھٹی، صوبیدار محمد اشرف، لفٹننٹ ایس اے بیگ، صوبیدار آزاد، صوبیدار میر زبان

(تیسری لائن) جمعدار دوست محمد، جمعدار عدالت خاں، جمعدار ولایت شاہ، جمعدار افسر، جمعدار شریف، لیفٹننٹ مصطفٰے ملک، جمعدار بشیر احمد، جمعدار حکم داد، جمعدار فضل الٰہی، جمعدار اے رحمٰن، جمعدار بی اے ای سی۔

(دائیں سے بائیں) کیپٹن محمد عارف میجر ایم این خاں، لیفٹننٹ کرنل ای۔آر۔آئی کارڈوزا، میجر ظفر اللہ خاں، کیپٹن ایف ایم صابر۔

(دوسری قطار) سیکنڈ لیفٹننٹ ایم بی احمد، لیفٹننٹ غلام مصطفےٰ ملک (کواٹر ماسٹر)، کیپٹن آراے بھٹی (اڈجوئنٹ) سیکنڈ لیفٹیننٹ ایم ایچ قریشی۔

''میرے محسن''

میجر ایس ایم زیدی

ہم کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل فضل الرحیم سے ملاقات کے لیے 17 پنجاب ہیڈکوارٹر گئے۔ بٹالین کے نئے سی او کاکول کے زمانہ سے عزیز بھٹی کے دوست تھے اور اکثر مسائل پر دونوں دوست بحث مباحثے بھی کرتے رہتے تھے مگر کرنل فضل الرحیم آج ایک اہم سرکاری ڈیوٹی کے سلسلہ میں کہیں چلے گئے تھے۔

اتفاق سے سیکنڈ ان کمانڈ میجر ایس ایم زیدی وہاں موجود تھے۔ وہ بٹالین میں جنگ کے بعد آئے تھے۔ جنگ کے زمانہ میں مشرقی پاکستان میں تھے۔ ان سے کہا ''آپ بھی میجر بھٹی شہید کے بارے میں اپنے تاثرات اور یادداشتوں سے نوازیئے''۔ ایک دن قبل کرنل فضل الرحیم سے ان کی موجودگی میں بات چیت ہو چکی تھی' اس لیے وہ اس سوال کے مضمرات کو خوب سمجھتے تھے۔ کہنے لگے: میجر بھٹی کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں لیکن افسوس! کہ ان کے متعلق عام لوگوں کی معلومات بہت کم ہیں۔

ہم کاکول اور پھر ایبٹ آباد میں اکٹھے رہے اور ان کے ساتھ ایسا تعلق خاطر پیدا ہوا کہ زندگی بھر اس میں اضافہ ہی ہوا۔ میجر بھٹی میں یہ ایک عجیب خوبی تھی کہ ان کے حلقہ احباب میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ عام طور پر ہر انسان اپنے دوست مخصوص طبقے سے چنتا ہے۔ مثلاً ادبی ذوق رکھنے والوں کے دوست ادیب اور شراب پینے والوں کے شرابی ہوتے ہیں۔ مگر میجر بھٹی کے دوست زندگی کے مختلف طبقوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کے دوستوں میں امیر' غریب' ادیب' جاہل' لائق اور نالائق سب شامل تھے۔ یعنی اس حلقہ میں جہاں کرنل فضل الرحیم جیسے فاضل لوگ شامل تھے وہاں مجھ جیسوں کو بھی رسائی حاصل تھی۔ میں گریجوایٹ ہوں لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں

نے اپنی زندگی میں بہت کچھ صرف بھٹی صاحب سے سیکھا ہے۔ حالانکہ وہ صرف میٹرک تھے۔ وہ ایک عبقری تھے اور دوسروں کے لیے ان کے بے پناہ جذبہ اخلاص نے انہیں ہر طبقہ میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔

آپ کو بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جو خود کو شہید کا دوست کہیں گے مگر وہ مبالغہ نہیں کر رہے ہوں گے۔ ان کے دوستوں کا دائرہ بے حد وسیع تھا اور ہر کوئی انہیں اپنا ہمدرد اور دوست کہتا تھا۔ وہ سادہ اور منکسر المزاج تھے اور نمود و نمائش سے کوسوں دور تھے۔

وہ دنیا کی سیر کر چکے تھے۔ ان کے پاس تجربات کا بے پناہ ذخیرہ تھا۔ لیکن اگر کوئی اجنبی یا ان سے ناواقف شخص ان کی موجودگی میں یہ شیخی بگھارنے لگتا کہ جب وہ کینیڈا گیا تو اس نے وہاں یہ کیا یا یہ دیکھا اور وہ صریح جھوٹ بول رہا تو بھی میجر بھٹی اس کو ٹوک کر شرمندہ نہیں کرتے تھے اور کسی بات کی تردید نہیں کرتے تھے۔ البتہ وہ شیخی بگھارنے کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اسے کردار کے کھوکھلے پن سے تعبیر کرتے تھے۔

"ہم محنت نہیں کرتے"

میجر زیدی نے کہا: میجر بھٹی ہر وقت دوسروں کی امداد کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ ان کے پاس سے کوئی حاجت مند مایوس نہیں لوٹتا تھا۔ وہ دوسروں کو ان کے مسائل میں ہر ممکن امداد دیتے تھے۔ اپنی مثال دیتے ہوئے کہا:

سچی بات یہ ہے کہ میری ساری کامیابی کا باعث میجر بھٹی کی ذات تھی، ورنہ مجھ جیسا ست انسان کبھی سٹاف کالج ایسے امتحانات پاس کرنے کا نہیں سوچ سکتا تھا۔ انہوں نے اپنے مخصوص طریقے سے مجھے اس پر آمادہ کیا۔ وہ کبھی ناصحانہ انداز اختیار نہیں کرتے تھے بلکہ بڑے دل نشین انداز اور مثالوں سے بات ذہن نشین کراتے تھے۔ فوج کے متعلق وہ کہا کرتے تھے ہم لوگ اتنی محنت نہیں کرتے جتنی ہمیں کرنا چاہئے۔ ایک دن کہنے لگے۔ ذرا باقی پیشوں کو دیکھیں۔ ایک وکیل ایک کیس کے لیے کتنی محنت کرتا ہے۔ اپنے حق میں کہاں کہاں سے دلائل جمع کرتا ہے۔ ایک صحافی کو دیکھیں اپنی سٹوری کی تحقیق اور تفصیلات کے لیے دیوانہ وار محنت کرتا ہے۔ اس کی راہ میں کتنی

رکاوٹیں آتی ہیں۔ اکثر اسے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر وہ اپنی دھن میں لگا رہتا ہے۔ اس کا ذوق جستجو کم نہیں ہوتا اور جب تک اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر لیتا' چین سے نہیں بیٹھتا۔

حتیٰ کہ ایک مزدور کو دیکھیں۔ جو دن بھر اینٹیں اٹھاتا رہتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اپنے کام کے مناسب ''معلومات'' حاصل کرتا ہے کہ سر پر زیادہ سے زیادہ کتنی اینٹیں اٹھا سکتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ وہ سر پر جتنی اینٹیں رکھتا ہے اس کے لیے اسنے پہلے سے سوچ سمجھ کر ایک اندازہ قائم کر رکھا ہے۔ اس سے اگر ایک اینٹ زیادہ رکھے تو وہ اٹھا نہ سکے اور کم رکھے تو کام بڑھ جائے۔ پھر آپ دیکھیں وہ کیوں کر دن بھر کام میں لگا رہتا ہے اور صرف آرام کے وقت تھوڑا بہت آرام کرتا ہے۔ تب جا کر اسے دو یا تین روپے دن کی مزدوری نصیب ہوتی ہے۔

اس کے برعکس ہم نے جو عظیم فرض اپنے ذمے لے رکھا ہے اس کی بہترین ادائیگی کے لیے کیا کرتے ہیں؟ بس روٹین ورک! اس سے زیادہ کچھ نہیں کرتے۔ نہ تو اپنی معلومات بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ کارکردگی۔ حالانکہ خوش قسمتی سے ایک مزدور کی نسبت ہمیں بہت زیادہ مزدوری ملتی ہے۔ یہ امر اور تکلیف دہ ہے کہ ہم وقت کے ضیاع کا احساس نہیں کرتے۔

قوت ارادی

میجر بھٹی کی قوت ارادی کے واقعات بتاتے ہوئے کہنے لگے: کاکول کی مشقوں میں ہمیں اکثر پچیس، تیس میل روزانہ پیدل جانا ہوتا تھا۔ سخت گرمیوں کے دن تھے، دو تین میل پیدل چلیں تو پیاس لگ جاتی تھی اور حلق خشک ہو جاتا تھا۔ جون، جولائی میں رمضان المبارک آ گیا۔ ہم جیسے لوگوں کے روزے رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مگر عزیز بھٹی واحد جوان تھے جنہوں نے ایک روزہ بھی قضا نہیں کیا تھا۔ وہ محض اپنی قوت ارادی کے سہارے پچیس، تیس میل پیدل چلے جاتے تھے اور بھوک و پیاس سے بے نیاز تھے۔ اس کے ساتھ وہ دن بھر زندہ دل رہتے تھے۔ یہ نہیں کہ اپنے زہد تقویٰ کا ڈھنڈورا پیٹتے پھریں یا ماتھے پر تیوری سے یہ اعلان رقم کر دیں۔ کہ "مجھے مت چھیڑیئے۔ میں روزے سے ہوں۔"

ایثار

قدرت نے ایثار کی خوبی ان کی سرشت میں ودیعت کر رکھی تھی۔ ایسی چھوٹی کتنی ہی باتیں ہیں جن پر ہم نے اس وقت زیادہ توجہ نہ دی۔ مثلاً مجھے ابھی یاد آ رہا ہے کہ ایبٹ آباد میں ایک مشق کے دوران ہمیں چار دن مسلسل پیدل چلنا پڑا۔ پانچویں دن پیدل چل رہے تھے، منزل ابھی پانچ میل دور تھی۔ جوان اور افسر سب تکان سے چور تھے۔ اتنے میں ڈاک رنر موٹر سائیکل پر ڈاک لے کر آ گیا۔ عزیز بھٹی اڈجوٹنٹ تھے اور میں کمپنی کمانڈر تھا، مگر انہوں نے اس موقعہ سے استفادہ مناسب نہ سمجھا۔ وہ مجھے کہنے لگے: زیدی تم موٹر سائیکل پر چلے جاؤ، میں ابھی پہنچ جاؤں گا۔ میں نے انکار کیا مگر وہ بضد رہے اور مجھے موٹر سائیکل پر بھیج دیا۔ اصل میں ان کی کوشش ہمیشہ یہ

ہوتی تھی کہ وہ دوسروں کی نسبت بڑھ چڑھ کر تکلیف اور مشکلات برداشت کریں۔اس میں اگر ان کو رعایت دی جاتی تو وہ قبول نہ کرتے تھے۔ وہ طبعًا یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے ساتھی مشکل میں ہوں اور وہ آرام کریں۔

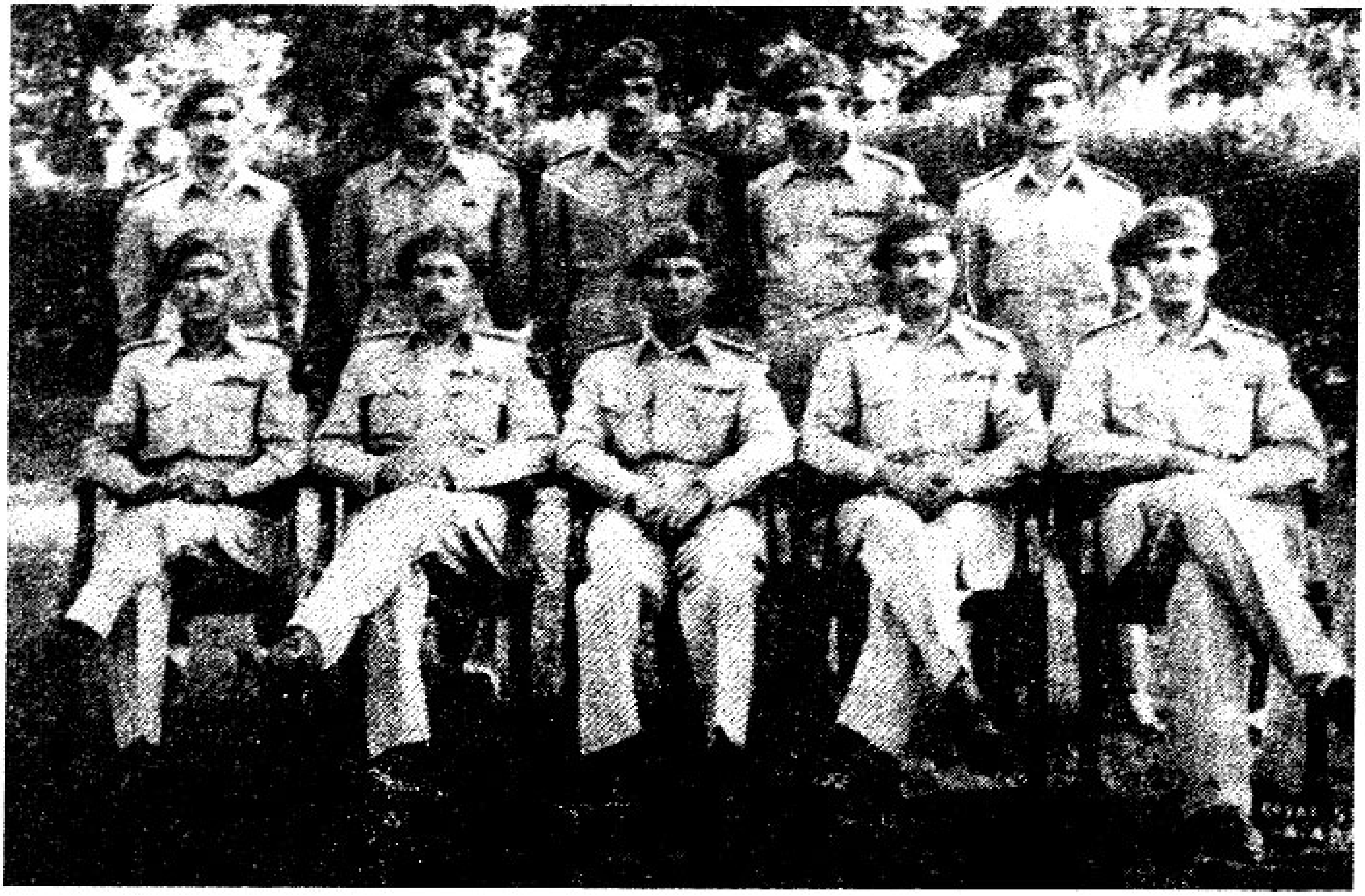

دائیں سے بائیں) کیپٹن محمد گلزار خاں، میجر ایم عثمان، لیفٹیننٹ کرنل ای آر آئی کارڈوز، میجر غلام رسول، کیپٹن میر زمان۔

(دوسری لائن) لیفٹیننٹ ایس ایم زیدی، لیفٹیننٹ جنجوعہ، لیفٹیننٹ مصطفٰے ملک، لیفٹیننٹ آر۔اے بھٹی۔لیفٹیننٹ ایس اے بیگ۔

''میری پہلی ملاقات''

.................شفقت بلوچ

عزیز بھٹی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔ میں ای۔ایم۔ای سے جان چھڑا کر ۱۶/۴ پنجاب میں آ گیا۔ان دنوں میں خاصا پریشان تھا۔ایک آفیسر کو پیٹنے کے الزام میں میرا کورٹ مارشل ہوا تھا اور سزا کے طور پر میری ایک سال کی سینیارٹی چھن چکی تھی۔

کیپٹن عزیز بھٹی ان دنوں بٹالین اڈجوٹنٹ تھے۔بٹالین میں میرے خیر مقدم کے طور پر انہوں نے مجھے ایک طویل خط لکھا جس میں انہوں نے میرے ساتھ خلوص اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔اس پریشانی کی حالت میں ان کی طرف سے ہمدردی اور محبت کے کلمات میرے لیے ناقابل فراموش یادگار بن گئے۔میں وہ خط گزشتہ بارہ سال سے حرز جان بنا رکھا تھا (افسوس! ستمبر کی جنگ کے بعد سارا سامان بے ترتیبی سے گھر بھیج دیا گیا اور اب تک تلاش کے باوجود وہ خط نہیں مل سکا)۔

جب میں عزیز بھٹی کی بٹالین میں آیا تو اس کے کمانڈر لیفٹیننٹ کرنل ای آر آئی کارڈوزا تھے۔انہوں نے مجھے بلا کر پوچھا ''تمہارا کورٹ مارشل کس الزام میں ہوا تھا؟'' میں نے بتایا کہ ایک آفیسر کو پیٹا تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل کارڈوزا میری صاف گوئی پر خوش ہوئے اور کہنے لگے: ''مجھے اختیار ہے کہ پونے دو سال بعد ہی تمہیں فل لیفٹیننٹ بنا دوں۔تمہاری سروس سوا دو سال ہے، ایک سال نکال کر سوا سال رہ جاتی ہے۔چھ ماہ بعد تمہیں ترقی دے کر فل لیفٹیننٹ بنا دیا جائے گا۔اس طرح تمہاری سزا از خود ختم ہو جائے گی۔مگر یاد رکھو! اب تمہیں اپنی عادات تبدیل کرنا ہوں گی''۔(یہ یاد رہے کہ پہلے قواعد کے تحت سنیارٹی چھن جانے کی سزا کا اثر ساری ملازمت تک قائم رہتا تھا، لیکن

اب ان قواعد میں یہ تبدیلی کردی گئی کہ اگلے رینک پر ترقی کے بعد یہ سزا از خود ختم ہو جاتی ہے۔ نئے قواعد کے نفاذ کے بعد میرا یہ کیس پہلا کیس تھا۔

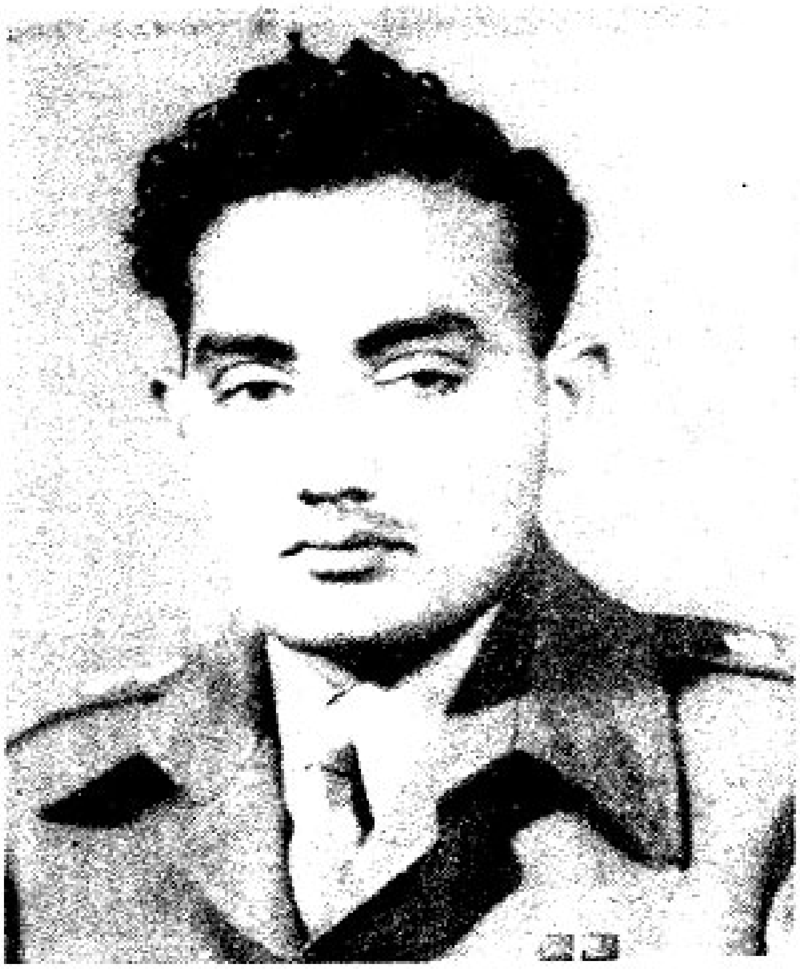

لیفٹیننٹ کرنل کارڈوزا اور کیپٹن عزیز بھٹی کے سلوک سے میں بے حد متاثر ہوا اور ان کے اس کردار اور ہمدردانہ رویہ نے مجھے یکسر بدل دیا۔

کیپٹن عزیز بھٹی سے جو تعلق ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوا۔ اس کی گہرائی اور استحکام میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ عزیز میرے بہترین دوست، بہترین مشیر اور راہنما تھے۔

میجر شفقت بلوچ مسکرا کر کہنے لگے ''وہ ہم سب کے ''ساہوکار'' بھی تھے۔ یعنی نہ صرف ہم اپنے سرکاری اور نجی مسائل میں ان کے قیمتی مشوروں سے استفادہ کرتے تھے، جس کسی کو روپیہ پیسہ کی اشد ضرورت پیش آئے وہ بھی سب سے پہلے میجر عزیز بھٹی کا رخ کرتا تھا اور ان سے جہاں تک بھی ممکن ہوسکتا تھا ہر دوست کی مدد کرتے تھے۔ دوستوں کی مدد کے لیے ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ حتیٰ کہ جب وہ کسی دوسرے سٹیشن پر ہوں تو بھی ہم اپنی مشکلات میں انہی کا سہارا لیتے۔

دو عظیم انسانوں کی ملاقات

میں نے بیگم بھٹی سے پوچھا۔ جب آپ کوئٹہ میں تھے اور بھٹی صاحب وہاں ٹیکٹکس ونگ میں انسٹرکٹر تھے۔ تو میجر طفیل محمد شہید (نشان حیدر) بھی وہاں ویپن ونگ میں اسٹرکٹر تھے۔ ان دونوں عظیم انسانوں کی آپس میں کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی؟

کہنے لگیں ضرور ہوتی ہوگی لیکن مجھے کوئی خاص واقعہ یاد نہیں۔ البتہ ایبٹ آباد کا ایک واقعہ یاد ہے:

''میجر طفیل محمد ایبٹ اباد میں تشریف لائے تھے۔ میجر نصر اللہ (موجودہ کرنل نصر اللہ) نے ان کی دعوت طعام کی تھی۔ مسز اور میجر نصر اللہ ہمارے ہمسائے اور مہربان تھے۔ اس دعوت میں صرف میجر طفیل محمد اور ہم مدعو تھے۔ میجر طفیل محمد تشریف لائے۔ وہ بڑے متین اور منکسر المزاج انسان تھے۔

ظفر اور سکول

کھانے کی میز پر ظفر جاوید کے سکول جانے بلکہ نہ جانے کا موضوع شروع ہوا۔ بر نہال سکول ایبٹ آباد میں داخل کروایا تھا' مگر وہ سکول جانے سے گریز کرتا تھا۔ بھٹی صاحب نے کہا: ہمارے لیے یہ مسئلہ بنا ہوا ہے۔ میجر طفیل محمد پوچھنے لگے' ظفر کی عمر کتنی ہے؟ بتایا' پانچ سال کا ہو رہا ہے۔ مسکرا کر کہنے لگے:

> ''عمر سکول جانے اور پڑھنے کے لیے پڑی ہے مگر یہ بچپن تو لوٹ کر نہیں آئے گا۔ ابھی اس کی مرضی پر چھوڑ دیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

واقعی جب وہ بڑا ہوا تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔

اس زمانے میں کیپٹن فضل کریم کے نام ایک خط میں بچوں کا ذکر کرتے ہوئے ظفر کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ایبٹ آباد — میرے پیارے فضل کریم

۱۹۔جولائی ۱۹۵۳ء — السلام علیکم۔خط کا شکریہ

مجھے یاد ہے آپ نے وعدہ کر رکھا ہے کہ جونہی آپ کو چھٹی ملی۔آپ ہمیں ملنے کے لیے آئیں گے۔امید ہے کہ آپ اپنا وعدہ ایفا کریں گے۔

ظفر سکول تو بلا ناغہ جاتا ہے مگر سکول اسے کبھی بہلا پھسلا کر اور کبھی ڈرا دھمکا کر ہی بھیجا جاتا ہے۔

اس کی ہیڈ مسٹرس شکایت کرتی ہیں کہ ساری جماعت میں وہ سب سے ضدی اور عدم تعاون کرنے والا طالب علم ہے۔

رفعت کوز کام ہو گیا ہے لیکن جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔زلفی پہلے سے زیادہ موٹا ہو رہا ہے۔آپ کی ترقی کے امتحان کا کیا بنا ہے؟ کیا آپ نے وہ امتحان دیا تھا؟ میں مشورہ دوں گا کہ جتنی جلدی ہو سکے یہ امتحان پاس کر لیں۔

جب میں چاند ماری کے کورس کے لیے گیا تھا تو ڈار صاحب کوئٹہ میں ملے تھے۔آپ انہیں اچھی طرح یاد ہیں۔

مجھے سردار کا خط ملا ہے جس میں لکھا ہے کہ وہ آپ کو ملنے کے لیے گئے تھے۔آپ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

زرینہ آپ کو سلام لکھوا رہی ہیں۔وہ کھانے پکانے، تین بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کے دوسرے کام کاج میں خاصی مصروف رہتی ہیں۔

فاطمی، حمید اور کمپنی کو میرا سلام دیں۔

آپ کا..................عزیز

''بہترین انسٹرکٹر''

..................میجر یوسف علی

جنوری ۱۹۵۴ء میں کیپٹن عزیز بھٹی سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس کوئٹہ میں انسٹرکٹر مقرر ہوئے۔کوئٹہ میں ان کی پہلی تقرری تھی۔

ان کے کاکول کے دوست یوسف علی بھی سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس کوئٹہ میں انسٹرکٹر تھے۔میجر یوسف علی، شہید کے متعلق مزید لکھتے ہیں:

اس ہونہار افسر کو سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس کے جونیئر لیڈرز ونگ میں بہترین انسٹرکٹر قرار دیا گیا۔وہ حربی تدبیروں اور فوجی مسائل کو خوب سمجھتے تھے۔پانچ سال سے بھی کم کمیشنڈ سروس کے بعد وہ تیاری کے بغیر ہر طرح کی جنگی کاروائی کا تفصیلی خاکہ پیش کر سکتے تھے۔

ایک دفعہ ہم میں سے کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ کو یہ عبور کیسے حاصل ہو جاتا ہے؟ انہوں نے بڑے انکسار سے جواب دیا۔''آپ کو معلوم ہوگا کہ صرف چار جنگی کاروائیاں ہیں جن کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے اور جب سے میں اکیڈیمی سے نکلا ہوں، دن میں صرف ایک گھنٹہ اس مطالعہ میں صرف کرتا ہوں تاکہ اپنے پیشے سے واقفیت رہے۔''

بھٹی خداداد ذہنی صلاحیتوں کے مالک تھے۔فوجی تاریخ پڑھنے کے وہ بے حد شائق تھے۔افسانہ، ناول بہت ہی کم پڑھتے تھے۔دوسری جنگ عظیم کے بارے میں چرچل کی یادداشت کی دوسری جلد سے وہ بہت ہی متاثر تھے۔اتحادی فوجوں کے جرنیلوں کے وہ بڑے مداح تھے۔اپنے ایک رفیق کار کیپٹن (اب میجر) جان گل کے ساتھ ان کی بڑی دلچسپ جھڑپیں ہوتی تھیں۔جان گل جرمن جرنیلوں کے معتقد تھے۔مختلف کورسوں کے درمیان جو وقفے ہوتے تھے ان میں ہم نئی جنگی

مشقیں تیار کرتے تھے یا ان پر نظر ثانی کرتے تھے۔ اس دوران بھٹی ہمیں بڑے کام کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ ہمارے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل (اب بریگیڈیئر) امیر عبداللہ خاں نیازی اور چیف انسٹرکٹر میجر (اب لیفٹیننٹ کرنل) حق نواز ان کے بارے میں اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ ایک ممتاز افسر ہیں ہم بھٹی کو اکثر یہ کہہ کر چھیڑا کرتے تھے کہ وہ سی او کے ''چہیتے'' ہیں اور ہمارا یہ اندازہ درست ہی نکلا۔

انکسار

وہ بہت ہی منکسر المزاج تھے۔ سٹاف کالج میں داخلہ کے امتحان کی تیاری کرتے ہوئے وہ ہم سے کہا کرتے تھے ''میری کامیابی کے لیے دعا کرو''۔ کیپٹن (اب میجر) حامد مختار نے ان کے ساتھ شرط لگائی کہ وہ (بھٹی) امتحان میں اول آئیں گے۔ لال کبابی والے کی دکان پر مرغا مرغا شرط ٹھہری۔ بھٹی کی یہ پسندیدہ دکان تھی۔ حامد مختار کو پورا یقین تھا کہ ان کا مرغا کھرا ہے۔ بھٹی اول

''دوست کسی انہماک سے عزیز کی بات سُن رہے ہیں!''

بھی آئے اور کینیڈا میں سٹاف کورس کے لیے بھی منتخب کر لیے گئے۔ بعد میں وہ جرمن انٹر پریٹر شپ کورس میں بھی اول آئے اور اس طرح وہ جرمن سٹاف کورس میں شریک ہونے کے اہل ہو گئے۔

بھٹی بہت اچھے دوست تھے۔ جو بھی ان کے قریب آتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ ہمیں ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا' ہم ان سے رہنمائی لیتے اور مشورہ طلب کرتے۔ ان کی گفتگو میں بڑی لذت تھی اور مزاج میں شگفتگی۔ ان کے پاس لطیفوں اور ہنسی کی باتوں کی کبھی کمی نہ ہوئی تھی۔ موسیقی سے بھی شغف تھا اور ہارمونیم خوب بجا لیتے تھے۔ ان کا پسندیدہ گانا وڈکٹرز تھا جس کی دھن کی ہم فرمائش کرتے تو وہ مست ہو کر بجاتے۔

پاک باز

وہ بہت پاک باز تھے۔ نماز کی سختی سے پابندی کرتے۔ وہ دوسروں کے کام کرنے میں سرور محسوس کرتے خواہ اس سے انہیں کتنی ہی تکلیف اٹھانا پڑتی۔ ایک دفعہ ہم نے محسوس کیا کہ انہوں نے چند ماہ سے ٹینس کھیلنا ترک کر رکھا ہے' حالانکہ وہ اس کے بہت شائق تھے۔ ہم نے وجہ پوچھی تو

کینیڈا جانے سے پہلے

عزیز　　　　سردار　　　　نذیر

وہ ٹال گئے۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ انہیں کسی حاجت مند کی مدد کے لیے پیسے بھیجنے ہوتے ہیں لہٰذا ان کے پاس ٹینس کے لیے پیسے نہیں رہے۔ وہ خود بڑے سادہ کپڑے پہنتے اور سادہ زندگی گزارتے۔ ہم کبھی کہتے کہ آپ سگریٹ نہیں پیتے تو جواب دیتے ''چھوٹا موٹا گناہ کیا کرنا ہے''۔

ان کی گھریلو زندگی بڑی سادہ تھی۔ ان کی اہلیہ بڑی نیک سیرت خاتون ہیں۔ وہ زیادہ تر اپنے بچوں کے مصروف رہتیں۔ وہ بھی حاجت مندوں کی ضرورتیں رفع کرنے میں سرور محسوس کرتی ہیں۔ اس گھرانے میں سرخی، پاؤڈر اور ریشمی کپڑے کا گزر نہ تھا۔ بیگم بھٹی کو کلب یا مجلسی تقریبوں میں شرکت کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔

راجہ عزیز بھٹی اپنے ہم عصروں میں ہر لحاظ سے ممتاز تھے............ دوست کی حیثیت سے، سپاہی کی حیثیت سے، لیڈر کی حیثیت سے۔ کوئی مشکل آتی وہ اس سے مردانہ وار نمٹتے۔ کسی آزمائش میں وہ پست حوصلہ نہیں ہوئے۔ وہ ہر آزمائش اور ہر امتحان میں اول آتے۔ اس عمدہ زندگی کا انجام یہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ شہادت کے بلند ترین مقام پر فائز ہوں اور وطن انہیں ''نشان حیدر'' کا اعلیٰ ترین اعزاز نذر کرے۔

کنگسٹن سٹاف کالج کینیڈا میں

سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس کوئٹہ میں قیام کے دوران وہ سٹاف کالج کے داخلہ کے امتحان میں شریک ہوئے۔ چونکہ وہ فطرتاً منکسر المزاج تھے' اس لیے دوستوں سے کہا کرتے: دعا کیجئے امتحان میں کامیاب ہو جاؤں"۔ دوستوں کو ان کی کامیابی میں شبہ ہی نہ تھا۔ چنانچہ کورس کے بعد کامیاب امیدواروں میں حسب توقع وہ سرفہرست تھے۔

بہت سے افسروں کے نزدیک کنگسٹن سٹاف کالج کورس کے لیے ان کا منتخب ہو جانا حیرت انگیز تھا۔ پاکستان تو کیا شاید ہی کسی ملک میں اتنی کم سروس کے ساتھ کسی افسر کو کنگسٹن سٹاف کورس کے لیے منتخب کیا گیا ہو۔ وہ کیپٹن تھے اور کورس میں جانے سے قبل ان کا رینک بڑھا کر انہیں میجر بنا دیا گیا تھا۔

خود اعتمادی

میجر ایس۔ ایم زیدی کہتے ہیں:

ان دنوں عزیز کے بعض بہی خواہوں نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ کورس کے لیے منتخب تو ہو گئے ہیں لیکن ابھی ان کو کورس پر جانا نہیں چاہیے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ملٹری میں ان کا تجربہ ابھی بہت کم ہے۔ پہلے کاکول میں دو اعزازات حاصل کرنے کے باعث شاندار ریکارڈ قائم ہو چکا ہے اور ساری فوج میں بڑی اچھی شہرت ہے۔ خدانخواستہ اس کورس میں ناکامی ہوئی تو پہلے ریکارڈ پر پانی پھر جائے گا۔ کنگسٹن ستاف کورس بڑا سخت اور مشکل کورس ہے۔ اور پھر عزیز کی بنیادی تعلیم صرف میٹرک تک تھی۔

عزیز بھٹی ان مشوروں پر مسکرا دیے۔ کہنے لگے: مجھے اپنے آپ پر اور اپنے خدا پر پورا بھروسہ ہے۔ اسے غلطی نہ سمجھیں۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ دنیا میں مشکل کیا ہوتا ہے؟۔ عزم ہونا

چاہیے۔ قدرت نے انسان کو بہت کچھ صلاحیتیں دے رکھی ہیں۔ یہ کورس اور یہ امتحانات کیا ہے؟
میجر زیدی کہتے ہیں ان کے ایک ایک لفظ سے بے پناہ خود اعتمادی ٹپکتی تھی۔

قومی خودداری

سٹاف کالج کورس کے لیے کینیڈا جانے والے تھے۔ بچوں کو بھی ساتھ لے جا رہے تھے۔ انہیں معلوم ہوا کہ بعض دوستوں نے بر سبیل تذکرہ اس امر پر اظہار تعجب کیا ہے کہ بیگم بھٹی انگریزی نہیں جانتی ہیں وہاں جا کر کیا کریں گی؟

دوستوں کو بلا کر کہنے لگے "ہمارے ہاں غیر ملکی لوگ بکثرت آتے رہتے ہیں اور سارے ملک کی سیاحت کرتے ہیں۔ ان میں کتنے ہیں جو اردو پنجابی سیکھ کر آتے ہیں؟ آخر ہمیں ہی یہ احساس کمتری کیوں ہے؟ ہماری قومی خودداری کا تقاضا ہے کہ ہم ایسے احساسات سے بلند تر ہوں۔ بیگم بھٹی کے ساتھ تو خیر میں ایک بہترین ترجمان ہوں، ویسے بھی انہیں دقت کہاں پیش آئے گی۔ شاپنگ کے لیے اگر چیزوں کے نام نہ آئیں گے تو ہاتھ کے اشاروں سے کام لے لیں گی۔ پھر وہاں رہنے سے کچھ نہ کچھ انگریزی سیکھ بھی جائیں گی"

(چنانچہ ایسے ہی ہوا بیگم بھٹی اب انگریزی میں روانی سے گفتگو کر لیتی ہیں۔ میجر بھٹی نے انہیں خود بھی انگریزی کے درس دیے اور کینیڈا کے ماحول نے بھی خاطر خواہ اثر ڈالا۔)

کالج میں

کینیڈا میں یہ کالج کنگسٹن میں واقع ہے جو جھیل انٹیریو Anterio Lake کے کنارے ایک خوبصورت جزیرہ ہے۔ یہاں سال میں دس مہینے برف پڑتی ہے۔ میجر عزیز جنوری ۱۹۵۶ء میں وہاں گئے تھے اور اسی سال نومبر میں کورس کرنے کے بعد واپس ہوئے تھے۔

میجر بھٹی سٹاف کالج میں بڑے ہر دلعزیز تھے اور ہمیشہ کی طرح وہاں بھی ہر امتحان میں نمایاں پوزیشن حاصل کرتے رہے۔ انہوں نے بریگیڈیر نیازی کے نام کوئٹہ ایک خط میں لکھا:

"میری انگریزی تحریر انگریزوں سے بھی زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ میری مشق کی کاپیوں پر

سرخ نشان بہت کم لگتے ہیں‘‘

وہاں ان کے بہت سے دوست بن گئے۔ان میں ایک میجر ہیلیئرڈ Hilliard بھی تھے جواب کرنل ہیں۔

کرنل ہیلیئرڈ

۲۰ نومبر ۱۹۶۵ء کو ہم ۵۴ نیپیئر ہوٹل لاہور میں بیٹھے تھے کہ کرنل ہیلیئرڈ تشریف لائے‘ محترمہ زرینہ اختر بھٹی نے تعارف کرایا کہ کینیڈا سے کرنل ہیلیئرڈ ہیں۔ یہاں Unipom ہیڈ کوارٹر میں چیف آف سٹاف کے عہدہ پر فائز ہیں۔میجر صاحب کی شہادت کی خبر سن کر اگلے دن بھی تشریف لائے تھے مگر شہید کے والد صاحب سے ملاقات نہ ہوسکی۔ میرا بھی تعارف کرایا۔ بڑے زندہ دل اور مستعد آفیسر تھے۔

ہم چائے پی رہے تھے کہ ماسٹر عبداللہ بھٹی بھی تشریف لے آئے۔میجر بھٹی شہید کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔کرنل ہیلیئرڈ نے عزیز شہید کی خوش اخلاقی اور بلند کرداری کی بہت

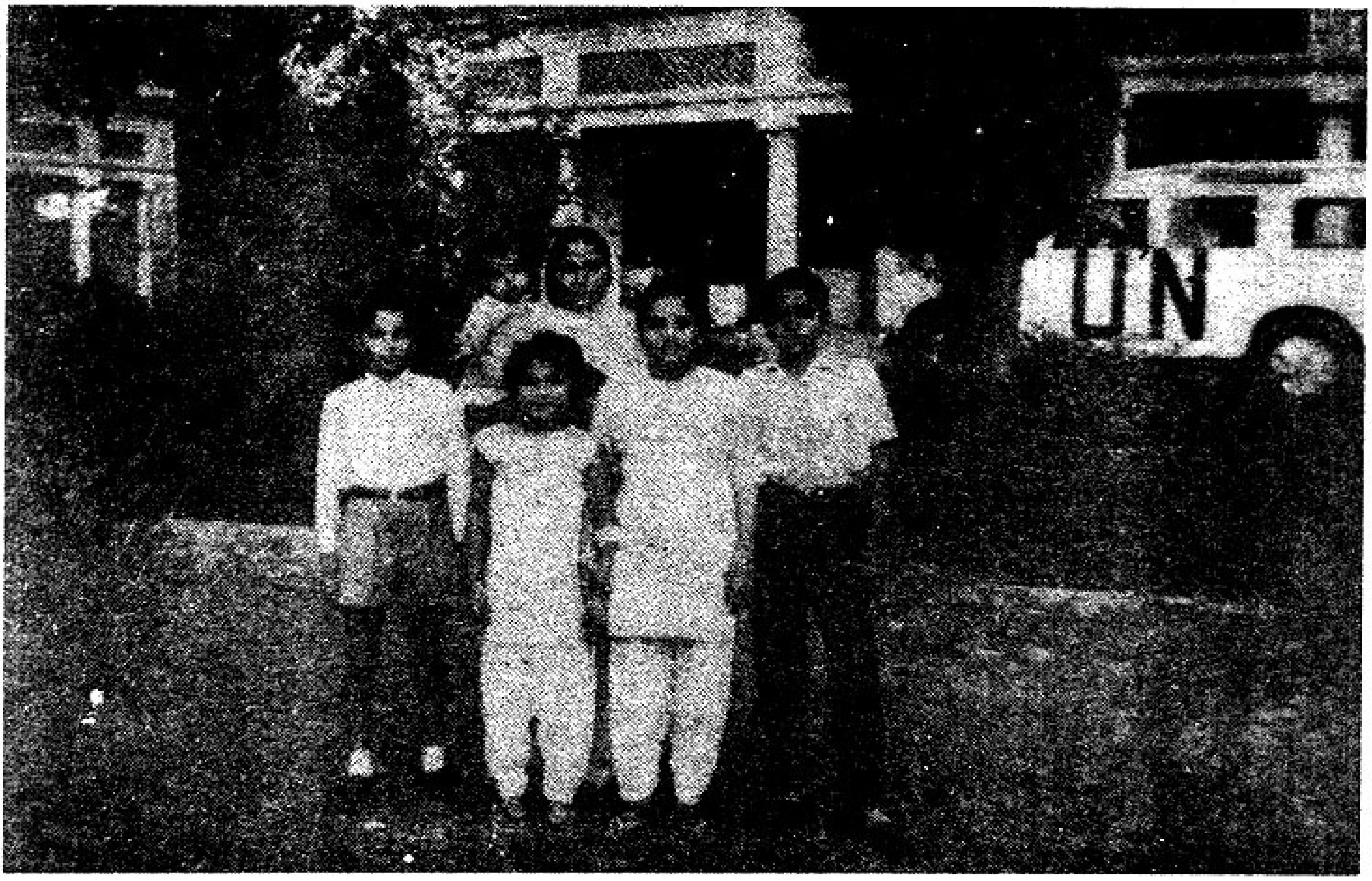

شہید کے بچوں کا وہ فوٹو جو کرنل ہلیرڈ نے لیا

تعریف کی۔ پھر انہوں نے کہا' ایک سپاہی کی اس سے بڑی معراج کیا ہوسکتی ہے کہ وہ وطن کی حفاظت کے لیے جان دے دے۔ انہوں نے بتایا کہ میجر عزیز کنگسٹن سٹاف کالج میں بڑے ہردلعزیز تھے۔ ہمارے ساتھ شہید کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ہمارا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا''۔ تھوڑی دیر بعد کرنل ہیلیئرڈ نے شہید کے بچوں کی تصویریں لیں۔ ایک منٹ بعد تصویر تیار ہوجاتی تھی۔ کہنے لگے یہ کیمرہ جنرل نمو کا ہے (جنرل نمو بعد میں راولپنڈی میں حرکت قلب بند ہونے سے راہیٔ ملک عدم ہوگئے تھے) اور ان سے عاریتاً لایا ہوں۔ میں ماسٹر جی سے باتیں کررہا تھا کہ انہوں نے ہماری تصویر تیار کرکے ایک منٹ بعد میز رکھ دی۔

بچوں کو مشرقی پاکستان نے ایک ہوائی جہاز تحفتہً ملا تھا۔ اس کی تصویر بنا کر بچوں کو دینا چاہتے تھے۔ مگر وہ ابھی اسمبل نہیں ہوا تھا' اس لیے پرسوں سوموار کو پھر آنے کا وعدہ کیا۔

ماسٹر جی کے ہاتھ میں گالف سٹک دیکھ کر پوچھنے لگے: آپ گالف بھی کھیلتے ہیں؟'' اس پر ماسٹر جی نے بتایا کہ یہ سٹک ان کو ہانگ کانگ میں ان کے ایک دوست نے تیس سال قبل بطور یادگاری دی تھی اور تب سے یہ ان کے پاس ہے۔

اتنے میں نئی ڈاک آئی اور ماسٹر جی اسے دیکھنے لگ گئے۔ ڈاک میں لادیاں (ضلع گجرات) سے ایک خط بھی تھا جس سے معلوم ہوا کہ بجلی گاؤں میں پہنچ گئی ہے اور وہ بستی جو عزیز کی شجاعت اور نور شجاعت سے منور ہوچکی ہے اب بجلی کے قمقوں سے بھی جگمگا اٹھے گی۔

کرنل ہیلیئرڈ سے میں نے میجر عزیز شہید کے متعلق مفصل انٹرویو لینا چاہا تو انہوں نے ذرا تامل کے بعد کہا: اقوام متحدہ کے پاک ہند مبصرین مشن Unipom میں چیف آف سٹاف کے طور پر میرے موجودہ فرائض بڑے نازک ہیں۔ البتہ ایک ہفتہ بعد میں اس کے متعلق آپ کو کچھ بتا سکوں گا۔

۲۷ نومبر ۱۹۶۵ء کو لاہور پہنچ کر میں نے ۷۰۳۵ پر فون کیا اور کرنل ہیلیئرڈ کا پوچھا۔ جواب ملا یہیں ہیں۔ کہا: ذرا ان کو ٹیلی فون پر بلایئے۔ فون پر آئے تو میں نے یاددہانی کرائی ''اپنا وعدہ کب ایفا کریں گے؟'' کہنے لگے ''ابھی تشریف لے آئیں۔ میرے پاس وقت ......

ہے۔"

میرے دوست چودھری محمد اشرف میرے ہمراہ تھے۔ ہم دونوں Unipom ہیڈکوارٹر پہنچ گئے۔ کرنل صاحب سامنے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ وہاں مختلف رنگ ونسل کے مبصرین ادھرادھر پھر رہے تھے۔ کرنل ہیلیئرڈ نے ہمیں اپنے کمرے میں بٹھایا تو انہیں دوسرے کمرے سے بلاوا آ گیا۔ چند منٹ کے لیے اٹھ کر چلے گئے۔ واپس آکر معذرت کی اور میجر بھٹی کے متعلق باتیں ہونے لگیں۔ وہ کینیڈا کے مخصوص انگریزی لہجہ میں بات کرتے تھے۔ بعض دفعہ ان کے تلفظ کو سمجھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ 'پی' کو 'فی' کر کے بولتے تھے۔ کہنے لگے۔ اگرچہ کالج میں میں میجر بھٹی سے سینئر کلاس میں تھا لیکن اس سے تعارف کے بعد مجھے ان کی خوش اخلاقی اور بلند کرداری نے بڑا متاثر کیا۔ وہ اپنی کلاس میں بڑے ممتاز اور ہردلعزیز تھے۔ وہاں ان کے بڑے مداح اور دوست ہیں۔ ہر امتحان میں اول رہتے تھے۔ ان کی صاف اور شستہ انگلش پر انگریز بھی حیران ہوتے تھے۔ ان کا لہجہ بالکل انگریزوں جیسا تھا۔

عزیز بھٹی، ہلیرڈ کے ساتھ باہر ایک آؤٹنگ میں کھانا کھا رہے ہیں

عزیز بھٹی کینیڈا میں ایک دوست کے ہمراہ

کرنل ہیلیئرڈ کہنے لگے: بھٹی بڑے وسیع المشرب تھے اوران میں تنگ نظری نام کو نہ تھی .... البتہ ہمارے لیے ان میں یہ امتزاج عجیب سا تھا کہ اپنی وسیع المشربی اور وسیع النظری کے باوجود اپنے عقائد پر وہ سختی سے کاربند تھے۔ ان کی عبادت کے لیے باقاعدگی اور شراب سے مکمل پرہیز مثالی تھا۔ ضیافتوں اور پارٹیوں میں ان کے لیے ہمیشہ الگ اہتمام کرنا پڑتا تھا۔

کرنل ہیلیئرڈ نے کہا۔ ہمارے آپس میں گھریلو تعلقات تھے۔ ان کی بیوی اور میری بیوی آپس میں گہری دوست ہیں۔ ان کے کینیڈا سے آنے کے بعد بھی ہماری خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ بھٹی کی شہادت پر میری بیوی کو بڑا صدمہ ہوا تھا۔ اس نے مسز بھٹی کو تعزیت کا خط لکھا۔ اس نے مجھے لکھا تھا کہ میجر بھٹی کے سارے بچوں کے فوٹو لے کر بھیجوں۔ چنانچہ اس دن جو فوٹو میں نے لیے تھے ان کی ایک ایک کاپی اسے بھی ارسال کی تھی۔

کرنل ہیلیئرڈ سے میجر بھٹی کے ہمراہ فوٹو کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے کہ مسز بھٹی کے ہاں ایسے کئی فوٹو آپ کو مل جائیں گے ورنہ مجھے بتائیں میں اپنی مسز کو لکھ دوں گا وہ وہاں سے بھیج دیں گی

کینیڈا کے ایک پارک میں بچوں کے ساتھ

"ننھے! دودھ پی لو ورنہ مَیں پی جاؤں گا!"

ہمیں کرنل ہیلیرڈ کی بطور چیف آف سٹاف پاک وہند مصرین بے پناہ مصروفیتوں کا احساس تھا۔ چنانچہ ان سے اجازت لی اور واپس ہوئے۔

شراب سے اجتناب

محترمہ زرینہ اختر بھٹی نے کینیڈا کے قیام کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے بتایا:
کینیڈا کے قیام کے دوران ضیافتوں میں شرکت پر ہمارے میزبانوں کو ہمیشہ خصوصی انتظامات کرنے پڑتے تھے۔ ہمارے لیے شراب کی بجائے کوکا کولا اور دوسرے مشروبات کا اہتمام

ہوتا تھا۔ سینڈوچز ہمارے لیے چکن کے بنائے جاتے تھے۔ پارٹی میں کئی دوست مذاقاً کہتے تھے کہ ''آ گئے ہیں کوکا کولا پینے والے''! لیکن ہمارے اس اجتناب کو وہ برا نہیں سمجھتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کنگسٹن سٹاف کالج کے ایک ڈی ایس کرنل انسٹرکٹر واپس امریکہ جا رہے تھے۔ ان کے اعزاز میں پارٹی تھی۔ حسب معمول ہمارے شراب اور مشکوک گوشت سے پرہیز پر بحث چل نکلی۔ امریکی کرنل نے میجر صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''آپ لوگ تو شراب سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔ پاکستان کے ایک کرنل امریکہ گئے تھے وہ تو یہ بھی نہیں پوچھتے تھے کہ سینڈوچز میں گوشت کس جانور کا ہے؟''

پھر میجر صاحب کی طرف سے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی کہنے لگے:

''مسٹر بھٹی! سچ پوچھیے تو ہمیں آپ کے اس رویہ پر خوشی ہوتی ہے۔ آپ جس بات کو اعتقاد کا جزو سمجھتے ہیں اس پر سختی سے کاربند تو ہیں''

میجر صاحب بعد میں مجھے کہنے لگے: ''زرینہ! ہمارے لوگ بیچارے احساس کمتری کے مارے اکثر صرف ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے شراب بلکہ حرام گوشت سے بھی پرہیز نہیں کرتے' لیکن آپ سن رہی تھیں خود امریکی آفیسر کا ایسے لوگوں کے متعلق کیا خیال تھا؟''

مالکہ مکان کی شکایت

جس فلیٹ میں ہم رہتے تھے وہ دوسری منزل میں تھا۔ ایک دن ہماری مالکہ مکان مسز ویب Webb تشریف لائیں اور کہنے لگیں کہ آپ کے ساتھ کے فلیٹ والوں نے آپ کی شکایت کی ہے۔ میں بڑی حیران ہوئی کہ ہمارے کس طرز عمل کے خلاف انہیں شکایت کا موقع ملا ہے۔ مالکہ نے کہا: وہ کہتے ہیں کہ چند دنوں سے ان لوگوں نے (ہم نے) آدھی رات سے ''کھڑکار'' کرنا شروع کر دیا ہے۔ رات کو ہماری نیند خراب کرتے ہیں۔ نہ جانے کیا کرتے ہیں۔ پھر یہ پیاز

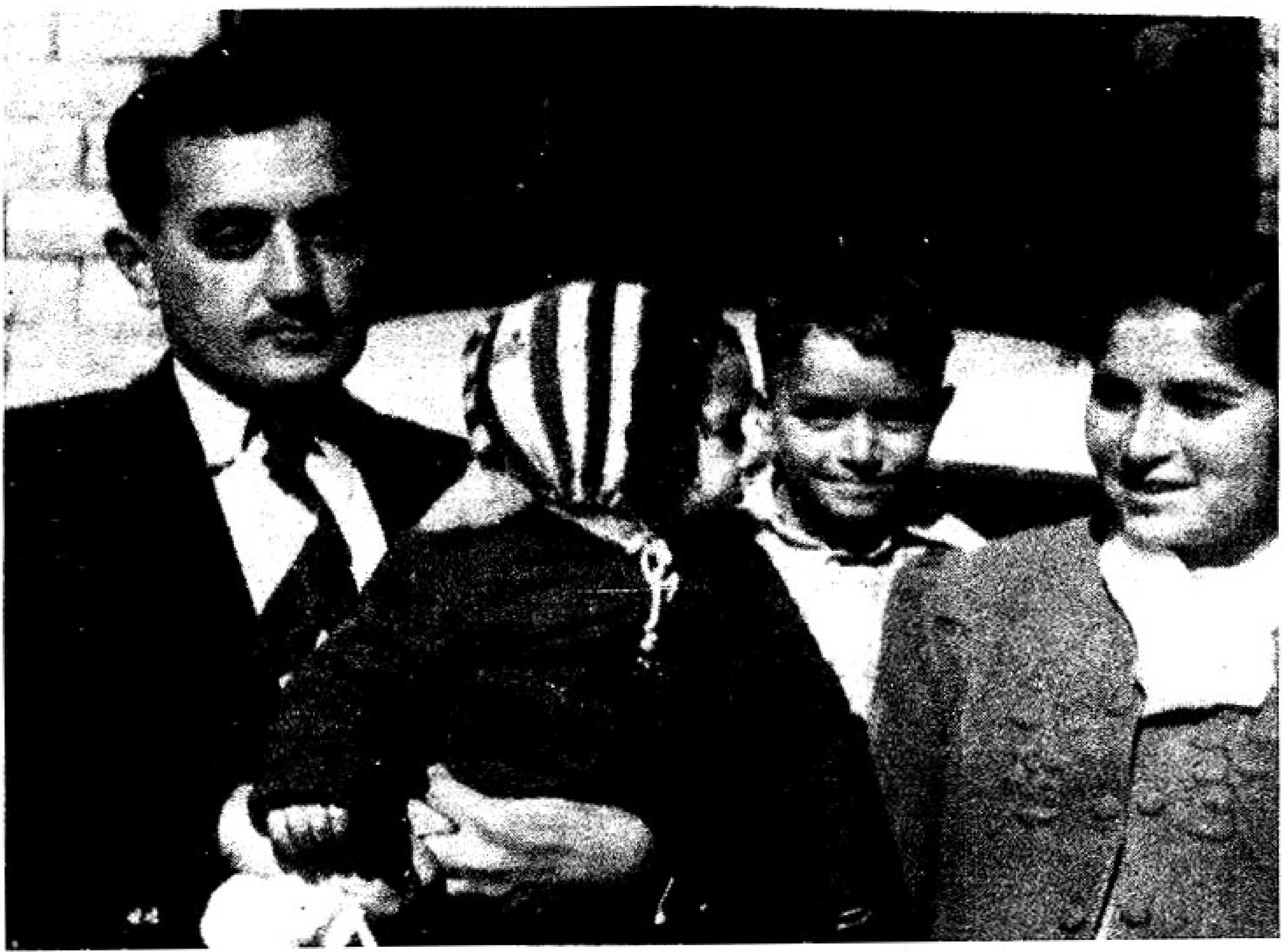

بہت بھونتے ہیں، اس کی بو آتی ہے۔"

میں نے اپنی مالکہ کو سمجھایا کہ یہ مسلمانوں کا متبرک مہینہ رمضان المبارک ہے، اس میں ہم لوگ روزے رکھتے ہیں اور دن چڑھنے سے بہت پہلے ہمیں کھانا کھانا پڑتا ہے۔ ہمارے پڑوسی پریشان نہ ہوں، صرف چند دن مزید ان کی نیند میں خلل پڑے گا۔ جہاں تک پیاز بھوننے کا تعلق ہے، میرے شوہر انڈوں کا آملیٹ کھاتے ہیں اس لیے پیاز بھوننا پڑتا ہے۔ مالکہ مکان مطمئن ہو کر چلی گئی اور اس نے ہمارے پڑوسیوں کو سمجھا دیا...... کہ صرف چند یوم اور آپ کو بیزاری ہو گی آپ پریشان نہ ہوں۔

جوس پی لیں

میں ان دنوں ذرا تکلیف سے تھی۔ ہماری چھوٹی بچی زینت تھوڑے دنوں بعد اس دنیا میں آنے والی تھی۔ میجر صاحب مجھے ساتھ لے کر ایک بزرگ ڈاکٹر میکلاڈ کے پاس گئے تو انہوں نے تشخیص کے بعد ایک نسخہ لکھ کر دیا اور دن کے لیے خوراک تجویز کی۔ میں نے دن کے وقت کھانے

سے معذوری ظاہر کی کہ میں روزے سے ہوتی ہوں۔ڈاکٹر صاحب کہنے لگے ”ہاں ہاں میں سمجھ گیا! آپ لوگ فاسٹ کرتا ہے۔اچھا! تم دن کو صرف جوس پی لیا کرو۔جب ہم نے انہیں بتایا کہ ہم مسلمان اپنے روزے میں جوس بھی نہیں پی سکتے تو ڈاکٹر صاحب بہت ہنسے۔ان کے لیے یہ بات بالکل عجوبہ تھی!“

ننھا ظفر

برف سے کھیل رہا ہے

”کار“

کینیڈا میں جاتے ہی ایک کار خرید لی۔کار کی ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے یوں تو خاصی دقت ہوتی تھی،سٹاف کالج میں ان کے ایک دوست مسٹر جیک (برطانیہ سے) تھے انہوں نے بھٹی صاحب کو ڈرائیونگ سکھائی۔

اپنی کار پاس ہونے کے باعث وہاں وقت بڑا بچ جاتا تھا۔خوب سیر وسیاحت کی۔جیک اور مسز جیک سے بھی ہمارے خاصے تعلقات تھے۔وہ میاں بیوی بڑے اچھے لوگ تھے۔ہم کینیڈ جاتے ہوئے رفعت اور ذوالفقار کو لادیاں چھوڑ گئے تھے۔رفعت اپنی نانی کے پاس اور ذولفی دادی اماں کے پاس رہے۔

ظفر اور رفیق ساتھ تھے۔زینت وہیں پیدا ہوئی۔ہسپتال میں قیام کے دوران دونوں بچے مسز

جیک، نے اپنے پاس رکھے اور دونوں ان کے پاس بے حد خوش رہے۔ مسز جیک نے انہیں اپنی ماں سے دور ہونے کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ وہ بڑی اچھی خاتون تھیں۔

شاندار کامیابی

کنگسٹن کورس کے دوران میجر جنرل حیاء الدین (جو حادثہ قاہرہ میں ہلاک ہوئے تھے) نیویارک سے کینیڈا آئے۔ انہوں نے میجر بھٹی کے سٹاف کالج کے نتائج دیکھے تو بہت خوش ہوئے اور انہیں مبارک دی۔

میجر عزیز بھٹی نے کینیڈا میں سٹاف کالج کورس بڑی امتیازی شان سے مکمل کیا۔ واپس آئے تو اس شاندار کامیابی پر بری افواج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے خصوصی ہدیہ تبریک بھیجا۔

وہ صرف صاحب سیف ہی نہیں
صاحب قلم بھی تھے

EDITOR

☆

Maj R.A. BHATTI

PUNJ AB

کینیڈا سے واپس آ کر چند ماہ کے لیے سیالکوٹ چھاؤنی میں ڈی۔ کیو رہے۔

پھر جولائی ۱۹۵۷ء میں جی ایس او (۲) اوپریشنز کی حیثیت سے ان کا تبادلہ فرسٹ کور میں ہو گیا۔

۱۹۵۸ء میں کور کے جہلم کے قیام کے دوران ان کو شدید حادثہ پیش آیا۔ جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

۱۹۵۹ء میں فرسٹ کور کی طرف سے اپنے ایک ترجمان رسالہ موسومہ ''تھنڈر بولٹ'' (برق خاطف) کے اجراء کا مسئلہ درپیش تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس کی ادارت کے گراں بار فرائض کون سرانجام دے۔

رہ رہ کر نظریں میجر عزیز بھٹی کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ میجر بھٹی دسمبر ۱۹۵۸ء کے شدید حادثہ کے بعد مارچ ۱۹۵۹ء تک ہسپتال میں رہے۔ حادثہ میں ان کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور دیاں بازو مفلوج ہو گیا تھا۔

ہسپتال سے صحت یاب ہو کر بھی وہ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۹ء تک رخصت پر رہے۔ (یہ تاریخ ان کی زندگی میں بڑی اہم ہے۔ تاریخ شہادت بھی ۱۲ ستمبر ہے) مگر قرعہ فال اس دیوانے کے نام پڑا اور فرائض انہیں کے سپرد کیے گئے۔ انہوں نے اس فریضہ کو جس حسن وخوبی سے نبھایا اس سے انکی بلند پایہ صحافیانہ صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔

انہوں نے کم سے کم وقت میگزین کا پہلا شمارہ نومبر ۱۹۵۹ء میں شائع کر دیا۔ بلند پایہ مقالات' مضامین کے تنوع' تصاویر' کارٹون غرض صوری اور معنوی ہر لحاظ سے وہ ایک معیاری جریدہ تھا۔

اس میں ان کا لکھا ہوا اداریہ چین پر ایک معلوماتی فیچر' ان کے تخیل اور آرٹ کا نمونہ ان کا ایک کارٹون شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر مضامین کے انتخاب سے اس عظیم سپہ سالار کی عظیم ادبی اور صحافتی صلاحیتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

اداریہ

ہم اپنے قارئین کرام کی خدمت میں ''تھنڈر بولٹ'' ''برق خاطف'' کا پہلا شمارہ مسرت اور فخر کے ملے جلے جذبات سے پیش کر رہے ہیں۔اس جریدہ کی اشاعت کا مقصد وحید یہ ہے کہ ایک ہمارے افسر صاحبان اپنا مافی الضمیر دوسروں پر واضح کر سکیں اور دوسرے ہم اپنے دلوں میں کور نمبر ا کا صحیح جذبہ اور ولولہ پیدا کر سکیں۔ ہمارے لیے یہ امر حد درجہ حوصلہ افزا ہے کہ ہمیں اہل قلم حضرات کی طرف سے بہت سے مضامین موصول ہوئے ہیں۔افسوس کہ یہ سب مضامین گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے شائع نہیں کیے جسکے۔لیکم ہمیں اپنے معاونین سے اس امر کی توقع ہے کہ وہ اس مجبوری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہمارے ساتھ اپنا تعاون بدستور جاری رکھیں گے۔

پچھلا سال کور نمبر ا کے لیے بڑا پر آشوب سال رہا ہے۔ مارشل لاء کے نفاذ کی وجہ سے تقریباً ساری کی ساری کور کو سویلین حکومت کا ہاتھ بٹانے میں مصروف ہو جانا پڑا۔اس صورت حال کے نتیجہ کے طور پر لیفٹیننٹ جنرل محمد اعظم خاں ہلال قائد اعظمؒ کو بھی اپنی کمانڈ سے سبکدوش ہو کر وزیر بحالیات کا عہدہ سنبھالنا پڑا۔ہم ان کی نئی ذمہ داریوں میں کامیابی کی دعا کرتے ہیں۔

اب ہمیں لیفٹیننٹ جنرل بختیار رانا (ستارہ قائد اعظمؒ۔ ملٹری کراس کی سربراہی کا فکر حاصل ہے جو کور کمانڈر کی زبردست ذمہ داریوں کے علاوہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا عہدہ بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ہمیں ان کی ذات گرامی پر پورا پورا بھروسہ ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے باحسن وجوہ برآ ہوں گے۔

اس موسم گرما کے آغاز میں ہمیں ایک بار پھر سیلابوں کی افت سے نبرد آزما ہونا پڑا اور ہمیں سیلاب زدہ علاقوں میں سول حکام کے ساتھ سیلاب زدگان کی امداد و اعانت کے سلسلہ میں خدمات انجام دینا پڑیں۔اس ضمن میں کور نمبر ا نے جو شاندار خدمات انجام دیں ان کا اندازہ

ہمارے محترم کمانڈر انچیف کے حسب ذیل مکتوب سے کیا جا سکتا ہے...... جو انہوں نے ہماری خدمات کے اعتراف میں ہمارے کور کمانڈر کو ارسال فرمایا:۔

''گزشتہ دو مہینوں میں مغربی پاکستان کے بے وقت اور زبردست سیلاب کا سامنا کرنا پڑا۔اس ناگہانی مصیبت میں فوج نے نقصان زدہ پلوں، پشتوں کے شگافوں نہروں اور سڑکوں کی مرمت کے سلسلہ میں سیلاب زدگان کی ہر ممکن امداد کے بارے میں نہایت شاندار کردار ادا کیا ہے۔ہمیں اس کارگزاری پر جو ہم نے ملک اور قوم کی بہبود کے لیے کی ہے، بجا طور پر فخر اور ناز ہے۔سول حکام اس ضمن میں فوجی افسروں اور جوانوں کی خدمات کے حد درجہ مداح ہیں۔فوجیوں نے نامساعد موسمی حالات کا جس بے جگری سے مقابلہ کر کے سیلاب زدہ علاقوں میں خدمات انجام دیں، اس سے عوام کے دلوں میں انکی قدر اور زیادہ ہوگئی ہے اور وہ فوجی مجاہدوں کے احساس فرض، تنظیم اور حب الوطنی کے جذبہ کے اور زیادہ قائل ہو گئے ہیں۔آپ میری طرف سے اپنے تمام افسروں اور جوانوں کی اس شاندار کارکردگی پر مبارک باد دیجیئے مجھے یقین ہے کہ ان کو بھی اپنی۔کامیاب خدمات پر پورا پورا فخر ہے''

چین

(میجر راجہ عزیز بھٹی (شہید)......پنجاب)

یہ شہید وطن میجر راجہ عزیز بھٹی مرحوم کی ایک انگریزی نشری تقریر کا ترجمہ ہے جو آپ نے ریڈیو پاکستان کے ایک سلسلہ تقاریر (باشندے اور ممالک) میں نشر کی تھی۔

اس شام کی صحبت میں آپ کو میں چینیوں کے متعلق کچھ بتانا چاہتا ہوں اور میں آپ کو چینیوں کے متعلق جو کچھ بتاؤں گا اسے آپ محض سطحی معالعہ تصور نہ کیجیے گا' کیونکہ میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ چینیوں کے ساتھ بسر کیا ہے۔

آپ سب چین کا محل وقوع جانتے ہیں اور شاید آپ کو یہ بھی علم ہے کہ چین ایشیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ چین کے مختلف علاقوں کی آب وہوا بھی مختلف ہے۔ اگر شمال مغربی چین میں گرما میں شدت کی گرمی پڑتی اور سرما میں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے تو جنوب مشرقی چین کی آب وہوا گرم مرطوب واقع ہوئی ہے۔ عمومی طور پر چین بڑا زرخیز ملک ہے اور اس کی بہت بڑی آبادی ہے۔ جو انڈوچائنا' ملایا اور انڈونیشیا کے ساحلی علاقوں تو پھیلتی چلی گئی ہے۔ گو ہمارے ملک کی طرح چین کی بھی زرعی معیشت ہے لیکن ماضی قریب میں چین نے صنعت وحرفت کے میدان میں بھی خاصی ترقی کی ہے۔

نسلی اعتبار سے چین میں قریب قریب ایک ہی نسل کے لوگ ہیں جن کا تعلق منگول نسل سے ہیں۔ ان کے خدوخال بھی مخصوص قسم کے ہوتے ہیں۔ جبڑے کی اوپر والی ہڈی واضح طور پر نمایاں ہوتی ہے۔ ناک چپٹی ہوتی ہے۔ بادامی آنکھیں اور سر کے بال سیاہ اور بالکل سیدھے ہوتے

ہمیں ۔ان کے چہروں اور جسم پر بہت کم بال اگتے ہیں اس لے وہ معمر ہونے کے باوجود بھی جوان نظر آتے ہیں۔ ہمارے معیار حسن کے مطابق چینیوں کو جاذب نظر نہیں کہا جا سکتا' لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی فرد ضرور ایسا نظر آ جاتا ہے جو خدوخال کے اعتبار سے ہم سے مشابہ ہو۔

چین کی تہذیب دنیا بھر کی قدیم ترین تہذیب سمجھی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب باقی دنیا محض وحشیوں کی زندگی گزار رہی تھی تو چینی تہذیب اوج کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔اس حقیقت کے پیش نظر یہ ایک قدرتی بات ہے کہ چینی دیگر اقوام کو محض وحشی گردانتے ہیں۔اہل چین' اہل یورپ کو ''سرخ بالوں والے شیطان'' اور ہندوستان یا پاکستان کے باشندوں کو بھی ایسے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

چینیوں نے اپنی ثقافتی قدریں برقرار رکھنے میں بڑی ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے دوسری تہذیبوں کو اپنی تہذیب میں ضم کر لینے کی صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ اس صلاحیت کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ چین پر شمال اور شمال مغرب سے کئی حملے ہوئے لیکن چینیوں نے حملہ آور فاتحین کو اپنی تہذیب میں جذب کر لیا۔

چینیوں کی سب بڑی عجیب چیز ان کی زبان ہے۔اگرچہ ملک کے مختلف علاقوں میں بالکل مختلف بولیاں رائج ہیں جو ایک دوسری سے اتنی مختلف ہیں جتنی کہ ہمارے ہاں پشتو اور بنگالی ایک دوسری سے مختلف ہیں لیکن سارے ملک کی تحریری زبان صرف ایک ہے۔چینی زبان کا رسم الخط قدیم مصری زبان کی طرح ہے' جس میں الفاظ کو تصویروں کا جامہ پہنایا جاتا ہے۔چینی زبان میں حروف تہجی نہیں ہوتے اور ہر لفظ کی بناوٹ اور تشکیل جداگانہ ہوتی ہے۔اس لیے اگر کوئی یہ چاہے کہ وہ چینی زبان کو کوئی اخبار پڑھ اور سمجھ لے تو اسے کم سے کم چھ سے آٹھ ہزار تک مختلف الفاظ کی بناوٹ اور شکل ازبر کرنا ضروری ہوگی۔غرضیکہ چینی زبان دنیا بھر میں لکھنے اور پڑھنے کے اعتبار سے مشکل ترین زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری افواج میں دنیا کے دیگر جدید زبانوں کے مترجمین کو پانچ سو روپیہ معاوضہ دیا جاتا ہے مگر چینی زبان کے مترجمین کو دو ہزار روپیہ معاوضہ دیا جاتا ہے۔چین کی موجودہ حکومت چینی زبان کے حروف تہجی بنانے کی تجویز پر غور کر رہی ہے لیکن اس کام پر ابھی

کافی مدت صرف ہوگی۔ چینی زبان (کالموں کی شکل میں) اوپر سے نیچے کی طرف لکھی جاتی ہے اور سطریں' دائیں طرف سے شروع ہوکر بائیں طرفو جاتی ہیں۔ چینی زبان میں ''ر'' مفقود ہے اس لیے چینی زبان میں ''ر'' کی آواز ہی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ چینی طلباء جو دوسرے ملکوں میں تعلیم پاتے ہیں ایسے لفظوں کے تلفظ ادا کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے جن میں ''ر'' کا حرف آجاتا ہے۔

مذہب کے اعتبار سے بیشتر چینی بدھ مت یا کنفیوشس عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کنفیوشس چین کا ایک عظیم فلسفی اور مفکر تھا اور کنفیوشزم ایک مخصوص ضابطہ اخلاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ چین میں مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ موجودہ دور میں چینی مسلمانوں کے عقائد پر کوئی پابندی لگائی جاچکی ہے یا نہیں لیکن جس زمانے میں چینی مسلمانوں کو میں دیکھا تھا وہ بڑے راسخ العقیدہ اور قدامت پسند مسلمان تھے۔ مثلاً ایک ایسے ملک میں جس میں خنزیر بکثرت ہوتے ہیں' وہاں کے مسلمان ''حرام'' اور ''حلال'' میں پورا امتیاز روا رکھتے ہیں۔ باقاعدہ عربی میں نماز ادا کرتے ہیں اور تمام اسلامی شعائر ادا کرتے اور اسلامی تہوار جوش وخروش سے مناتے ہیں۔ میں جتنا عرصہ چین میں رہا ماہ رمضان المبارک میں ہم باقاعدگی سے چینی امام کے پیچھے نماز تراویح ادا کرتے رہے۔ چین کی مسلم خواتین برقع نہیں پہنتی اور اور ننگے سر رہتی ہیں' لیکن مسجد یا قبرستان میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے سر رومالوں یا ڈوپٹوں سے ڈھانپ لیتی ہیں۔ چین میں خال خال عیسائی بھی ہیں لیکن وہ زیادہ تر ساحلی علاقوں میں پائے جاتے ہیں' جہاں یورپ کا زیادہ اثر رہ چکا ہے۔ اب ہانگ کانگ کو چھوڑ کر باقی سارے چین میں عیسائیت کم ہورہی ہے۔

چینی عقیدہ تناسخ پر بھی یقین رکھتے ہیں' جس کے نتیجے کے طور پر تجہیز وتکفین میں بہت سی ایسی عجیب وغریب رسوم ادا کی جاتی ہے جو قدیم مصر کی رسوم سے ملتی جلتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں مصر کی قدیم تہذیب میں مرنے والے کو اگلے جہاں میں آرام وآسائش مہیا کرنے کے لیے اس کے ساتھ ہی اس کی غلام' لونڈیوں' گھر کا سامان' اور دیگر اشیاء دفن کردی جاتی تھیں' چینی اپنے مردے کی قبر کے پاس کاغذ اور بانس سے تیار کیے ہوئے ایسی اشیاء کے نمونے ڈھیر لگا کر سپرد آتش کردیتے ہیں' تاکہ مرنے والا ان اشیاء سے عدم میں پہنچ کر فائدہ اٹھا سکے۔ اس رسم میں

زمانے کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ جدت اختیار کر لی گئی ہے مثلاً جب میں چین میں تھا تو میں نے دیکھا کہ مردے کی قبر پر موٹروں اور ہوائی جہازوں کے کاغذ اور بانس سے بنے ہوئے نمونے بھی رکھ کر جلادیے گئے اور اب تو یہاں تک ہو رہا ہے کہ نقلی کرنسی نوٹ تک چھاپ کر مردے کی چتا کے ساتھ سپرد آتش کیے جاتے ہیں۔

ہماری طرح چینی بھی بڑے توہم پرست واقع ہوئے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مرنے والے کی روح ضرور اس کے گھر میں واپس آتی ہے۔ چنانچہ گھر کو مردے کی روح سے محفوظ رکھنے کے لیے عجیب غریب طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ میت کو گھر کے دروازے سے باہر نہیں لے جایا جاتا' بلکہ کھڑکی کے راستے یا چھت میں شگاف کر کے باہر نکالا جاتا ہے اور جب چھت کے شگاف کے راستے میت باہر نکال لی جاتی ہے' تو وہ سیڑھی یا کوئی دوسرا ذریعہ جو اس مقصد کے لیے اختیار کیا جاتا ہے اسے فوراً توڑ پھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ جب مرنے والی کی روح واپس آئے تو وہ بھٹک جائے اور اسے گھر میں داخل ہونے کا راستہ دکھائی نہ دے۔ پھر یہ کہ جنازہ بڑے پیچیدہ راستوں سے قبرستان لے جایا جاتا ہے تاکہ مرنے والے کی روح کو واپس آنے کا راستہ نہ ملے۔ موت ہو جانے پر نوحہ خواں کرایہ پر منگوائے جاتے ہیں اور یہ پیشہ عموماً عورتیں کرتی ہیں۔ انہیں رونے پیٹنے اور ماتم کرنے کی خاصی اجرتی ملتی ہے۔ چین میں ایک رسم ادا کی جاتی ہے' جسے چینی زبان ''چنگ منگی'' کہا جاتا ہے۔ اس تیوہار پر لوگ اپنے اعزہ واقربا کی قبروں جاتے ہیں۔ قبریں کھود کر مردوں کی ہڈیاں نکال لی جاتی ہیں اور مٹی کے مٹکوں میں بند کر کے مٹکے پہاڑوں پر رکھ دیے جاتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم بچپن کے زمانے میں پہاڑیوں پر جا کر مردوں کی ہڈیوں والے مٹکوں پر پتھر مارا کرتے تھے اور چینی اس سے پریشان ہوتے تھے۔

چینیوں کی غذائیں مختلف قسم کی ہیں۔ چینیوں کی عام خوراک تو چاول ہے لیکن شمالی چین میں گیہوں بھی بکثرت کھایا جاتا ہے۔ چینی دودھ نہیں پیتے' اس لیے چین میں گایوں کی بہت کمی ہے اور جو گائیں ہیں بھی وہ بہت گھٹیا نسل کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں ڈیری کی تیار شدہ جو اشیاء بکثرت ملتی ہیں' چین میں ان کا شدید فقدان ہے۔ البتہ ساحلی علاقوں میں ایسی اشیاء ضرور مل جاتی

ہیں کیونکہ ساحلی علاقوں میں کافی مغربی اثر ونفوذ ہے۔ کھانا پکانے میں اکثر مونگ پھلی کا تیل اور سور کی چربی استعمال ہوتی ہے۔

چینیوں کی بعض غذائیں ہمارے لیے بے حد ناپسندیدہ ہیں اور ان کا نام سنتے ہی گھن آنے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر شارک مچھلی کے پر شوق سے ابال کر کھائے جاتے ہیں۔ خنزیر کا خون جما کر اس کا شوربہ تیار کیا جاتا ہے، جسے ''چی ہونگ چوک'' کہا جاتا ہے۔ چینی سانپ کی بعض قسمیں بھی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ ہم جس طرح بڑی بڑی ''چکیوں والے'' دنبے قربانی کے لیے شوق سے پالتے ہیں اسی طرح چینی لوگ کتوں کے پلوں کو پال پال کر موٹا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا گوشت مزے لے لے کر کھایا جاتا ہے۔

چینی چھری کانٹے سے نہیں کھاتے بلکہ ان کی جگہ تیلیاں استعمال کرتے ہیں جو لمبائی میں پنسل کے برابر لیکن قدرے پتلی ہوتی ہیں۔ جس برتن میں چاول ہوتے ہیں اسے منہ کے نزدیک رکھ کر دونوں ہاتھوں سے اس میں سے تیلیوں سے چاول بڑی تیزی سے اٹھا اٹھا کر منہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔ وہ تیلیاں اس تیزی اور کاریگری سے استعمال کرتے ہیں کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں ہم لوگ سرعام کھانے پینے سے گریز کرتے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ کہیں الگ بیٹھ کر چپ چاپ کھانا کھالیں، وہاں چین کے لوگ بڑے شوق سے اپنے کھانے پینے کی نمائش کرتے ہیں۔ بلکہ وہ کھانے کی میز کو اپنی جگہ سے اٹھا کر ایسی جگہ پر لگا دیتے ہیں جہاں زیادہ لوگ انہیں کھاتا پیتا دیکھ سکیں۔ جتنا کھانا پرتکلف ہو اس کی اتنی ہی زیادہ نمائش چاہتے ہیں۔

چینی مردوں کا روایتی لباس عموماً لمبے بازوؤں والے شیروانی نما کوٹ اور پائجامے پر مشتمل ہوتا ہے اور وہ کپڑے کے جوتے اور کپڑے کی ٹوپی پہنتے ہیں، لیکن کام کاج کے وقت وہ کوٹ کے بجائے صدری پہن لیتے ہیں۔ لیکن اب چینیوں نے زیادہ تر مغربی لباس پہننا شروع کر دیا ہے۔ عورتوں کا لباس دو طرز کا ہوتا ہے۔ ایک لباس تو صرف ایک لمبے کرتے پر مشتمل ہوتا ہے اور دوسرا لباس دو جاموں پر۔ اول الذکر بند گلے کی لمبی سی قمیض ہوتی ہے جو گھٹنوں سے نیچے تک

چلی جاتی ہے۔ اس کے دونوں پہلوؤں میں چاک ہوتے ہیں تاکہ نقل و حرکت میں دقت نہ ہو۔ فیشن ایبل طبقہ کے قمیض کے چاک ذرا بڑے ہوتے ہیں جس سے بدن کے کچھ حصے کی نمائش بھی ہو جاتی ہے۔ عورتوں کے دو جاموں کا لباس بند گلے کی جاکٹ اور پائجامہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

چینی باشندے بڑے محنتی اور تنومند ہوتے ہیں لیکن ہماری طرح وہ بھی تقدیر کے قائل ہوتے ہیں۔ تقدیر کے متعلق ان کے عقیدے کا اندازہ ان کی اس کہاوت سے ہو سکتا ہے کہ ''اب کیا ہو سکتا ہے؟...... یا...... جو ہونا ہے سو ہو کر ہی رہے گا''...... یہی وجہ ہے کہ اگر ان پر کسی طرح کی مصیبت آ جائے تو وہ اسے صبر و سکون سے جھیل لیتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ مثال سنئے:

جاپانیوں نے جب ہانگ کانگ پر حملہ کیا اور ہانگ کانگ کے سمندری علاقے پر شدید بمباری کی، تو چینیوں کی ہزارہا کشتیاں بموں کا نشانہ بن کر غرق ہو گئیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ایک بم زدہ کشتی دیکھی جو آدھی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی، لیکن اس کے پچھلے حصے میں چند چینی مزے سے تاش کھیل رہے تھے۔ جب ان کو بتایا کہ ان کی کشتی ڈوب رہی ہے اور ان سے جاپانیوں کے وحشیانہ اقدام پر ہمدردی ظاہر کی گئی تو کشتی کے مالک نے افسردہ نگاہ سے صرف ایک بار ہماری طرف دیکھا اور یہ کہہ پھر تاش کے کھیل میں مصروف ہو گیا کہ...... ''جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے......''

اب چند باتیں چینیوں کے تیوہاروں کے بارے میں بھی سن لیجیے:

چینیوں کا سال قمری ہوتا ہے اور یہ انکی عجیب رسم ہے کہ بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی عمر میں عمر میں اسی وقت ایک سال جمع کر لیتے ہیں۔ مثلاً جو بچہ آج پیدا ہو گا اس کی عمر ایک سال شمار ہو گی۔ جب چینیوں کا نیا سال شروع ہوتا ہے تین دن کی عام تعطیل کا اعلان کر دیا جاتا ہے اور ان تین دنوں میں ہر قسم کا کاروبار معطل رہتا ہے۔ دن بھر رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں اور رات کو میلے لگتے ہیں۔ اہل چین سرخ رنگ کو اچھا شگون سمجھتے ہیں، چنانچہ کسی کو تحفہ پیش کرنا ہو تو سرخ لفافے میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ابلے ہوئے انڈوں پر سرخ رنگ کر کے بیچا جاتا ہے۔ نئے سال پر ہر شے پر سرخ رنگ پھیر کر سارا شہر بیر بہوٹی بنا دیا جاتا ہے۔ سب سے دلچسپ تیوہار ''اژدھے'' کا جلوس ہوتا ہے۔ کئی سو فٹ لمبا رسہ تیار کر کے اس کے گرد گھاس لپیٹ دی جاتی ہے۔ اس میں دس دس فٹ کے

فاصلے پر جلتی ہوئی لکڑیاں لگادی جاتی ہیں۔اس کے سر میں دونوں طرف طاقتور برقی ٹارچیں نصب کردی جاتی ہیں جو خوفناک اژدھے کی آنکھیں معلوم ہوتی ہیں۔ رات کو اس اژدھے کا جلوس نکالا جاتا ہے اور بڑے زور شور سے ڈھول تاشے اور سنکھ بجائے جاتے ہیں ۔ یہ طویل اژدھا جس کے ایک ایک رونگٹے سے شعلے نکل رہے ہوتے ہیں، بڑا بھیانک منظر پیش کرتا ہے۔جلوس کے خاتمے پر اژدھے کو سمندر یا دریا کی نذر کردیا جاتا ہے اور جلوس والے اس وقت بے پناہ شور مچاتے ہیں۔

چینی ڈرامہ روایات کے اعتبار سے بہت اونچے معیار کا ہوتا ہے لیکن چینی تمثیل میں سیدھی سادھی گفتگو کی بجائے شروع سے آخر تک اشاروں کنایوں سے کام لیا جاتا ہے۔اس لیے جو لوگ چینی تہذیب وتمدن سے واقف نہ ہوں چینی ڈرامہ دیکھ کر ان کے پلّے کچھ نہیں پڑ سکتا۔چینی ڈرامے میں ''حقائق نگاری'' کا مطلق دخل نہیں ۔ان کا کہنا ہے کہ جب سٹیج پر کبھی بھی حقیقت پیش نہیں کی جاسکتی، تو پھر مصنوعی مناظر سے حقیقت ظاہر کرنے کی کوششِ ناکام کا فائدہ ہی کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ وہ ڈرامے میں سارا کام استعاروں اور کنایوں سے لیتے ہیں اور دیکھنے والے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ان کا مطلب نکال لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر چھڑی سے گھوڑی کا مطلب لیا جاتا ہے۔ہوا میں بازو ہلانے کا مطلب یہ ہے کہ تیر کر دریا پار کیا جارہا ہے۔ہوا میں اچھلنے سے مراد یہ کہ گھمسان کی ہورہی ہے۔چینی موسیقی بھی حد درجہ کی کلاسیکی موسیقی ہوتی ہے اور ہمارے لیے اتنی ہی ناقابل فہم کہی جاسکتی ہے جیسے ہماری کلاسیکی موسیقی چینیوں کے لیے۔

چینیوں میں جمالیاتی حس خصوصیت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔چنانچہ وہ فنون لطیفہ کے اعتبار سے بڑے ماہر ہوتے ہیں اور ہاتھوں اور انگلیوں کی مدد سے بڑی عجیب وغریب چیزیں بنالیتے ہیں۔چینکی بنی ہوئی ہاتھی دانت اور مونگے کی سوغاتیں ساری دنیا میں مشہور ہیں ۔ مجھے چین سے وطن واپس آکر معلوم ہوا کہ جنگ سے پہلے چینی ہمارے شہروں میں گلی گلی پھر کر کشیدہ کاری والے کپڑے اور دیگر سوغاتیں بیچا کرتے تھے۔

میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ چینی بڑی محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں ۔آج یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ نہایت کاہل ہیں اور افیون کے عادی لوگ ہیں ۔ چینیوں میں زبردست کاروباری

صلاحیتیں ہیں چنانچہ جنوب مشرقی ایشیا کے تمام ممالک کی منڈیوں چینی ہی چھائے ہوئے ہیں۔

اب چند الفاظ میں چین کی روایتی افیون خوری کے بارے میں بھی:

چینی افیون کھاتے نہیں تھے بلکہ تمباکو کی طرح افیون پیتے تھے۔ افیون کی باریک گولیاں بنا کر ایک چلم میں بھر لی جاتی تھیں۔ یہ چلم ایک نے کے سرے پر لگی ہوتی تھی۔ چلم کو دیے سے آگ دکھا دی جاتی تھی اور افیون پینے والا بانس کی چٹائی پر لیٹ کر لمبے لمبے چند کش لگا کر دھت ہو جاتا تھا۔ لیکن اب چین میں افیون نوشی اتنی ہی کم ہے جتنی کہ ہمارے ہاں افیون خوری۔ بلکہ اب چین میں کوئی افیونی شاید ڈھونڈے ہی سے مل سکے۔

اخیر میں مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ چینی خوش باش اور راضی برضا قسم کے لوگ واقع ہوئے ہیں۔ وہ تقدیر کے قائل ہوتے ہیں اور اس لیے ان کا عقیدہ یہ ہے کہ۔

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اس عقیدے کا اندازہ میرے ایک ہانگ کانگ کے گہرے چینی دوست کے الفاظ سے کیا جس کا ہے جو اسنے ہانگ کانگ میں مقیم کفایت شعار ہندوستانی باشندوں کا ذکر کرتے ہوئے کہے تھے:

"تم ہندوستانی نرالے ہی لوگ ہو۔ ساری عمر اس لیے غریبانہ گزارہ کرتے ہو کہ مرتے وقت امارت کی حالت میں مرو"

''فرض شناس افسر''

............جنرل اعظم خاں

۲۳ ستمبر ۱۹۶۶ء کو لاہور چھاؤنی میں لیفٹیننٹ جنرل اعظم خاں کے ساتھ ان کے بنگلہ پر ایک ملاقات میں انہوں نے بتایا:

اکتوبر ۱۹۵۸ء کے انقلاب سے قبل میں فسٹ کور کمانڈر تھا اور میجر عزیز بھٹی میرے پاس جنرل سٹاف II (اوپریشنز) تھے۔ میں جب میجر عزیز بھٹی کو چشم تصور میں لاتا ہوں تو میں ایک پاکیزہ متدین اور انتہائی فرض شناس افسر کا خاکہ میرے سامنے آتا ہے۔

جنرل اعظم کہنے لگے: اللہ تعالیٰ نے عزیز شہید کو بہت بلند مرتبہ دیا ہے' میں ڈرتا ہوں محض حافظہ کی بنا پر ان کے بارے میں کوئی بات غلط یا مبالغہ آمیز نہ کہہ دوں۔ البتہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں اپنے ماتحت افسروں کے کام کے متعلق جو رپورٹ لکھی تھی' اسمیں میں عزیز بھٹی کے بارے میں اپنے تفصیلی تاثرات لکھے تھے۔ اگر ممکن ہو سکے تو آپ ملٹری سیکرٹری سے میری وہ رپورٹ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

ستمبر کی جنگ کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے: ہماری مسلح افواج خراج تحسین کی مستحق ہیں۔ جن کی شجاعت' دلاوری اور بروقت کاروائی نے بھارت کے ناپاک منصوبوں کو ناکام بنا دیا تھا۔

میں ۶ ستمبر کو برکی محاذ کی طرف بھی گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں جوانوں کے عزم اور بلند حوصلوں سے بہت متاثر ہوا تھا۔

مکان کی تعمیر

۱۹۵۹ء میں میجر عزیز بھٹی نے راولپنڈی میں ذاتی کوٹھی کی تعمیر کرائی۔ ان کے والد تعمیر کی نگرانی کرتے تھے۔ اس کے لیے پلاٹ انہوں نے ۱۹۵۵ء سے خرید رکھا تھا۔

کرنل فیض احمد (سدھ گجرات) نے ایک ملاقات میں بتایا۔

جب وہ فوج میں شامل ہوگئے تو ہم الگ الگ رجمنٹ میں تھے' لیکن کبھی کبھی ملاقات ہوجاتی تھی۔ یہ ۵۶-۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ عزیز نے مجھ سے مشورہ کیا کہ گاؤں کے علاوہ کسی شہر میں بھی اپنا مکان ہونا چاہیے۔ ان کا ذاتی رجحان گجرات کی طرف تھا' لیکن میں نے راولپنڈی کا مشورہ دیا' کہ وہاں گجرات کی نسبت زیادہ سہولتیں میسر ہوں گی۔ اس وقت راولپنڈی یا اس کے قرب وجوار میں صدر مقام بننے کا کوئی سوال نہ تھا' البتہ میرا اپنا مکان راولپنڈی میں تھا۔ وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد قائل ہوگئے۔ اب زمین خریدنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ میرے پاس ۸ کنال کا پلاٹ تھا۔ اڑھائی کنال زمین عزیز نے خرید کر مکان بنوالیا۔ گاہے گاہے ان سے وہاں ملاقات ہوتی رہی۔ یہ مکان مغل آباد راولپنڈی چھاؤنی ٹینچ بھاٹہ روڈ پر واقع ہے۔ پہلے اس محلہ کا نام ''اسلام آباد'' تھا مگر جب صدر مقام کا نام ''اسلام آباد'' رکھا گیا تو اس محلہ کا نام ''اسلام آباد'' تھا مگر جب صدر مقام کا نام ''اسلام آباد'' رکھا گیا تو اس محلہ کا نام بدل کر ''مغل آباد'' رکھا گیا اور اب عزیز کی نسبت سے اسے ''بھٹی آباد'' کہتے ہیں۔ عزیز کے چھوٹے بھائی سردار احمد نے راولپنڈی میں ہی مکان بنالیا ہے۔

کیپٹن احسان الرحمٰن بخاری نے بتایا کہ کوٹھی کی تعمیر کے لیے ان کے پاس روپیہ نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی کار فروخت کردی۔ (جو کینیڈا سے لائے تھے) اور مکان بنوانے کے لیے

محکمانہ طور پر قرضہ بھی حاصل کیا۔

عمارت کے لیے خود ہی ایک سادہ نقشہ دیا۔ پھر دوستوں کے مشوروں کے مطابق اس میں ترمیم کرتے رہے۔ یہ عمارت ان کی سادگی اور بھولے پن کی حسین مظہر ہے۔

زبان دانی

ہانگ کانگ میں عزیز نے بیک وقت چار زبانیں سیکھ لیں۔ گھر میں چاروں زبانیں بولی جاتی تھیں...... پنجابی' اردو انگریزی اور چینی.......... سکولوں میں انگریزی بولی جاتی تھی اور بازار میں زیادہ تر چینی زبان استعمال ہوتی تھی۔ ہانگ کانگ پر جاپان کے تسلط کے بعد انہیں جاپانی سیکھنی پڑی اور جاپانی زبان میں بحریہ کے کپتان کو کورس بھی پاس کیا۔

میجر عزیز بھٹی نے جرمن انٹرپریٹرشپ کورس بھی کیا۔ جرمن زبان کا ابتدائی کورس کراچی میں کیا پھر ایک سال کے لیے جرمنی جا کر اس کی اعلیٰ تربیت حاصل کی۔ وہ فوج میں جرمن زبان کے سرکاری ترجمان تھے۔ جرمن زبان سے انہیں بے حد دلچسپی تھی۔ اس پر عبور حاصل کرنے کے بعد مشہور جرمن اہل قلم بالخصوص گوئٹے کے کلام کا انہوں نے بڑے شغف سے مطالعہ کیا۔ قرآن کریم کی باقاعدہ تلاوت کے ساتھ اس کا جرمن میں ترجمہ بھی پڑھتے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ جہاد و قتال اور جنگ و جدل کے مسائل پر جس حسن و خوبی اور فصاحت اور بلاغت سے جرمن ترجمہ میں روشنی ڈالی گئی ہے' شاید ہی کسی دوسری زبان میں ہو۔ اسے پڑھنے سے بے حد لطف آتا ہے۔ ان کے خیال میں اس کی ایک وجہ غالباً یہ ہے کہ جرمن قوم کی طرح جرمن زبان بھی عسکری رنگ غالب ہے۔

وہ عربی زبان بھی صرف و نحو کے ساتھ باقاعدہ سیکھ رہے تھے تاکہ براہ راست اس زبان میں قرآن کریم کے ابدی پیغام کو سمجھ سکیں۔

شہادت سے کچھ عرصہ قبل میجر عزیز بھٹی نے اپنے طور پر بنگلہ زبان سیکھنے کا کورس شروع کر رکھا تھا۔ وہ تھوڑی بہت بول بھی لیتے تھے۔ نزدیک بارکوں میں انجینئرز کور کے بنگالی جوان رہتے تھے۔ ان کے ساتھ بنگلہ زبان میں بات چیت کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔ ان سے ملتے تو

کہتے:

''السلام علیکم''! آپنی گیمون آچھین؟ (آپ کا کیا حال ہے؟)

''آپنی کوتھائے گوے چھین؟'' (آپ کہاں گئے تھے؟)

انجینئرنگ کور کے ایک بنگالی جوان حبیب الرحمٰن خاں ہمیں ملے۔ انہوں نے میجر صاحب کے حسن اخلاق کی بے حد تعریف کی۔ کافی دیر تک وہ ہمارے ساتھ بنگالی نما اردو میں باتیں کرتے رہے۔ جاتے ہوئے بنگلہ میں ایک پیغام بھی لکھ کر دیے گئے۔

میجر عزیز کے لیے مختلف زبانیں سیکھنا شاید اتنا مشکل نہ تھا کہ ایک زبان کی گرائمر میں مہارت انہیں دوسری زبانیں سیکھنے میں مدد دیتی تھی۔ بلاشبہ ایک زبان پر عبور حاصل کر لینے کے بعد دوسری زبان میں اظہار خیال کی آسانی ہو جاتی ہے۔

وہ اپنے علم میں اضافہ کے لیے گورمکھی اور ہندی رسم الخط سے بھی واقفیت حاصل کر رہے تھے۔ ان کو زبانیں سیکھنے ہی کا شوق نہ تھا' وہ دوسروں کو زبانیں سکھا کر بھی بہت خوش ہوتے تھے۔ چنانچہ فوج میں بہت سے افسران کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرتے تھے۔

جرمن کے ترجمان

۱۹۶۰ء میں میجر عزیز بھٹی جرمن زبان کے ابتدائی کورس کے لیے منتخب کر لیے گئے۔ یہ ۶ ماہ کا ابتدائی کورس کراچی میں ہوا۔

میجر عزیز کے ایک دوست باقر صدیقی کو جرمن زبان میں انٹرپریٹر شپ کورس کرنے کا بہت شوق تھا' لیکن وہ کراچی کی ابتدائی جرمن کورس کے لیے منتخب نہ ہو سکے۔ اس کورس کے آخری ٹسٹ میں پرائیویٹ طور پر شامل ہونے پر البتہ کوئی پابندی نہ تھی۔ میجر عزیز بھٹی نے باقر صدیقی سے کہا کہ وہ پریشان نہ ہوں' وہ انہیں پرائیویٹ طور پر تیاری کروا کے امتحان میں کامیابی کے قابل بنا دیں گے۔ باقر صدیقی کی پوسٹنگ کراچی میں تھی۔ انہوں نے پرائیویٹ طور پر تیاری شروع کر دی۔ میجر عزیز جو کچھ پڑھ اور سیکھ کر آتے تھے' وہی آکر میجر باقر صدیقی کو پڑھا دیتے تھے اور

دونوں مل کر خوب محنت کرتے تھے۔ جب کراچی میں جرمن زبان کا امتحان ہوا تو میجر بھٹی حسب معمول سرفہرست تھے۔ مگر دوسرے افسران کے لیے یہ امر باعث حیرت تھا کہ ایک پرائیویٹ طور پر شریک امتحان...... میجر باقر صدیقی...... دوسرے نمبر آئے۔

چنانچہ جرمن زبان کے انٹرپریٹر شپ کورس کے لیے دونوں ہی دوست منتخب ہو گئے اور دونوں نے جرمنی میں جرمن زبان کی ترجمانی کا کورس کیا۔

میجر عزیز جرمنی میں

جرمن زبان پر عبور

شہید کی جرمن زبان کی ایک چھوٹی سی نوٹ بک ہے جس میں جرمن زبان کے بعض شعراء گوئٹے، مسیھیاس، کلاوڈیس، میور کے، گسھر اور ہنری ہیز کی نظموں اور شعروں کے علاوہ جرمن لوک گیت بھی درج ہیں۔ ترجمے کے لیے پاک جرمن کلچرل سنٹر لاہور کے ڈاکٹر نذیر الاسلام کو دکھایا، تو وہ حیران رہ گئے۔ اگرچہ وہ خود کافی عرصہ جرمنی میں رہ چکے تھے بلکہ پاکستان میں شاید ہی کوئی اور شخص ان سے زیادہ جرمن زبان جاننے کا دعویٰ کر سکے، لیکن لوک گیت وہ بھی نہیں سیکھ سکے تھے۔ کہنے لگے: شہید کا جرمن زبان پر عبور حیرت انگیز ہے۔

جرمن کلچرل سنٹر کی مسز ملک نے اسے دیکھا تو جرمن نژاد ہونے کے باعث اس سے بہت لطف اندوز ہوئیں۔ کہنے لگیں: لوک گیتوں کو سمجھنے کے لیے جرمن زبان پر بہت زیادہ عبور حاصل ہونا چاہیے۔ اس نوٹ بک سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جرمن زبان بالکل اہل زبان کی طرح سمجھنے لگے تھے۔

اس نوٹ بک میں گوئٹے کی مشہور نظم ''میں اپنا دل ہائیڈل برگ میں چھوڑ آیا ہوں'' ہنری ہیز ''لورے لائی''...... گوئٹے کی ایک نظم ''پھول اور بچہ'' جس میں شاعر نے بچے کو پھول سے شبیہہ دی ہے' بھی شامل ہیں۔ جبر وقدر کے مسئلہ پر بھی چند شعروں کا انتخاب ہے۔ ایک صفحہ پر اس شعر ؎

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

کے مترادت جرمن اشعار نوٹ کیے ہیں۔

لوک گیتوں میں سپاہی کا وہ گیت جب وہ اپنے قصبے کو چھوڑ کر میدان جنگ میں جاتا ہے

قابل ذکر ہے۔

وہ جرمنی سے گیتوں کے بہت سے ریکارڈ بھی ساتھ لائے تھے۔

جرمن ٹیچر

پاک آرمی میں جرمن زبان سیکھنے کے لیے بہت سے افسران کے ممنون احسان تھے۔ان میں جنرل بلگرامی تک شامل تھے، جنہیں وہ کوئٹہ کے قیام کے دوران جرمن زبان سکھایا کرتے تھے۔

جرمن بول چال

شہید نے جرمن زبان کے چند الفاظ گھر میں بچوں کو بھی سکھا رہے تھے۔مثلاً شکریہ کے لیے وہ ''وانکے شن' یا اش وانکے' بولتے تھے۔اور مہربانی یا انگریزی ''پلیز'' کے لیے بٹے شون' کہتے تھے۔بچے بھی گھر میں اکثر ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت میں یہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔

صبح قرآن مجید کی تلاوت کے وقت جرمن ترجمہ کھولتے ہوئے جرمن زبان میں ''ام نامن اللہ دس گناڈی گن دس بارم ہرزی گن''

کہتے تھے۔جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کا ترجمہ ہے۔

یہ الفاظ ہر روز سن سن کر گھر والوں کو بھی زبانی یاد ہو گئے ہیں۔

جرمن ترجمے میں نشانی کے طور پر ایک جرمن کارڈ رکھتے تھے۔

۶ ستمبر کی تاریخی صبح کو محاذ پر جانے سے قبل تلاوت کر چکے تھے۔ان کے ہاتھ کا رکھا ہوا کارڈ اسی طرح پڑا ہے۔اتفاق سے اس دن سورہ یٰسین کا ترجمہ زیر مطالعہ تھا۔

''عسکری ضابطے کی خلاف ورزی''

میجر عزیز بھٹی، جرمن انٹر پریٹر شپ کورس میں اول آئے تھے، اس طرح جرمن سٹاف کورس کے لیے ان کی راہ میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ مگر ان کی توقعات کے برعکس جرمن سٹاف کورس کے میجر باقر صدیقی کو منتخب کر لیا گیا۔

میجر عزیز بھٹی کے لیے یہ فیصلہ قطعی غیر متوقع تھا۔ اس سے ان کے جذبات کو خاصی ٹھیس لگی۔ ان کی طبیعت کے بحر پرسکون میں تلاطم آ گیا۔

جنرل موسیٰ سے احتجاج

میجر عزیز بھٹی کوئٹہ میں تھے۔ اتفاق سے ان دنوں کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ کوئٹہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ میجر عزیز اپنی اس حق تلفی کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے اپنے افسران بالا کی باضابطہ اجازت کے بغیر براہ راست جنرل موسیٰ سے ملاقات کرنے چلے گئے۔

جنرل موصوف ایک شریف النفس اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان اور ذہین افسر کے لیے یہ فیصلہ کتنا تکلیف دہ ہے۔ انہوں نے نوجوان افسر کی معروضات کو بڑی ہمدردی سے سنا اور اس کے تالیف قلب کی پوری پوری کوشش کی اور وعدہ کیا کہ وہ خود سارے معاملہ کی چھان بین کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس کیس کے سارے کاغذات منگوانے کے

جرمن جنرل ہینگز، عزیز بھٹی سے مصروفِ گفتگو ہیں،
باقر صدیقی ساتھ کھڑے ہیں

احکامات صادر کر دیے۔

دو دن بعد میجر عزیز بھٹی پھر کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ سے ملاقات کرنے گئے۔ تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ تو کوئٹہ سے بذریعہ طیارہ راولپنڈی روانہ ہو گئے ہیں۔ دوسری اڑان سے میجر عزیز بھٹی بھی کوئٹہ سے راولپنڈی کی سمت پرواز کر رہے تھے۔ راولپنڈی پہنچ کر وہ سیدھے کمانڈر انچیف کے پاس پہنچے۔ اس وقت تک موصوف اس کیس کی فائل دیکھ چکے تھے۔ وہ میجر عزیز کی معروضات سننے کے ساتھ ساتھ ان کو سرکاری نقطہ نگاہ سے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اے روشنی طبع تو بر من بلا شُدی

سرکاری نقطہ نظر یہ تھا کہ میجر عزیز بھٹی نے تھوڑی سی سروس میں بہت سے کورس پاس کر لیے ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں وہ کینیڈا سے سٹاف کالج کورس بھی کر چکے ہیں۔ وہ اپنی خداداد قابلیت اور

عسکری صلاحیتوں کے لحاظ سے باقی افسروں سے بہت آگے ہیں۔ اگر صرف اہلیت اور استحقاق کو سامنے رکھا جائے تو ان کا مقابلہ کوئی نہیں ہے۔ بلاشبہ تمام کورسوں کے لیے صرف انہی کو مستحق گردانا جائے گا' لیکن اس طرح تو صرف ایک ہی افسر کو اعلیٰ تربیت کے مواقع مل سکیں گے۔ یہ امر عسکری حکمت عملی کے سراسر منافی ہے۔ چنانچہ اس دفعہ ان کی بجائے دوسرے افسر کو موقع دیا گیا ہے۔ انہیں جرمن سٹاف کورس کے لیے پھر موقعہ دیا جائے گا۔

میجر عزیز بھٹی' کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ خاں کے حسن اخلاق اور ان کی دلآویز شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ ان سے دو مرتبہ مل کر اس مسئلہ پر اپنے خیالات کا دل کھول کر اظہار کر چکے تھے اور غبار خاطر نکال چکے تھے۔ دوسری دفعہ ان کے احتجاج میں پہلی سی شدت نہ تھی۔ اگرچہ جذباتی طور پر وہ سرکاری وضاحت سے مطمئن نہیں تھے' لیکن اس دلیل کی معقولیت اور اس حکمت عملی کی افادیت سے انکار نہ کر سکے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اس واقعہ کو جسے انہوں نے جذباتی طور پر اتنی شدت سے محسوس کیا 'صرف چند ہی دنوں بعد وہ یکسر بھول گئے۔

سرکشی

البتہ ان کے جنرل آفیسر کمانڈنگ نے اسے عسکری ضابطے کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے ان سے جواب طلبی کر لی کہ وہ باضابطہ اجازت کے بغیر کمانڈر انچیف سے کیوں ملے؟

میجر عزیز بھٹی نے (بقول ان کے ایک ساتھی کے) عسکری زندگی میں پہلی دفعہ عسکری ضابطے کی خلاف ورزی کی تھی۔ انہوں نے اس کے نتائج کو خوب سوچ سمجھ کر ایسا کیا تھا اور اگر وہ کمانڈر انچیف کی طرف سے سرکاری نقطہ نظر کی معقولیت کے قائل نہ ہو جاتے تو وہ ان عواقب کے لیے بھی تیار ہو چکے تھے جو اپنے موقف پر قائم رہنے کی صورت میں متوقع تھے۔

ان کے جی' او' سی نے میجر بھٹی کو جو ریمارکس دیئے ان میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

نوجوان افسر کو (ضابطہ کی) فرضی مشکلات سے ڈرنا نہیں چاہیے!

مگر ان ''ریمارکس'' سے عسکری مسائل پر عبور رکھنے والی ایک عظیم شخصیت کو اختلاف ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل سر فرانسس ٹکر کردار کی اس خصوصیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں آپ کو یہ بتادوں کہ جو شخص ہمیشہ تابع فرمانی نہیں کرتا' اس میں کوئی عظیم خصوصیت ضرور ہوتی ہے۔ کیوں؟

اس لیے کہ اگر ہم انہی احکام پر عمل پیرا رہتے جو پانچ سو سال پیشتر بادشاہ ظل اللہ جاری کیا کرتے تھے تو آج بھی ہم سب کے سب غلام ہوتے۔

اس طرح اگر ہم پادریوں کی باتوں پر عمل کرتے تو ابھی تک سب کے سب جاہل مطلق ہوتے۔

اور اگر ڈاکٹروں کی جملہ ہدایات کی تعمیل کرتے تو ہم سب کبھی کے ملک عدم میں پہنچ چکے ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''سرکشی نے ہمیں بچالیا ہے''

(لیفٹیننٹ جنرل سرِ فرانسس ٹیوکر)

''وہ دوسروں کے کام آتے تھے''

جرمنی سے آنے کے بعد وہ کچھ عرصہ اپنی یونٹ کے ساتھ کوئٹہ میں رہے' پھر انفنٹری سکول میں دوبارہ بطور انسٹرکٹر تقرر ہوا۔ کاکول میں ان کے دوست کرنل جہاں زیب بنگش نے کوئٹہ میں ان کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا: کمیشن کے بعد وہ پنجاب رجمنٹ میں اور میں فرنٹیئر فورس میں چلا گیا' مگر ایبٹ آباد میں ۱۹۵۱ء تک ایک سال کے قریب ایک دوسرے کے نزدیک ہی رہے۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۲ء تک ہم ایک دوسرے سے دور رہے مگر خط و کتابت کے ذریعے ملتے رہے۔ ۱۹۶۲ء میں جب میں سٹاف کالج کورس کے لیے کوئٹہ گیا تو وہ وہاں اپنی پلٹن کے ساتھ تھے

جب ۱۹۶۳ء میں میں انفنٹری سکول میں انسٹرکٹر پوسٹ ہوا تو میجر عزیز بھٹی پہلے ہی وہاں انسٹرکٹر تھے۔

میجر بھٹی وہاں اساتذہ اور شاگردوں میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ جو چیز ہم نہیں سمجھ سکتے تھے' وہ بلا تامل ان سے جا کر سمجھتے تھے۔ صرف میں ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے انسٹرکٹر ان کے پاس اپنے مسائل لے کر جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا۔ کہ ان کو رات بہت دیر تک جاگنا پڑا' مگر انہوں نے کبھی اکتاہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ وہ دوسروں کے لیے اپنا کام چھوڑ دیتے تھے۔ مگر حیرت ہے کہ ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ مثال کے طور پر وہ وقت پر نماز بھی پڑھتے تھے' اپنے بچوں کی تدریس بھی کرتے تھے' شام کو باغبانی بھی ضرور کرتے تھے' اپنے باغیچے میں پھل اور سبزیاں اگا رکھی تھیں۔ سوشل معمولات میں بھی کبھی فرق نہیں آنے دیا دوستوں کے ہاں جاتے تھے' ان کو دعوتوں پر بلاتے تھے۔ حیران ہوں کہ اس کے باوجود وہ دوسروں کو اتنا وقت کیونکر دیتے تھے۔ نہ جانے وہ کس بلا کے انسان تھے۔ وہ زندگی میں بڑے مطمئن اور مسرور سے رہتے تھے۔ ان کی زندگی بڑی سادہ تھی۔

سفارش

وہ پری ٹوریا روڈ پر پہلے جس مکان میں رہتے تھے' وہ انہوں نے مجھے دے دیا اور خود فین روڈ پر دوسرے مکان میں چلے گئے۔ پہلے مکان میں انہوں نے اپنے ہاتھ سے درخت لگا رکھے تھے اور سبزیاں اگا رکھی تھیں۔ اس مکان کے تین سرونٹس کوارٹرز میں سے دو میں غریب آدمی رہتے ہیں۔ جاتے ہوئے کہنے لگے میری ایک سفارش بھی ہے۔ اگر تمہیں ان کمروں کی ضرورت نہ ہو تو ان لوگوں کو یہاں ہی ٹکا رہنے دیں۔ چنانچہ وہ لوگ وہیں رہتے رہے۔

مجھے جب کوئی پریشانی ہوتی تو ان کے ہاں چلا جاتا تھا۔ وہ میری پریشان صورت دیکھتے ہی پہلے تو موسیقی کا پروگرام بناتے۔ اگر اس سے بھی موڈ ٹھیک نہ ہوتا تو پکچر پر ساتھ لے جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ملاقات سے ہی طبیعت خواہ کتنی پریشان کیوں نہ ہو بہلنا شروع ہو جاتی تھی۔

چھوٹا سا واقعہ

بنگش نے ایک چھوٹا سا واقعہ بتاتے ہوئے کہا۔ انسان کے کردار کا جائزہ صرف بڑے کاناموں سے نہیں ہوتا۔ بسا اوقات چھوٹے چھوٹے واقعات اس کے کردار کی بہتر عکاسی کر جاتے ہیں۔ کہنے لگے:

ایک دفعہ ہم کچھ دوست کوئٹہ سے سیر وسیاحت کے لیے چمنجا رہے تھے۔ کار پر ڈرائیور کے علاوہ چار سیٹوں کوئی چھ دوست بیٹھے تھے۔ ایک جگہ سڑک خراب تھی۔ چڑھائی میں کار کا نچلا حصہ سڑک سے ٹکرانے لگا۔ ڈرائیور نے کار روک دی اور کہا ''اوورلوڈنگ کے باعث یہ خرابی پیدا ہورہی ہے''۔ ایک سواری کم کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ عزیز بھٹی نے بلا تامل یہ پیشکش کردی کہ وہ بس پر آجائیں گے۔ حالانکہ ہم سب ان کو کار میں لے جانا چاہتے تھے اور ان کی جگہ ہر کوئی بس میں جانے کے لیے تیار تھا مگر وہ نہیں مانے اور بس پی ہی چمن گئے۔ ان کی زندگی کے ایسے بیسیوں واقعات ہے۔ وہ ذاتی ایثار کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

''اخلاقی جرأت''

کرنل آر ڈی خاں نے ایک ملاقات میں بتایا:

بھٹی جب انسٹرکٹر بن کو کوئٹہ میں آئے تو پھر ان سے تعلقات اور بھی گہرے ہوتے چلے گئے۔ عزیز بھٹی کو اللہ تعالیٰ نے وہ تمام خصوصیتیں عطا کی تھیں جو صرف اس کے انعام یافتہ بندوں میں ہوتی ہیں۔ اس کے قلب ونظر میں اتنی وسعت تھی کہ عام زندگی میں ہم اسکا تصور بھی نہیں کر سکتے

اس میں احترام آدمیت تھا۔ کسی انسان کو دکھ یا تکلیف پہنچانا تو درکنار وہ کسی کو دکھ یا تکلیف میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس میں بے پناہ اخلاقی جرأت تھی۔ وہ بڑے سے بڑے افسر کے

سامنے بھی سچی بات کہنے سے ہچکچاتا نہیں تھا۔ وہ آسانی سے اپنا موقف نہیں بدلتا تھا۔ اس کے دلائل منطقی ہوتے تھے اور اس کی بحث سن کر بڑا لطف آتا تھا۔ وہ دوسروں کے دلائل کا جواب دلائل سے دیتا تھا اور بحث کرتے ہوئے غصہ میں نہیں آتا تھا' نہ اونچی آواز سے بولتا تھا بلکہ نہایت تحمل سے اور دھیمے انداز سے بحث کرتا تھا۔

بحث

کرنل آر ڈی خاں نے بتایا:

ایک دن میس میں ایک ٹیبل پر واقعات عالم زیر بحث تھے۔ ایک کرنل ویت نام کے مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے اور دوسرے آفیسر بیٹھے سن رہے تھے۔ میں بھی دوسری میز پر تھا۔ جب کرنل نے اپنا سلسلہ کلام ختم کیا تو ایک دوست نے عزیز بھٹی سے اس مسئلہ پر ان کی رائے پوچھی۔ انہوں نے کرنل کے تجزیہ کے بالکل خلاف اپنے افکار کا اظہار کیا اور سامعین بے حد متاثر ہو کر ان کے دلائل سنتے رہے۔ کرنل نے اسے خاصا محسوس کیا۔ مگر بھٹی کے دلائل کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ بھٹی اپنے حقیقی خیالات کے اظہار پر کبھی کوئی پابندی محسوس نہیں کرتے تھے اور میں نے اکثر دیکھا کہ وہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے بالمقابل اظہار خیال سے باز نہیں رہتے تھے۔

میں نے بڑے اشتیاق سے کرنل آر۔ڈی خاں سے پوچھا کہ ویت نام کے مسئلہ پر شہید کے خیالات کیا تھے۔ انہوں نے کہا۔ چونکہ مجھے موضوع بحث سے کوئی دلچسپی نہ تھی' میں نے یہ غور نہیں کیا تھا کہ ان کا تجزیہ کیا تھا۔

کرنل رشید الدین خاں (آر۔ڈی خاں) نے مزید بتایا: ایک دن میں بھٹی کے ہاں گیا ......ایک جگہ پوسٹ ہوں تو ہم اکثر ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے تھے...... باتوں باتوں میں علوم دست شناسی' نجوم' جفر اور رمل پر بحث شروع ہو گئی (مختلف مسائل پر اکثر بحثیں کرتے رہتے تھے اور بھٹی کے ساتھ بحث کرنے میں بڑا لطف آتا تھا)

مجھے ان علوم سے کسی زمانے میں خاصی دلچسپی رہی تھی اور میں ان علوم کی صداقت کا قائل مگر بھٹی کو ان کی صداقت پر کچھ شکوک و شبہات تھے۔ ہم دونوں اپنے اپنے دلائل دے رہے تھے اور

سچی بات یہ ہے کہ میں ان کے منطقی دلائل کے سامنے بالکل بے بس ہو گیا۔ ہماری بحث میں خاصا جوش وخروش تھا۔ اتنے بیگم بھٹی نے انہیں اندر بلوایا اور کہنے لگیں ''کرنل صاحب ہمارے گھر آئے ہیں۔ آپ بحث میں انہیں لتاڑ رہے ہیں۔ آپ کو ان کا کچھ تو لحاظ کرنا چاہیے۔'' جواب میں کہہ رہے تھے ''بحث میں لحاظ کے کیا معنی۔ میں ان کے خیالات سن رہا ہوں اور اپنے ان کو پیش کر رہا ہوں۔ اس میں آخر بے لحاظی کی کیا بات ہے؟''

بحث میں بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے۔ کہتے تھے اس سے دماغ کو جلا ملتی ہے۔ دوسروں کا نقطہ نظر سمجھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ ہم دوسرے کی رائے یا دلیل سے قائل نہ ہوں تو بھی ہمیں اپنی رائے اور دلیل کو پرکھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اکثر بحث میں مسائل کے نئے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ کبھی ہم کو اپنی دلیل کے کھوکھلے پن کا احساس ہو جاتا ہے اور کبھی اس کی صحت اور توانائی کے لیے اور مواد ملتا ہے۔

البتہ بحث میں خواہ مخواہ مداخلت نہیں کرتے تھے۔ جب تک انہیں بحث میں حصہ لینے کے لیے کہا نہ جائے وہ خاموش رہتے تھے۔

مختلف مسائل پر دوسروں سے مشاورت بہت پسند کرتے تھے۔ کسی کام میں بھی مشورہ لینے سے نہیں ہچکچاتے تھے' حالانکہ وہ دوسرے انہیں مشورہ دیتے ہوئے ضرور شرماتے تھے' کیونکہ وہ ان کی بہتر معلومات کے معترف تھے۔ ان سے کسی مسئلہ پر کوئی مشورہ طلب کرے تو بڑی دلچسپی سے اور بڑی وضاحت سے اس کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈال کر مشورہ دیتے تھے۔

انداز فکر

مجھے یاد ہے کہ کوئٹہ میں آٹھ ڈویژن کے افسروں کے سامنے میجر عزیز بھٹی نے مصر کے ساتھ اسرائیل کی لڑائی یعنی سینائی مہم پر لیکچر دیا تھا۔ ساتھ ہی ماڈل مباحثہ بھی تھا۔ لیکچر اتنا کامیاب رہا کہ

کمانڈر انچیف کی طرف مبارکباد کا خصوصی پیغام آیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ میجر عزیز بھٹی کی افتاد طبع اور انداز فکر بالکل جرنیلوں جیسا تھا۔ وہ ہمیشہ

اپنے رینک سے بہت آگے نظر آتے تھے۔ میں دوستوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ ہم تو اس وقت سروس میں ہوں گے۔ عزیز بھٹی بلاشبہ اس ملک کا عظیم جرنیل ہوگا۔ کرنل آر۔ ڈی خاں کہنے لگے: میں اسے زندگی کا سب سے بڑا فخر سمجھتا ہوں کہ میجر عزیز بھٹی میرے شاگرد اور دوست تھے۔

آخری ملاقات

میجر عزیز بھٹی سے اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کرنل آر۔ ڈی خاں نے کہا: میں ان دنوں جی ایچ کیو میں ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ ڈائریکٹوریٹ کا جنرل سٹاف آفیسر نمبر ایک تھا ۔ وہ دفتر میں مجھے ملے۔ میں نے انہیں عشائیہ پر دعوت دی۔ وہ تشریف لائے۔ ہم دونوں نے اکٹھے زندگی کا آخری کھانا کھایا۔ ۷ اپنجاب کے میجر محمد اصغر ان کی بیگم اور میری بیگم اور بھاوج بھی اس دعوت میں شامل تھے۔ کھانے کے بعد دیر تک محفل جمی رہی۔ اس وقت کیا خبر تھی کہ ہم زندگی کا آخری کھانا اکٹھے کھا رہے ہیں۔

ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے تو اکثر کھانا اکٹھے کھاتے تھے۔ کبھی میں بھٹی کے ہاں چلا جاتا اور کبھی بھٹی میرے ہاں۔ بھٹی بڑے مہمان نواز تھے۔ وہ اکثر سب دوستوں کی دعوت کرتے تھے۔ اچانک کوئی مہمان آجائے تو بالکل بے تکلفی کے ساتھ ماحضر پیش کر دیتے تھے۔ مہمان کی خاطر مدارت کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔

ستمبر ۱۹۶۴ء میں جب ہم کرنل آر ڈی خاں سے ملے تو انہیں اپنے نئے عہدہ کا چارج لیے ابھی چند دن ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا: لاہور آتے ہی بھٹی کے ہاں گیا تھا اور یہ سوچ کر گیا تھا کہ وہاں ضبط سے کام لوں گا۔ مگر جونہی ڈرائنگ روم میں جوٹ کا بنا ہوا سرخ رنگ کا قالین دیکھا تو بے اختیار میری آنکھیں چھلک پڑیں اور پھر میں دیر تک روتا رہا۔ مجھے وہ لمحات تصور میں فلم کی طرح یاد آرہے تھے جب ہم دونوں نے کوئٹہ میں یہ قالین خریدا تھا۔

''شاگردان کے گرویدہ تھے''

میجر ایم اے برلاس نے کرنل آر ڈی خاں کے ہاں ایک ملاقات میں بتایا:

یوں تو کوئٹہ میں ہمارے چالیس سے زیادہ انسٹرکٹر تھے۔ مگر ان سب میں میجر عزیز بھٹی کی شخصیت منفرد اور ناقابل فراموش تھی۔ وہ اپنے شاگردوں میں بے حد ہر دلعزیز تھے۔ ہمارے ساتھ ان کا رویہ دوستانہ اور ہمدردانہ تھا۔ ہمیں جو بھی مشکل درپیش ہو وہ ہر وقت مدد کے لیے مستعد رہتے تھے۔ اگرچہ وہ اپنے مضمون پر مکمل طور پر حاوی تھے لیکن اس موضوع پر مزید مطالعہ بھی جاری رکھتے تھے۔

میجر برلاس نے بتایا: کہ ہمارے کورس میں بہت سے غیر ملکی بھی تھے جن میں عراق گھانا۔ نائیجیریا۔ لنکا اور ملائیشیا کے آفیسر بھی زیر تربیت تھے۔ میجر بھٹی غیر ملکی شاگردوں کے ساتھ اور بھی محبت اور التفات سے پیش آتے تھے اور وہ سبھی سب ان کے گرویدہ تھے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ بعض افسر تو ان سے والہانہ محبت وعقیدت رکھتے تھے۔ ان میں عراق کے میجر محمد عباس مظلوم اور ملائیشیا کے ثناء بن سطن قابل ذکر ہیں۔

ایک سوال کے جواب میں میجر برلاس نے کہا:

مظلوم' میجر محمد عباس کا تخلص نہیں تھا۔ ان کا اپنا نام صرف محمد تھا۔ عباس والد کا نام اور مظلوم دادا کا نام تھا۔ عراق میں نام عموماً مفرد ہوتے ہیں اور ساتھ کا باپ دادا کا نام لگا لیتے ہیں۔

ثناء بن سطن بھی مسلمان تھے۔ انگریزی میں ASNA لکھتے تھے۔ معلوم نہیں یہ ثناء ہے یا اثنیٰ ہے۔ البتہ سطن وہ سلطان کے معنوں میں بولتے ہیں۔

میجر برلاس نے میجر عزیز بھٹی کے ساتھ اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ میں اگست ۱۹۶۵ء کی ایک دوپہر کو جہلم سے لاہور آنے والی ایک بس میں سوار ہوا۔ سامنے دیکھا تو

عزیز بھٹیؒ صاحب تشریف فرما تھے۔ میں ملا' خلوص اور تپاک سے ملے' پہلے تو ایک کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے' مجھے قریب ہی جگہ مل گئی' راستے میں حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہے۔

"ناقابل فراموش کردار"

کھاریاں چھاؤنی میں میجر محمد یونس نے ایک ملاقات میں بتایا: میجر عزیز بھٹی کوئٹہ میں ہمارے انسٹرکٹر تھے۔ ہم نے دس ہفتے ان سے تربیت حاصل کی۔ ہمارے کورس کے اور بھی بہت سے انسٹرکٹر تھے۔ اور یہ مدت کوئی ایسی طویل بھی نہیں تھی۔ تاہم میجر بھٹی کے بارے میں میرا تاثر میرے ذہن میں ابھی تک اجاگر ہے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں کہ انہیں ملنے کے بعد کوئی شخص بھی انہیں فراموش نہیں کر سکتا۔

مجھے اس دوران کا کوئی بھی ایسا واقعہ یاد نہیں جسے خاص واقعہ کہہ سکوں۔ لیکن مجموعی طور پر میرے ذہن میں اثر ہے کہ وہ ہمارے ساتھ بے حد شفقت سے پیش آتے تھے۔ ان کی صورت بڑی اعتماد آفرین تھی اور وہ اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی تھے۔

''روپے پیسے کے معاملات میں''

سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس کوئٹہ سے جنوری ۱۹۶۵ء میں بطور سیکنڈ ان کمانڈ ۱۷ پنجاب رجمنٹ' لاہور پوسٹ ہوئے۔

ایک دن سارے افسر میس میں بیٹھے تھے۔ کیپٹن انور منیر الدین اڈجوٹنٹ آئے اور بتایا کہ انہیں فوری طور پر تین ہزار روپیہ کی ضرورت پڑ گئی ہے جن جن صاحب کے پاس جو کچھ ہے وہ دے دیں۔

سب سے پہلے میجر بھٹی بولے: ''منیر! تم ایسا کرو ابھی میرے ساتھ بنک چلو وہاں میرے کچھ پیسے ہیں وہ پہلے نکلوا لیتے ہیں' اس کے بعد دوسروں سے لے لینا۔'' چنانچہ وہ اسی وقت بنک گئے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ان کے بنک میں صرف پانچ سو روپے باقی ہیں۔ مینجر سے بات کر کے پانچ سو کا اوور ڈرافٹ لیا اور ایک ہزار روپیہ اسی وقت کیپٹن منیر کے حوالے کیا۔ باقی دوسروں سے بھی مل گئے۔ کچھ منیر کے اپنے پاس بھی۔ اس طرح اس کا مسئلہ حل ہو گیا۔

ان پر ہر شخص کو بے حد اعتماد تھا۔ جس کسی کو کوئی مسئلہ درپیش ہو وہ ان کے پاس جاتا تھا۔ ان کے ساتھیوں اور ماتحتوں کو تو ان کی ذات سے بے پناہ عقیدت تھی اور وہ ان کو اپنا سہارا سمجھتے تھے۔ وہ لوگ صرف سرکاری مسائل ہی میں نہیں بلکہ زندگی کے تمام مسائل میں ان پر اعتماد کرتے تھے اور ان سے مدد کے طلب گار ہوتے تھے۔ لین دین کے ایسے بیسیوں اور واقعات ہیں۔

ایک دن میس میں بیٹھے انہیں معلوم ہوا کہ ایک آفیسر الف کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ آفیسر ''ب'' نے ''الف'' سے کتنی رقم ادھار لے رکھی ہے اور ''الف'' کو اب اس کی ضرورت ہو گی۔ اور وہ لازماً ''ب'' سے مطالبہ کرے گا۔ کچھ دیر سوچ کر وہاں سے اٹھے۔ اور سیدھے آفیسر ''ب'' کے پاس گئے اور اسے پوچھا ''کیا تمہارے پاس اتنے پیسے ہیں؟'' اس نے کہا

’’جی ہاں! ہیں۔ کیا آپ کو چاہئیں؟‘‘

کہنے لگے ’’پوری اطمینان کرلیں کہ کیا واقعی آپ مجھے اتنے پیسے دے سکیں گے؟‘‘

اس نے کہا ’’بھٹی صاحب! ضرور دے سکوں گا۔‘‘

تو پھر اسے بتایا کہ ’’الف‘‘ کا تبادلہ ہو گیا ہے‘ مجھے یاد آ گیا کہ اسے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ جانے آپ کے پاس اتنے پیسے ہوں یا نہ ہوں۔ شاید میں کچھ مدد کرسکوں۔ اس لیے حاضر ہوا تھا مگر اب مجھے تسلی ہو گئی ہے۔‘‘

میجر شفقت بلوچ نے بتایا کہ ایک دفعہ جب میجر عزیز بھٹی کوئٹہ میں تھے تو مجھے پیسوں کی سخت ضرورت پڑ گئی اور باوجود کوشش کے کہیں اور سے نہ مل سکے میجر بھٹی قریب ہوتے تھے تو ان باتوں کے لیے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا تھا‘ وہ کوئی نہ کوئی انتظام کر دیتے تھے۔ جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو میں کوئٹہ میں میجر بھٹی کو خط لکھا کہ یا! مجھے اتنے پیسوں کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ میں جانتا تھا کہ ان کے پاس بھی پیسے مشکل سے ہی جمع ہوتے ہیں۔ بال بچوں کے اخراجات پورا کرنا ہی بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ مگر مجھے ان پر یہ اعتماد تھا کہ ان کے پاس جو کچھ ہوگا وہ بھیج دیں گے۔

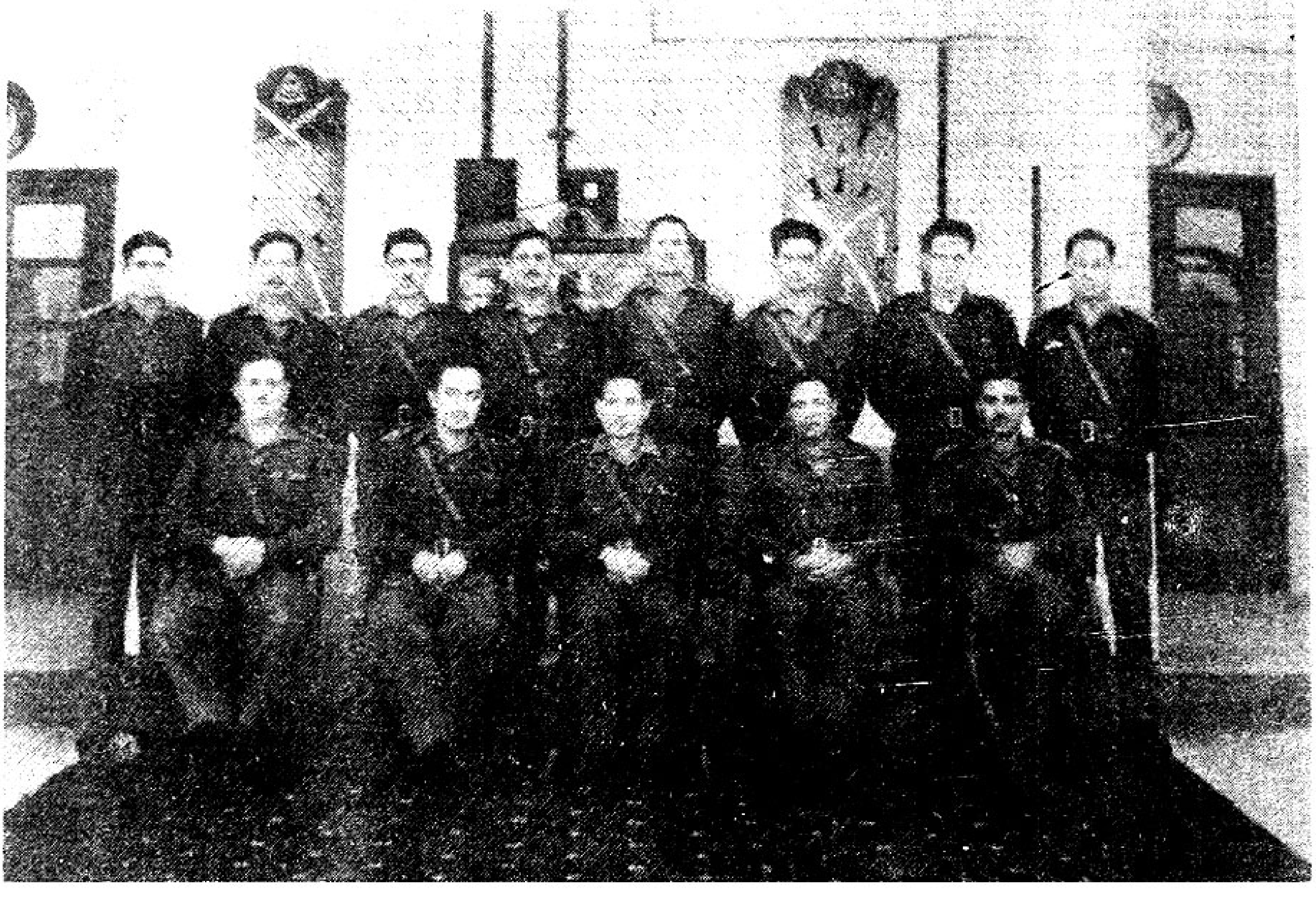

واپسی ڈاک انکا معذرت نامہ ملا۔ کہ افسوس آپ کا خط ایسے وقت ملا' جب میرے پاس کوئی نقد پیسہ نہیں۔ البتہ میں نے سوچا ہے کہ راولپنڈی میرے مکان کا کرایہ میرے لیے ایک فالتو ذریعہ آمدنی ہے۔ میں وہاں کیپٹن احسان الرحمٰن بخاری کو لکھ رہا ہوں کہ آئندہ وہ مجھے کرایہ بھیجنے کی بجائے آپ کو بھیج دیا کریں۔ جب تک آپ کی ضرورت پوری نہ ہو وہ آپ کو بھیجتے رہیں گے۔ میں انہیں خط لکھا اور ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد انہیں لکھ دیا کہ وہ یہ تکلیف نہ کریں۔ میرا کام بن گیا ہے۔ میں نے ایک خط کیپٹن بخاری کو بھی لکھ دیا کہ وہ کرایہ مجھے نہ بھیجیں بلکہ بدستور میجر بھٹی کو ہی بھیجتے رہیں۔

کیپٹن احسان بخاری اور کوٹھی کا کرایہ

راولپنڈی میں کوٹھی کے کرایہ کی بھی ایک دلچسپ داستان ہے........۱۹۵۹ء میں اس کی تعمیر کے بعد کچھ عرصہ بچوں کو وہاں رکھا۔ جرمنی جاتے ہوئے ان کو گھر بھیج دیا۔

کوٹھی ایک دوست' گجرات کے میجر رحمت اللہ قریشی کو بالکل معمولی سے کرایہ پر دے دی۔ ان کے دوست کیپٹن احسان الرحمٰن بخاری نے جی ایچ کیو میں آنے کے بچ بھاٹہ بازار میں اسی روپے ماہوار کے ایک فلیٹ میں رہنا شروع کیا۔ اکتوبر۱۹۶۲ء میں میجر بھٹی ایک دفعہ راولپنڈی تشریف لائے' تو وہاں فلیٹ میں ان کے پاس ٹھہرے۔ کہنے لگے "بخاری! یہ آپ کے رہنے کے لیے اچھی جگہ نہیں ہے"۔ بخاری نے کہا "بھئی! آخر میرے جیسے آدمی کو جو زیادہ کرایہ نہیں دے سکتا' راولپنڈی جیسے شہر میں جبکہ وہ مرکزی دارالحکومت بن چکا ہے اسی روپے میں یہ فلیٹ بھی غنیمت ہے"۔

کہنے لگے: "نہیں بھئی بخاری! میری کوٹھی خالی ہو رہی ہے۔ میجر رحمت اللہ قریشی کا تبادلہ ہو گیا ہے' آپ وہاں منتقل ہو جائیں"۔

کیپٹن بخاری نے ایک ملاقات میں یہ واقعہ سناتے ہوئے بتایا: ان کی اس تجویز پر میں نے کہا "خدا کے واسطے میری حالت پر رحم کرو۔ میں کوٹھی کا کرایہ کہاں سے دوں گا؟"

"نہیں کرایہ آپ سے زیادہ نہیں لوں گا۔"

میں جانتا تھا کہ رحمت اللہ قریشی بھٹی صاحب کے دوست اور وہ ان سے ایک مدت سے صرف ایک سو روپیہ ماہوار کرایہ لے رہے ہیں' حالانکہ اب یہ کوٹھی تین چار سو روپیہ ماہوار کرایہ پر دی جا سکتی ہے۔ رحمت اللہ قریشی کے جانے کے بعد لازمی طور پر اسے اچھے کرایہ پر دے کر استفادہ کرنا چاہیے۔ مگر میجر بھٹی بڑی سنجیدگی سے یہ اصرار کرنے لگے کہ میں فلیٹ سے کوٹھی میں منتقل ہو جاؤں۔ انہیں یہ بات گوارا نہ تھی کہ راولپنڈی میں ان کی وسیع کوٹھی ہو جو زیادہ کرایہ کے لالچ میں کسی اور کو

دے دی جائے اور ان کا دوست معمولی سے فلیٹ میں گزارہ کرے۔

جب انہوں نے میرے لیے کوئی جائے مفر نہ چھوڑی تو میں نے کرایہ کی بات کی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کتنی رعایت کیوں نہ کریں' بہر حال کرایہ کے تعین میں معقولیت ہونی چاہیے۔ مگر ان کی شرط یہ تھی کہ پہلے میں وہاں منتقل ہو جاؤں پھر وہ کرایہ کی بات طے کریں گے۔ جب میں وہاں چلا گیا تو انہوں نے مجھے لکھا ''قریشی! رحمت اللہ میجر ہیں' وہ سو روپے ماہوار کرایہ دیتے رہے ہیں۔ آپ کیپٹن ہیں' آپ اسّی روپے ماہوار دے دیا کریں۔'' میں نے کافی اصرار کیا کہ خدا کے بندے مجھے شرمندہ نہ کرو' مگر وہ بضدر ہے اور اپنی بات کو منوا کر چھوڑا۔ چنانچہ تب سے میں فلیٹ کے کرایہ پر راولپنڈی جیسے شہر میں کوٹھی میں مقیم ہوں۔

انہیں دنوں مجھے معلوم ہوا کہ ایک اور آفیسر نے میجر بھٹی کو کوئٹہ خط لکھ کر اس کوٹھی کے لیے کافی زیادہ کرایہ کی پیشکش کی ہے' جسے انہوں نے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ مگر انہوں نے مجھے یہ بات نہ بتائی' البتہ اس آفیسر نے میجر بھٹی کے جواب کی تندی اور تلخی کا اپنے کسی دوست سے ذکر کر دیا' تو بات چلتے چلتے مجھ تک بھی پہنچ گئی۔

ان کی شہادت کے بعد میں نے از خود کرایہ میں معقول اضافہ کر کے محترمہ بہن زرینہ اختر بھٹی کو ارسال کیا' مگر انہوں نے شہید کے مقرر کردہ کرایہ سے ایک پائی بھی زیادہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ میجر بھٹی اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت تھے کہ ان کو اپنے سفر حیات میں زرینہ اختر بھٹی کی صورت میں ایک ایسا رفیق ملا تھا' جس کے ساتھ قدرتی طور پر ان کی طبیعت کو بہت مناسبت تھی۔ شہید ہی استغناء اور قناعت کی دولت کے قارون نہ تھے' اس کا کچھ حصہ محترمہ زرینہ کے پاس بھی ہے۔

مگر میرے لیے اب اس وسیع و عریض کوٹھی میں رہنا جبکہ وہ میجر عزیز کے بچوں کے لیے ایک معقول کرایہ کا ذریعہ بن سکتی تھی' ممکن نہ تھا۔ چنانچہ بہن زرینہ کے ساتھ مشورہ کر کے اس کی ریکویزیشن کے لیے کوشش کی گئی۔ ریکویزیشن کے بعد سرکاری طور پر اس کی مکانیت اور جائے وقوع کے لحاظ سے اس کا کرایہ ۴۱۵ روپے ماہوار مقرر ہوا ہے۔

شانِ اِستغناء

اس دور کو بعض لوگ لکشمی دیوی کا دور بھی کہتے ہیں۔ کتنی اقدار دولت کی جھنکار اور چاندی کی چکاچوند کے سامنے ماند پڑ چکی ہیں۔ جب خیالات کی دنیا بسنے والے بڑے بڑے فلسفیوں کو زندگی کے تلخ حقائق سے واسطہ پڑتا ہے تو اپنے فلسفوں کو بھول جاتے ہیں اور مادی ضروریات کے لیے افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جب ہم اپنے ہیرو کی زندگی کے اس پہلو کا بہ نظر تحقیق مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی زندگی میں شروع سے لے کر آخر تک ایک عجیب شان استغناء پائی جاتی ہے۔ اس کی زندگی میں عجیب عجیب دور آئے۔ بچپن میں ان کے ہاں مادی وسائل کی فراوانی تھی۔ زندگی کی ساری آسائشیں میسر تھیں۔ مگر ہانگ کانگ پر جاپان کے تسلط کے بعد ان پر وہ لمحات بھی آئے کہ سینکڑوں روپے کی خوبصورت آبنوسی الماری دے کر چاولوں کی چند پلیٹیں نصیب ہوتی ہیں اور یہ بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ دوسرے وقت کا کھانا کہاں سے ملے گا؟

بچپن میں مادی وسائل کی فراوانی نیان کے مزاج میں استغناء اور قناعت پیدا کرنے میں تو مدد دی لیکن انہیں دولت پیدا کرنے کے جائز وسائل سے بھرپور تمتع سے کبھی بے نیاز نہیں کیا۔ نہ انہیں اسراف اور فضول خرچی سکھائی۔ وہ دولت کو ضروریات زندگی کے حصول کے لیے ناگزیر سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے حصول رزق کے لیے زندگی میں زیادہ زیادہ محنت کرنے سے کبھی اجتناب نہ کیا۔ وہ جرمنی زبان کے سرکاری ترجمان تھے اور اس کام کے لیے انہیں الگ معاوضہ ملتا تھا۔ وہ بڑے شوق اور انہماک سے یہ کام اپنے فارغ اوقات میں سرانجام دیتے تھے۔

لیکن دولت کو انہوں نے کبھی مقصود بالذات نہیں گردانا۔ ہانگ کانگ پر جاپان کے تسلط کے تاریک ترین دور میں جب ان کی تنگ دستی بے بسی کی حدود کو چھونے لگی تھی تو بھی ان کے ذہن میں عدم تحفظ کا وہ احساس کبھی نہیں پیدا ہوا کہ وہ دولت کو زندگی کی دوسری قدروں پر ترجیح دینے لگتے یا

حصول دولت کو زندگی کا نصب العین قرار دے دیتے۔ البتہ اس ابتلاء سے ان میں یہ احساس ضرور پیدا ہوا کہ مادی وسائل سے محروم لوگ کن پریشانیوں سے دوچار رہتے ہیں اور ان کے لیے چھوٹی موٹی امداد بھی انہیں زندگی کی کن مسرتوں سے ہم کنار کردیتی ہے اور کوذا امداد کرنے والے کو حیات کی کن لطیف مسرتوں سے آشنا کرتا ہے۔

ہوس دولت ایک نفسیاتی بیماری ہے

ان کی چھوٹی بہن محترمہ رشیدہ نے بتایا: ''بھائی عزیز اکثر یہ کہتے تھے کہ ضروریات زندگی کے لیے ہمیں زیادہ سے زیادہ سے کمانا چاہیے۔ مگر دولت کی ہوس تو ایک نفسیاتی بیماری ہے خدا اس سے محفوظ رکھے۔ ایسے لوگ خود بھی زندگی کی حقیقی خوشیوں سے محروم رہتے ہیں اور دوسروں کو اس سے محروم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے:

''جس دل میں دولت کی ہوس ہو، بھلا وہ دل بھی زندگی کی حقیقی مسرتوں سے آشنا ہو سکتا ہے؟''

دوسروں کو بھی تو......

دولت جمع کرنے یا محض جائیداد بڑھانے کی طرف شروع سے ہی انہیں کوئی رغبت نہ تھی ۔ان کی بہن محترمہ طاہرہ کہنے لگیں:

ایک دفعہ عزیز گھر رخصت پر آئے تو بابو جی (والد صاحب) نے بڑے اشتیاق سے بالتفصیل ان کو بتایا کہ انہوں نے گاؤں میں کون کون سی زمین خرید لی ہے اور کون کون سی خریدنے کا پروگرام ہے۔ میں دیکھا عزیز والد صاحب کی بات میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے۔ آخر سن کر کہنے لگے: ''بابو! خدا آپ کو مبارک کرے۔ لیکن دوسروں کو بھی اپنی جائیدادیں بڑھانے کا موقعہ دیجئے''۔ مجھے وہ الفاظ اب تک یاد ہیں۔ عزیز نے انگریزی میں کہا تھا:

"God bless you, father, let other, too, expand"

سخت محنتی

وہ کمانے کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کرتے تھے۔ ان کے والد نے بتایا کہ گھر رخصت پر آتے تو اکثر فائلیں بھی ساتھ لے آتے تھے۔ ایک دفعہ میں پوچھا کہ یہ فائلیں کیسی ہیں؟ تو کہنے لگے ”یہ جرمن زبان کی ہیں اور مجھے ان کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرنا ہے“۔

”مگر راجہ تم گھر بھی کام ساتھ لے آتے ہو“۔

کہنے لگے بابو جی! جرمن زبان سے ترجمہ میرا مشغلہ بھی ہے اور پھر اس کا معقول معاوضہ بھی ملتا ہے، مثلاً اس کے پانچ سو روپیہ کے قریب مل جائیں گے۔ وہ کام انتھک تھے۔

دوسروں کا حق

اس ضمن میں ۷اپنجاب کے نائیک کلرک خالد اقبال نے بتایا کہ وہ جس ٹائپسٹ سے جرمن زبان کا ترجمہ ٹائپ کرواتے تھے، اسے اپنے معاوضہ کا دس فیصد دیتے تھے۔ دفتر کے سارے ٹائپسٹ ان کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان سے اتنی محبت رکھتے تھے کہ وہ ٹائپ کا معاوضہ لینے سے انکار کردیتے۔ مگر وہ کسی سے بغیر معاوضہ کام نہیں کرواتے تھے۔ کہتے تھے تمہاری سرکاری ڈیوٹی ہے، نہ میری سرکاری ڈیوٹی، مجھے اس کا زائد معاوضہ ملتا ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ میں تو اپنی محنت کا معاوضہ لوں لیکن آپ کو اس سے محروم رکھوں۔ اگر آپ قبول نہیں کریں گے تو میرے دل پر اس کا بوجھ پڑے گا اور مجھے بازار سے ٹائپ کروانا پڑے گا۔ ان کی اس دلیل کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ وہ سب ان کی طبیعت کو سمجھ گئے اس لیے وہ معاوضہ لے لیتے تھے۔ (جو ٹائپ کے عام معاوضے سے زیادہ ہوتا تھا)

غریب پروری

عزیز طبعاً بڑے غریب پرور تھے۔ وہ ہر وقت اس دھن میں رہتے تھے کہ دوسروں کے کام آسکیں۔ اس میں انہیں ایک طرح کی روحانی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ ان کی غریب پروری کے

کئی ایک واقعات ہیں مثلاً:۔

لادیاں کے قریب ایک گاؤں موضع اودھے میں ایک شخص کی چینی بیوی تھی ۔ وہ اسے ہانگ کانگ سے بیاہ کر لایا تھا۔ میجر عزیز کا سارا کنبہ چینی زبان خوب سمجھتا تھا' اس لیے وہ خاتون ان سب سے بہت مانوس تھی ۔ کچھ عرصہ بعد اس کا خاوند فوت ہوگیا اور چار چھوٹے چھوٹے یتیم بچے رہ گئے ۔ عزیز کو اس کے بیوہ ہونے کا علم ہوا تو عزیز نے بلا تاخیر ان کے لیے معقول وظیفہ مقرر کر دیا ۔ بڑے لڑکے کے برسر روزگار ہونے پر انھوں نے میجر عزیز کو شکریہ کا خط لکھ کر یہ امداد لینا بند کر دی ۔ عزیز نے والدہ کو لکھا کہ اب کسی اور مستحق کو ہر ماہ یہ امداد دے دیا کریں' چنانچہ گاؤں کی دو اور بیوگان کو یہ وظیفہ دیا جانے لگا۔ ان کے علاوہ بھی عزیز گاؤں کا بیوگان اور یتیموں کی امداد کرتے تھے ۔

ان کے پاس روٹی کپڑے اور بیس روپے ماہوار پر گاؤں کا ایک ذاتی ملازم تھا۔ وہ اپنے باپ کی وفات پر گھر گیا تو عزیز نے اسے تنخواہ کے علاوہ معقول نقد رقم دے کر سمجھایا کہ تم غریب لوگ ہو' دیہات کی غلط رسموں میں پڑ کر زیادہ خرچ نہ کرنا۔ مگر جب معلوم ہوا کہ وہ مزید چالیس روپے کا مقروض ہو گیا ہے تو عزیز نے اسے بتائے بغیر اس کی والدہ کے نام چالیس روپے کا منی آرڈر بھیج دیا۔

جب اس بڑھیا کو منی آرڈر ملا تو وہ عزیز کے والدین کے پاس آئی اور بتایا کہ عزیز نے چالیس روپے بھیجے ہیں' معلوم نہیں یہ کیسے ہیں؟ ماسٹر جی اسے کہا کہ وہ خط لکھ کر پوچھ لے۔ چنانچہ ان نے خط لکھوایا تو عزیز نے جواب میں اپنے کو لکھا کہ ان لوگوں نے غریب ہونے کے باوجود خواہ مخواہ قرض لے کر خرچ کیا ہے۔ سوچتا ہوں اتنی تنخواہ میں یہ لوگ کب جا کر قرض اتاریں گے' اس لیے میں نے یہ روپے ان کی امداد کے لیے بھیجے ہیں ۔ آپ ان کو سمجھا دیں کہ وہ اپنا قرض ادا کر دیں۔

بڑھاپے کا احترام

بوڑھوں کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے ۔ بیگم بھٹی کہنے لگیں: مجھے یاد ہے ایک دفعہ ایبٹ آباد میں ہم سیر سے واپس آرہے تھے' بھٹی صاحب نے دور سے ایک سفید ریش شخص کو

لکڑیوں کا ایک گٹھا اٹھائے آتے دیکھا۔ مجھے وہیں کھڑا کر کے اس کی طرف چلے گئے۔ اس کے قریب جا کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس کی مٹھی میں کچھ دیا اور واپس آ گئے۔ میں نے کہا آپ تو کہا کرتے ہیں کہ صرف مستحق لوگوں کو ہی دینا چاہیے۔ آپ کو کیوں کر معلوم ہوا کہ وہ مفلس اور واقعی مستحق ہے۔

کہنے لگے، زرینہ! بوڑھے کی عمر ۹۰ سال سے زائد معلوم ہوتی ہے اور لکڑیوں کا اتنا بڑا گٹھا اٹھائے ہوئے ہے کہ بیچارے سے چلا بھی نہیں جاتا۔ اگر غریب اور مستحق نہیں ہے تو کیا امیر یہ کام کرتے ہیں؟ میں لاجواب ہو گئی۔

وہ غیر مستحق اور ہٹے کٹے بھکاریوں کو خیرات دینے کے خلاف تھے۔ کہتے تھے انہیں دینے سے مستحق لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔

لاہور چھاؤنی ہمارے بنگلوں میں ایک بوڑھا پھیری والا منیاری کا سامان فروخت کیا کرتا تھا۔ مہینہ بیس دن بعد وہ ضرور چکر لگاتا تھا۔ بہت بوڑھا تھا۔ اپنی عمر ۱۰۰ سال سے زائد بتاتا تھا۔ میجر صاحب کہتے تھے ان باباجی سے ضرور کچھ نہ کچھ خرید لیا کرو۔ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی بجائے خود محنت کرتے ہیں، کتنا بلند عزم ہے۔

میں کہتی تھی باباجی کے پاس ردی سامان ہوتا ہے۔ ہم ان سے کیا خریدا کریں، فرماتے کچھ بھی ہو، جو چیزیں یہ لاتے ہیں ضرورت کی چیزیں ہیں وہ اور کہیں سے نہ لیا کرو۔ آپ کچھ نہ لیں گی تو میں اپنے پاس سے انہیں روپیہ دو روپے دے دیا کروں گا۔

چنانچہ ہم باباجی سے چار پانچ روپے کا سامان ضرور خریدتے اور شہید خوش ہو جاتے تھے۔ رہائش تبدیل ہو جانے کے بعد وہ باباجی پھر نہیں ملے نہ جانے کس حال میں ہیں۔ میں چاہتی ہوں اب بھی وہ آیا کریں تو میں ان سے وہ چیزیں خریدا کروں۔

شاپنگ

ایک دفعہ ہم شاپنگ کے لیے گئے تو میجر صاحب بھی ساتھ تھے۔ چھوٹی بہن فاطمہ کے لیے قمیض کا کپڑا خریدنا تھا۔ بوڑھا سا دکاندار تھا۔ اس نے ایک کپڑے کا بھاؤ چھ روپے گز بتایا۔ ہم

نے پانچ روپے گز کہا تو دکاندار کہنے لگا نہیں جی! ''ساڑھے پانچ روپے تو میری اپنی خرید ہے' اس پر کچھ نہ کچھ منافع بھی لینا ہوتا ہے۔ ہم پانچ پر اڑے رہے۔ قریب تھا کہ ساڑھے پانچ روپے گز پر سودا ہو جاتا' مگر میجر صاحب سے نہ رہا گیا' کہنے لگے ''چھوڑو زرینہ! بابا ٹھیک کہتا ہے۔ چھ روپے گز ہی ٹھیک ہے۔ پیسے دو!''

ہم نے راستہ میں ان سے کہا۔ آپ نے خواہ مخواہ ۸ آنے گز زیادہ دلوائے ہیں۔ کہنے لگے: ''چلو بوڑھا آدمی ہے۔ وہ زیادہ لے گیا تو کیا حرج ہے؟''

ان کی شاپنگ بڑی عجیب تھی۔ دکاندار جتنے دام مانگے اتنے ہی دے دیتے تھے۔ اگر قیمت زیادہ سمجھیں تو وہ چیز خریدتے ہی نہیں تھے' مگر وہ سودا نہیں کرتے تھے۔ میں اکثر ان سے جھگڑتی تھی کہ آپ کو چیزیں خریدنے کا کوئی پتہ ہی نہیں ہے۔ لوگ اتنے ہشیار اور سیانے ہوتے ہیں کہ کافی دیر سودا کرتے ہیں' بعد میں چیز خریدتے ہیں مگر آپ ہیں کہ جو کچھ دکان دار مانگے وہی دے آئے۔ پتہ نہیں لوگ آپ کو اتنا لائق کیوں سمجھتے ہیں؟

مسکرا کر جواب دیتے ''زرینہ! تم ہماری قدر کیا جانو!''

ایک روح پرور تقریب

''لانس نائیک شیر شاہ کے واقعہ سے دو نتیجے اخذ ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ اپنے فرض کی ادائیگی میں بڑی سے بڑی قربانی بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ دوسرے یہ کہ جو لوگ یہ عظیم قربانی دیتے ہیں ان کا نام ہمیشہ کے لیے بہادروں کی تاریخ میں جگہ حاصل کر لیتا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے نہ صرف ایک قابل رشک مثال کا کام دیتا ہے بلکہ ان کو حوصلہ اور ہمت بھی عطا کرتا ہے''۔

میجر جنرل اختر حسین ملک ان الفاظ میں پنجاب رجمنٹ کے ایک جیالے فرزند لانس نائیک شیر شاہ کو خراج تحسین ر ادا کر رہے تھے۔ جسنے ۲۰/۱۹ جنوری ۱۹۴۵ء کی درمیانی رات کو برما کے محاذ پر داد شجاعت دیتے ہوئے جان دے دی تھی۔ ان کی اس عظیم بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے سلطنت برطانیہ نے لانس نائیک شیر شاہ کو بعد از وفات وکٹوریہ کراس عطا کیا' جو پاکستان کے بہادری کے سب سے بڑے اعزاز ''نشان حیدر'' کے برابر ہے۔

پنجاب رجمنٹ اپنے اس عظیم فرزند کی یاد میں ''یوم شیر شاہ'' مناتی ہے۔ گزشتہ سال ۲۷ مارچ ۱۹۶۵ء کو یوم شیر شاہ سیالکوٹ میں منایا گیا جہاں ایک عظیم دربار میں رجمنٹ کے افسروں کا ایک شاندار اجتماع بھی ہوا۔

میجر جنرل یحیٰ خاں نے اس موقعہ پر لانس نائیک شیر شاہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''اس بٹالین کے کارہائے نمایاں قابل فخر ہیں اور آپ ان پر جتنا بھی ناز کریں کم ہے...... شیر شاہ نے اپنی جان قربان کی تا کہ بٹالین اور آپ کی فوج کا نام زندہ رہے۔ یہ ایک ایسی قربانی ہے جس پر ہر سپاہی بجا طور پر فخر کر سکتا ہے .... آج جب ہمیں اپنی قوم اور اپنے ملک کی خاطر لڑنا ہے تو اپنی زریں تاریخ کو روشن کرنا ہم سب کا فرض ہے..................

میں دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ شیر شاہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہماری فوج کے ہر سپاہی کو شیر شاہ جیسی شجاعت عطا فرمائے............''۔

میجر جنرل اختر حسین ملک نے دربار سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''اس بٹالین کی خدمات واقعی قابل تعریف اور تقلید ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ بٹالین کے ہر فرد پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ وقت آنے پر ان شاندار روایات کو آگے بڑھاوے۔

دربار میں بٹالین کے سابق کمانڈنٹ صاحبان نے اپنے اپنے وقتوں کے قصے سناتے ہوئے بٹالین کے عظیم الشان ماضی پر روشنی ڈالی اور امید ظاہر کی وقت پڑنے پر بٹالین کا جوان شیر شاہ ثابت ہوگا۔

اس ساری کارروائی کے دوران میرے سامنے بیٹھے ہوئے میرے ایک دوسرے آفیسر انتہائی محویت کے ساتھ یہ تقریریں سن رہے تھے۔ ان کی نیم وا آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ یوں انہماک سے متوجہ تھے گویا ایک ایک لفظ ان کے دل و دماغ پر اپنے انمٹ اثرات مرتسم کر رہا ہو۔

''فرض کی ادائیگی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کوئی معنی نہیں رکھتی ...... جو لوگ عظیم قربانی دیتے ہیں ان کا نام ہمیشہ کے لیے بہادروں کے تاریخ میں زندہ رہتا ہے اور آنے والی نسلوں کے قابل رشک مثال کا کام دیتا ہے''

شاید وہ یہ سوچ رہے تھے کہ وقت آنے پر ان شاندار روایات کو کیونکر آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

جب کمانڈنٹ صاحبان عظیم الشان ماضی کے عظیم قصے سنا رہے تھے تو میں دیکھا کہ یہ نوجوان افیسر ماضی کے ان قصوں میں دلچسپی کی بجائے اب کچھ اور سوچ رہا ہے۔ وہ کیا سوچ رہا تھا ؟ یہ میں اس وقت نہ جان سکا، لیکن اب یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ عظیم الشان ماضی میں دلچسپی کی بجائے عظیم الشان مستقبل کی ایک عظیم داستان کی تصنیف میں مصروف تھا۔ وہ پنجاب رجمنٹ کی ان شاندار روایات کو آگے بڑھانے کے لیے بے قرار تھا...... مگر اس وقت کون اندازہ کرسکتا تھا کہ صرف ۱۶۸ دن کے اندر یہ نوجوان آفیسر پنجاب رجمنٹ کے لانس نائیک شیر شاہ مرحوم کیپٹن محمد سرور شہید اور میجر طفیل محمد شہید کی عظیم روایات کو اوج ثریا پر لے جائے گا۔

میرے سامنے بیٹھے ہوئے خاموش آفیسر ۱۷ پنجاب کے میجر راجہ عزیز بھٹی تھے۔ وہ لاہور سے تشریف لاوے تھے اور میں جی ایچ کیو کے شعبہ آئی ایس پی آر سے فوجی اخبار ''ہلال'' کے لیے دربار کی کاروائی کی رپورٹ لینے سیالکوٹ گیا گھا۔ ہم دونوں ایک ہی کمرہ میں ٹھہرے تھے ۔میجر عزیز بھٹی سے میری یہ چوتھی ملاقات تھی۔

اس ملاقات کو یاد کر کے کیپٹن محمد صدیق سالک کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا: پہلی دو ملاقاتوں میں تو سرسری علیک سلیک ہوئی مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ میں نہ صرف گجرات بلکہ ان کے گاؤں لادیاں سے بالکل قریب موضع مگلیاں کا رہنے والا ہوں تو اسی ملاقات میں بے تکلف دوست بن گئے۔ ان کی شخصیت میں ایک طرح کا جادو تھا اور وہ اپنی کشش سے دوسرے انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ میں بھی کھنچ کر ان کے قریب چلا گیا۔

شہید کا تحفہ

جب سیالکوٹ میں ہم تقریب سے فارغ ہوئے اور میں راولپنڈی روانہ ہونے لگا، تو انہوں نے اٹیچی کیس سے دو خوبصورت ٹائیاں نکال کر مجھے تحفۃً دیں۔ پہلے میں نے ذرا تامل کیا تو اصرار کرنے لگے۔ البتہ جب میں لینے پر آمادہ ہوا تو پھر رکھ دیں۔ میں نے اب بے تکلف ہو کر کہا ''بھٹی صاحب! میں قبول کرنے پر آمادہ ہوا ہوں تو آپ نے رکھ دی ہیں۔''

ناقابل فراموش تبسم کے ساتھ فرمانے لگے:

''صدیق صاحب! صرف ایک شرط پر دیتا ہوں''

''وہ شرط کیا ہے؟''

"You wear them often and remember me often."

''یعنی انہیں اکثر پہنا کرو اور مجھے اکثر یاد کیا کرو''۔

''بھٹی صاحب! یہ بھی کوئی شرط ہے''۔

میں ان کی اس معصوم تمنا پر ہنس پڑا۔

چنانچہ ان کے ساتھ ''آخری دفعہ'' ہاتھ ملایا اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔

وہ دونوں ٹائیاں میں خوب پہنا کرتا اور وہ اکثر یاد آتے تھے۔ لیکن ان کی شہادت کے بعد تو وہ میرے لیے زندگی بھر کے عظیم تحفہ اور Souvenir کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔ میں انہیں پہننے کی بجائے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں مگر انہیں پہننے پر مجبور ہوں۔ شہید کی اس شرط کو پورا کرنے کے لیے............''۔

ذوق معالعہ

تاریخ ساز شخصیتوں کو تاریخ کے مضمون سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے“

_______ لڈوِگ

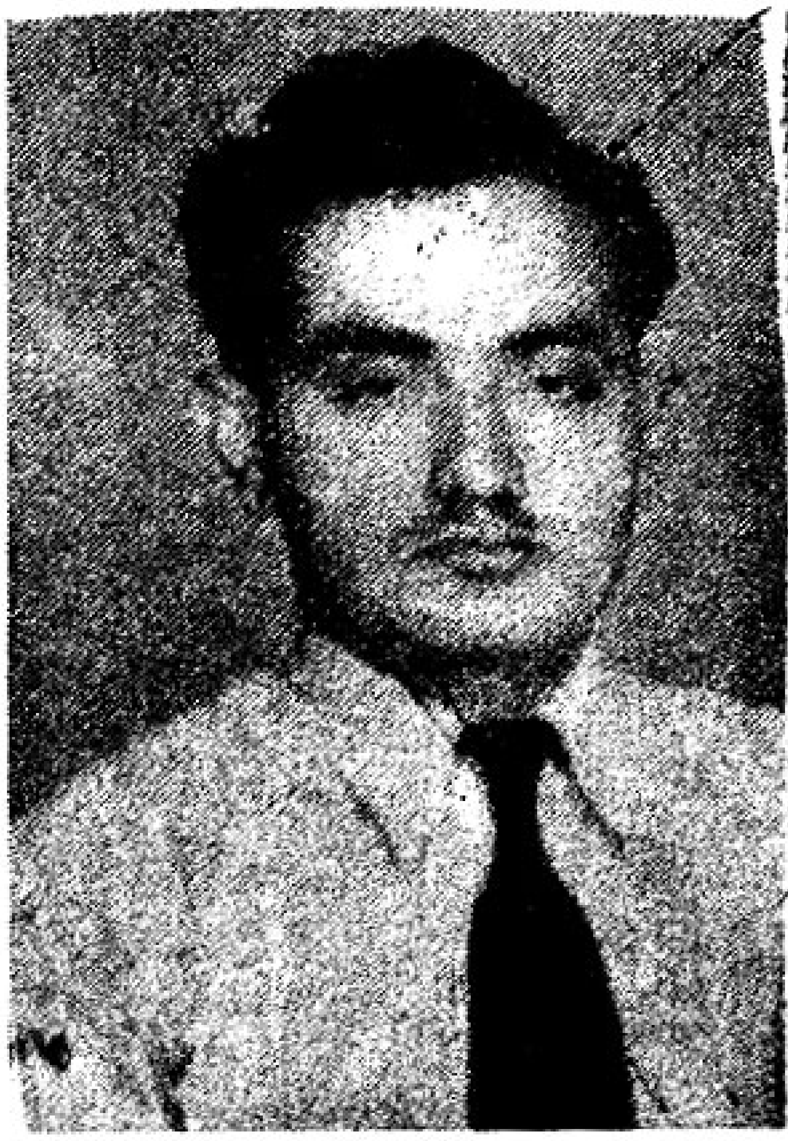

میجر شفقت بلوچ نے میجر عزیز بھٹی کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہووے کہا: میں نے زندگی میں انہیں صرف ایک دفعہ ناراض ہوتے دیکھا ہے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بالکل ابتدائی ایام میں ایک دن مجھے ساتھ لے کر ملٹری سٹیشن لائبریری گئے' کچھ کتابیں واپس کرنے کے لیے اور کچھ نئی جاری کرانے کے لیے۔

جب لائبریرین نے کتابیں واپس کر لیں تو اس نے کہا آپ کے نام دیر سے کتابیں واپس کرنے پر پانچ روپے جرمانہ بھی ہے۔ کہنے لگے ''اچھا!''

فرسودہ قواعد اور ان کی غلط تعبیر

پھر کچھ سوچ کر طبیعت میں ملال آ گیا کہنے لگے ''یہ قواعد و ضوابط کتنے غلط اور فرسودہ ہیں' یا ان کی کتنی غلط تعبیر ہوتی ہے۔ ارباب متعلقہ کو تو چاہیے کہ میرا شکریہ ادا کیا کریں کہ میں ان کتابوں سے استفادہ کرتا ہوں۔ اس زمانے میں سنجیدہ اور فکر انگیز موضوعات پر کتابیں پڑھنے والے کتنے ہیں؟ بھلا کتنے مسلمان ہیں جنہیں مطالعہ کا شوق ہے؟''

میجر بھٹی کہے جا رہے تھے۔ ''اس زمانے میں تو ہمیں اس قسم کے لٹریچر کا مطالعہ کرنے

والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور انہیں نفسیاتی ترغیبات سے اس طرف راغب کرنا چاہیے۔ اس کی بجائے ان فرسودہ قواعد پر عمل کر کے ہم انہیں ان کتابوں سے اور دور رکھتے ہیں"

میں نے کہا "بھٹی یار............! "آپ تو کبھی ناراض نہیں ہووے تھے۔ آج کیا بات ہے؟ کہنے لگے "بلوچ! مجھے اس بات پر رونا آتا ہے کہ ہم لوگ کتنے بے حس ہیں؟ ہم قانون اور روایات کی روح کو فراموش کر دیتے ہیں اور قواعد ضوابط کو پلے باندھ لیتے ہیں۔ آخر یہ قواعد وضوابط کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بنائے گئے تھے' مقصود بالذات نہ تھے۔ یہ قواعد وضوابط اس وقت تک مفید اور کارآمد تھے جب کتابیں پڑھنے والے بہت زیادہ تھے۔ اور کتابیں کم۔ اگر ایک آدمی کتاب بروقت واپس نہ کرے تو دوسرا خواہش منداس سے محروم رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے آدمی کو وقت پر کتاب واپس کرنے کے لیے مجبور کرنے کے لیے اس کو جرمانہ کیا جاتا تھا۔ یہ قابل فہم بھی تھا اور ضروری بھی۔ لیکن جہاں حالت یہ ہو کہ ہزاروں نہیں لاکھوں روپے کی قیمتی کتابیں الماریوں میں بےکار پڑی رہتی ہیں یا انہیں دیمک چاٹتی رہتی ہے تو اس سے آخر کیا فرق پڑتا ہے کہ ایک شخص ایک کتاب کو چند یوم زیادہ اپنے پاس رکھ لے۔ جرمانہ ایک معمولی بات ہے لیکن اس کے نفسیاتی اثرات کا بھی تصور کریں۔ اب تو ایسے قواعد مرتب کرنے چاہئیں جو لوگوں کو مطالعہ اور مفید کتابیں پڑھنے کی ترغیب دلا سکیں"۔

میجر عزیز نے کتابیں واپس کر کے ایک کتاب اور جاری کروائی۔

دوسرے دن مجھے ساتھ لے کر پھر لائبریری گئے۔ لائبریرین کو کل والا پانچ روپے جرمانہ ادا کیا' مگر وہ جرمانہ لیتا نہیں تھا کہ "نہیں صاحب! آپ جرمانہ رہنے دیں"۔ میجر بھٹی کہنے لگے "نا بابا! یہ تو جرمانہ ہے یہ تو بہر حال دینا ہے۔ میرا اعتراض جرمانے پر تو نہیں تھا۔ میں تو ان فرسودہ قواعد وضوابط کا رونا رو رہا تھا جن کو بدلنے کی آج تک ضرورت محسوس نہیں کی گئی"

لائبریرین سے ملاقات

اس واقعہ کی مزید تفصیل معلوم کرنے کے لیے ہم ملٹری سٹیشن لائبریری گئے۔ لائبریرین

وہاں موجود نہ تھے۔ ان کے ایک نائب سے رجسٹر لے کر ہم وہ کتابیں نوٹ کرنے لگے جو میجر عزیز بھٹی شہید اس دوران پڑھتے رہے تھے۔ ۲۰ اپریل ۱۹۶۵ء سے ۴ ستمبر ۱۹۵۶ء تک ۱۳۴ دنوں میں انہوں نے ۳۲ کتابیں پڑھ ڈالیں جن میں کافی ضخیم کتابیں بھی شامل ہیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر تاریخ اور ملٹری ہسٹری پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ سوانح عمری' فوجی مہمات' سیاسیات' ادب اور مذہب کے موضوعات پر کتابیں بھی شامل تھیں۔

تاریخ سے انہیں شروع سے ہی انتہائی دلچسپی تھی۔ ان کے اس انتہائی شغف کو دیکھ کر اس تاریخی کلیہ کی صداقت پر یقین لانا پڑتا ہے کہ:

"تاریخ بنانے والوں کو تاریخ سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے"۔

اتنے میں لائبریرین نائب صوبیدار محمد اعظم بھی آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی اپنے نائب کو سخت جھاڑ پلائی کہ تمہیں کہہ دیا گیا ہے کہ یہ رجسٹر میری اجازت کے بغیر کسی کو مت دکھاؤ۔ ہنگامی حالات میں اس میں افسروں کے پتے درج ہوتے ہیں' فوجی راز فاش ہونے کا خطرہ ہے"۔

پھر ہم سے متعارف ہوئے جب ہم نے (میرے ساتھ چوہدری محمد اشرف بھی تھے) ان سے پوچھا کیا میجر عزیز ستمبر کے پہلے ہفتے کتابیں واپس کرنے آئے تھے اور جرمانہ کا سن کر کچھ ناراض ہوئے تھے۔؟

وہ حیرت زدہ ہو کر کہنے لگے "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

ہم نے بتایا کہ میجر شفقت بلوچ کی زبانی سنا تھا' اب اپ سے اس کی تصدیق چاہتے ہیں۔ کہنے لگے "ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ ۳ ستمبر کی بات ہے۔ میجر عزیز بھٹی اور میجر شفقت بلوچ تشریف لائے تھے' میں نے یہاں نیا نیا چارج لیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میری ان سے کوئی واقفیت نہ تھی اور میں اپنے فراض منصبی کے قواعد وضوابط کا سخت پابند ہوں۔ بلکہ اس بات کے لیے بدنامی کی حد تک مشہور ہوں۔ ابھی آپ نے دیکھا ہے کہ میں نے آپ سے باتکرنے سے قبل اپنے آدمی کو قواعد کی خلاف ورزی پر سختی سے ٹوکا ہے۔ معاف کیجئے! آپ اسے محسوس نہ کریں (ہم نے کہا ہم تو اس سے محفوظ ہوئے ہیں)۔

ایسے ہی میں نے رجسٹر دیکھ کر میجر عزیز بھٹی کو بھی جرمانہ سنا دیا۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو ''اچھا'' کہا مگر پھر جیسے انکو یہ بات ناگواری گزری وہ شفقت بلوچ سے باتیں کرتے ہوئے کہنے لگے:

''یہ قواعد وضوابط کی کتنی غلط تعبیر ہے۔ اب تو لوگوں میں اچھے لٹریچر کا ذوق مطالعہ پیدا کرنے کے لیے ان کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے اور یہ ابھی تک ان فرسودہ قواعد پر عمل کر رہے ہیں۔ میجر صاحب کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ مجھے ان کی ایک ایک بات بے حد پسند آئی''

دوسرے دن میجر بلوچ کے ہمراہ پھر تشریف لائے۔ جرمانہ دینا چاہا تو میں نے کہا آپ جرمانہ نہ دیں۔ کہنے لگے نہ بھئی! سوال جرمانے کا نہیں ہے۔ جب تک قواعد یہی ہے یہ تو آپ کو لینا پڑے گا۔ چنانچہ میرے اصرار کے باوجود انہوں نے پانچ روپے جمع کرادیے۔ میں ان کی فلسفیانہ گفتگو سے بڑا متاثر ہوا اور ان کی عظمت کا قائل ہو گیا۔

جب سے وہ لاہور تشریف لائے تھے، وہ مسلسل کتابیں نکلواتے رہے۔ چار پانچ کتابیں ہر وقت ان کے پاس رہتی تھیں اور قواعد کے مطابق دو ہفتہ بعد انہیں واپس کر کے نئی جاری کروالیتے تھے۔

البتہ جب ۳ ستمبر کو آئے تو ۷ استمبر کو واپس کرنے کے لیے صرف ایک کتاب جاری کروائی ۔ دوسرے دن تشریف لائے تو کتاب بھی واپس دے گئے۔ کہنے لگے۔ بس رات کو ہی سونے سے قبل ختم کر لی تھی۔

ان کی شہادت کے بعد میں لائبریری کے رجسٹروں کی پڑتال کروائی۔ ان کے نام کوئی کتاب نہ تھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ ۴ ستمبر کو انہوں نے پہلی دفعہ کتاب واپس کرنے کے بعد کوئی نئی کتاب جاری نہ کروائی۔ انہوں نے ۲۰ اپریل سے ۴ ستمبر تک جو کتابیں جاری کروائیں۔

بیگم زرینہ اختر بھٹی نے بتایا:۔

دو ماہ کی چھٹی میں زیادہ وقت مطالعہ میں مصروف رہتے۔ زیادہ تر ملٹری ہسٹری پڑھتے تھے۔ کئی دفعہ کہا آپ ہر وقت کتابوں میں ہی سر دیے رہتے ہیں، دنیا جہاں کی ہوش نہیں ہے۔ کہنے

لگے میں آرمی سے دور رہا ہوں۔ پڑھا نہیں گیا۔ جب تک ہم اپنی معلومات کو پورا نہ کریں ہم ان کی کمان کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

جب میں کمرے میں جاتا تو کتاب رکھ کر چند منٹ میرے ساتھ باتیں کرتے' پھر کتاب پکڑ لیتے۔ ایک مسولینی کا کوئی واقعہ پڑھتے ہوئے ذوالفقار اور دوسرے بچوں کو بلایا اور اس کی بہادری کا واقعہ سنایا۔

ایک لطیفہ

ایک دن پڑھتے پڑھتے اکیلے ہی قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔ عام طور پر وہ اس طرح نہیں ہنستے تھے' مگر آج تو بہت ہنس رہے تھے۔ میں نے اندر جا کر پوچھا کہ آج کوئی ناول پڑھ رہے ہیں' (میں نے سوچا ملٹری ہسٹری کے مضمون میں ہنسی کی باتیں کہاں سے آئیں) کہنے لگے بچوں کو بھی بلاؤ' آپ کو لطیفہ سنائیں۔ پھر انہوں نے کتاب سے لطیفہ سنایا کہ ایک جرنیل کا باورچی چھٹی پر چلا گیا۔ اس نے کوارٹر ماسٹر سے عارضی طور پر کوئی باورچی بھیجنے کو کہا۔ کوارٹر ماسٹر نے ایک لانگری کو جرنیل کی خدمت کے لیے بھیج دیا۔

اسی دن اتفاق سے جرنیل کے کچھ مہمان آ گئے۔ لانگری کو چائے تیار کرنے کے لیے کہا گیا۔ اس نے بلا تامل چائے تیار کی اور بجائے خانساماں کو بلا کر چائے لگانے کے' اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' بالٹی چائے سے لبالب بھری اور مہمانوں کی گنتی کے مطابق فوجی مگ لے کر بالٹی کمرے کے درمیان رکھی۔ اور مگ بھر کر جرنیل کے پیش کیا۔ وہ اس نظارے کی تاب نہ لا سکا اور بیچارے لانگری کو نوکری سے بھی جواب مل گیا۔ ہم لطیفہ سن کر بہت محفوظ ہوئے اور خوب ہنستے رہے۔

ایک دفعہ ایک کتاب کوئی دوست مانگ کر لے گیا تھا۔ اس کی دیر سے واپسی پر جرمانہ دینا پڑا تھا۔ لائبریری کے واقعہ کا ذکر گھر میں کیا تھا۔

میجر زیدی نے بتایا کہ کاکول میں جتنا وقت ملے پڑھتے رہتے تھے اور بعد میں بھی انہوں نے مطالعہ جاری رکھا۔ ملٹری ہسٹری کی کوئی قابل ذکر کتاب ایسی نہیں جو ان کی نظر سے نہ گزری ہو۔ چرچل کی تصانیف' بالخصوص دوسری جنگ عظیم کے متعلق چرچل کی یادداشتیں' ساری جلدیں کئی دفعہ

پڑھ چکے تھے۔

اسلامی سپہ سالاروں خالدؓ ' طارقؒ ' محمد بن قاسمؒ ' موسیٰؒ بن نصیر' صلاح الدین ایوبیؒ سب کے کارنامے یاد تھے۔ سکندر' سیزر' نپولین' چنگیز خان اور بابر کی جنگیں ازبر تھیں۔ ہٹلر اور مسولینی پر کئی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ ان کے مطالعہ کی رفتار ہم سب سے زیادہ تھی۔ ہم ایک سو صفحہ پڑھیں تو تین سو صفحے پڑھ جاتے تھے اور ہمیں جو کچھ یاد ہوتا تھا اس سے بیس گنا ان کے دماغ میں محفوظ رہتا تھا۔

متعصب مورخ

کرنل جہاں زیب کہنے لگے: وہ بڑے پرسکون انسان تھے۔ ان کو غصہ کبھی نہیں آتا تھا' مگر کاکول کے زمانے میں مجھے یاد ہے کہ ایک دن وہ خاصے چڑ گئے تھے۔ خالد میس میں بیٹھے تھے' اسلامی تاریخ کے موضوع پر بات چھڑ گئی تو ایک صاحب نے کہہ دیا کہ ''محمود غزنوی کہاں کا ہیرو تھا وہ تو ایک لٹیرا تھا''۔

اس پر عزیز بھٹی کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگے: ہمارے نوجوانوں کو چاہیے کہ پہلے اپنی تاریخ سے کماحقہ آگاہی حاصل کریں۔ تاریخ کی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے یہ بھی تو دیکھیں کہ یہ کس نے لکھی ہے۔ مصنف کا مسلمانوں کے بارے میں عمومی رویہ کیا ہے؟ کیا وہ مسلمانوں کے خلاف تعصب تو نہیں رکھتا؟

میں اندھی عقیدت کا قائل نہیں ہوں۔ سچائی اور حقائق کی تلاش تاریخ کے بنیادی عناصر ہیں۔ مگر فوری طور پر نتائج پر پہنچنے سے قبل موضوع پر جتنا تقابلی مواد مل سکتا ہے اسے نظر سے گزاریں ۔ پھر اپنی سوچ سے بھی کام لیں۔ صرف متعصب مصنفین کی کتابیں پڑھ کر اور ان کی رائے کو الہام کا درجہ دیکر اسے ہی نہیں اپنا لینا چاہیے۔ رنج کی بات یہ ہے کہ دور غلامی میں ہماری تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ سلطان محمود غزنویؒ اور سلطان ٹیپوؒ شہید ایسے عظیم انسانوں کی سیرت غلط رنگ میں ہمارے سامنے پیش کی جاتی رہی ہے۔

کرنل بنگش کہنے لگے۔ تاریخ اور عظیم جرنیلوں کی سوانح حیات عزیز بھٹی کا بے حد مرغوب

موضوع مطالعہ تھا۔

ذہنی یک سوئی

ان کی والدہ محترمہ نے بتایا: کہ بچپن میں بھی ان کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اپنی مخصوص آرام کرسی پر بیٹھ کر پڑھتے پڑھتے اکثر کتاب ہاتھ میں ہوتی تھی کہ سو جاتے تھے۔

البتہ بیگم بھٹی نے بتایا کہ اب وہ کتاب ہاتھ میں رکھ کر کبھی نہیں سوتے تھے بلکہ جب نیند آجائے تو کتاب کو بند کر کے علیحدہ رکھ دیتے تھے۔ اب شاذ ہی کبھی نیند سے اتنے مغلوب ہوئے ہوں کہ پڑھتے پڑھتے سو جائیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ پڑھنے کے لیے انہیں کسی خاموش ماحول کی ضرورت نہ تھی۔ ریڈیو کھلا ہو یا بچے شور کر رہے ہوں، وہ مگن رہتے تھے۔ ایک دفعہ بیگم بھٹی کے والدان کے پاس گئے تو انہوں نے دیکھا کہ بھٹی اپنے کمرے میں پڑھ رہے ہیں اور بچے شور کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی زرینہ سے پوچھا۔ عزیز اس سے پریشان نہیں ہوتے اور بچوں کو جھڑکتے نہیں ہیں؟ زرینہ نے بتایا کہ مطالعہ میں ان ایسے شور سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور بچوں کو انہوں نے شور سے کبھی منع نہیں کیا۔ وہ بچوں سے صرف یہ کہتے کہ میرے پاس آ کر مجھے بلانا نہیں ہے، اس کے سوا جس طرح چاہیں، کھیلیں اور شور کریں۔

میجر بشیر نے ان سے کوئٹہ میں (جب وہ کینیڈا کے لیے سٹاف کالج کورس کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے) پوچھا: آپ گھر بچوں میں رہ کر امتحان کی تیاری کیسے کر لیتے ہیں؟ تو کہنے لگے: میری حالت یہ ہے کہ بیرونی شور نہ ہو تو میں توجہ سے پڑھ نہیں سکتا۔ چنانچہ اگر بچے شور نہ کر رہے ہوں تو ریڈیو کھلا رکھ کر مطالعہ کرتا ہوں۔

کرنل آر۔ ڈی خان نے عزیز بھٹی کے مطالعہ کی عادات کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ان میں یہ خداداد صلاحیت تھی کہ جس کتاب کو ایک دفعہ نظر سے گزار دیں، وہ انہیں ساری کی ساری ذہن نشین ہوتی تھی۔ ان کے مطالعہ کی رفتار حیرت انگیز تھی۔ وہ ہر ایک کتاب کو لفظ بہ لفظ نہیں پڑھتے تھے۔ بلکہ اکثر کتابوں کے وہ صرف ضروری حصے ہی نظر سے گزارتے تھے۔ مگر ان کی نظر انتخاب حیرت

انگیز تھی۔ وہ غیر ضروری حصوں، پیروں اور سطروں کو چھوڑتے چلے جاتے تھے۔ وہ عموماً آرام کرسی یا پلنگ پر لیٹ کر پڑھتے تھے اور مطالعہ کے وقت شوروغل کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ میں ان کے ہاں گیا تو دیکھا بچے شور مچارہے ہیں اور چھوٹا بچہ رفیق ان کے پیٹ پر چڑھا بیٹھا ہے، مگر بھٹی پلنگ پر لیٹے پوری توجہ سے مصروف مطالعہ ہیں۔

پوچھا۔ بھٹی! اس شوروغل میں تم کیونکر اتنے انہماک سے پڑھ سکتے ہو؟

بھٹی کہنے لگے۔ ''جب میں مصروفِ مطالعہ ہوتا ہوں تو دنیا کی کوئی چیز خلل انداز نہیں ہوسکتی۔ یہ شوروغل کوئی بات نہیں''۔ انہیں بلا کی ذہنی یک سوئی حاصل تھی۔

ارادے کے سامنے

عزیز بھٹی جب مطالعہ کا اردہ کرلیتے تھے تو ان کی راہ میں کوئی مشکل حائل نہیں ہوتی تھی اگر وہ روشنی گل ہوجائے تو وہ لیمپ جلالیتے تھے۔ لیمپ میں تیل ختم ہوجائے تو موم بتی سے کام چلاتے تھے، مگر مطالعہ جاری رکھتے تھے۔ مطالعہ ان کی زندگی کا مرغوب ترین شغل تھا۔ ملٹری ہسٹری کی تو شاید ہی کوئی ایسی قابل ذکر کتاب ہو جو عزیز بھٹی کی نظر سے نہ گزری ہو۔

میجر ایم اے برلاس نے جو کوئٹہ میں میجر عزیز بھٹی کے شاگرد رہ چکے تھے، ایک ملاقات میں بتایا ''میجر عزیز بھٹی سے میری آخری ملاقات ایک بس میں ہوئی تھی۔ یہ اگست ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ وہ راولپنڈی سے لاہور کی طرف تشریف لارہے تھے۔ میں جہلم سے بس میں سوار ہوا۔ میں دیکھا وہ پسینے سے شرابور عسکری موضوع پر ایک موٹی سی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہیں''

اب تک

ملٹری سٹیشن لائبریری لاہور کی شکایات وتجاویز کے رجسٹر میں صرف ایک ہی تحریر ہے اور وہ میجر راجہ عزیز بھٹی شہید کے ہاتھوں کی ہے۔

اگست ۱۹۶۵ء میں ان کی طرف سے اس تحریر میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ:۔

"کتابوں کے مطالعہ کے لیے اوقات بڑھائے جائیں۔ حالات نازک ہو رہے ہیں' افسروں کو ملٹری ہسٹر کے مطالعے کے لیے زیادہ وقت ملنا چاہیے۔ کتابوں کے اجراء کے قواعد میں بھی نرمی کی جائے۔

ریڈرز ڈائجسٹ اور مانچسٹر گارڈین کے نامکمل فائلوں کو مکمل کرنے کی طرف بھی توجہ دی جائے"

نیند

ہانگ کانگ میں ایک دن ہم ''کولون'' سے ایک دعوت کے بعد گھر لوٹ رہے تھے۔ ''شوکی دان'' جانے والی بس پر سوار تھے اور ہمیں ٹنگلو وان اسٹاپ اترنا تھا۔ سارے بچے ساتھ تھے اتر کر چلنے لگے تو نذیر نے پوچھا۔ مہاماں جی! عزیز کہاں ہے؟ دیکھا تو عزیز بس سے نہیں اترا تھا۔ اور بس دوبارہ سٹارٹ ہوگئی تھی۔ نذیر بھاگا اور اس نے بس کو روک لیا۔ عزیز کو بازو سے پکڑ کر جگایا اور نیچے اتارلیا۔ عزیز کی اس گہری نیند نے بھائی جان کو پانچ ڈالر کے ایک خوبصورت قلم سے محروم کردیا جو اس دوڑ بھاگ میں کہیں گر گیا تھا''۔

عزیز کی زندگی کا یہ واقعہ سناتے ہوئے ان کی والدہ محترمہ آمنہ بھٹی نے کہا: عزیز کی نیند بچپن سے عجیب تھی۔ وہ کھیلتے کھیلتے سوجاتا تھا۔ اور اس کے لیے اس نے کبھی چارپائی یا بستر کا انتظار نہیں کیا تھا۔ کئی دفعہ تلاش کرتے تھے تو کسی میز کے نیچے یا کسی صندوق کی اوٹ میں سویا پڑا ہوتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ دروازے، دیوار یا کسی سہارے کے ساتھ کھڑے سوجاتا تھا اور میں اس کو اٹھا کر چارپائی پر لٹادیتی تھی۔

بیگم زرینہ بھٹی بتایا کہ میجر صاحب کو اپنی نیند پر بڑا اختیار تھا۔ وہ دوپہر کو کھانے کے لیے آتے تو قیلولہ ضرور کرتے تھے۔ وہ ارام کرسی پر لیٹتے ہی سوجاتے تھے اور جتنا وقت چاہیں سوتے تھے۔ اکثر یہ وقفہ صرف پانچ منٹ کا ہوتا تھا اور وہ تازہ دم ہوکر اٹھتے تھے۔ وہ ضرورت اور حالات کے مطابق نیند کو گھٹا بڑھا لیتے تھے۔ جب انہیں مکمل فراغت ہوتی تو بطور مشغلہ سوتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ مجھے جگانا نہیں۔ پھر پہروں سوئے رہتے تھے۔ کہا کرتے تھے نیند میری ''عیاشی'' ہے۔ اگر طبیعت پر کوئی بوجھ ہوتا یا کسی ذہنی صدمہ سے دوچار ہوں تو سوجاتے تھے۔ اٹھتے تھے تو کہتے تھے اب ٹھیک ہوں۔ کہا کرتے تھے نیند مجھے شاک ابزاربر Shock Absorber کا کام دیتی ہے۔

خوابوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے اور انہیں خیالات سے تعبیر کرتے تھے۔ یعنی جو خیالات دن کو ہمارے دل ودماغ پر چھائے رہتے ہیں وہی تسلسل رات کو بھی قائم رہتا ہے اور کہتے: خواب نفسیاتی طور پر ہماری مستوں کو بڑھاتے اور حسرتوں کو کم کرتے ہیں۔ یعنی ہماری جن خواہشات کی تکمیل دن میں نہیں ہوسکتی' رات کے وقت نیند میں ہو جاتی ہے۔ البتہ بعض خوابوں کو بڑا اہم قرار دیتے تھے اور انہیں مستقبل کے متعلق اشارے سمجھتے تھے۔

بیگم زرینہ اکتر بھٹی نے بتایا کہ میجر صاحب جب سوتے تھے تو بچوں کی طرح ان کے چہرے پر مسکراہٹ سی رہتی تھی۔ البتہ دو تین دفعہ وہ خواب میں روئے بھی تھے۔

ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہنے لگیں: شادی کے تھوڑے عرصہ بعد کی بات ہے' ان کے رونے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں اپنی چارپائی سے اٹھی اور ان کو جگایا۔ میں نے پوچھا کیا آپ خواب میں ڈر گئے تھے۔ آپ بڑی اونچی آواز سے رو رہے تھے۔ کہنے لگے ''زرینہ! میں خواب میں ڈرا نہیں تھا۔ ہو یوں کہ ایک مدت کے بعد مجھے اپنا پیارا بھائی بشیر احمد خواب میں ملا۔ اسے پا کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ہم دونوں بھائی باتیں کر رہے تھے کہ کھانا میز پر لگا دیا گیا۔ ہم کھانے کی میز پر بیٹھے ہی تھے کہ بشیر نہ جانے کیسے یکا یک غائب ہو گیا اور میں اکیلا رہ گیا۔ میں اس کی تلاش میں بھاگ رہا تھا اور رو رہا تھا''۔

حیرت انگیز

۱۹۶۲ء کے شروع میں کوئٹہ میں ٹرپس کے ہمراہ ہماری مشقیں ہو رہی تھیں ۔ کرنل عبدالغفار شاہ ۷ ار جمنٹ پنجاب کے کمانڈنگ آفیسر تھے۔ مگر فوجی مشقوں کے لیے میں (کرنل آر ۔ڈی خاں) کمانڈنگ آفیسر تھا۔ میں نے مشقوں کے لیے میجر بھٹی کو اپنا اڈجوٹنٹ بنایا اور وہ بریگیڈ کے وائرلیس سیٹ پر متعین تھے۔

ایک دن مشقوں کے دوران میں بٹالین کا کام دیکھنے چلا گیا کہ آیا جوان صحیح صحیح کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ دیکھ بھال کر کے واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ بھٹی نے ہیڈ فون کانوں سے لگا رکھا ہے اور مائیکروفون ہاتھ میں ہے مگر خود بھٹی نیند کے مزے لے رہا تھا۔ وہ خراٹے لے رہا تھا۔ تھوڑا سا منہ کھلا تھا اور خوب گہری نیند سو رہا تھا۔

ستم ظریفی یہ ہوئی کہ وائرلیس پر بریگیڈ کمانڈر کا پیغام آ رہا تھا۔ اس کا جو حصہ میں نے سنا اس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ کمانڈر کا پیغام بے حد اہم تھا۔ میں جانتا تھا کہ بھٹی سخت تھکا ہوا ہے ۔ مجھے اس سے بے حد پیار تھا۔ مگر آج اس کی اس حرکت پر سخت افسوس اور ملال ہوا۔ میں غصے میں جگانے ہی والا تھا کہ کمانڈر کا پیغام ختم ہو گیا اور میسج ...... کے خاتمہ پر دوسری طرف سے اوور over کہہ دیا گیا۔

معاً ایک جھٹکے سے بھٹی اٹھ بیٹھا اور وائرلیس پر پیغام کا جواب دینا شروع کر دیا۔ میں دم بخود اور حیران و ششدر کھڑا تھا۔ بھٹی نے جواب ختم کیا تو میں پوچھا: بھٹی! تم تو سو رہے تھے۔

خراٹے بھر رہے تھے۔ ظالم! تم نے پیغام کیسے سن لیا اور اس کا جواب کیسے دے دیا؟

بھٹی کے جواب نے میری حیرت میں اضافہ کر دیا کہنے لگا:

"جناب! میں جسمانی طور پر بے شک سویا ہوا تھا، مگر میں ذہنی طور پر بیدار تھا۔ میں نے آرام کرنے کا ارادہ کیا تو اپنے ذہن کو یہ تجویز دے دی کہ جونہی کوئی پیغام آئے وہ اسے ریکارڈ کر لے اور مجھے بروقت جگا دے"۔

میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ میں اس کی گہری نیند میں ذہنی بیداری پر حیران رہ گیا۔

کرنل آر۔ڈی خاں نے یہ واقعہ سناتے ہوئے: نیند پر بھٹی کے اختیار کے بارے میں ہم سب جانتے تھے کہ وہ جب چاہیں چند منٹوں کے لیے سو جائیں اور جب چاہیں جاگ اٹھیں۔ مگر گہری نیند میں ذہنی بیداری (؟) میرے لیے یہ بات بڑی عجیب اور سخت حیرت انگیز تھی اور میں دوستوں کو بتایا تو ان کو حیرت ہوئی۔

سادگی

- ☆ کھانا
- ☆ لباس
- ☆ سواری
- ☆ رہائش

کھانا

میں ایبٹ آباد میں ان کا مہمان تھا۔ بھائی عزیز نے میرے لیے تکلف سے مچھلی بھی پکوائی۔ قطب الدین ان کا ملازم تھا۔ اس نے مچھلی پر بیسن بہت زیادہ لگا دیا اور وہ اچھی نہ پک سکی۔ میں خیال کیا کہ وہ اسے ناپسند کریں گے۔ مگر جب انہوں نے مچھلی کا ٹکڑا لیا تو اس کی تعریف کرنے لگے اور قطب الدین کو بھی شاباش دی کہ بہت اچھی مچھلی پکائی ہے۔ میں نے دل میں سوچا کتنا بھولا انسان ہے۔ کیپٹن فضل کریم بھٹی نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا: ان کے نزدیک کھانے پینے کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ وہ پر تکلف کھانوں کے شائق نہ تھے۔ وہ سادہ کھانا پسند کرتے تھے۔ کھانے کے لیے جو کچھ بھی مل جائے انہوں نے کبھی شکایت نہیں کی تھی۔ بھوک خوب لگتی تھی اور خوب پیٹ کر کھاتے تھے۔ یوں وہ رات کو عموماً شوربے یا دال کے ساتھ چاول کھاتے تھے۔

میجر ایس ایم زیدی نے بتایا کہ آلو میجر بھٹی کا من بھاتا کھانا تھا۔ مثلاً میس میں آلو گوشت پکا ہو تو وہ آلوؤں کو گوشت پر ترجیح دیتے تھے اور آلو چن چن کر کھاتے تھے۔ وہ آلو چپس بھی کھاتے تھے اور مچھلی کے بھی شوقین تھے۔

بیگم بھٹی نے بتایا کہ وہ ٹماٹر اور سبزیاں خود اگاتے تھے۔ ٹماٹر اور سلاد شوق سے کھاتے۔ کبھی کبھی وہ گھر میں آئرش سٹو پکواتے۔ سٹیو غلط لفظ ہے۔ اس میں گوشت کے ساتھ ساری سبزیاں ڈال کر ہلکی آنچ پر دم پخت کرتے ہیں۔ اس میں نمک اور گرم مسالہ تو ڈالتے ہیں' مرچ نہیں پڑتی۔ ہمارا ملازم قطب الدین اس کھانے کا خاصا ماہر ہو گیا۔ پھر میں نے خود بھی اس سے سیکھ لیا تھا اور خود انہیں بنا کر دیتی تھی۔ اسے وہ ڈبل روٹی کے ساتھ کھاتے تھے۔

دودھ والی چائے بھی پیتے تھے' لیکن بغیر دودھ کے لیمن چائے کو ترجیح دیتے تھے۔ آفیسر میس کے سیکرٹری تھے تو ایک دفعہ بغیر دودھ کے لیمن چائے افسروں میں مقبول کروانے کی کوشش کی کہنے

لگے کچھ عرصہ تو آفیسر شوق سے پیتے رہے مگر مستقبل مقبول نہیں ہو سکی۔ وہ کافی کے بھی رسیا تھے۔ ایک دفعہ کافی بڑی مہنگی ہوگئی' دس روپے کا ڈبہ ملتا تھا' مگر انہوں نے نہ چھوڑی۔ کہتے تھے: زندگی میں کھانے پینے کی ایک ہی تو ''عیاشی'' رکھی ہے اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔ سارے ہی پھل شوق سے کھا لیتے تھے اور انہیں روزمرہ خوراک کا ضروری جزو سمجھتے تھے۔ البتہ سیب بالخصوص پسند کرتے تھے۔ کوئٹہ کے قیام کے دوران تو گھر کے ہر فرد کے لیے روزانہ تین سیب منگواتے تھے اور صبح' دوپہر اور شام ایک ایک سیب کھاتے اور سب کو کھلاتے تھے۔

گھر میں ملازم کو گھر کے افراد کے ساتھ ویسا ہی کھانا ملتا تھا۔

کرنل جہاں زیب بنگش نے بتایا: گھر میں کوئی خاص چیز پکتی تو اکیلے نہیں کھا سکتے تھے' جو بھی دوست قریب ہو اسے بلا لیتے تھے یا اس کو وہاں بھیج دیتے تھے۔

ویسے کھانے پینے کے معاملات میں انتہائی سادگی پسند تھے۔ جو بھی مل جائے اسے اس رغبت اور مست سے کھاتے تھے گویا سپاس نعمت کر رہے ہوں۔ جسمانی محنت کے عادی تھے' انہیں بھوک خوب لگتی تھی اور جس طرح ایک کسان ہل چلا کر خوب سیر ہو کھاتا ہے اسی طرح خوب کھاتے تھے۔

لباس

''میجر عزیز بھٹی جرمنی سے زبان کا کورس کرنے کے بعد واپس آئے تو مجھے ملنے راولپنڈی گئے۔ میں ان دنوں جی ایچ کیو میں تھا۔ بغل گیر ہو کر ملے اور خوب باتیں ہوویں۔ میں ان سے پوچھا: یار! لوگ تو باہر جاتے ہیں اور بہت کچھ ساتھ لاتے ہیں۔ تم کم سے کم اپنے چند سوٹ ہی لے آتے۔ وہی سادہ سوتی بشرٹ' سادہ سی پینٹ اور پشاوری چپل پہن رکھی ہے''۔

کہنے لگے ''میں جرمنی کپڑے خریدنے نہیں گیا تھا۔ جرمن زبان سیکھنے گیا تھا اس کے متعلق پوچھو کہ کیا کچھ سیکھ کر آیا ہوں؟''

لیفٹیننٹ کرنل فضل الرحیم سے ان کے دفتر میں یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ کرنل محمد ابراہیم قریشی کے بعد وہ بٹالین کے کمانڈنٹ بن کر آئے تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل فضل الرحیم کے میز پر میجر عزیز بھٹی شہید کی خوبصورت تصویر سامنے رکھی ہوئی تھی۔ وہ میجر عزیز بھٹی کے پی ایم اے کے گہرے دوست تھے۔

میجر بھٹی خوراک کی طرح لباس کے معاملے میں سادگی پسند اور لا پرواہ تھے۔

بچپن میں ہانگ کانگ میں انگلش سکولوں میں تعلیم حاصل کرنے اور انگریزی لباس پہننے کی عادت کے باوجود وہ سادہ لباس زیب تن کرتے تھے۔ قیمتی لباس' کریز اور ٹیپ ٹاپ سے شخصیت کو موثر بنانے کی کوشش ان کے نزدیک مضحکہ خیز تھی۔ مغربی لباس پہنتے تھے' مگر اپنے لیے قیمتی کپڑا کبھی نہیں خریدتے تھے۔ حتیٰ کہ کینیڈا اور جرمنی سے جہاں دوسروں کے لیے بہت سے تحائف لائے' اپنے لیے ایک سوٹ تک نہ لائے۔

نکٹائی پہننے کو ایک مصیبت تصور کرتے تھے۔ عام طور پر گرمیوں میں بشرٹ پہنتے تا کہ ٹائی نہ لگانی پڑے۔

نماز ہمیشہ لٹھے کے مخصوص تہ بند میں پڑھتے تھے۔ دفتر جانے کے وقت تبدیل کرتے تھے۔

شلوار صرف عید کے دن پہنتے تھے۔ نماز پڑھتے وقت سر پر رومال باندھتے تھے۔ گھر میں آکر پاجامہ اور قمیض پہنتے تھے۔ گرمیوں میں گھر آکر قمیض اتار دیتے تھے' صرف بنیان بلکہ اکثر بنیان تک اتار کر بیٹھتے تھے۔

کوئی بڑے سے بڑا افسر آجائے تو جس لباس میں ہوں اسے ملنے چلے جاتے تھے۔ لباس کی قطعاً پرواہ نہ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر صرف بنیان پاجامے میں ہوں تو بھی ایسے ہی باہر نکل کر مل لیتے تھے اور اطمینان سے بعد میں قمیص پہن لیتے تھے۔ ان کے ساتھی اور افسران کے درویشانہ اطوار سے خوب واقف تھے۔

لباس کو خوب سنبھال کر رکھتے تھے۔ شادی کے بعد ۱۹ سال میں صرف ایک شلوار اور تین لٹھے کے تہ بند سلوائے۔ تہ بند پنجابی طرز کا 'ٹنگھواڑ' پسند کرتے تھے۔ بیگم بھٹی نے بتایا کہ اس دفعہ کچھ عرصہ قبل مگر انہیں سینے کا پتہ نہ تھا۔ بڑی مشکل سے اپنی گجرات کی ایک واقف خاتون سے سلوایا۔

بے نیازی

کرنل جہاں زیب بنگش نے بتایا:

عزیز بھٹی اپنے لباس کے متعلق انتہائی لاپروا تھے۔ جب کبھی وہ میرے ہاں تشریف لاتے اور میں کسی تعارف کراتا کہ یہ میرے دوست عزیز بھٹی ہیں (فوج میں عزیز بھٹی ایک معروف شخصیت تھے۔ ان کی کاکول کے زمانے سے شہرت تھی۔ اور غائبانہ تعارف بہت سے افسروں کو تھا) وہ ان کا نام سن کر اور لباس کی سادگی دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔

عزیز بھٹی نے عسکری زندگی کے ہر شعبہ میں کمال حاصل کیا لیکن لباس کے معاملے میں ان کی طبعی لاپرواہی ان کی فوجی یونیفارم کو بھی متاثر کرتی رہی۔

زندگی کی خواہش

کرنل آرڈی خاں نے بتایا کہ میجر عزیز بھٹی کی لباس اور یونیفارم میں لاپرواہی بڑی دلچسپ تھی۔ میں معمول بنالیا تھا کہ جب بھی وہ مجھے یونیفارم میں ملتے تو میں کہتا۔ بھٹی! ذرا وردی کو درست تو کرلو۔ بھٹی مسکراتے ہوئے ٹوپی اور پیٹی کو جلدی سے ہاتھ مار کر درست کر لیتے۔

جب میرا تبادلہ کوئٹہ سے جی ایچ کیو راولپنڈی ہوا تو بھٹی مجھے الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن پر آئے۔ اتفاق سے اس وقت وہ وردی میں تھے۔ میں سنجیدگی سے کہا۔ ''بھٹی میری زندگی کی ایک خواہش ہے اگر تم اسے پورا کرسکو''! بھٹی نے بڑے تعجب سے میری طرف دیکھا اور کہا ''ہاں تو بتایئے!'' میں نے کہا:

"Before I leave I want to see you Properly dressed."

بھٹی مسکرایا اور حسب معمول ٹوپی اور پیٹی کو درست کرلیا۔

کار اور چھٹی

میجر عزیز بھٹی کینیڈا اسٹاف کورس سے واپس آئے تو کار ساتھ لائے۔ وہاں جاتے ہی کار خرید لی تھی۔ واپس آ کر کچھ عرصہ کار رکھی، مگر جب راولپنڈی میں جگہ لے کر مکان کی تعمیر شروع کی تو اسے فروخت کر دیا اور کچھ سرکاری قرضہ لے کر مکان تعمیر کیا (اس کی اقساط ان کی زندگی میں ختم نہ ہوئیں۔ بعد میں بیگم بھٹی نے بقایا رقم یک مشت ادا کر دی ہے)۔

ان کے دوست میجر ایس ایم زیدی بتاتے ہیں:

ایک دن میں نے میجر عزیز بھٹی سے کہا کہ کار آپ کو فروخت نہیں کرنا چاہیے تھی۔ پوچھنے لگے ''کیوں؟''

میں نے کہا: کار اس دور کی ضرورت بھی ہے اور اس سے انسان کی شخصیت اور حیثیت میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔

فرمانے لگے: پہلی بات تو قابل فہم ہے اور کسی حد تک درست بھی۔ مگر دوسری بات کا میں مطلق قائل نہیں ہوں کہ کار یا لباس سے انسان کی شخصیت میں بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ میرے نزدیک کسی ایسی شخصیت یا اس کے اونچے سٹیٹس کی کوئی حقیقت نہیں ہے جو کار کی محتاج ہو۔

بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے: اب ہم پہلی بات کی طرف آتے ہیں کہ کار ایک ضرورت ہے۔ بلاشبہ کار ایک ضرورت بھی ہے، مگر ہر انسان کی ضروریات الگ الگ ہوتی ہیں۔ جب میں اپنی ضروریات کی فہرست مرتب کرتا ہوں تو اس میں کھانے پینے، لباس اور رہن سہن کے لیے مکان کے علاوہ بچوں کے لیے اچھی سے اچھی تعلیم تربیت کا انتظام سرفہرست آئیں گے۔ اگر ان اخراجات کے باوجود جیب میں اتنی گنجائش ہوگی تو زندگی کی ان ضروریات کی طرف بھی دھیان دیا جا سکتا ہے۔ ورنہ یہ ضروریات لازمی طور پر اپنے سے بلند تر ضروریات کے لیے قربان ہوتی رہیں گی۔

کوئٹہ میں قیام کے دوران انہوں نے ایک آٹو سائیکل یا پھٹ پھٹی رکھی ہوئی تھی۔ بہت سے دوستوں نے اصرار کیا کہ پھٹ پھٹی آپ کی شان کے شایاں سواری نہیں ہے۔ کم از کم ایک سکوٹر رکھیں۔ مگر یہ ''شایان شان'' والی بات ان کے لیے ہمیشہ نا قابل فہم رہی کہا کرتے تھے: یہ آٹو سائیکل میرا مقصد پورا کر دیتی ہے تو میں کسی دوسری سواری کے لیے زیادہ پیسے کیوں صرف کروں اور وہی پھٹ پھٹی ہی استعمال کرتے رہے۔

احساس کمتری

میجر سعید ملک (۷ اپنجاب) نے بتایا:

سواری کے لیے سائیکل یا آٹو سائیکل استعمال کرتے تھے۔ کینیڈا میں جاتے ہی کار خریدی تھی۔ یہاں آ کر کچھ عرصہ رکھی' پھر فروخت کر دی۔ لیکن نہ تو کار میں بیٹھ کر انہیں کوئی احساس برتری ہوا اور نہ سائیکل پر بیٹھ کر کبھی شرمائے۔ بلکہ کوئٹہ میں تھے تو اونچے نیچے راستوں میں میکسنگ کرتے ہوئے گھر آتے تھے۔ بیگم بھٹی نے کئی دفعہ کہا کہ دوسرے آفیسر کیا کہتے ہوں گے۔ تو کہتے تھے ''وہ سب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں!''

حقیقت میں وہ بڑا بننے' نمایاں ہونے یا اہمیت اختیار کرنے کے لیے کسی خارجی سہارے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ لباس' سواری' کھانے پینے کی پسند' ناپسند اور عادات کے لحاظ سے انتہائی سادہ اور درویش منش تھے۔ انہیں زندگی کے کسی شعبہ میں بھی چھوٹے پن کا احساس نہیں ہوا تھا کہ نفسیاتی طور پر وہ بڑا بننے کے لیے خارجی سہاروں کے محتاج ہوتے۔

کوئنز کالج ہانگ کانگ میں ان کے استاد محترم خان میر عالم خاں ایک خط میں لکھتے ہیں: ''قدرت نے عزیز کی سرشت میں داخلی ضبط نفس کی ایک عجیب صلاحیت سمو رکھی تھی''۔ ظاہر ہے کہ ایسے انسان کو کسی خارجی احتساب یا نظم وضبط کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ کسی خارجی احتساب کی قطعاً پروانہ کرتے تھے۔ ان میں عزت نفس کا اتنا شدید احساس تھا کہ اس کی موجودگی میں لوگوں کی پسند یا ناپسند کو معیار بنانے یا نت نئے بدلتے سطحی معیاروں پر پورا اترنے کی انہوں نے کبھی کوشش نہ کی۔

رہائش گاہ

میجر سعید احمد ملک نے سٹاف کالج کورس کوئٹہ جانے سے قبل ایک ملاقات میں بتایا کہ ان کا ذاتی ایثار مثالی تھا۔ جب وہ جنوری ۱۹۶۵ء میں کوئٹہ سے بٹالین میں واپس آئے تو میں سیکنڈ ان کمانڈ تھا۔ وہ مجھ سے سینئر تھے' چنانچہ وہ سیکنڈ ان کمانڈ بن گئے اور میں کمپنی کمانڈر۔

ان دنوں میں نیپیئر ہوٹل میں رہتا تھا اور ان کو نیپیئر ہوٹل کے سامنے والی کوٹھی ملی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ہی اپنے اپنے مکانوں سے بہت تنگ تھے۔ میری تکلیف تو صرف اتنی تھی کہ بچے زیادہ تھے اور جگہ تنگ تھی' مگر میجر بھٹی کا مسئلہ نازک تر تھا۔ ان کی کوٹھی نہایت خستہ حالت میں تھی۔ ہر وقت یہ خدشہ رہتا کہ کوئی حصہ گر نہ جائے۔ چنانچہ میجر بھٹی بڑی ہی دوڑ دھوپ کے فیدرسٹن روڈ پر آفیسرز کالونی میں ایک شاندار کوٹھی نمبر ۱۱۷ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ سن کر ہم سب کو خوشی ہوئی کہ کم از کم بھٹی صاحب کو تو اس خطرناک کوٹھی سے نجات ملی ہے۔

دوسرے دن میجر بھٹی ملے اور کہا: کہ آپ اس کوٹھی میں شفٹ کر جائیں۔ میں کہا خدا کا خوف کریں' مجھے تو صرف جگہ کی تنگی ہے اور آپ کی کوٹھی تو نہایت خستہ حالت میں ہے اور ہر وقت اس کے گرنے کا خدشہ رہتا ہے۔ پھر نا معلوم کب کوئی سرکاری رہائش گاہ مل سکے گی؟ بلکہ آپ نے از خود یہ چانس گنوایا تو پھر آپ کو نمبر بہت دور جا پڑے گا۔ آپ یہ موقعہ کیوں ضائع کرتے ہیں۔ میرے علاوہ کمانڈنگ آفیسر اور دوسرے دوستوں نے انہیں بہتیرا سمجھایا مگر ہم سب کے اصرار کے باوجود نہ مانے اور مجھے ہی نئی کوٹھی میں منتقل ہونے پر مجبور کیا۔

جلال و جمال

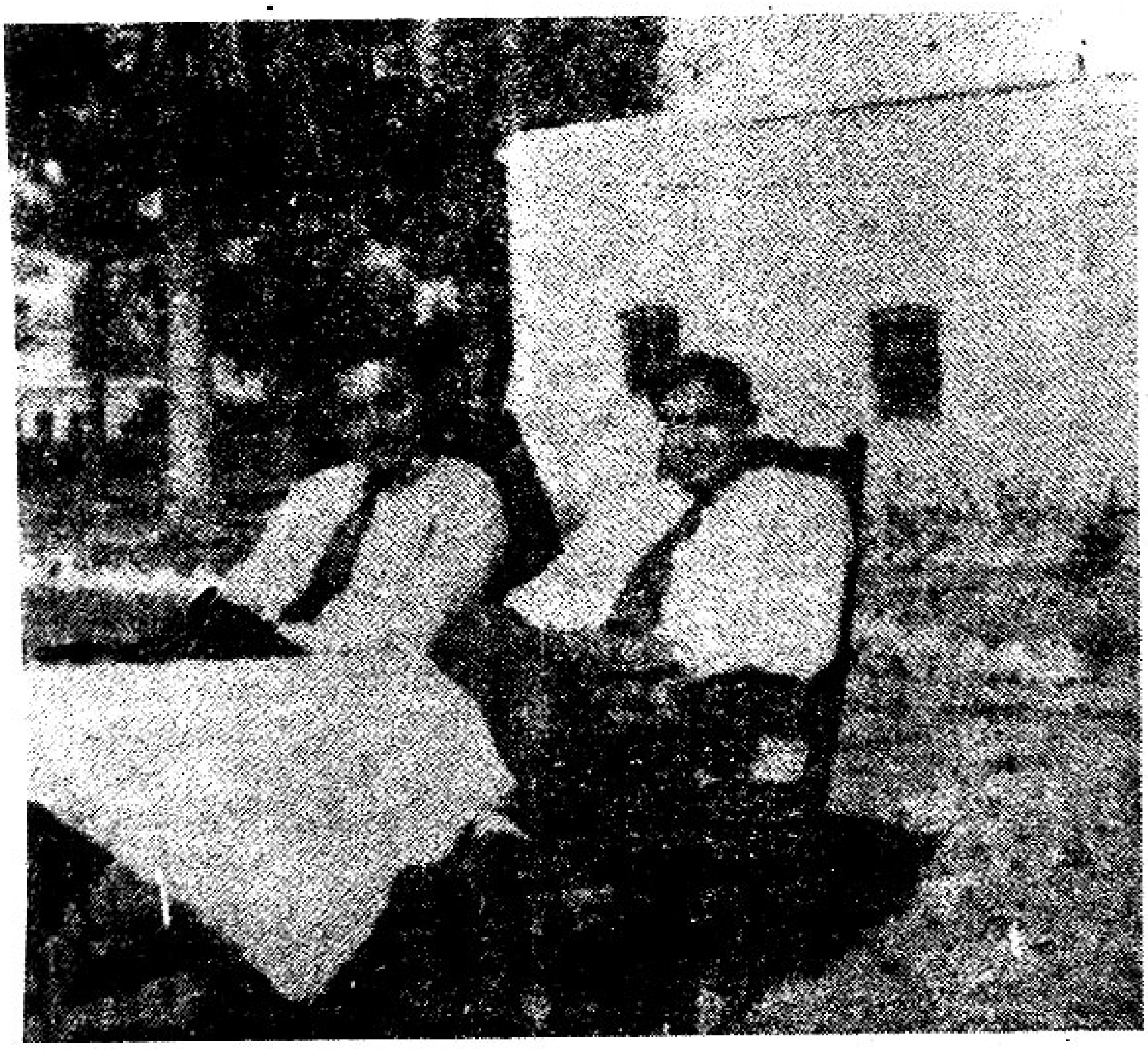

قلوپطرہ کا خواب

عزیز　　　شریف

مہاماں جی !(میجر عزیز بھٹی کی والدہ کو چھوٹے بڑے سب ہی مہاماں جی کہتے ہیں)

عزیز کو بلاشبہ بڑا اعزاز ملا ہے۔اس نے پاکستان ملٹری اکیڈمی سے شمشیر فاخرہ او، نارمن گولڈ میڈل حاصل کیے ہیں۔لیکن اپ یقین کریں کہ اگر میں خود اپنی آنکھوں سے عزیز کو پریڈ کرواتے نہ دیکھتا تو میں زندگی بھر کبھی باور نہیں کر سکتا تھا کہ عزیز جیسا بھولا بھالا' ڈھیلا ڈھالا او، سیدھا سادہ انسان ان اعزازات کا مستحق ہو سکتا ہے۔

مگر کاکول میں اس کی مستعدی اور پھرتی دیکھ کر عجیب خوش گوار حیرت ہوئی۔وہ ہمارا عز، لگتا ہی نہیں تھا۔ایک دفعہ تو میں نے سچ مچ یہ خیال کیا کہ وہ کوئی اور ہے۔

مہاماں جی !اس نے پریڈ کرواتے ہوئے جب ورڈ اف کمانڈ دیا ح تو اس کی آواز میر اتنی ہیبت اور جلال تھا کہ ہم جیسے لوگ بھی کرسیوں پر بیٹھے ہووے اٹینشن ہو گئے"

یہ الفاظ عزیز کی بہن طاہرے کے شوہر کیپٹن محمد شریف (نیوی) کے ہیں۔جو شہید ے والد' بیگم اور دوسرے بہنوئی کیپٹن فضل کریم کے ہمراہ پاسنگ آؤٹ پریڈ کی تقریب دیکھنے کا کوا

گئے تھے۔ کاکول سے واپس آ کر وہ ان کی والدہ کو تقریب کی روئداد سنا رہے تھے۔

گھنگریالے بالوں، کشادہ پیشانی، چوڑے سینے، باریک ہونٹوں اور نشیلی آنکھوں کے ساتھ عزیز ایک رعنا جوان تھے۔ ان کا معصوم اور بھولا بھالا چہرہ ان کی دلی کیفیات کا صحیح آئینہ دار تھا۔ وہ بہت آہستہ بولتے تھے اور بڑے شیریں زبان تھے۔

وہ بے حد حساس اور رحم دل تھے۔ دوسرے انسان کو تکلیف میں دیکھ کر بے قرار ہو جاتے تھے۔

وہ حسن فطرت کے پجاری تھے۔ پھولوں، شفق اور مناظر قدرت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ موسیقی کے دل دادہ تھے۔

ان کی حیات کا یہ جمالیاتی پہلو دیکھنے والا انسان مشکل سے ہی یہ باور کر سکتا ہے، کہ میدان کارزار میں یہی معصوم بھولا بھالا انسان دشمن پر ایک قہر خداوندی کی مانند نازل ہوتا ہے۔ اس پر ایک زخم خوردہ بپھرے ہوئے شیر کی سی تندی و تیزی سے جھپٹتا ہے اور حملہ اور دشمن کی خاک و خون میں لتھڑی ہوئی لاشوں کے منظر کو یوں دیکھ سکتا ہے گویا یہ بھی شفق کا کوئی منظر ہے اور بموں اور گولوں کے دھماکوں سے ''موسیقی'' کی طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔

اس کی جلالی قوتیں عمل میں آتی ہیں تو صحرا دریا اس کی ٹھوکر سے دو ٹکڑے اور پہاڑ اس کی ہیبت سے سمٹ کر رائی بن جاتے ہیں۔ اس کی شیریں کلامی بجلی کی کڑک میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

(اقبالؒ)

''انطونی اور قلوپطرہ'' میں شیکسپیئر نے انطونی کی جلالی خصوصیات کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا ایک ایک لفظ میجر عزیز بھٹی کی ذات پر پورا اترتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مغرب کا عظیم تمثیل نگار پاکستان کے اس عظیم ہیرو کو خراج تحسین پیش کر رہا ہے۔

ڈرامہ کے پانچویں باب کے تیسرے منظر میں...... قلوپطرہ کی زبان سے:

''کیا دیکھتی ہوں.........انطونی.........شہنشاہ

.........کاش وہی خواب اور ایک بار.........

کاش میں اسے پھر دیکھ لوں

اس کا چہرہ' آسمانوں کی طرح.........جن میں سورج اور چاند سجے سجائے اپنی اپنی راہوں پر چلے جاتے ہیں اور ہماری گول گول زمین کو منور کرتے ہیں

۔

(اس کے چہرے میں دونوں آنکھوں سے میری دنیا روشن تھی) سمندر اس کے لیے پایاب.........وہ ہاتھ اٹھائے تو ساری دنیا اس کی زیر نگین.........

دوستوں کے لیے اس کی آواز میں سرود انجم.........

لیکن.........وہ چاہے تو اس کی آواز میں بجلی کی کڑک سے یہ کرہ ارض کانپ اٹھے.........

اس کی سخاوت بے پایاں تھی.........پھل پھولوں کے موسم کی طرح کہ پھل توڑتے جائیں اور توڑتے جائیں۔وہ اور پکتے جائیں اور پکتے جائیں۔

انطونی کی شادمانیاں بنت البحر کی شادمانیوں کی طرح تھیں جو کمر پانی سے اوپر اٹھاتی ہے تو اس پر ہیرے پنے جڑے نظر آتے ہیں.........

بڑے بڑے تاجدار اس کے حضور صف بستہ کھڑے رہتے۔تاج وتخت اور سلطنتیں اس کی لونڈیاں تھیں.........کوئی اور انسان ایسا ہوا ہے؟

کیوں؟ کیا کوئی اور آدمی اتنا عظیم ہوسکتا ہے!.........وہ عظیم انسان

.........جو میں نے دیکھا ہے.........جو میرے خوابوں میں بسا ہوا ہے

!!''

.... اور وہ رو دیے ....

(ا) ۱۹۶۴ء میں وہ کوئٹہ میں تھے کہ بڑے بھائی نذیر احمد بھٹی المعروف ''بھائی جان'' پاکستان سفارت خانے میں تھرڈ سیکرٹری ہو کر تین سال کے لیے پیکنگ جانے والے تھے۔ ان دنوں کوئٹہ میں کچھ ایسی سرکاری مصروفیت تھی کہ وہ کراچی نہ جا سکے۔

والدین بھائی ''جان'' کو الوداع کہنے کراچی گئے ہوئے تھے۔ عزیز نے کوئٹہ سے کراچی بھائی جان کے ساتھ ٹیلی فون پر بات کی مگر باتیں کرتے کرتے رو پڑے۔

والدہ اس واقعہ کو یاد کر کے کہنے لگی: نذیر نے ریسیور منہ سے ہٹا کر ہمیں بتایا کہ عزیز تو بچوں کی طرح رو رہا ہے۔ ہم سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نذیر نے بتایا کہ رہا تھا ''آپ تین سال کے لیے جا رہے ہے۔ ہمارے والدین بوڑھے ہیں۔ خدا جانے تین سال میں...... اس کے بعد اس کی آواز بھرا گئی۔ اذر وہ رونے لگ گیا۔

(بھائی جان کے ساتھ اس کی یہ آخری گفتگو ثابت ہوئی)

....

قبر کے پاس شہید کے ہاتھوں سے لگائے ہوئے خوب صورت باغیچہ میں بیٹھے ہوئے' شہید کی والدہ محترمہ کہنے لگیں:

''مگر عزیز کو کیا علم تھا کہ بھائی جان تو تین سال کے لیے بوڑھے والدین کو چھوڑ کر پیکنگ جا رہا ہے۔ مگر وہ خود ہمیشہ کے لیے ہمیں چھوڑ کر............................''

اور پھر ان کی آنکھو سے آنسوؤں کا رکا ہوا سیلاب بہہ نکلا۔

....

بیگم بھٹی نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا: جب ''بھئی جان'' پیکنگ گئے تو کوئٹہ میں تھے۔ وہ کراچی جا کر انہیں الوداع کہنا چاہتے تھے مگر سرکاری مصروفیت حائل ہوئی اور ٹیلیفون پر ہی انہیں

خدا حافظ' کہنا پڑا۔ میں پاس بیٹھی تھی۔ ٹیلیفون پر باتیں کرتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ ٹیلی فون چھوڑ کر رونے لگے۔

میں نے پوچھا۔ آخر آپ کو کس بات ا تنا رونا آ رہا ہے؟

کہنے لگے: ''زرینہ! اور تو کوئی بات نہیں۔ تین سال کوئی ایسی مدت نہیں ہے مگر والدین چین کی سرزمین پر پہلے ہی ایک بیٹے کی قربانی دے آئے تھے۔ اب وہ بوڑھے ہو چکے ہیں' نہ جانے ان کے دل و دماغ میں کیا کیا خیالات آ رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر رونا آ گیا۔''

....

بیگم بھٹی نے بتایا: وہ اپنے بھائی بشیر مرحوم کو کبھی نہیں بھولتے تھے۔ کئی دفعہ اس کے لیے چپکے سے رو لیتے تھے مگر کسی کو جتلاتے نہیں تھے۔

وہ انتہائی پرسکون انسان تھے۔ ان کی طبیعت میں مایوسی' الجھن' بیزاری' خوف' غصہ اکتاہٹ اور اعصابی تناؤ نام کو نہ تھے۔ اس کے باوجود وہ حد درجہ حساس تھے۔ اپنی ذاتی تکلیف کی نہ پروا کرتے تھے' نہ اس سے پریشان ہوتے تھے' بلکہ بڑی سے بڑی تکلیف خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے تھے۔ مگر دوسرے انسان کو تکلیف میں دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے تھے۔

آخری دفعہ ۱۶ اگست ۱۹۶۵ء کو راولپنڈی گئے تو کیپٹن احسان الرحمٰن بخاری کے ہاں اپنی کوٹھی ہی میں ٹھہرے۔ ۱۸ اگست ۱۹۶۵ء کو کیپٹن بخاری کی سالگرہ تھی۔ دونوں دوست صبح اسلام آباد گئے۔ خوب سیر کی۔ پچھلے پہر ٹوپی پارک آ دے۔ سہ پہر کو ہوٹل میں چائے پی۔ دن بھر خوب لطف اندوز ہوئے اور رات کو دیر سے کوٹھی واپس آئے۔ سونے سے قبل دونوں دوستوں مے چند گھریلو باتوں کا ذکر ہوا۔ تو کیپٹن بخاری کے ایک ذاتی مسئلہ پر وہ اتنے پریشان ہوئے کہ رو پڑے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ بخاری خود اس مسئلہ پر کچھ ایسے پریشان نہیں تھے البتہ اس بات پر وہ ضرور پریشان ہوئے کہ بھٹی سے اس کا ذکر کر کے ان کو پریشان کیا ہے۔ صبح جب کیپٹن بخاری نے نہانے کے لیے کہا تو کمرے سے اٹھ کر ساتھ غسل خانہ میں گئے۔ وہاں کچھ دیر خیالات میں محو رہے۔ پھر تولیہ اٹھا کر کندھے پر رکھا اور واپس آ گئے۔

کیپٹن بخاری نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا: جب میں پوچھا کہ نہائے کیوں نہیں، تو چونک کر کہنے لگے ''واقعی میں نہیں نہایا؟''

....

بیگم عزیز بھٹی نے بتایا کہ گھر آ کر بھی کیپٹن بخاری کے مسئلہ کا ذکر کیا تو آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ بیگم بھٹی نے یہ بھی بتایا کہ کیپٹن بخاری کا وہ مسئلہ ان کی شہادت کے جلد بعد حل ہو گیا تھا اور اب ان کی روح دوست کی شادمانی پر خوش ہو گی۔

کھیل اور موسیقی

عزیز سکول کے زمانہ سے ہی نہ صرف تعلیم میں بلکہ کھیلوں میں بھی خوب دلچسپی لیتا تھا۔
بچپن میں اس کا جسم بڑا نرم و نازک تھا مگر آہستہ آہستہ وہ خاصا مضبوط ہوتا چلا گیا۔
ہانگ کانگ میں وہ کرکٹ' فٹ بال اور والی بال کے اچھے کھلاڑیوں میں شمار ہوتے تھے
۔کرکٹ کے بہترین بیٹسمین تھے اور اپنے شان دار کھیل سے تماشائیوں کو خوب محفوظ کرتے تھے۔
کاکول اکیڈمی میں وہ دوسرے کھیلوں کے علاوہ ہاکی ٹیم میں گول کیپر کے فرائض
سرانجام دیتے تھے۔گول کیپر کے فرائض کا بہترین مظاہرہ انہوں نے ''برکی محاذ'' پر بھی کیا۔
رجمنٹ کی فٹ بال ٹیم میں کھیلتے تھے۔فٹ بال کے ایک میچ میں ان کا گھٹنا اتر گیا تو نی
کیپ Knee Cap پہن کر فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔

عزیز بھٹی کو پیراکی اور سکیٹنگ کا شروع سے ہی بڑا شوق تھا اور یہ شوق عمر بھر قائم رہا۔ وہ کشتی رانی اور پیراکی کے مقابلوں میں اکثر اول انعام حاصل کرتے تھے۔

کوئٹہ میں وہ اکثر سکیٹنگ کرتے ہوئے ہی گھر سے انفنٹری سکول آیا جایا کرتے تھے۔ کینیڈا کے قیام کے دوران برف پر سکی ان Skiing اور سکیٹنگ خوب کرتے تھے۔ انہوں نے سارے بچوں کو سوئمنگ اور سکیٹنگ سکھا رکھی تھی۔ بچوں کو کھیلتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے۔

بیگم بھٹی نے بتایا کہ میں نے ان سے ایک دفعہ کہا کہ اب بچے سوئمنگ سیکھ رہے ہیں، اگر ان کے سامنے آپ بھی سوئمنگ کریں تو وہ شرم محسوس کریں گے۔ آپ کو تو سوئمنگ چھوڑنا پڑے گی! کہنے لگے اس میں کون سی شرمانے کی بات ہے؟ دنیا میں شرمانے کی اور بہت باتیں ہوتی ہیں۔ اس طرح کوئٹہ کی سڑکوں پر سکیٹنگ کرتے ہوئے وہ کبھی بھی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوتے تھے کہ کوئی کیا کہے گا!!

موسیقی کا دلدادہ

عزیز کو موسیقی سے بچپن سے ہی بے حد شغف تھا اور اس کی یہ دلچسپی عمر بھر قائم رہی۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے ماؤتھ آرگن سے مختلف دھنیں بجانا سیکھا۔ وہ زیادہ انگلش اور چینی سروں کو پسند کرتے تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ماؤتھ ارگن وہ ساری عمر بجاتے رہے اور ان کی کوئی ذاتی پارٹی ہو، شادی کی کوئی تقریب ہو یا فوج میں کوئی جشن، ہر پروگرام ماؤتھ آرگن کی دھنوں کے بغیر نامکمل تصور کیا جاتا تھا۔ یہ دھنیں ورائٹی شو کا دلچسپ حصہ ہوتی تھیں۔ ماؤتھ ارگن کے ساتھ ایک جنگی رقص کی دھن بڑے شوق سے بجاتے تھے اور اس کے ساتھ خود رقص بھی کیا کرتے تھے۔

بچپن میں ہانگ کانگ کے گردوارہ کے ایک سکھ گرنتھی سے انہوں نے ہارمونیم بجانا سیکھا تھا۔ وہ گرنتھی گھر آ کر انہیں ہارمونیم سکھایا کرتے تھے۔ عزیز اکثر گنگناتے بھی رہتے تھے۔ وہ

انگلش گانے زیادہ پسند کرتے تھے۔

ماؤتھ آرگن سے ان کی بجائی ہوئی گانوں کی دو دھنیں ٹیپ پر بھی محفوظ ہیں۔ ان میں ایک فلم محل کا مشہور گانا ''آئے گا آنے والا'' کی پر سوز دھن ہے اور دوسری پنجابی گانے ''لارا لپا لائی رکھدا'' کی۔

جرمن نوٹ بک میں جرمن اور انگلش گیتوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے چند اردو گانے بھی نوٹ کر رکھے تھے۔

''میں طور نہیں جو جل جاؤں''

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں
ہر چیز مقابل آ جائے
منزل کی طرف دو گام چلوں۔ اور سامنے
منزل آ جائے

....

اے دل کی لگی چل یوں ہی سہی
چلتا ہوں اُن کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا
جب رنگ پہ محفل آ جائے

....

اے برق تجلی کوند ذرا
کیا مجھ کو بھی موسیٰ سمجھا ہے
میں طور نہیں جو جل جاؤں
جو چاہے مقابل آ جائے

....

اے میرے دل کہیں اور چل
غم کی دنیا سے دل بھر گیا
ڈھونڈ یے اب کوئی گھر نیا

....

چل جہاں غم کے مارے نہ ہوں
جھوٹی آشا کے تارے نہ ہوں

وہ صرف خود ہی گاتے بجاتے نہ تھے بلکہ ان کے نزدیک موسیقی روح کی غذا ہے' چنانچہ وہ دوسروں کے لیے بھی اس کا خاص خیال رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ جب وہ معرکہ ''برکی'' میں ایک تیس فٹ اونچے بالا خانے پر کھڑے ہوئے ذاتی تحفظ سے بے نیاز ہو کر دشمن کی نقل و حرکت کو دیکھ رہے تھے اور یمین و یسار سے اس پر گولہ باری کر وا رہے تھے' تو بھی وہ موسیقی سے بے نیاز نہ تھے۔ انہوں نے موت کو ایک کھیل سے زیادہ کوئی حیثیت نہ دی اور

> توپوں کے گولوں کی آواز جس سے کان پھٹے پڑتے تھے' وہ اس سے بھی مانوس ہو گئے اور وہ ان کے لیے موسیقی کے ایک متبادل انتظام کی حیثیت اختیار کر گئی۔

اس اونچے چبارے سے وقفوں کے بعد موسیقی کی دھنیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ میجر عزیز نے خبروں اور جوانوں کی دلچسپی کے لیے ایک ٹرانزسٹر رکھا ہوا تھا...... جب برکی کا محاصرہ ہوا تو جوانوں کو میجر عزیز نے وائرلیس کے تمام سامان کے ساتھ وہاں سے بحفاظت نکال لیا مگر ٹرانزسٹر کو زائد سامان تصور کر کے وہیں رہنے دیا گیا۔

ڈسپلن کی پابندی

فوجی ڈسپلن کے سخت پابندی تھے اور ڈسپلن کی خلاف ورزی معاف نہیں کرتے تھے۔ کاکول میں بٹالین سینئر انڈر افیسر بنے تو فوجی ڈسپلن کے معاملے میں اپنے حلقہ احباب میں اور دوسرے کیڈٹوں میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتے تھے۔ کوئی دوست غلطی کرے تو اسے ضرور سزا دیتے تھے۔ ان کی گرفت سخت تھی۔ کسی سے قطعاً کوئی رعایت نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے: اس مسئلہ میں دوستوں سے رعایت کرنا نہ صرف اپنے ساتھ بلکہ ان کے ساتھ بھی جرم کرنے کے مترادف ہے۔ آگے چل کر ان کو اس کی زیادہ قیمت دینا پڑتی ہے۔ ان کی گرفت پر ان کے اکثر دوست حیران و متعجب ہو جاتے تھے۔

میجر زیدی نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ کس طرح معمولی غلطی پر ان کو پکڑا تھا اور سزا دی تھی۔ میجر زیدی نے بتایا کہ ان کے احباب ان کی طبیعت اور کردار کو سمجھ گئے تھے۔ اس لیے اس بات پر ان کا کوئی دوست ان سے ناراض نہیں ہوتا تھا۔ سروس میں بھی یہی حال تھا۔ وہ بڑے نرم مزاج تھے۔ مگر ڈسپلن کے معاملے میں وہ بڑے سخت تھے۔

جہاں زیب بنگش نے بتایا:

عزیز بھٹی ڈسپلن کے معاملے میں کسی کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ وہ بٹالین سینئر انڈر آفیسر تھے۔ اگرچہ ہم ان کے بہت قریب تھے مگر اس معاملے میں ہم بھی اس سے ڈرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں ذرا لیٹ آیا تھا' انہوں نے ڈسپلن کے تحت میری پیشی کر دی۔

ان کے سب سے پہلے کمانڈنگ افیسر نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ وہ اور لیفٹیننٹ بھٹی جیپ پر جا رہے تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ دونوں ہی بنیانوں اور نیکروں میں تھے۔ چھاؤنی میں ایک فوجی افسر نے ان کو نہ پہچانا اور سلیوٹ کرنے کی بجائے جیپ روک کر پوچھا؟ کون ہو؟

کرنل اکبر کہتے ہیں: بجلی کی کڑک کے ساتھ لیفٹیننٹ بھٹی پکار اٹھا ''جانتے نہیں ہو۔ سی او صاحب ہیں'' بھٹی کے الفاظ سے وہ سر سے پاؤں تک کانپ گیا اور فوراً اٹینشن ہو کر سلیوٹ کیا۔

وہ اپنے سینئر افسروں کی پوری عزت کرتے تھے۔ اس معاملہ میں فوجی ڈسپلن کے اتنے ہی پابند تھے، مگر انہوں نے زندگی بھر کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ کبھی کسی سے مرعوب ہوئے۔ انہوں نے اپنی ترقی کے لیے خداداد قابلیت اور انتھک محنت کے سوا کوئی اور سہارا تلاش نہ کیا۔

بنگش

پاکیزگی اور شرافت

کرنل جہاں زیب بنگش نے کہا: ہمارے ہاں کوہاٹ کی طرف پردے کی بہت زیادہ پابندی ہے، مثلاً ہمارے ہاں ایسے رشتہ داروں سے بھی پردہ کیا جاتا ہے کہ ادھر پنجاب میں وہ بالکل مضحکہ خیز معلوم ہو۔ میرے اپنے گھر میں پردے کی اسی طرح شدت سے پابندی کی جاتی ہے۔ میرے بہت سے دوست ہیں اور میری بیگم سب سے پردہ کرتی ہیں۔ البتہ اس کلیہ سے میرے صرف ایک دوست مستثنیٰ تھے اور وہ راجہ عزیز تھے۔ نہ صرف یہ کہ میری بیوی ان سے پردہ نہیں کرتی تھیں بلکہ میری غیر حاضری میں بھی میرے گھر کے دروازے ان پر کھلے تھے۔ میری بیوی کو ان کے ہاں جانے کی اسی طرح آزادی تھی جیسے اپنے بھائی کے گھر جانے کی۔

کرنل بنگش کہنے لگے: میجر عزیز کی پاکیزگی صرف ان کے اعمال و اطوار تک محدود نہ تھی۔ میں ان کے ساتھ انتہائی بے تکلف رفاقت میں یہ محسوس کیا ہے کہ ان کے خیالات بھی اسی طرح پاکیزہ تھے۔ ان کی پاکیزگی ان کے چہرے سے جھلکتی تھی۔

....

لادیاں کی ایک خاتون محترمہ سردار بیگم نے ایک ملاقات میں بتایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ وہ اس بستی کا ایک شریف ترین انسان تھا تو غلط نہ ہوگا۔

میں نے عزیز کو اس کی زندگی کی مختلف حالتوں میں دیکھا ہے۔ اتفاق سے میرا گھر زرینہ کے میکے کے بالکل نزدیک ہے اور عزیز یہاں اکثر آیا کرتا تھا۔ عمر بھر اس کے انکسار میں فرق نہیں آیا۔ وہ گھر آتا تو خالص دیہاتی لباس پہنتا، ننگے سر گاؤں میں نہیں نکلتا تھا اور گلیوں میں چلتے ہوئے

ہمیشہ نگاہیں نیچی رکھتا تھا۔ ویسے بڑا شگفتہ مزاج تھا اور جب بھی سسرال آتا تو اڑوس پڑوس میں بھی سب کی خیر و عافیت پوچھتا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ اس سے محبت کرتے تھے۔ بچے بالخصوص اس سے بڑے مانوس تھے۔

محترمہ سردار بیگم کے پاس بیٹھی ہوئی خواتین نے بے ساختہ ان کے خیالات کی تائید کی اور ایک بڑی بی کہنے لگیں: یوں تو بابو جی کی ساری اولاد بری نیک ہے' مگر عزیز تو ان سب میں ایک نرالی ہی چیز تھا۔

محبت کا لازوال سرچشمہ

عزیز کے بچپن میں اس کی خاموشی' کم گوئی اور گہری سوچ بچار کی عادت سے یہ شبہ ہوتا تھا کہ شاید اس کی دلچسپی کا محور صرف اس کی اپنی ذات ہے۔ البتہ دوسرے عوامل اس شبہے کی تکذیب کر دیتے تھے۔ مثلاً وہ گہری سوچ بچار اور کم گوئی کے باوجود دوسروں میں دلچسپی لیتا تھا۔ وہ ان کے ساتھ تعاون کرتا' ان کے لیے ایثار کرتا تھا۔ اس کی انکسار پسندی ضرب المثل تھی۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا گیا اس کی طبیعت کا یہ رخ اور واضح ہو کر سامنے اتا گیا۔ وہ دوسروں کی خوشنودی سے دلی شادمانی حاصل کرتا اور اکثر اپنی خوشیوں کو دوسروں پر نچھاور کر دیتا۔ کسی انسان کی دل آزاری اس کے نزدیک بہت بڑا گناہ تھا۔ اس کا دل محبت کا ایک لازوال سرچشمہ تھا۔

اسے اپنے والدین سے بے پناہ محبت تھی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھا اس کی محبت کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اسے اپنے بہن' بھائیوں' اساتذہ' دوستوں اور ہم جولیوں سے بڑی محبت تھی۔ اسے اپنی والدہ کے ساتھ ایسے ہی جذباتی لگاؤ تھا گویا وہ ایک معصوم بچہ ہے اور یہ عمر بھر قائم رہا۔ مراجعت وطن کے بعد اس کی شادی کر دی گئی۔ میاں بیوی ایک دوسرے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ میجر بھٹی کی ازدواجی زندگی مثالی حد تک کامیاب اور خوش گوار تھی۔ خدا نے انہیں پر مسرت ازدواجی زندگی کے اثمار پیارے بچوں کی صورت میں عطا کیے تو انہیں ان بچوں کے ساتھ بھی بے پناہ محبت تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کو زندگی میں کبھی عزیز کے ساتھ واسطہ پڑا وہ اس کی دل آویز شخصیت کے سحر اور اس کی محبت کی مقناطیسیت کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے اپنے گھر' اس کے ٹیڑھے میڑھے راستوں' اس کے ندی نالوں' باجرے کے کھیتوں اور آموں کے درختوں' سب سے بڑی جذباتی محبت تھی۔

اس کے دل کی پہنائیوں اور وسعتوں میں بہت سی محبتیں بیک وقت سمائی رہتی تھیں۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ بے پناہ محبت کے باوجود اپنے والدین اور بہن بھائیوں سے بھی اتنی ہی محبت رکھتا تھا اور ان محبتوں میں کبھی تصادم کی نوبت نہیں آتی تھی۔ اسی طرح کسی ایک دوست کی محبت کو اس نے دوسرے کی محبت پر قربان نہیں کیا' بلکہ سب سے اپنی اپنی محبت اور واسطہ قائم رہتا تھا۔

البتہ عزیز بھٹی کا ایک محبوب ایسا بھی تھا جس کی محبت میں وہ زندگی کی عزیز سے عزیز ترین متاع حتیٰ کہ والدین' بہن بھائیوں' بیوی بچوں اور دوستوں کی مفارقت برداشت کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اور وہ محبوب' اس کا پیارا وطن ...... پاکستان ......تھا' جس کی آن پر ان نے اپنی جان نچھاور کر دی اور جس کی آغوش میں وہ ابدی نیند سو رہا ہے۔

بچوں سے پیار

عزیز کو چھوٹے بچوں سے غیر معمولی محبت تھی ۔ معصوم بچوں کو دیکھتے تو پیار کرنے کے لیے جیسے وہ مچل جاتے تھے ۔شاید معصومیت کے ساتھ ان کی ذہنی معصومیت کو مناسبت تھی ۔ وہ بچوں کی صحبت میں بے حد مسرور رہتے تھے ۔ اپنے بچوں کے ساتھ بھی انہیں بڑا پیار تھا۔ وہ بچوں کو قدرت کا ایک انمول تحفہ قرار دیتے تھے اور کہا کرتے تھے: بچوں کی محبت کا دنیا میں کوئی بدل نہیں ہے۔

بچوں کے ساتھ اکثر کھیلتے تھے ۔ بچوں کے جذبات واحساسات اور ان کی ضروریات کا بڑا خیال رکھتے تھے ۔ان کے لیے سیر وتفریح' کھیل کود اور موسیقی کا خاص دھیان رکھتے تھے۔

خود چینی' انگلش' یا جرمن گانوں کی دھنیں زیادہ پسند کرتے تھے اور ان گانوں کے بہت سے ریکارڈ منگوا رکھے تھے مگر بچوں کے لیے اردو اور پنجابی گانوں کی دھنیں بالخصوص سیکھتے تھے اور انہیں منہ کے باجے سے سناتے تھے۔

جہاں کہیں ہوں اور خواہ کیسے ہی مصروف کیوں نہ ہوں' بچوں کو خود پڑھانے کے لیے وقت ضرور دیتے تھے ۔ ۱۹۶۵ء کے آغاز میں کوئٹہ میں انفنٹری سکول سے لاہور اپنی یونٹ میں واپس آئے تو سکولوں کی تبدیلی کے باعث بچوں کی تعلیم بہت متاثر ہوئی ۔ جولائی ۱۹۶۵ء میں دو ماہ کی رخصت لے رکھی تھی تا کہ گرما کی تعطیلات میں بچوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دے سکیں (ساتھ ہی ملٹری ہسٹری پڑھنے کا پروگرام تھا)۔

جنگ کے عین دوران گھر والد صاحب کو خط لکھا تو بھی یہ لکھنا نہ بھولے کہ جنگ کے دوران بھی بچوں کی تعلیم جاری رکھیں۔

پیار کے ساتھ ساتھ بچوں کے نظم وضبط کا بھی خاص خیال رکھتے تھے ۔ وہ ان کی زیادہ

سے زیادہ آزادی کے قائل تھے مگر بے لگامی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ بعض دفعہ ان کو جھڑکتے اور بدنی سزا بھی دیتے تھے مگر ان کی مار خالی از پیار نہ ہوتی تھی۔

بیگم بھٹی سناتی ہیں کہ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ جب کسی بچے کو جھڑکنا یا سزا دینا چاہتے تو اس کو پکڑ کر مجھے آنکھ سے اشارہ کر دیتے تھے کہ تم آ کر مجھ سے چھڑا لو۔ تا کہ بچے کو ڈر بھی رہے اور وہ سزا سے بھی بچ جائے۔ چنانچہ میں دوڑ کر اسے چھڑا لیتی تھی اور ابا جان سے معافی لے دیتی تھی۔ وہ بہت خوش ہو جاتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں خود ان سے تنگ آ کر چاہتی تھی کہ ذرا ان کی پٹائی ہو جائے چنانچہ میں بھٹی صاحب کے اشاروں کو نظر انداز کر دیتی تھی۔ پھر تو انہیں نظم وضبط قائم رکھنے کے لیے تادیبی کاروائی کرنا پڑتی تھی۔ لیکن پھر علیحدگی میں مجھے سخت کوستے اور کہتے "تم بہت ظالم ہو، تم نے اسے مجھ سے چھڑایا کیوں نہیں؟" پھر خود ہی بچے کو راضی کر لیتے اور اسے بہت پیار کرتے تھے۔ بچے کو جھڑکنے یا سزا دینے سے انہیں سخت روحانی اذیت ہوتی تھی۔

جب بھی گھر آتے بچے شور مچاتے تھے کہ ابا جی آ گئے اور ان کی ٹانگوں سے چمٹ جاتے تھے۔ شام کو دیر سے آئیں تو بچے بستروں میں لیٹے ہوں تو ہر ایک کے بستر پر جا کر اسے گدگداتے تھے، پھر ان سے پیار کر کے ان کو سلا دیتے تھے۔ اکثر بچے جان بوجھ کر یوں آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتے تھے گویا سو رہے ہیں۔ ان کے گدگدی کرنے سے وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیتے تھے۔ البتہ رات دیر سے گھر آئیں تو انہیں جگاتے نہیں تھے بلکہ ان کی نیند میں خلل انداز ہونے کے ڈر سے جوتا دروازے میں اتار کر ہر ایک کو باری باری دیکھ کر اپنے بستر جا کر لیٹ جاتے تھے۔

روبی

ان کی ایک بچی روبینہ عرف روبی ۳۰ مئی ۱۹۵۸ء کو جہلم میں پیدا ہوئی۔ اور دو سال زندہ رہ کر ۶ جون ۱۹۶۰ء کو راولپنڈی میں چل بسی۔

روبی بچپن میں کافی بیمار رہی جس سے خاصی کمزور ہو گئی تھی۔ جب وہ گھر آتے تھے۔ تو

سب سے زیادہ پیار روبی سے کرتے تھے۔ آتے ہی اسے اٹھا کر اس کی پشت سہلاتے' پیار کرتے پھر اسے لے کر کھلاتے رہتے۔

ہمسائیگی میں ایک کرنل رہتے تھے۔ وہ حیرت اور تعجب سے کہا کرتے تھے کہ یہ شخص زندگی کے تکلفات سے کتنا بے نیاز ہے؟ بیمار' کمزور اور لاغر بچی کو گھنٹوں اٹھائے پھرتا ہے۔ حالانکہ گھر میں اسے کھلانے کے لیے نوکر' دوسرے بچے اور اس کی والدہ بھی موجود ہیں۔

پھر روبی بالکل صحت یاب ہوگئی اور اتنی موٹی ہوگئی کہ اپنی دو سال بڑی بہن زینت کے برابر لگتی تھی۔

۱۹۶۰ء میں اسے کالی کھانسی کے ساتھ غشی کی بیماری لگ گئی۔ جب اس پر غشی کی حالت طاری ہوتی تو یوں لگتا کہ اب اس کا سانس واپس نہیں آئے گا' مگر سانس پھر واپس آ جاتا۔ ڈاکٹروں کو دکھایا تو انہوں نے کہا غشی کی حالت میں اس کا گلا بالکل بند ہو جاتا ہے۔ اس کا تو مرض خطرناک ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ یہ کوشش کی جایا کرے کہ اسے کسی بات پر غصہ نہ آئے۔

۶ جون ۱۹۶۰ء کو روبی حسب معمول نہا دھو کر بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی کہ کسی بات پر بگڑ کر غشی کی حالت طاری ہوگئی۔ زرینہ نے پہلے اسے کوئی اہمیت نہ دی کہ ابھی تنفس بحال ہو جائے گا' مگر جب دیر تک سانس واپس نہ آیا تو اسے ملٹری ہسپتال لے گئیں۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ بچی تو مر چکی ہے' مگر اس کی والدہ کو یقین نہ آیا۔ اسے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے بھی یہی کہا۔ وہ انتظار کرتی رہیں مگر آج روبی روٹھ کر دور جا چکی تھی۔ ناچار رو دھو کر اسے دفنا دیا۔ مگر آخر تک اس کی ماں کو یوں احساس رہا جیسے روبی ابھی آنکھیں کھول دے گی۔

روبی کے ابو کو ننھی کا قدرتی طور پر بڑا صدمہ ہوا۔ ان دنوں وہ جرمن زبان کے ابتدائی کورس کے لیے کراچی میں تھے۔ پھر وہ کنبہ بھی وہاں لے گئے کہ ماں کے لیے الگ رہ کر یہ صدمہ ناقابل برداشت ہوگا۔

۷ا پنجاب کے میجر سعید ملک نے بتایا:

بچوں کے ساتھ بہت پیار کرتے تھے۔ گھر آ کر ان کے ساتھ کھیلنا ان کا مرغوب مشغلہ تھا

۔بال بچوں کے ساتھ سیر یا ہوا خوری کو نکلیں تو انہیں اٹھا لیتے تھے اور اس امر سے ہرگز نہیں ہچکچاتے تھے کہ "لوگ کیا کہیں گے؟" پوچھتے تھے کیا لوگ اس پر اعتراض کریں گے کہ اپنا بچہ یوں اٹھایا ہوا ہے؟

میجر سعید ملک ۱۷ پنجاب نے بتایا کہ جب میجر بھٹی شروع ۱۹۶۵ء میں واپس رجمنٹ میں آئے تو میں نیپئر ہوٹل میں رہتا تھا اور وہ سامنے کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ اکثر شام کو کہتے کہ چلو بچوں کو ساتھ لے سیر کو چلیں۔ کبھی کبھی انہیں ۲۲ بریگیڈ میس میں ٹیلی ویژن دکھانے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔

صدر محمد ایوب خاں کے دورہ روس سے واپسی پر گارڈ آف آنر کی فلم بھی ہم نے یہیں دیکھی تھی۔ میجر بھٹی ہی گارڈ آف آنر کے انچارج تھے۔ سب بچوں کو ساتھ لے کر گئے تھے۔

کئی دفعہ میں کہہ دیتا کہ بچوں کو ساتھ لے جانے کی مصیبت ہے لیکن وہ میرے تامل کے باوجود اصرار کرتے اور اکثر میرے چھوٹے بچے کو خود اٹھا لیتے تھے۔ حالانکہ کرنل قریشی کے رخصت پر چلے جانے کے بعد وہ بٹالین میں قائم مقام کمانڈنگ آفیسر تھے اور میں ان کے ماتحت ایک کمپنی کمانڈر تھا۔ وہ کمتری اور برتری کے ان احساسات اور اوہام سے بلند تھے۔

بچوں کی تعلیم پر اخراجات

وہ ضروریات کے لیے دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ بچوں کو اچھے اچھے سکولوں میں داخل کرواتے تھے اور ان پر خوب خرچ کرتے تھے۔ بچوں کی تعلیم پر خرچ کر کے وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ پنجاب رجمنٹ کے میجر غلام مصطفیٰ ملک کہنے لگے ایک دفعہ میں نے میجر بھٹی سے باتیں کرتے ہوئے اپنی پریشانی کا اظہار کیا کہ تعلیم کے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں اور ہم جیسے لوگوں کے بچوں کو تعلیم دلوانا کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ مگر بجائے اس کے کہ میجر بھٹی روایتی انداز میں میرے ساتھ اظہار ہمدردی کرتے وہ کہنے لگے "یار بچوں کی تعلیم سے بڑھ کر آ کر کونسی مد ہے جس پر زیادہ خرچ کرنے کے لیے پیسے چاہئیں۔ بلکہ میں تو اکثر یہ سوچ کر تعجب کرتا ہوں کہ ہمارے بچوں کو تعلیم

کتنی سستی ملتی ہے؟''

میں ان کی بات سن کر حیران سا ہوا اور سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ ان کی دلیل میں واقعی وزن تھا۔ لیکن میجر عزیز بچوں پر ان کی ضروریات کے مطابق خرچ کرنے کے قائل تھے۔ ان کے سیر و تفریح اور ان کے شوق کی چیزیں خریدنے پر دل کھول کر خرچ کرتے تھے مگر ان کو اسراف اور فضول خرچی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ بلکہ بچوں کو کفایت شعاری کی عادت سکھاتے تھے۔ کوئٹہ میں ظفر کے نام خطوط میں انہوں نے اس موضوع پر بڑی مفید اور کار آمد باتیں لکھی ہیں۔

شہید کے چند خطوط

ظفر کے نام مئی ۱۹۶۵ء سے اگست تک کے زمانے کے یہ چند خطوط ہیں۔ ان میں ۳ جون کا خط ظفر کے علاوہ اپنے بہن بھائیوں کے نام بھی ہے۔

شہید کے یہ خطوط سیدھے سادے گھریلو خطوط ہیں۔ البتہ ان سے ان کی اپنے بال بچوں سے محبت' ان کی تعلیم و تربیت کے ساتھ دلچسپی اور بہن بھائیوں اور دوستوں سے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۷ پنجاب　　　　میرے پیارے ظفر

۵ مئی　　　　مجھے تمہارا ۶۵۔۵۔۲ کا خط ملا۔ تمہارے ماموں شفیع کا پتہ یہ ہے

۲ اوکٹری روڈ۔ برنلے لنکا شائر' یو کے اور پچاس پیسے کا ہوائی ڈاک کا لفافہ درکار ہوتا ہے۔

بھائی جان کا پتہ یہ ہے: لیفٹیننٹ این اے بھٹی۔ تھرڈ سیکرٹری۔ پاکستانی سفارت خانہ پیکنگ' معرفت وزارت امور خارجہ۔ اسمبلی بلڈنگ کراچی

کیا یہ طویل نہیں ہے؟ خط ۱۵ پیسے کے عام لفافہ میں بھیجیں۔

مجھے ڈر ہے۔ یہ ممکن نہیں ہوگا کہ ابھی کوئی پتلون بنوائی جائے۔ زلفی۔ رفیق اور بچیوں کی یونیفارموں اور کتابوں پر کافی خرچ ہو چکا ہے۔

یہ خیال رکھیں کہ تمہاری پڑھائی کا خرچ بھی بہت زیادہ ہے۔ صرف اندازاً تمہارے بلوں کا خلاصہ یہ ہے:

فروری: ۱۲۷روپے

مارچ: ۲۲۸روپے

اپریل: ۲۷۷روپے (معہ پچاس روپے کرایہ)

مئی ۲۷۹روپے (معہ پچاس روپے کرایہ پیشگی)

پس کفایت شعاری سے کام لیں۔ تم ملیالے رنگ کی پتلون کیوں نہیں پہنتے۔ جو ہم نے تمہارے لیے سلوائی تھی؟ جب تم موسم گرما کی تعطیلات سے آؤ گے تو ہم تمہیں مزید قمیضیں لے دیں گے۔ ٹیپ ریکارڈر ابھی تک کراچی میں ہے۔ اگر کوئی کوئٹہ جاتا آدمی مل گیا تو ہم تمہیں کچھ چیزیں بھیج دیں گے۔

تمہارا پیارا ابا

....

۱۷ پنجاب رجمنٹ
۷ مئی

پیارے ظفر!

چند دن ہوئے تمہارا خط ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تم بخیریت ہو مگر تمہیں خط و کتابت میں ذرا اور باقاعدگی کرنی چاہیے۔

میں نے تمہیں ایک ٹائپ شدہ خط بھیج دیا ہے اور اگر میں کل لاہور نہ گیا تو کل ہی ''بھائی جان'' کا خط بھی ارسال کر دوں گا۔

آپا طاہرہ کراچی سے آ رہی ہیں اور شاید ٹیپ ریکارڈ بھی ساتھ لائیں۔ جب تم جولائی میں گھر آؤ گے تو تم کچھ اچھے ریکارڈ ٹیپ کر سکو گے۔

کیا وجہ ہے کہ مجھے تمہارے سکول کے امتحانات کے نتائج کی اطلاع نہیں دی جاتا' کیا یہ اطلاع سکول کی طرف سے براہ راست دی جاتی ہے یا تمہاری وساطت سے؟ میں نے انتظام کر دیا ہے کہ میجر بخاری تمہیں ریاضی پڑھایا کریں۔ تم ان سے رابطہ قائم کر کے پڑھائی شروع کر دو۔

بٹالین میں اب کافی آفیسر آ گئے ہیں' مگر ابھی تک ملاقات نہیں ہو سکی۔

ہمیں تمہاری کمی کا شدید احساس ہوتا ہے' خاص کر زنئی اور رفیق کو۔ وہ سوئمنگ کلب کے ممبر ہیں اور انہوں نے باقاعدگی سے پیراکی میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔

میجر سعید کا بڑا صاحبزادہ بھی گیریزن سکول میں داخل ہو گیا ہے جہاں زلفی پڑھتا ہے

گزشتہ ہفتے میں لاہور گیا تھا اور بچوں کی تین تین ماہ کی فیسیں ادا کر آیا تھا۔ فادر گاڈ فرلے سے گزارش کر دینا کہ اگلے مہینے میں ۲۰۰/۰۰ کی بجائے ۳۰۰/۰۰ روپیہ ارسال کر دوں گا تا کہ وہ زائد اخراجات بھی پورے ہو جائیں جن کی فہرست انہوں نے بھیجی ہے۔

محبت کے ساتھ.........آپ کا ابا

ننھے کی مٹھائی کے لیے پیسے اگلی دفعہ بھیج دیں گے۔

....

۱۷ پنجاب رجمنٹ۔ لاہور سب کو سلام علیکم!

۳ جون ۱۹۶۵ء

یہاں پر بفضل تعالیٰ بالکل خیریت ہے۔ آپ لوگوں کی نیک مطلوب ہے میں نے ایک مدت کے بعد پھر ٹائپ رائٹر پر ہاتھ رکھا ہے۔ چنانچہ آج یہ خط ٹائپ میں لکھ رہا ہوں۔

سب سے پہلے محمد بوٹا نمبر ۴ کے متعلق سنیے:۔

وہ بڑا صحت مند ہے اور اس کا وزن تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ شروع شروع میں وہ پتلا دبلا تھا لیکن چند دن قبل جب میں گھر گیا تو اس کے وزن میں دو پونڈ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ پکے رنگ میں رفیق کی ہو بہو نقل معلوم ہوتا ہے۔ ۵ جون کو زرینہ ختنے کے لیے اسے فوجی ہسپتال لے جائے گی ۔ زرینہ بھر اس کے ساتھ مصروف رہتی ہے۔ ہمارا اردلی چھٹی سے واپس آ گیا ہے اور گھر کا زیادہ تر کام کاج وہی کرتا ہے۔

طاہرہ! میں نے آپ کو لکھا تھا کہ مجھے پتہ دیں کہ شریف صاحب اب کہاں ہیں؟ ترکیہ

میں تو اب ڈار صاحب چلے گئے ہیں مگر آپ نے انکا ایڈریس نہیں لکھا۔ انکا پتہ مل سکتا ہے یا نہیں؟

بچوں کے سکول اس ماہ کے آخر میں بند ہو رہے ہیں اور پھر ستمبر میں کھلیں گے' اس لے وہ جلدی گاؤں نہیں جاسکیں گے۔

کراچی والو! میرا خیال ہے یہ بہتر رہے گا کہ آپ سب لوگ لاہور اتریں اور دس دن ٹھہر کر بس کے ذریعے گجرات یا لالہ موسیٰ چلے جائیں۔ زرینہ کے لیے خوب مصاجت رہے گی۔

بچیاں اگر پیرا کی سیکھنے میں دلچسپی رکھتی ہیں تو ہم ان کے لیے رفعت کے سکول میں اجازت ناموں کا انتظام کر دیں گے۔ مکانیت کی ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر سامان بندھا پڑا ہے اور ڈرائنگ روم کو بھی بطور خواب گاہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ میں ہفتے عشرے بعد گھر آتا ہوں' اس لیے جگہ کی بہت گنجائش ہے۔

براہ نوازش اس تجویز پر ضرور غور کریں۔

ہمارے ہاں آنے کے لیے نیپیئر ہوٹل کا پوچھ لیں۔ ہم نیپیئر ہوٹل کے بالمقابل ۸۳ کنگھم روڈ پر رہتے ہیں۔ ریلوے سٹیشن لاہور سے اومنی بس نمبر ۲ کا سٹاپ بالکل ہمارے گھر کے سامنے ہے۔ اگر آپ پہلے خط لکھ دیں تو میں یہ انتظام کر دوں گا کہ کوئی آپ کو سٹیشن پر مل جائے جو سامان کی حفاظت کرے۔

ریزرو پر آئے ہوئے فوجی جوانوں کو کثیر تعداد میں واپس بلایا جا رہا ہے۔ مجھے فضل کریم کے متعلق کوئی علم نہیں ہے کہ آیا انہیں بھی واپس فوج میں بلایا گیا ہے؟

یوں لگتا ہے جیسے ابھی ہمیں یہاں کافی عرصہ ٹھہرنا پڑے گا۔ یہاں سخت گرمی پڑتی ہے مگر سب کے حوصلے بلند ہیں اور ہندو بنیوں پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بیقرار ہیں۔

اقبال قریشی ہم سے کوئی بیس میل دور ہوگا لیکن جب سے ہم ادھر آئے ہیں ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

بھائی جان! زلفی اپنے انعام کے لیے دق کرتا رہتا ہے۔ آپ اس کے متعلق کیا کر رہے ہیں؟ آپ کا آخری خط چین پر ایجر سنو کی کتاب کا ایک اقتباس معلوم ہوتا ہے' آپ یہ کتاب ضرور

پڑھیں۔

رشید! تم نے یہ نہیں لکھا کہ فاطمہ اور بچے یہاں کراچی میں تمہارے ساتھ ہیں یا ڈھاکہ میں۔ وہاں مشرقی پاکستان میں تو خطرناک طوفان آ رہے ہیں مگر تم نے چپ سادھ رکھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اس مقولے پر عمل کرتے ہو کہ کوئی خبر نہ آنا بھی تو ایک اچھی خبر ہے۔ کیا تمہیں بھی ادھر سفر کرنے کا وقت مل جائے گا۔ اگر یوں ہو تو اہل کراچی کے ساتھ ہی آ جاؤ۔ جتنے زیادہ ہوں گے اتنی ہی رونق زیادہ ہو گی۔

ظفر! دو ہفتوں سے زائد عرصے سے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ میرا خیال ہے تم اس دوران میں زیارت چلے گئے ہو گے۔ ذرا زیادہ باقاعدگی سے خط لکھا کرو۔ جب تمہیں کوئی مطالبہ پیش کرنا ہو تب تو خط لکھنے خاصے مستعد ہوتے ہو!

زرینہ نے گرمیوں کے لیے زینت کے بال لڑکوں کی طرح کٹوا دیے ہیں۔ وہ نکر پہنے تو بالکل لڑکا معلوم ہوتی ہے۔ سلام دعا کے ساتھ

آپ کا پیارا والد (ظفر کے نام)

....

میں اگلی دفعہ تمہیں چچا' بھائی جان کا خط بھیجوں گا۔ کوئٹہ سے سب لوگ اس ایریا میں آئے ہوئے ہیں مگر ابھی ان سب سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ اگر تمہارے گرما کی تعطیلات پر آنے تک ہمارا قیام یہیں رہا تو تمہیں میں یہ جگہ ضرور دکھاؤں گا۔ ہم اکثر نہر (بی آر بی) میں پیراکی کرتے ہیں۔

۲۱ جون

میرے پیارے ظفر!

میں تم کو بھائی جان' کے دو پچھلے خط بھیج رہا ہوں۔ میں ان میں سے ایک پشت پہ ہی لکھ رہا ہوں تاکہ خط بھاری نہ ہو جائے۔ ہم نہر سے کچھ فاصلے پر ہیں اور تیرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔

رفیق ہسپتال سے واپس آ گیا ہے۔ کیا تم نے چچا جی۔ ایم سے دس روپے لیے ہیں۔

آج بریگیڈیر نیازی صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔

مجھے لکھو کہ سائنس اور ریاضی میں تم کیسے جا رہے ہو۔ تمہیں اپنے اساتذہ کرام کو یہ باور کرانا ہوگا کہ تم اپنی بہترین کوشش کر رہے ہو تاکہ تم امتحان میں بیٹھ سکو۔ کیا تم بخاری صاحب سے ملے ہو؟

محبت بھرے جذبات کے ساتھ

تمہارا ابا

....

۱۷ پنجاب رجمنٹ   میرے پیارے ظفر!

۱۴ جولائی   تصویریں بھیجنے کا شکریہ! وہ اچھی تھیں، امید ہے کہ تم مجھے زیارت کی تصویر بھی بھیجو گے۔

مجھے تمہارے پچھلے ٹسٹ کا نتیجہ ملا ہے۔ ریمارکس یوں درج ہیں:

''ترقی کی ہے مگر محنت جاری رکھیں''۔ یہ بہت ہی حوصلہ افزا ہے اور مجھے یہ کہنا چاہیے کہ اگر کوشش کرو تو تم بہت ہی اچھے ہو سکتے ہو۔ یہ اچھا مظاہرہ ہے، اسے برقرار رکھو۔ نجمی نے لکھا ہے کہ ان کے فارم بھیجے جا چکے ہیں۔ تمہارے فارموں کا کیا بنا۔

یہاں کوئی لڑائی نہیں اور ہم سب لاہور واپس آ گئے ہیں۔ جو یونٹیں کوئٹہ سے آئی ہیں انہیں واپس جانے میں کچھ وقت لگے۔

میں ان کتابوں کی لسٹ ساتھ بھیج رہا ہوں جو نجمی کے زیر مطالعہ ہیں۔ شاید ان میں اور دوسری جگہوں پر پڑھی جانے والی کتابوں ...... مثال کے طور پر سینٹ انتھونی میں کچھ فرق ہو، لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا یہ کتابیں تمہارے لیے کیسی رہیں گی؟

میں نے اس مہینہ کے وسط میں دو ماہ کی چھٹی مانگی ہے تاکہ صبح بچوں کو پڑھا سکوں۔

تمہاری موسم گرما کی تعطیلات کب شروع ہوں گی اور کب تک رہیں گی؟

سردار نے لکھا ہے کہ اسے ترقی دے کر وارنٹ آفیسر بنا دیا گیا ہے۔ یہ عہدہ کمیشنڈ نہیں ہے لیکن اس کا وقار اور تنخواہ اچھی ہے۔ شریف صاحب بھی ترقی کر کے کمانڈور بن گئے ہیں اور انہوں نے بندرگاہ کا چارج لے لیا ہے۔ یہ اچھی خبر ہے۔

زلفی کا رنگ پیرا کی سے سانولا ہو گیا ہے۔ اس نے کئی ایک کامکس جمع کر لیے ہیں۔ اقبال چند دنوں سے تندرست نہیں' اس کو پیچش لگ گئے تھے مگر اس کے باوجود وہ خاصا موٹا ہے۔ فاطمہ کا جاوید بالکل بنگالی لگتا ہے۔

میں نے میجر بخاری صاحب کو لکھا ہے مگر انہوں نے جواب نہیں دیا۔ کیا انہوں نے تمہیں پڑھانا شروع کیا ہے؟ انہیں مل کر معلوم کرو۔

محبت بھرے جذبات سے............تمہارا والد

نوٹ: بچے کہتے ہیں کہ تم انہیں علیحدہ خط نہیں لکھتے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمہیں نہیں لکھتے ہیں

۱۷ پنجاب لاہور

۲۳ جولائی

میرے پیارے ظفر!

یہاں سب خیریت ہے۔ ہم تمہارے یہاں پہنچنے کی خبر کے منتظر ہیں۔ تمہیں کتنے دن کی چھٹی مل رہی ہے؟

یہ خط چچا جی۔ ایم کو دکھائیں اور وہ تمہیں پارٹی کے لیے دس روپے دیں گے۔

تمہارا پیارا............ابا

....

لاہور ۶۔ اگست

میرے پیارے ظفر!

مجھے فادر گاڈفرے کا خط ملا ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ تمہاری تعطیلات ۲۰ اگست سے شروع ہو رہی ہے اور تم یا تو گھر آ جاؤ گے یا دس دن کے لیے زیارت جاؤ گے۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اگر تم زیارت جانا چاہتے ہو تو میں تمہیں لاہور کا درمیانے درجے کا دوطرفہ رعایتی کرایہ معہ جیب خرچ بھیج دوں گا۔ یہ تمہاری مرضی ہے۔ اگر تم یہاں

آنا چاہتے ہو تو جلد جواب دینا تاکہ میں فادر گاڈفرے کو اطلاع دے سکوں۔ فادر گاڈفرے کا حساب پھر تمہارے سر ہو گیا ہے۔ انہیں بتادو کہ یہ چیک پچھلا قرضہ چکانے کے لیے ہے اور بقیہ پیشگی کے طور پر جمع رہے گا۔ وہ زیارت نہ جانے کی صورت میں تمہیں ریل کے کرایہ کے لیے بھی دیں گے۔

ان ہی دنوں شاید میں دو دن کے لیے لادیاں جاؤں۔

کیا آنے سے پہلے تمہیں اپنے ٹسٹ کا نتیجہ مل جائے گا؟

مجھے تمہارے بل سے معلوم ہوا ہے کہ تم نے کورس کی دو اور کتابیں خریدی ہیں۔ وہ کس مضمون کی ہیں؟

اقبال فربہ ہو رہا ہے کبھی تو وہ زینت کی طرح لگتا ہے اور کبھی کبھار زلفی کی طرح نظر آتا ہے۔ ہمارے اڈجوٹنٹ کیپٹن کامل اسمٰعیل کا تبادلہ مری ہو گیا ہے اور آج رات ہم انہیں الوداعی عشائیہ دے رہے ہیں۔

تمہارا پیارا.................ابا

تم نے Received کے ہجے پھر غلط لکھے ہیں' یہ Recieved نہیں ہے۔ مجھے زلفی اور کمپنی کے خط بھی ملے ہیں۔ تمہاری (دادی اماں) مہاماں جی نے شکایت کی ہے کہ تم نے کبھی ان کو خط نہیں لکھا۔ انہیں بھی خط لکھا کرو۔

....

لاہور

۱۱ اگست

میرے پیارے ظفر!

ابھی ابھی تمہارا خط ملا ہے تم درمیانہ درجے میں سفر کیوں نہیں کر لیتے۔ واپسی پر سیکنڈ کلاس میں چلے جانا۔ یہ تمہاری اپنی مرضی پر ہے۔

اس ہفتہ کے اختتام پر میں لادیاں جا رہا ہوں اور اس کے بعد راولپنڈی جاؤں گا' مگر جلد ہی واپس آجاؤں گا۔

ہم ابھی تک اسی مکان میں ہے۔ اگر ہم نے نقل مکانی کی تو تمہیں لکھ دوں گا، تمہیں بھی لکھنا ہوگا کہ تم کب اور کس گاڑی پر آ رہے ہو؟

تمہارا.............ابا

عزیز ۱۴ اگست کو لاہور سے لادیاں گئے اور دو دن رہ کر والدین
سے آخری ملاقات کرنے کے بعد راولپنڈی چلے گئے۔

آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے عزیز کی والدہ محترمہ نے فرمایا: اس دفعہ راجہ نے میرے لیے دوسرے تحائف کے علاوہ مٹھائی کا ایک خصوصی لفافہ پیش کرتے ہوئے کہا: مہاماں جی! یہ مٹھائی میری سالگرہ کی ہے (ہفتہ بھر پہلے ۶ اگست کو اس نے اپنی مناوی تھی۔ بچے ہانگ کانگ میں بالالتزام اپنی اپنی سالگرہ منایا کرتے تھے، مگر جاپانی ابتلاء کے بعد یہ تقریبات فراموش ہوگئی تھیں۔

خاندان کے افراد

لیکن اب کچھ عرصہ سے وہ پھر باقاعدگی سے سالگرہ مناتے تھے۔ان دنوں مقبوضہ کشمیر میں بغاوت زوروں پر تھی۔اکثر اس موضوع پر باتیں ہوتی تھیں۔راجہ کے دل میں اہل کشمیر کی آزادی کے لیے بڑی تڑپ تھی۔اوران پر بھارتی فوج کے مظالم پر بہت کڑھتے تھے۔

بیگم بھٹی نے بتایا: اگست کے آخری ہفتے میں جب ظفر کوئٹہ سے آیا تو میں نے انہیں یاد دلایا کہ گاڑی آنے کا وقت ہوگیا ہے اور آپ سٹیشن پر نہیں گئے؟"

فرمانے لگے: "ظفر اب بالغ اور ذمہ دار ہوگیا ہے' اب اسے سٹیشن پر جا کر لانے کی ضرورت نہیں ہے"

بھارتی عزائم کا تجزیہ

کرنل جہاں داد ملک ملٹری سیکرٹری گورنر مغربی پاکستان نے ایک ملاقات میں بتایا:
ہم کاکول میں میجر عزیز بھٹی کے ساتھ ایک ہی گروپ میں تھے بلکہ ایک ہی کمپنی خالد کمپنی .... میں تھے۔ لیکن عزیز کے قریبی حلقہ احباب میں کرنل فضل الرحیم، کرنل جہاں زیب بنگش، کرنل حامد حسن شگری اور میجر یوسف علی وغیرہ تھے۔

کاکول کے متعلق مجھے صرف وہی واقعات یاد ہوں گے جو معروف ہیں اور جن کا آپ کو علم ہو چکا ہوگا۔ مثلاً ایک دفعہ حالات حاضرہ کے پروفیسر احسان اللہ خاں تشریف نہیں لائے تھے تو بھٹی نے لیکچر دیا تھا، وغیرہ وغیرہ

البتہ ایک تاثر میرے ذہن میں بڑا واضح ہے کہ اس زمنے میں عزیز بھٹی کا مختلف مسائل کا تجزیہ اور تبصرہ حیرت انگیز ہوتا تھا۔ ان کی بات کو سب کے سب بڑے ہی غور سے سنتے تھے۔ عام گفتگو ہو رہی ہو یا با قاعدہ بحث ہو ان کے تبصرے میں منطق اور دلائل ہوتے تھے۔ وہ پورے پس منظر کا جائزہ لیے بغیر کوئی بات نہ کرتے تھے۔

قومی اور بین الاقوامی مسائل پر زبان کھولیں یا حالات حاضرہ پر تبصرہ کریں، ان کے تاثرات کی گہرائی اور ان کی معلومات کی وسعت حیرت انگیز تھی۔ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے وہ اکثر آئندہ کے لیے پیش گوئیاں بھی کرتے تھے کہ اب حالات یہ رخ اختیار کر سکتے ہیں۔ ان کا قیاس عموماً درست ثابت ہوتا تھا۔

کاکول کے بعد بھی اکثر ان کے ساتھ ملاقات ہوتی رہی ہے۔ اتفاق سے بھارت کے حملہ سے صرف چند دن قبل ان سے میری آخری ملاقات ہوئی۔

اپنی آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کرنل جہاں داد کہنے لگے: اس ملاقات میں کشمیر

کی صورت حال اور بھارت کے ساتھ پاکستان کے بگڑتے ہوئے حالات اور ان کے خطرناک موڑ بھی زیر بحث آئے۔

اس سوال پر کہ کیا میجر عزیز نے بھارت کے پاکستان پر حملے کے امکان کا بھی ذکر کیا تھا کرنل ملک نے کہا: بالکل! وہ اس امکان پر دیر تک بحث کرتے رہے اور مجھے حیرت ہے کہ ان کا تجزیہ حیرت انگیز حد تک درست ثابت ہوا ہے۔ وہ ذہنی طور پر بھارت کے متوقع حملے کے لیے صرف پوری طرح تیار تھے بلکہ وہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ اس حملے کی صورت میں پاک فوج کا کردار کیا ہوگا۔ وہ بڑے صائب الرائے تھے اور ان کی نظر دور مستقبل تک دیکھ سکتی تھی!

اسلحہ ہی فیصلہ کن نہیں

میجر عزیز بھٹی کے پھوپھی زاد بھائی بشیر حسین نے ایک ملاقات میں بتایا کہ عزیز بھٹی پاکستان کے خلاف بھارت کے جارحانہ عزائم اور معاندانہ رویے کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کرتے رہتے تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے کچھ کلیے قائم کر رکھے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دسمبر ۱۹۶۲ء میں ہم گاؤں میں اکٹھے ہوئے (عام طور پر سارے بھائی چھٹیوں کے پروگرام اکٹھے ہی بناتے تھے) میں، بھائی نذیر احمد عرف ''بھائی جان'' اور عزیز بھائی بیٹھے تھے۔ چین اور بھارت کے سرحدی تنازعہ اور ان کے درمیان جنگ کے موضوع پر بحث ہو رہی تھی۔

میں کہا کہ بھارت اس بہانے امریکہ اور دوسرے ممالک سے اسلحہ جمع کر رہا ہے' یہ لامحالہ پاکستان کے خلاف استعمال کرے گا۔ عزیز نے میرے ساتھ پورا اتفاق کیا' لیکن بڑے پر اعتماد لہجے میں کہنے لگے۔ ''بشیر! پاکستان تو بھارت پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ لیکن میں آپ پر واضح کر دوں کہ اگر اسنے پاکستان پر حملہ کیا تو دنیا جان لے گی کہ پاکستان اپنا دفاع کیسے کرتا ہے؟ بھارت کتنا ہی اسلحہ جمع کر لے' جنگ میں صرف اسلحے کے انبار فیصلہ کن نہیں ہوتے' فیصلہ ان ہاتھوں میں ہوتا ہے جو ان ہتھیاروں کو استعمال کرتے ہیں''

نذیر احمد　　　بشیر حسین　　　عزیز بھٹی

معرکہ رن کچھ کے بعد

۱۹۶۵ء میں رن کچھ میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جھڑپوں اور معرکے میں جب بھارت کو ہزیمت اٹھانا پڑی تو بھارت نے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ رن کچھ میں قدرتی واقعات اور حالات پاکستان کے موافق تھے۔ چنانچہ اس ہزیمت کا داغ دھونے اور اپنے گھناؤنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھارتی وزیر اعظم آنجہانی لال بہادر شاستری نے اپنی مرضی کا محاذ کھولنے کی دھمکی دے دی۔ دونوں ملکوں کی فوجیں محاذوں پر جمع ہو گئیں۔

عزیز بھٹی ان حالات کا بغور مطالعہ کر رہے تھے۔ ان دنوں بھی وہ برکی محاذ پر تھے۔ شاستری کی دھمکی کے بعد ان کے ۳ جون کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اور ان کے ساتھی دشمن کو اس دھمکی کا مزا چکھانے اور اپنی مرضی کا محاذ کھولنے کے متعلق اس کی خوش فہمی کو جلد سے جلد دور کرنے کے لیے کتنے بے تاب تھے۔

پیش گوئی

کرنل جہاں زیب نے انہی دنوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا:

ہم بھی ان دنوں لاہور کے محاذ پر تھے۔ ہمارا کیمپ قصور کی طرف للیانی کے قرب وجوار میں تھا۔ میجر عزیز بھٹی کو وہاں میری موجودگی کا علم ہوا تو ایک دن ملاقات کے لیے تشریف لائے۔

اس دن میجر عزیز بھٹی ذاتی مسائل کے بعد دیر تک حالات حاضرہ...... بھارت کے کشمیر میں روز افزوں مظالم، مظلوم کشمیریوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی، اس کے بدیہی نتائج اور ان کے دور رس مضمرات پر سیر حاصل بحث کرتے رہے۔ وہ بحث کے بعد اس منطقی نتیجے پر پہنچ جاتے تھے کہ بھارت ضرور پاکستان پر براہ راست حملے کی حماقت کرے گا اور اس کے لیے ہمیں مکمل تیاری کرنا چاہیے۔

ان کی نگاہیں دور افق میں بہت کچھ دیکھ رہی تھیں۔ یہ ان کی اصابت رائے کا اعجاز تھا یا وجدانی ہدایت، وہ بڑی بے تکلفی سے میرے ساتھ یہ بحث کرتے رہے کہ بھارت کے حملہ کی صورت میں وہ کیونکر جانبازانہ کردار ادا کریں گے۔ مجھے یاد ہے میں نے انہیں مذاقاً کہا تھا: یار اتنا بھی جوش میں نہیں آجانا چاہیے کہ کہیں ہم اس بھولی بھالی صورت ہی سے محروم ہو جائیں۔ مگر وہ تو بہت سنجیدہ انداز اختیار کیے ہوئے تھے۔ ان کی وہ ملاقات اور الوداعی منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ کسی وجدانی ہدایت کے تحت آخری ملاقات کے لیے تشریف لائے تھے۔

رَن کچھ کے زمانے میں بی آر بی پر

تحفظ وطن..............ایک عبادت

کرنل جہاں زیب بنگش نے کہا:۔

میجر بھٹی فوج کی ملازمت کو ایک ملازمت تصور نہیں کرتے تھے بلکہ ملک کا تحفظ ان کے نزدیک عبادت سے کم نہیں ......وہ پاکستان کے مفاد پر اپنے ذاتی مفادات ہمیشہ قربان کر دیتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم ۱۹۶۴ء میں کوئٹہ میں تھے' جب ہماری تنخواہوں میں اضافہ ہوا۔ ایک میجر کی تنخواہ میں اوسطاً ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار تک اضافہ ہوا۔ پھر یہ اضافہ جولائی ۱۹۶۳ء سے ہونا تھا' اس لیے بقایا جات میں بھی خاصی رقوم ملنا تھیں اور ہم سب آفیسر بڑے خوش تھے۔ مگر آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ میجر بھٹی اس پر خوش نہیں ہوئے تھے' بلکہ ملول سے ہو گئے اور کہنے لگے:

''نہیں یار! پہلی تنخواہ کافی تھی۔ اپنا ملک ہے' غریب ملک ہے۔ ہم اتنے اضافہ کے مستحق نہیں تھے''۔

یہ امر کہ ان کی اپنی تنخواہ میں اضافہ ہوا ہے' ان کی ذاتی مشکلات آسان ہو جائیں گی' بالکل ان کی نظر میں نہیں تھا۔ وہ ہم سب میں کثیر العیال تھے۔ بچوں کے علاوہ والدین کی کفالت بھی کرتے تھے۔ مگر وہ ذاتی نفع ونقصان سے بالکل بے نیاز تھے۔ پاکستان کا اجتماعی تصور ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا تھا اور وہ کبھی اپنے کو اس سے جدا نہیں کرتے تھے۔ وہ یوں محسوس کرتے تھے جیسے پاکستان ایک گھر ہو' اس میں ہم نے اپنا حصہ کچھ زیادہ رکھ لیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے افراد خانہ پر اس کا برا اثر پڑے۔ ہمیں ایثار سے کام لینا چاہیے تھا۔

قاتلو افی سبیل اللہ

شہید کے رف کاغذات میں شہید کے ہاتھ کی یہ تحریر ملی جس میں انہوں نے پیدل فوج کے لیے حسب ذیل ماٹو تجویز کیا:

مسودہ برائے منظوری (ڈرافٹ فار اپرووِل)

ا۔ہم تجویز کرتے ہیں کہ پیدل فوج کے لیے ذیل کا ماٹو اختیار کیا جائے:۔

"قاتلو افی سبیل اللہ"

۲۔ پیدل فوج کے نشان میں سنگین کی موجودہ تصویر موزوں سمجھی ہے اور اسے اسی طرح رہنے دینا چاہیے۔ سنگین کا نشان پیدل فوج کو فوج کی دوسری شاخوں سے ممیز کرتا ہے' اسے بطور نشان بدستور قائم رکھنا چاہیے۔

ا۔انفنٹری (پیدل فوج) کا ماٹو ایسا ہونا چاہیے جو دلوں میں ولولہ اور جوش پیدا کرے اور جو قرون اولیٰ کی اسلامی فوج کی اسلامی روایات کے عین مطابق ہو۔ہم تجویز کرتے ہیں کہ پیدل فوج کے لیے ذیل کا ماٹو اختیار کیا جائے۔

شوق شہادت

شہید کے ایک دوست آئے۔ ڈرائنگ روم میں شور بلند ہوا۔ جب بھی کوئی بے تکلف دوست آتا۔ ان کے کمرے میں خوب شور ہوتا تھا۔

مجھے بلایا، تو میجر خوش دل خاں آفریدی سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا: زرینہ! یہ میرے بہترین دوست ہیں، جن کا غائبانہ تعارف تم سے کرایا تھا۔

میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا: مگر آپ تو اور بھی کتنے دوستوں کو بہترین دوست کہتے ہیں مجھے کہاں یاد ہے کہ غائبانہ تعارف کس کا کرایا تھا؟

آفریدی نے زبردست قہقہہ لگایا۔

ذرا جھینپ کر کہنے لگے: ''جاؤ زرینہ! تم نے تو ہمارا مورال ہی ڈاؤن کر دیا ہے''

بات اصل میں یہ تھی کہ وہ بہت سے اپنے دوستوں کے بے حد مخلص دوست تھے اور ان کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ خود ان کے لیے یہ انتخاب مشکل تھا کہ ان میں سے بہترین کس کو قرار دیں۔ یعنی ان کے بہترین دوستوں کی فہرست بھی خاصی طویل تھی۔

میجر آفریدی سے بھی انہیں بڑا جذباتی لگاؤ تھا اور ان کی موجودگی میں بے حد مسرور رہتے تھے۔

جون ۱۹۶۵ء کے وسط میں میجر خوش دل آفریدی، رن کچھ میں بارودی سرنگ پھٹنے سے شدید زخمی ہو کر دشمن کے قابو میں آ گئے، تو یہ افواہ عام ہوئی کہ وہ شہید ہو گئے ہیں۔

میں نے سنا تو مجھے بڑا افسوس ہوا کہ وہ میجر صاحب کے بڑے عزیز دوست تھے۔ اس خیال سے کہ ایک عزیز دوست کی مفارقت سے ان کی حساس طبیعت رکھتا برا اثر پڑے گا میں اور بھی

گھبرا گئی۔ ان دنوں وہ خود بھی آگے محاذ پر تھے۔ آٹھ دس دن بعد گھر آتے تھے۔ گھر آئے تو میں نے آفریدی کا ذکر کیا۔ ابھی تک یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ قید ہوئے ہیں یا شہید مگر اغلب یہی تھا کہ وہ شہید ہو گئے ہیں۔

مگر میں نے دیکھا کہ انہوں نے اس موضوع پر زیادہ توجہ نہ دی۔ بس میری باتوں پر ہوں ہاں کہہ دیا پھر کوئی اور موضوع چھیڑ دیا۔

میں اس پر سخت متعجب ہوئی۔ میں خیال کیا کہ ان کی عادت یہ ہے کہ غم زیادہ گہرا ہو تو اس کو لاشعور کی تہوں میں دھکیل دیتے اور پھر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ مجھے ان کے بھائی بشیر احمد کا واقعہ یاد تھا۔ میں یہ چاہتی تھی کہ وہ اس کا دل کھول کر ذکر کریں اور اپنے غم کا بوجھ ہلکا کریں۔

"عزیز" خُوش دل آفریدی اور دوسرے دوست

چنانچہ دوسرے ہفتے گھر آئے تو کھانے پر میں نے دو تین مرتبہ میجر خوش دل آفریدی کی شہادت کی افواہ کا ذکر کیا تو سنجیدگی سے کہنے لگے:

"پگلی! تو کس وہم میں مبتلا ہے۔ کیا تو سمجھتی ہے کہ میں اپنے عزیز دوست کی شہادت کی خبر سے پریشان ہوں۔ ابھی تک تو ان کی شہادت کی خبر کی تصدیق نہیں ہوئی لیکن اگر وہ شہید ہو گئے ہیں تو اس سے بڑھ کر خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے؟ خدا کی قسم! مجھے تو اس پر فخر ہو گا کہ میرا دوست شہید ہوا ہے۔ دین و دنیا میں اس سے بڑا کوئی اور اعزاز بھی ہے؟"

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

کہنے لگے۔ زرینہ! یہ زندگی آخر ہے کہ! اتنے عظیم مقصد میں کام آئے تو خدا سے مانگنے کے لیے اور کیا رہ جاتا ہے!

لائف انشورنس

شروع شروع میں دوست احباب زندگی کے بیمے کے لیے کہتے تو انکار کر دیتے۔ کہتے تھے کہ لائف انشورنس سے ایک طرح کے عدم توکل کا احساس پایا جاتا ہے۔ اور میرا خیال ہے' شرعی نقطہ نظر سے یہ جائز نہیں ہے۔ کچھ دوستوں نے مجبور کر کے غالباً حبیب انشورنس کمپنی کی ایک پالیسی لے دی۔ اس کی ایک دو قسطیں جمع بھی کرائیں' مگر ذہنی طور پر اس مسئلہ پر مطمئن نہیں تھے' چنانچہ پھر کوئی قسط جمع نہ کرائی اور پالیسی ساقط ہو گئی۔ البتہ اس مسئلے پر برابر سوچتے اور پڑھتے رہے۔ جب ذاتی طور پر مطمئن ہو گئے کہ احتیاط غیر اسلامی نہیں ہے تو ۱۹۵۷ء میں ایک لائف انشورنس کمپنی ......نارو چ سے ایک پالیسی لے لی۔

شہادت سے صرف ایک ماہ قبل اگست ۱۹۶۵ء میں نہ جانے یہ خیال آیا کہ لائف انشورنس کمپنی کی ایک اور پالیسی خرید لی۔ اب کے آئیڈیل انشورنس کمپنی سے پالیسی لی۔

جب یہ پالیسی لی تو بیگم بھی ناراض ہوئیں۔ وہ کہتی تھیں ہمیں پہلے ہی ایک پالیسی کی قسطیں دینا پڑتی ہیں' اب یہ نئی قسطیں کہاں سے دیں گے۔ ہمارے اور اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے۔

مسکرا کر کہنے لگے "تم فکر نہ کرو۔ اس کی قسطیں تنخواہ سے نہیں دوں گا"

"تو پھر کہاں سے دیں گے؟" بیگم نے تعجب سے پوچھا؟

کہنے لگے "جرمن ترجمہ کا ۵۰۰ روپیہ مل گیا ہے' پہلی قسط اس سے ادا کر دوں گا اور بھی ترجمہ عنقریب کر رہا ہوں' اس کی قسطیں اس سے ادا کروں گا"۔

مگر اس کی پہلی قسط ہی اس کی آخری قسط ثابت ہوئی۔ اگست میں ہی اس کے کاغذات مکمل ہو کر آئے تھے کہ ستمبر میں ان کی شہادت ہو گئی۔

ابّو ! بہادری سے لڑنا

۲۹اگست ۱۹۶۵ء کو رجمنٹل ہیڈ کوارٹر سے ایک حکم نامہ وصول ہوا کہ ہنگامی حالات کے باعث آپ کی چھٹی منسوخ کی جاتی ہے' آپ واپس اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو جائیں۔ اپنے اردلی نادر کو بلا کر کہا: میری وردی ابھی تیار کرو' مجھے صبح ڈیوٹی پر جانا ہے۔ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ کیپٹن محمد سرور شہید (نشان حیدر) بھی چھٹی پر تھے کہ انہیں واپس بلا کر کشمیر میں تاریخی کمان ان کے سپرد کی گئی تھی)۔

رات کو کھانے کی میز پر بیٹھے تھے تو ہنگامی حالات اور چھٹی کی تنسیخ کا ذکر چلا۔ ذوالفقار نے پوچھا: ابا جان! کیا اب لڑائی ہو گی؟

میجر بھٹی: ہاں بیٹا۔ حالات روز بروز زیادہ نازک ہوتے جا رہے ہیں!

ذوالفقار: ابا جی! جنگ ہو تو آپ بھی خوب بہادری سے لڑنا' بزدلی نہ دکھانا۔

میجر بھٹی: (خوش ہو کر) لو بھئی زرینہ! سن رہی ہو نا! زلفی کیا کہہ رہا ہے؟

زرینہ: جی ہاں سن رہی ہوں۔

میجر بھٹی: دیکھو بیٹا اگر جنگ ہو اور میں جنگ میں بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں تو تمہیں آنسو نہیں بہانا ہوں گے۔

زلفی کی پشت تھپکتے ہوئے کہنے لگے: بیٹا تمہیں اپنی تعلیم کا پورا خیال رکھنا ہے۔ بہادر بات

لڑتے ہیں اور ان کے بہادر بیٹے اپنی ساری توجہ تعلیم پر صرف کرتے ہیں' تا کہ بڑے ہو کر وہ بھی بڑے کارنامے سرانجام دیں۔

دعا کیجئے! مجھے شہادت کا درجہ نصیب ہو

۳ ستمبر سہ پہر کو میجر عزیز بھٹی گھر آئے۔ پروگرام کے مطابق بال بچوں کے ہمراہ اپنے ایک عزیز میجر محمد شریف (ریٹائرڈ) کے ہاں گئے۔ ظفر جاوید نے صبح کوئٹہ جانا تھا' وہ بھی ہمراہ تھا۔

ان کے گھر خوب محفل جمی رہی اور بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ شام کو سیر کرتے پیدل واپس آرہے تھے کہ کنگھم روڈ پر بیگم بھٹی نے میجر بھٹی سے کہا: ''یوں معلوم ہوتا ہے یہ جیپ ہمارے گھر سے ہو کر آرہی ہے۔ میجر بھٹی نے کہا: تمہیں یہ اندازہ کیسے ہوا؟

''وجہ تو شاید نہ بتا سکوں' بس یونہی دل یہ گواہی دیتا ہے''

اتنے میں جیپ ان کے قریب آکر رک گئی۔ رجمنٹل ہیڈ کوارٹر سے کوئی ضرور پیغام تھا۔ اسی طرح سفید کپڑوں میں ہی ساتھ چلے گئے اور رات کو دیر سے گھر لوٹ کر آئے۔

رات کو سوئے ہوئے تھے کہ دو بجے کے قریب ان کے ہاں ایک ٹرک آیا۔ میجر بھٹی اٹھ کر باہر آگئے۔ کچھ دیر بعد واپس آکر لیٹ گئے۔ بیگم بھٹی بھی جاگ چکی تھیں۔ انہوں پوچھا: باہر کھڑکھڑاہٹ کیسی ہے؟

کہنے لگے ''کچھ ایسی بات نہیں۔ تم آرام سے سوئی رہو''

انہیں دروازہ کی جالی میں سے دو آدمیوں کی ٹانگیں نظر آرہی تھیں۔ دوبارہ پوچھا تو بتایا کہ ''مورچے کھودنے والے ہیں''۔

''مجھے صبح چار بجے ڈیوٹی پر جانا ہے۔ دن چڑھے مورچے کھودنے والوں کو ناشتہ کروا دینا۔ ان کا اپنا ناشتہ تو آئے گا مگر شاید دیر سے آئے''

بیگم بھٹی نے اٹھ کر چائے تیار کی۔ چائے پی رہے تھے کہ بیگم نے پوچھا کہ آپ نے ابھی چلے جانا ہے تو ظفر کو جگا دوں؟

نہیں! نہ جگاؤ۔ کھڑکھڑاہٹ میں پھر سو نہیں سکے تھا۔ اس نے چھ بجے جانا ہے خواہ مخواہ دو اڑھائی گھنٹے جاگے گا۔ شام کو میجر شریف کے ہاں مل جو لیا تھا۔ خدا اسے زندگی دے' دسمبر میں انشاء اللہ پھر آئے گا''

بیگم بھٹی نے پوچھا؟ ''کیا جنگ کا خطرہ ہے؟''

کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ حالات نازک ہیں۔ بھارت کرگل' درہ حاجی پیر اور اعوان شریف میں زیادتیاں کر چکا ہے۔ رن کچھ کی جنگ کے بعد بھارتی وزیر اعظم صاف الفاظ میں اپنی مرضی کا محاذ کھولنے کی دھمکی دے چکے ہیں۔ پاکستانی فوج کی امداد سے آزاد کشمیر کی فوجیں چھمب کے محاذ پر برابر بڑھ رہی ہیں۔ پاکستان اپنی سرحدوں کی حفاظت سے غافل نہیں ہے!'' پھر کہنے لگے:

''زرینہ! بعض ایسے موقع بھی آجاتے ہیں جب وطن عزیز کی حفاظت کے لیے جان کی قربانی ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی ایسا موقعہ آیا تو میں ملک وملت کی حفاظت کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لوں گا۔ دعا کرو مجھے شہادت کا درجہ نصیب ہو''

بیگم بھٹی کہنے لگیں'' خدا پاکستان کو اپنے فضل وکرم سے محفوظ رکھے اور پاکستان کے دشمنوں و غارت کرے۔ خدا اسلام کو فتح دے''

زرینہ! وطن کے دفاع کے لیے بڑی قربانیاں دینا پڑتی ہیں' اگر میں شہید ہو جاؤں تو تم آنسو نہ بہانا''

پھر وہ انشورنس کمپنیوں اور پنشن کے کاغذات کے متعلق ہدایات دیتے رہے۔

۵ ستمبر کو میجر بھٹی گھر پہنچے۔ کہنے لگے کہ امپیریل ڈیفنس کالج ٹیم کے ساتھ آیا ہوں۔ صبح کو شاہی قلعہ' شاہی مسجد' شالامار باغ اور مقبرہ جہانگیر کی سیر کرانی ہے۔ میں نو بجے گھر سے جاؤں گا۔

۶ ستمبر کی تاریخی صبح
گھر سے روانگی

۶ ستمبر کی صبح کو حسب معمولی فجر سے پہلے بیدار ہوئے، نہا کر نماز پڑھی۔ نماز کے بعد قرآن کریم کی تلاوت اور اس کے ساتھ جرمن ترجمہ پڑھتے رہے۔

جب ناشتہ کر چکے تو کمروں کی صفائی ہو رہی تھی۔ پوچھنے لگے کس کمرے کی صفائی ہو چکی ہے، میں ادھر چلا جاؤں۔ وہ گرد سے الرجک ہو جاتے تھے اور فوراً زکام ہو جاتا تھا، اس لیے گرد سے

بچتے تھے۔

بچوں کے کمرے میں صفائی ہو چکی تھی چنانچہ ادھر چلے گئے۔

ہاتھ میں ''پاکستان ٹائمز'' تھا (عموماً انگریزی اخبار ہی پڑھتے تھے) بچوں کے کمرے میں داخل ہوئے۔ جوڑیاں کی فتح کی تفصیلات بڑے شوق سے پڑھ رہے تھے۔

اتنے میں بیگم بھٹی سب سے چھوٹے بچے جاوید اقبال کو اٹھائے اندر داخل ہوئیں۔

اخبار میز پر رکھ کر بچے سے پیار کرنے لگے۔ پھر بچے کو گود میں لے لیا اور اس سے باتیں کرنے لگے۔ اس وقت تک اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا۔

اتنے میں ایک جیپ آئی۔ حوالدار نے جیپ سے اتر کر میجر صاحب کا پوچھا۔ میجر بھٹی کمرے سے باہر آ چکے تھے۔ انہوں نے پیغام وصول کر کے اپنے اردلی نادر کو بستر تیار کرنے کو کہا۔ اس میں سول کپڑے' سلیپنگ سوٹ' جائے نماز وغیرہ رکھا۔ وردی' تکیہ ہر چیز تیار تھی۔ پانچ منٹ کے بعد گھر والوں کو خدا حافظ کہا اور روانہ ہو گئے۔

ان کی روانگی کا ذکر کرتے ہوئے بیگم بھٹی کہنے لگیں:۔

میجر صاحب کے جانے کے بعد مجھ پر نہ جانے کیوں اداسی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ ننھے اقبال کے ساتھ انتہائی پیار بھری باتیں کر رہے تھے۔ (گھر میں ان کی یہ آخری باتیں ہوئیں) انہیں یک لخت جانا پڑا۔ میں یوں محسوس کر رہی تھی جیسے مجھ سے کچھ چھن گیا ہے۔ اتنے میں اردلی نادر کہیں سے آ گیا' کہنے لگا: بیگم صاحب! لاہور پر حملہ ہو گیا ہے۔

میں نے کہا تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ میجر صاحب ابھی گھر سے گئے ہیں' اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو وہ ضرور گھر بتلاتے۔ تم نے یوں ہی افواہ سنی ہے۔

نہیں بیگم صاحب! میرا خالہ زاد بھائی فوج میں ڈرائیور ہے' ابھی مجھے ملا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ واہگہ محاذ سے پانچ قیدی لے کر آیا ہے۔ ان میں ایک سکھ اور چار ہندو ہیں۔

اس کے بعد ہر طرف یہ شور تھا کہ ہندوستان نے حملہ کر دیا ہے۔ کئی عورتیں جمع ہو گئیں اور جنگ کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ میجر محمد شریف کے ہاں سے خالدہ بھی آ گئی۔ نیپیئر ہوٹل سے بیگم

میجر نذیر بھی آ گئیں۔

بھارت کے اچانک حملے کے باوجود لوگوں میں کوئی گھبراہٹ نہ تھی بلکہ قوم کے نام صدر مملکت کے خطاب کے بعد عوامی جوش وخروش قابل دید تھا۔ رات بھر محاذ سے گولوں اور نعروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ رات کو آنکھ نہ لگی' البتہ نہ جانے ہمیں اپنی حفاظت کی کوئی فکر کیوں نہ تھی۔ پاکستان کی سلامتی اور اپنے غازیوں کے لیے دعائیں کرتی رہیں۔

....

صبح سویرے چائے چولہے پر رکھی۔ ریڈیو لگانے کی کوشش کی' مگر وہ لگتا نہیں۔ اتنے بابو جی (میجر صاحب کے والد صاحب) تشریف لے آئے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنی سویرے کیسے آ گئے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ کل منور (اپنی نواسی) کو لادیاں سے لالہ موسیٰ چھوڑنے گیا تھا۔ واپس جانے لگا تو منور نے کہا کہ ابھی ریڈیو سے کچھ اعلان ہوا ہے' لوگ کہہ رہے ہیں لاہور پر حملہ ہو گیا ہے۔ وزیر آباد کے قریب ایک مسافر ٹرین پر بم پڑا ہے۔ صدر ایوب کی تقریر ہونے والی ہے۔ چنانچہ صدر پاکستان کی تقریر کے انتظار میں ریڈیو کے پاس بیٹھ گئے۔ ساڑھے دس بجے ریڈیو پر صدر پاکستان کی اعتماد آفریں آواز گونج رہی تھی۔

''ہم دشمن کو کچل کر رکھ دیں گے''

''عزیز ہم وطنو! السلام علیکم!

''دس کروڑ پاکستانی عوام کی آزمائش کا وقت آ گیا ہے''

بھارتی فوج نے آج علی الصبح مملکت پاکستان کی حدود میں لاہور کے محاذ پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے اپنی روایتی بزدلی کا مظاہر کرتے ہوئے اس مسافر ٹرین پر بمباری کی جو وزیر آباد سٹیشن پر کھڑی تھی۔ بھارتی حکمران گزشتہ پانچ کے دوران میں پاکستان کے خلاف جو جارحانہ اقدامات کرتے آئے ہیں۔ یہ تازہ حملہ انہی مجرمانہ سرگرمیوں کی ایک کڑی ہے۔

بھارتی حکمرانوں نے گزشتہ مئی میں خط متارکہ' جنگ کی خلاف ورزی ے کرتے ہوئے ہماری حدود میں کرگل کی تین چوکیوں پر قبضہ کر کے اپنے جارحانہ اقدام کی ابتدا کی تھی۔ اقوام متحدہ کی مداخلت پر بھارتی فوجوں نے چوکیاں عارضی طر پر خالی کر دیں اور اگست میں ان پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

بھارت نے جارحانہ اقدامات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ٹیٹوال کے علاقے میں ہماری چوکیوں پر قبضہ کرنے کے لیے پیش قدمی کی۔ اس کے بعد بھارتی فوج اپنی پوری طاقت کے ساتھ اوڑی اور پونچھ کے علاقے میں داخل ہوگئی۔ بھارت خط متارکہ جنگ کی صریح خلاف ورزی سے بھی مطمئن نہ ہوا' بلکہ اس نے پاکستان کے موضع اعوان پر گولہ باری کر دی۔ اب یہ بات ظاہر ہوگئی کہ ان تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود ہم نے جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا تھا' بھارتیوں نے اس کا مطلب غلط سمجھا۔ بھارتی جارحیت کو روکنے کے لیے آزاد کشمیر کی افواج کو بھمبر کے علاقہ میں داخل ہونا پڑا۔ اب بھارت جنون کے عالم میں اپنی فضائی فوج کو جارحانہ کاروائیوں کے لیے حرکت میں لے آیا۔ اس طرح ایک شدید بحران کی کیفیت پیدا ہوگئی۔

اس وقت تک یہ حقیقت ساری دنیا پر واضح ہو چکی ہے کہ کشمیر میں بھارت کا جارحانہ اقدام دراصل پاکستان پر حملہ کا آغاز تھا۔ بھارت نے قیام پاکستان کے فوراً بعد سے اسملک کے خلاف جن معاندانہ عزائم کی پرورش کی تھی، آج اس کا عملی ثبوت مہیا کر دیا ہے۔ بھارتی حکمرانوں نے پاکستان کی آزاد مملکت کو، جسے مسلمان اپنے وطن عزیز کے طور پر مستحکم بنائیں، کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ گزشتہ اٹھارہ سال کے دوران ان کی تمام جنگی تیاریوں کا مقصد پاکستان کے خلاف کاروائی تھا۔

بھارتی حکمرانوں نے چینی خطرے کا ہوا کھڑا کر کے ہمارے بعض دوست ممالک سے

زبردست فوجی امداد حاصل کی۔ ہمارے یہ مغربی دوست بھارتی حکمرانوں کے اصل مقاصد کو سمجھ ہی نہ سکے۔ انہوں نے بھارت کے ان اعلانوں پر یقین کرلیا کہ پوری طرح مسلح ہونیکی صورت میں وہ چینیوں سے جنگ کریں گے۔ یہ بات ہمیشہ ہمارے علم میں رہی کہ یہ اسلحہ ہمارے خلاف استعمال ہوگا۔ وقت نے ہمارے اس اندیشہ کی تصدیق کردی ہے۔

اب بھارتی حکمرانوں نے رسمی اعلان جنگ کے بغیر اپنی روایتی بزدلی اور عیاری سے کام لیتے ہوئے اپنی فوج کو پاکستان کی مقدس سرزمین میں داخل ہونے کا حکم دیا ہے۔ ہمارے لیے وقت آ گیا ہے کہ دشمن کو دندان شکن جواب دیں اور بھارتی سامراجیت کو کچل کر رکھ دیں۔

حالات نے دشمن سے مقابلہ کیلئے لاہور کے بہادر شہریوں کا سب سے پہلے انتخاب کیا ہے۔ تاریخ ان جوانمردوں کے کارنامے اس عبارت کے ساتھ زندہ رکھے گی کہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے دشمن کی تباہی کے لیے آخری ضرب لگائی۔

پاکستان کے دس کروڑ عوام جن کے دلوں میں لا الہ اللہ محمد الرسول اللہ کے مقدس کلمات بسے ہوئے ہیں' اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک بھارتی توپوں کے دھانے ہمیشہکے لیے سرد نہیں ہوجاتے۔ بھارتی حکمران نہیں جانتے کہ انہوں نے کس جری قوم کو چھیڑنے کی جسارت کی ہے۔ پاکستانی عوام جو اپنے عقائد کی سربلندی اور اپنے مقصد کی صداقت پر ایمان کامل رکھتے ہیں' اللہ کے نام پر فرد واحد کی طرح متحد ہو کر دشمن کے خلاف جنگ آزما ہوں گے۔ نوع انسانی کو اللہ تعالیٰ کی یہ بشارت ہے کہ حق کا ہمیشہ بول بالا ہوگا۔

ہنگامی حالات کا اعلان کردیا گیا ہے۔ جنگ شروع ہوگئی ہے۔ ہمارے صف شکن سپاہی دشمن کو پسپا کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں۔

پاکستان کی آزاد افواد دشمن کے حملہ کا منہ توڑ جواب دیں گی۔ یہ افواج جو ایک ناقابل شکست جذبہ اور غیر متزلزل ارادے کی مالک ہیں' دشمن کو کچل کر رکھ دیں گی۔ حکومت پاکستان پوری طرح تیار ہے اور اس کے تمام وسائل موجودہ صورت حال سے مقابلہ کے لیے وقف ہوں گے۔

بھارتی جارحیت کے خلاف اس جدوجہد میں ہمیں بلاشبہ ان تمام ملکوں کی ہمدردی اور تعاون حاصل رہے گا۔ جو امن اور آزادی پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم نے یہ کاروائی اقوام متحدہ کے منشور کے باب ہفتم کے تحت کی ہے۔ جس میں ہر ملک کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی مدافعت کا حق دیا گیا ہے۔

عزیز ہم وطنو! آزمائش کی اس ساعت میں تمہیں بالکل پرسکون رہنا ہوگا۔ ہم میں سے ہر فرد کو ایک عظیم فریضہ ادا کرنا ہے' جس کے لیے عقیدے کی پختگی اور والہانہ سپردگی درکار ہے۔ خدائے بزرگ و برتر اپنی رحمت بے پایاں سے ہمیں کامیابی نصیب کرے گا۔ حق کی فتح ہوگی۔ دشمن پر کاری ضرب لگانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ کیونہ شکست اور تباہی اس باطل کا مقدر ہے جس نے تمہاری سرحد پر سر اٹھایا ہے۔ مردانہ وار آگے بڑھو اور دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہو ۔پاکستان پائندہ باد"

....

تقریر اور خبریں سننے کے بعد میں لادیاں جانیکی بجائے لالہ موسیٰ سے لاہور روانہ ہوا۔ بسوں میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ رات دیر سے پہنچے۔ بلیک آؤٹ ہو چکا تھا۔ میں نے بسوں کے اڈہ پر رات گزاری اور سویرے اٹھ کر ادھر آیا ہوں۔ راجہ محاذ پر چلا گیا ہے' تم یہاں اکیلے ہو۔ میں نے سوچا بچوں کو لادیاں لے آؤں۔

روانگی

لاہور چھوڑنے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا لیکن میں بابو جی کے سامنے انکار بھی نہ کر سکی کہ ان کو وہاں لادیاں میں ہمارے لیے تشویش رہے گی۔ چنانچہ بچوں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور روانگی کے لیے

تیار ہو گئے ۔ لاہور چھوڑتے ہوئے میرے دل میں عجیب کش مکش سی تھی ۔ چیزیں فرج میں یونہی پڑی ہوئی تھیں ۔ دل و دماغ بے کسی کی سی کیفیت طاری تھی ۔

ہم سات بجے ہی موٹروں کے اڈے پر پہنچ گئے، مگر نو بجے تک گجرات جانے والی بس نہ مل سکی ۔ اڈے پر انتظار میں بڑی کوفت ہوئی ۔

معرکۂ برکی

''قوم آپ کی طرف دیکھ رہی ہے''

جنرل موسیٰ.........................

جنگ کے پہلے دن پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل محمد موسیٰ خاں نے جوانوں کے نام اپنے پیغام میں کہا:

''یہ وقت امتحان اور عظمت کا حامل ہے۔ بھارت نے تمام دھوکہ باز جارحیت پسندوں کی طرح آج صبح جسڑ' واہگہ اور بیدیاں کے پاکستانی علاقوں پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں ان کی بزدلی پوری طرح کارفرما تھی' کیونکہ انہوں نے یہ حملہ جنگ کا اعلان کیے بغیر کیا۔ ان علاقوں کی حفاظت پر متعین ہمارے بہادر دوستوں نے دشمن کے حملے کو روکا اور ان کو زبردست جانی نقصان پہنچایا۔ حملے کے چند گھنٹوں بعد ہی ہماری بہادر فوج نے حالات کو مستحکم بنالیا اور اب وہاں صورت حال پوری طرح ان کے قابو میں ہے۔ ہماری مقدس سرزمین پر بھارت کے اس وحشیانہ حملہ نے پاکستان کی افواج کو یہ موقع فراہم کر دیا ہے کہ وہ بھارت جنگ پسندوں پر واضح کر دیں کہ ہم اپنا دفاع کرنا اور دشمن کو دندان شکن جواب دینا جانتے ہیں۔ میں فوج کے ہر شخص سے ذاتی طور پر واقف ہوں اور ہماری فوج کا ہر فرد جنگ کے لیے بے تاب ہے اور اب وقت آ پہنچا ہے کہ ہر فرد یہ ثابت کر دے کہ وہ دشمن کو مکمل طور پر تباہ کر دینے کے لیے اپنی انتہائی صلاحیتوں کو کام میں لائے گا۔

آپ دشمن کو تباہ کر دیں اور بھارت کے سامراجی عزائم کو شکست دے کر تاریخ ساز فریضہ ادا کریں۔ بھارت کے ناپاک عزائم کی شکست کے لیے مکمل اور آخری شکست ہونی چاہیے۔ قوم آپ کی طرف دیکھ رہی ہے کہ آپ مادر وطن کی حفاظت کا فریضہ کس طرح ادا کرتے ہیں۔ آپ عزم اور حوصلہ سے آگے بڑھیں۔ خدا کے فضل و کرم سے فتح و نصرت آپکے قدم چومے گی''۔

۶ ستمبر

سب سیکٹر برکی میں اپنی پوسٹ سنبھالنے جارہی تھی۔ لاہور سے تیرھویں میل پر ساڑھے تین بجے صبح اے کمپنی کے جوانوں کو ہڈیارہ کی طرف سے رینجرز کی ایک جیپ بڑی تیز رفتاری سے آتی ہوئی ملی۔ اس میں سوار رینجرز کے جوانوں نے دشمن کے حملہ خبر دی اور کہا ہڈیارہ پر دشمن نے قبضہ کرلیا ہے۔ اے کمپنی کے جوانوں کے پاؤں تیز تیز اٹھنے لگے۔ انہوں نے بی آر بی نہر کو پار کیا اور معینہ جگہوں پر پہنچ گئے۔

اے کمپنی کے کمانڈر میجر عزیز بھٹی ابھی نہیں پہنچے تھے۔ بھارت کی طرف سے یوں اچانک حملے کا کوئی وہم وگمان نہ تھا۔ البتہ حفاظتی تدابیر کے پیش نظر فوج کے کچھ دستے سرحدوں پر متعین کیے جارہے تھے۔

میجر عزیز بھٹی آج سرکاری پروگرام کے مطابق امپریل ڈیفنس ٹیم کے ساتھ ان کو لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر کرانے والے تھے۔ لیفٹیننٹ عبدالرحمٰن عارضی طور پر ان کی کمپنی کی کمان کررہے تھے۔ اے کمپنی کی تینوں پلاٹونیں پورمستعدی کے ساتھ اپنے اپنے کام میں لگ چکی تھیں۔

لیفٹیننٹ عبدالرحمٰن کی پلاٹون نمبر ۱ برکی سے آگے کی جانب مشرق تھی۔ نائب صوبیدار محمد سلیمان کی پلاٹون نمبر ۲ برکی اور بی آر بی نہر کے درمیان متعین تھی۔ حوالدار محمد نذیر کی کمان میں پلاٹون نمبر ۳ ریزور تھی۔ اس کے علاوہ ۱۲ پنجاب کی پلاٹون نمبر ۱۲ جس کی کمان صوبیدار عالم زیب کررہے تھے، بھی اے کمپنی سے منسلک تھی۔ اس کی پوسٹنگ برکی سے بجانب شمال کھجور اریا میں تھی۔ اے کمپنی کی امداد کے لیے توپ خانہ کی ایک بیڑی تھی جس کا تعلق توپ خانہ کی پوری رجمنٹ سے بھی تھا، جس بوقت ضرورت امداد لی جاسکتی تھی۔

حوالدار محمد نذیر کی ریزرو پلاٹون کا کام مورچے کھودنا' پل کی حفاظت اور دوسرے کاموں میں اپنی دوسری دونوں پلاٹونوں کی امداد کرنا تھا۔ یہ پلاٹون برکی پل کے پاس بی آر بی نہر کے کنارے پر تھی ۔اس پلاٹون کے ۸ جوان حوالدار محمد عارف' لانس نائیک قطب حسین شاہ' لانس نائیک محمد شریف' سپاہی عبدالمحبوب' محمد اقبال' اورنگزیب' فضل حق اور نذیر حسین مورچے کھودنے کے لیے برکی سے مشرق کی جانب گئے۔

اے کمپنی سے منسلک توپ خانہ بیٹری کے فارورڈ ایریا میں کام کرنے والے جوان نائیک محمد اقیاس' خان محمد اور محمد الیاس' کیپٹن انور کی سرکردگی میں وہاں پہنچ چکے تھے۔حملہ کی خبر ہوتے ہی انہوں نے اے کمپنی کے سگلرز خان عالم اور محمد اکرم کو بھی ساتھ لیا اور برکی قصبہ کے شمال مشرقی محلّہ کے سب سے اونچے چوبارہ کو او پی پوسٹ کے منتخب کیا اور وہاں اپنا سامان سیٹ کر کے کام شروع کر دیا۔

صبح ساڑھے سات کے قریب میجر عزیز بھٹی کی تیز رفتار جیپ نے نہر بی آر بی کے پل کو پار کیا۔وہ جیپ سے اتر کر حوالدار نذیر کی پلاٹون کے ان جوانوں کے پاس گئے' جو وہاں موجود تھے۔ جلدی جلدی گھومتے پھرتے چکر لگایا اور ان سے کہتے چلے گئے ''شاباش بہادرو! ڈٹ کر مقابلہ کرو۔کفر نے ایک بار پھر اسلام کو للکارا ہے۔ہمیں اپنی خوش قسمتی پر فخر کرنا چاہیے کہ یہ مقدس فریضہ ہمارے سپرد ہوا ہے۔شیرو! صلاح الدین ایوبی اور ٹیپو سلطان کی روحوں کو خوش کر دو''

وہاں سے جیپ میں سوار ہو کر برکی طرف روانہ ہوئے راستے میں نائب صوبیدار محمد سلیمان کی پلاٹون کے پاس بھی ذرا رکے اور جوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''جہاں آپ جیسے شیر ہوں وہاں ہندوستانی گیدڑوں کی کیا مجال ہے کہ مقابلہ میں آسکیں''

میجر عزیز بھٹی برکی قصبہ سے گزر کر لیفٹیننٹ عبدالرحمٰن کی پلاٹون نمبر ۱ کے جوانوں کے پاس پہنچے اور جوانوں کو سینے تانے مقابلے کے لیے مستعد دیکھ کر خوش ہوئے اور کہا......شیرو! ڈٹے رہو۔ہم اپنے ایمان پر قائم رہیں تو دشمن ہماری ایک چوٹ بھی نہ سہہ سکے گا''۔قریب ہی مورچے کھودنے والے جوانوں کے پاس گئے۔ان کے کام کی تعریف کی۔اور کہا:...... ''بہادرو! کفر میں

تمہارے مقابلے کی جرأت نہیں ہو سکتی"۔

لیفٹیننٹ عبدالرحمٰن کو ضروری ہدایات دینے کے بعد او پی پوسٹ کی خبر لی اور سوا آٹھ بجے کے قریب وہ برکی کے بالاخانے میں پہنچ کر دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔

بحیثیت کمپنی کمانڈر میجر عزیز بھٹی کی پوسٹ ریزرو پلاٹون نمبر ۳ کے ساتھ بی آر بی نہر کے دائیں کنارے پر تھی، مگر انہوں نے پیچھے رہ کر اپنی کمپنی کو لڑانے کی بجائے ...... سب سے آگے او پی پوسٹ پر رہنا پسند کیا۔ جوان کی بے مثال شجاعت اور قابل تقلید حب الوطنی کی دلیل ہے۔

جب وہ او پی پوسٹ پر پہنچے تو دشمن اپنی پوری طاقت سے پیش قدمی کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ دشمن بہت جلد لاہور پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ ہڈیارہ پر اس کا قبضہ ہو چکا تھا۔ اگرچہ ہڈیارہ کا پل اڑا دیا گیا تھا اور اس کے پائپ ٹوٹ چکے تھے لیکن شکستہ پل اس طرح بیٹھ گیا کہ اس کے اوپر سے ٹینک اور گاڑیاں با آسانی گزر سکتی تھیں۔

میجر شفقت بلوچ کی ڈی کمپنی جس کی ڈیوٹی ہڈیارہ سب سیکٹر میں تھی، اس کے جوان بڑی بہادری کے ساتھ دشمن کی پیش قدمی کو روکے ہوئے تھے۔

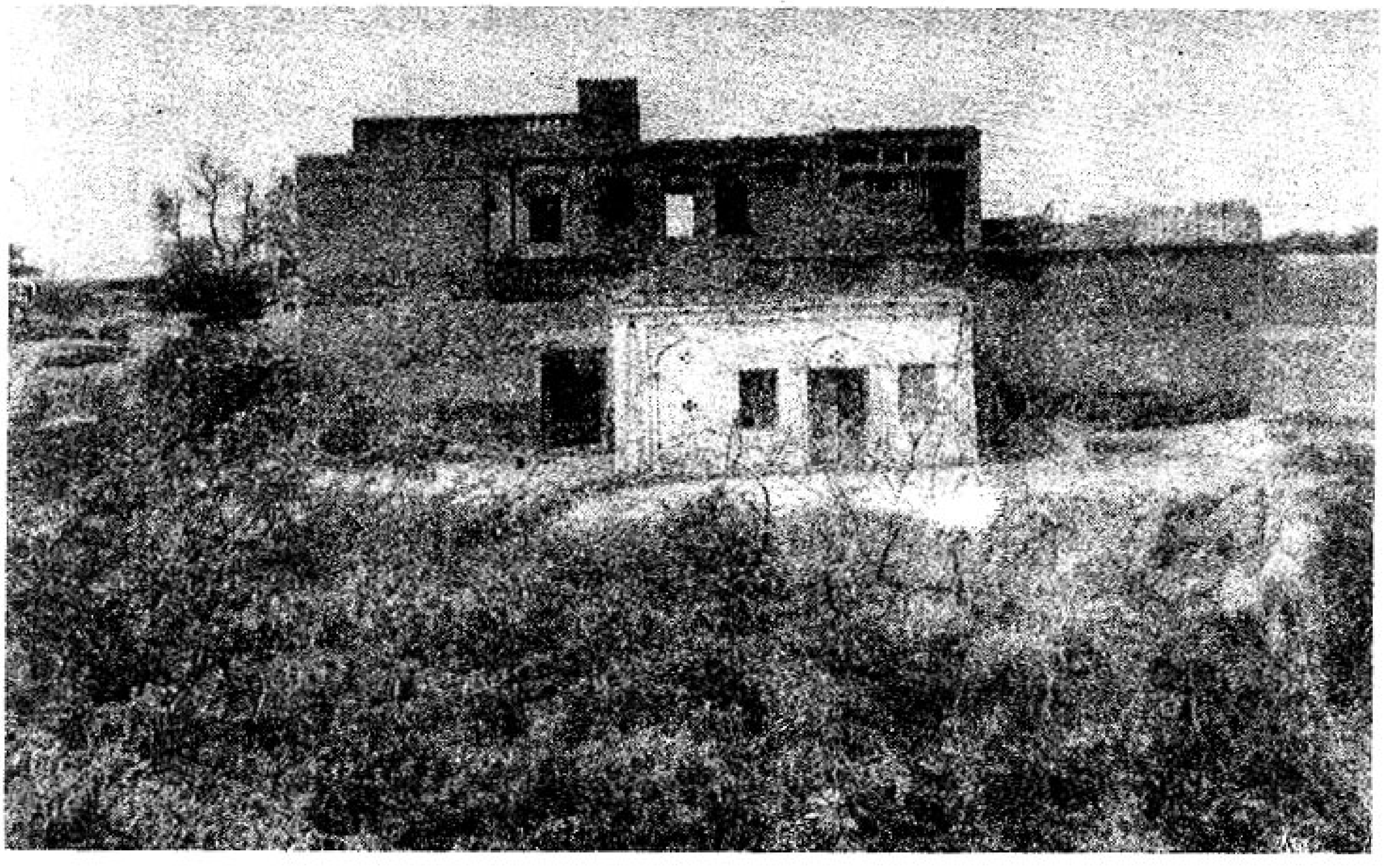

جس وقت میجر عزیز بھٹی چبارہ کے اوپر پہنچے تو کیپٹن انور اور نائیک اقیاس دوربینیں لگائے دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔ میجر بھٹی نے جاتے ہی جوانوں کو شاباش دی اور دوربین لگا کر خود بھی جائزہ لینے لگے۔ اتنے میں ہڈیارہ کے بائیں جانب سے دشمن کی ایک کمپنی نظر آئی ۔ اقیاس کو آرڈر دیا کہ نقشے پر مقام کا تعین کر کے گرڈ ریفرنس GRID REFERENCE نکالیں اور اس کے ساتھ کمپاس سے جو لائن بنتی ہے اس کی بیرنگ کریں۔ اس کے بعد پہلے فائر کا حکم دیا۔ چھ ہزار گز کے فاصلے پر پیش قدمی کرتے ہوئے دشمن پر گولے یوں پڑے جیسے کوئی آدمی قریب کھڑے دوسرے آدمی کو پتھر مارے۔ میجر بھٹی بہت خوش ہوئے۔ دشمن کی پوری کمپنی میں سے بمشکل چند آدمی بچے' سارے کی ساری کمپنی وہیں بھسم ہوگئی۔ دشمن کو پیش قدمی اور حملے کی بجائے اپنے بچاؤ کی تدابیر سوچنے پر مجبور ہونا پڑا۔ دشمن کو لحہ بہ لحہ تازہ کمک پہنچ رہی تھی۔ اس کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس نے پھر پیش قدمی کی کوشش کی مگر توپوں کا کوئی نشانہ خطا نہ جاتا تھا۔ اس نے بوکھلا کر اس محاذ پر ایئر فورس کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔

دشمن کے ایک طیارے نے ادھر پرواز کی۔ ہمارے شاہینوں نے ان کا تعاقب کیا اور اس کو مار گرایا۔ (اس دن مجموعی طور پر دشمن کے ۲۲ طیارے تباہ کیے گئے تھے) آٹھ بجے کے قریب مزید چھ ہوائی جہاز آئے جنہوں نے سائیفن کے پل پر بم گرا کر اسے توڑنا چاہا' مگر بم نشانے پر نہ لگیا ور پل نہ ٹوٹا۔ ایئر فورس کے تیسرے منظم حملہ میں ان کا نشانہ برکی کا وہ چوبارہ تھا جہاں ہماری او پی پوسٹ تھی اور جہاں سے میجر عزیز بھٹی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لے کر ان پر لگاتار گولے برسا رہے تھے۔ مگر دشمن کے طیارے بالاخانہ کو اپنا نشانہ نہ بنا سکے۔ صرف ایک گولہ چوبارے کے اوپر گرا جس سے دوسری منزل کا ایک حصہ گر گیا۔ میجر عزیز بھٹی اور ان کے ساتھی بال بال بچ گئے۔ باقی گولے چوبارہ کے آس پاس گرتے رہے۔

میجر عزیز بھٹی دشمن کے جہازوں کی گولہ باری سے یہ جان چکے تھے کہ دشمن کو ان کی او پی پوسٹ کا محل وقوع معلوم ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود وہ اسی جگہ ڈٹے رہے' اس لیے کہ سارے سیکٹر میں وہی سب سے اونچا مقام تھا جہاں سے کھڑے ہو کر ہڈیارہ تک بڑی آسانیسے دشمن کی نقل و

حرکت کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ اس کے لیے ہر خطرہ مول لینے کو تیار تھے۔

اس وقت تک بر کیسیکٹر میں مورچے کھودے جا چکے تھے اور دیگر دفاعی انتظامات مکمل کر لیے گئے تھے۔ ان حالات کے پیش نظر میجر شفقت بلوچ کو کم ملا کہ وہ اپنی کمپنی کو لے کر پیچھے ہٹ آئیں۔ ۹ گھنٹے تک دشمن کو روکے رکھنے کے بعد میجر شفقت بلوچ کی کمپنی ریٹائر ہو رہی تھی۔ وہ بچتے بچاتے اور دشمن کے حملوں کا مقابلہ کرتے واپس آ رہے تھے۔ اس مرحلہپر میجر عزیز بھٹی نے پلاٹون کمانڈروں کو ہدایت کی۔

''آپ فائر کروانے میں احتیاط سیکام لیں۔ میجر شفقت بلوچ کیکمپنی واپس آ رہی ہے۔ ان کا بھی خیال رکھیں۔ آپ لوگوں کو کسی قسم کی تشویش نہیں کرنیچاہیے۔ ہم نیدشمن کا حملہ روک دیا ہے' ہم انشاء اللہ اس کو یہاں سے مار بھگائیں گے''

میجر شفقت بلوچ کیکمپنی کے پیچھے ہٹنے کے ساتھ دشمن نیایک دفعہ پھر سر اٹھانے کی کوشش کی اور پیش قدمیکے آثار نمودار ہوئے۔ میجر عزیز بھٹی اس موقعہ کے منتظر تھے۔ چند لمحوں بعد دشمن کی پیش قدمی کا جوش ہمارے ٹھیک نشانے پر بٹھانے والے توپچیوں کے گولوں نے ٹھنڈا کر دیا۔

۱۲ بجے کے قریب میجر بھٹی اگلے مورچوں پر گئے۔ ابھی وہاں ہی تھے کہ کوارٹر ماسٹر حوالدار محمد اکرم دوپہر کا کھانا لیکر پہنچ گیا۔ اس نے میجر صاحب سے کہا صاحب! کھانا کھا لیں۔ کہنے لگے ''پہلے جوانوں کو کھانا دو۔ میں ابھی نہیں کھاؤں گا۔ جوانوں نے کھانا رکھوالیا اور پانی کی ایک بوکھال بھی لے لی۔ کوارٹر ماسٹر محمد اکرم کھانا تقسیم کرتا ہوا پلاٹون نمبر ۲ کی طرف چلا گیا۔ میجر عزیز بھٹی مورچوں کے پاس کھڑے تھے کہ دشمن کی طرف سے گولہ باری شروع ہو گئی۔ جوانوں نے مورچوں میں پوزیشن لے لی مگر میجر بھٹی اپنی جگہ پر کھڑے رہے اور گولے پھینکنے والی توپوں کی سمت کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر وہ ذاتی حفاظت سے بے نیاز جیپ پر تیزی کے ساتھ چوبارہ کی مشاہداتی چوکی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہاں پہنچے تو کیپٹن انور اور نائیک اقبال دشمن کی پوزیشن کا جائزہ لے رہے تھے۔ میجر بھٹی نے پھرتی کے ساتھ دوربین لگائی اور مشاہدہ کرنے میں

مصروف ہو گئے۔ پھر چوبارہ کی اوپر والی چھت پر چڑھ کر جائزہ لیا۔ چند لمحے مختلف ڈگریاں تبدیل کروا کر دشمن کے ٹھکانوں پر توپ خانہ سے فائر کروانے لگے۔

یہ بڑا نازک مرحلہ تھا۔ میجر شفقت بلوچ کی کمپنی بھی واپس آ رہی تھی۔ دشمن کو روکے رکھنا اور یہ احتیاط بھی ملحوظ رکھا کہ اپنی ڈی کمپنی کی کوئی جان ضائع نہ ہو بڑے تدبر کا کام تھا۔ جب دو بجے کے قریب میجر شفقت بلوچ کی کمپنی واپس پہنچ گئی تو ان کو آزادی ملی۔ اب صرف دشمن ہی سامنے تھا لیکن ڈی کمپنی کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد برکی تک دشمن کی راہ میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ چنانچہ دشمن نے اپنی پوری طاقت سے پیش قدمی کا نیا منصوبہ بنایا اور ہڈیارہ کے بائیں طرف سے بڑھ کر دشمن نے برکی پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ برکی کے بالا خانہ کی دور رس نگاہوں سے دشمن کی پیش قدمی کی یہ کوشش پنہاں نہ رہی۔ پوزیشن کا تعین کر کے توپوں سے فائر کروائے۔ گولے ٹھیک ٹھیک نشانے پر لگے۔ دشمن کے پانچ سات سپاہی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوتے نظر آئے' باقی وہیں کھیت رہے۔

میجر عزیز بھٹی اور ان کے ساتھیوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کامیابی پر ایک دوسرے کو مبارکباد دی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ میجر بھٹی نے دوربین لی اور اوپر چھت پر چڑھ کر دور دور تک مشاہدہ کرنے لگے کہ دشمن کسی طرف سے اچانک حملہ نہ کر دے۔ وہ کیا دیکھتے ہیں کہ ہڈیارہ سے دائیں جانب پیش قدمی کر کے دشمن کا لشکر برکہ کلاں سے بھی آگے نکل آیا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں جانب سے بیک وقت پیش قدمی کی گئی تھی مگر اس جانب سے درختوں کی اوٹ میں پہلے یہ طوفان نظر نہیں آ رہا تھا' مگر اس طوفان کی عمر بھی بہت کم تھی۔ توپوں کے گولے برکی کے بالا خانہ سے ان کے لیے پیغام اجل لے کر پہنچ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔

تھوڑی دیر بعد مشاہداتی چوکی کا کام کیپٹن انور' نائیک اقبال' خان عالم اور محمد اکرم کے سپرد کر کے میجر عزیز چوبارہ سے اتر کر جیپ میں اگلے مورچوں میں جوانوں کے پاس گئے۔ انہیں دشمن کی پیش قدمی کی کوشش اور ذلت آمیز شکست کے واقعات سے آگاہ کیا۔

میجر عزیز کے آتے ہی نعرہ ہائے تکبیر فضا میں گونجے۔ میجر عزیز ان سے کہہ رہے

تھے: ''غازیو! تمہیں خالد بن ولیدؓ ' محمد بن قاسمؒ اور صلاح الدین ایوبیؒ کے نقش قدم پر چلنا ہے۔''

''شیرو! کفر کی یلغار کیسامنے سیسہ پلائی دیوار بن جاؤ۔ ان گیدڑوں نے ہماری پاک سرزمین پر اپنا ناپاک قدم رکھنے کی جو جسارت کی ہے' اسے اس کا مزہ چکھادو''۔ سپاہی لابھ دین اور ای ایم ای کے ایک جوان کو بارودی سرنگیں بچھانے کے لیے آگے بھیج دیا۔

او پی پوسٹ کے چوبارے پر واپس آئے۔ آتے ہی دوربین لے کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ ۷ اویں میل سے آگے درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب یوں لگتا ہے جیسے گاڑیاں آ کر رک جاتی ہے۔ میجر عزیز بھٹی نے خیال کیا شاید اس جھنڈ کا فائدہ اٹھا کر دشمن اس جگہ اپنی طاقت جمع کر رہا ہے۔ انہوں نے اور غور سے دیکھا تو گاڑیوں کے پیچھے ٹینک بھی نظر پڑے۔ میجر بھٹی نے ان کو دیکھتے ہی گاڑیوں کا رینج لے کر توپ خانے کی پوری بیٹری کا فائر کروایا اور وہاں صفایا کرا دیا۔ کچھ تباہ ہوئے' باقی واپس ہو کر نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔ اتنے میں شام ہوگئی۔

میجر بھٹی بالا خانہ سے اتر کا اپنے سیکنڈ ان کمانڈ لیفٹیننٹ عبدالرحمٰن کے پاس گئے جو اس وقت برکی سے مشرق میں پختہ بنکر کے پاس تھے۔ عبدالرحمٰن نے بنکر کی آڑ لے رکھی تھی اور میجر بھٹی پاس ایک جھاڑی کے ساتھ کھڑے تھے۔ جنگ کے سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ پر بات کر رہے تھے۔ اتنے میں کوارٹر ماسٹر حوالدار محمد اکرم کھانا لے کر پہنچ گیا۔ اس نے کھانے کے لیے کہا تو جواب دیا عبدالرحمٰن کو کھانا کھلائیں۔ میری روٹیاں میرے تھیلے میں رکھ دیں اور سالن خراب ہو جائے گا اسے زمین پر انڈیل دیں۔ جوانوں کو کھانا مل گیا ہے؟''۔

اکرم نے بتایا کہ ''جوانوں کو کھانا باقاعدہ مل گیا ہے!''

کوارٹر ماسٹر اکرم نے تولیہ لپیٹ کر روٹیاں ان کے تھیلہ میں رکھدیں اور سالن زمین پھینک دیا۔

ریزرو پلاٹن نمبر ۳ کے کمانڈر حوالدار نذیر نے جس کی پلاٹون بی آر بی نہر پر متعین تھی اور پل کی حفاظت بھی اس کے ذمے تھی' آ کر بتایا کہ عسکری حکمت عملی کے پیش نظر اوپر سے احکام کے تحت برکی کا پل توڑ دیا گیا ہے۔ اسی وقت یہ خبر بھی ملی کہ بارودی سرنگ اچانک پھٹ جانے کے

باعث سپاہی لابھ دین اور ای ایم ای کا جوان دونوں ہی شہید ہو گئے ہیں۔

میجر عزیز بھٹی پل کے توڑے جانے پر ذرا متعجب ہوئے مگر انہوں نے جوانوں کے سامنے اس موضوع پر کوئی بات نہ کی۔ جس تدبر اور فوجی حکمت عملی کے پیش نظر پل توڑ دیا گیا تھا وہ اس سے متفق نہ تھے۔ اس حکمت عملی کا تقاضا یہ تھا کہ میجر عزیز بھٹی کی کمپنی کو برکی اور سارا علاقہ اسی دن دشمن کے حوالے کر کے نہر کے دائیں کنارے پر اپنے دفاعی مورچوں میں آجانا چاہیے۔

اس کے برعکس میجر بھٹی برکی جیسے اہم فوجی مقام کو کسی قیمت پر بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ برکی سیکٹر میں مٹھی بھر جوانوں کے ساتھ صرف دس بارہ گھنٹے کی دفاعی کاروائی میں ان کے نمایاں کارنامے حسب ذیل تھے:

(۱) دشمن ...... جس نے ۳ بجے رات کو بغیر اعلان جنگ کے اچانک تین محاذوں سے لاہور پر حملہ کیا تھا' وہ اس اچانک بھرپور حملہ سے پورا فائدہ اٹھا کر شام سے پہلے پہلے لاہور پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے ہر محاذ پر اپنے اس مقصد میں ناکامی ہوئی۔ مگر جہاں تک برکی ہڈیارہ محاذ کا تعلق ہے' دشمن کو صبح ہی صبح سرحد سے تھوڑا اندر جہاں روک دیا گیا تھا وہاں سے دن بھر میں ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ سکا تھا بلکہ اسے کچھ پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی

(۲) دن بھر کی فوجی کاروائیوں میں ‏دشمن کے سینکڑوں سپاہی کام آئے اور اس کا بے شمار اسلحہ اور سامان حرب تباہ ہوا۔ میجر عزیز بھٹی کی کمپنی کے اب تک صرف دو سپاہی بارودی سرنگیں بچھاتے ہوئے شہید ہوئے تھے۔

(۳) پاکستانی جوانوں کے مورال اور خود اعتمادی میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ ان کے حوصلے بلند تھے۔ اس کے برعکس بھارتی سپاہی ذلت آمیز پٹائی

کے بعد اعتماد نفس کھو چکے تھے اور ان کا ''مورال'' گر چکا تھا۔

میجر عزیز بھٹی نے لیفٹیننٹ عبدالرحمٰن سے مشورہ کیا کہ اگلے مورچوں پر جوانوں کا کام ذرا مشکل ہوتا ہے' اس لیے بہتر ہوگا کہ یہاں پر پلاٹون کو باری باری تبدیل کر کے لگائیں۔ چنانچہ ان سے کہہ دیا گیا کہ کل وہ اپنی پلاٹون کو برکی سے پیچھے پلاٹون نمبر ۲ کی جگہ لے جائیں اور نائب صوبیدار محمد سلیمان کی پلاٹون یہاں آگے آجائے گی۔ یہ ہدایات دیکر وہ پھر چوبارہ پر چلے گئے۔

چاند کی چاندنی میں بالاخانہ کے شمالی برآمدے میں کھڑے دوربین سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ کہ دشمن کی طرف سے گولہ باری شروع ہوگئی۔ ساتھیوں سے کہا: صرف محمد اقیاس میرے ساتھ رہے۔ باقی سب نیچے مورچوں میں چلے جائیں۔

خود برآمدہ کے شمال والے دوہرے ستون کی آڑ لے کر جنوبی طرف اس کے ساتھ لگ گئے۔ اقیاس سے کہا کہ وہ شمالی جانب کھڑا ہو اور دونوں مشاہدہ کرتے رہے۔ جب گولہ باری تھم گئی تو دوسرے جوانوں کو بھی اوپر بلایا۔ رات کافی بیت چکی تھی۔ کہنے لگے اب ذرا باری باری آرام کرلیں۔

کیپٹن انور اور اکرم سے کہا: آپ پہلے ستالیں۔

اپنے بٹ مین محمد اقبال کو بلایا ''بیٹا اقبال! رات بیدار رہنے کے لیے چائے ضروری ہے۔ دن کو تو آپ بڑی آسانی سے کام کر لیتے ہیں' اب یہ احتیاط کریں کہ روشنی باہر نہ جائے اور وقفوں بعد گرم گرم چائے پلاتے رہیں''۔

ایک بجے رات تک دو دفعہ چائے پی۔ دوسری دفعہ چائے پی چکنے کے بعد اقیاس اور خان عالم سے کہا: کہ آپ لوگ بھی ذرا آرام کرلیں۔ خود اکیلے ہی ڈیوٹی دیتے رہے۔

اڑھائی بجے کے قریب کیپٹن انور اور اکرم کو جگا دیا اور خود ذرا ستانے کے لیے برآمدہ سے باہر کھلی چھت پر بنے ہوئے شہ نشین پر لیٹ گئے۔

اردلی اقبال نے کہا: ''صاحب! نچلی منزل میں شہری بستر چھوڑ گئے ہیں وہ لا دیتا ہوں' بستر پر آرام فرمائیں''۔

"کہنے لگے شہریوں کا سامان ہم استعمال نہیں کر سکتے یہ ہم پر حرام ہے۔ میرا سونے کا ارادہ بھی نہیں ہے۔ یوں بھی فیلڈ ایریا میں بستروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں اپنا بستر اسی لیے ساتھ نہیں لایا کمپنی ہیڈ کوارٹر میں چھوڑ آیا ہوں"۔

پھر اقبال سے کہا: اقبال! کیپٹن صاحب اور اکرم کو چائے پلاؤ اور خود بھی آرام کرلو۔

میجر عزیز نے پون گھنٹہ آرام کیا پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد اکرم سے کہا: اقبال کو جگاؤ۔ چائے تیار کرے۔

کھڑے کھڑے چائے پی رہے تھے کہ کچھ شبہ ہوا۔ پیالی جنگلہ پر رکھی اور دوربین لے کر جائزہ لینا شروع کر دیا۔ جہاں کہیں شبہ پڑتا ایک دو فائر کروا دیتے تھے۔ پون گھنٹہ آرام کرنے کے سوا رات بھر اسی طرح بالا خانہ کے صحن اور چھت پر چلتے پھرتے اور دشمن کی حرکات کا جائزہ لیتے گزار دی۔ دن کے وقت انتہائی مہارت اور مستعدی سے گولہ باری کروانے اور دشمن کو بری طرح نقصان پہنچانے کے باعث دشمن کو یقین تھا کہ اس محاذ پر پاکستان کی فوج اور توپ خانہ کی بھاری طاقت ہے۔ دشمن رات کو کوئی خاص کاروائی نہ کر سکا۔ وہ سنبھل کر بڑی طاقت سے حملہ کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ یہ سب کچھ ڈیڑھ سو نفوس اور توپ خانہ کی ایک یونٹ کی مستعدی اور ان پر او پی پوسٹ کی بے مثال نگرانی کا نتیجہ تھا۔ سہ پہر کو جم خانہ کلب لاہور میں چائے پینے کا آرزو مند دشمن اس محاذ پر گزشتہ ۲۴ گھنٹوں میں فوجی اہمیت کی کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا بلکہ ذلت آمیز پٹائی کے بعد سرحد کے قریب بیٹھا اپنے ہی زخم چاٹ رہا تھا۔

مشرقی افق پر سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ میجر عزیز بھٹی نے اقبال سے پانی منگوایا' آنکھوں میں پانی کے چھینٹے مارے۔ وضو کیا اور خدا کے حضور سربسجود ہوئے۔ سر اٹھایا تو آنکھوں سے تشکر کے آنسو موتی بن کر گر رہے تھے۔

۷ ستمبر

۷ ستمبر صبح سورج نکلنے والا تھا' روشنی پھیل چکی تھی' میجر عزیز بھٹی دوربین لگائے عقابی نگاہوں سے دشمن کا جائزہ لے رہے تھے۔ برکہ خورد اور برکہ کلاں کے درمیان درختوں کی اوٹ میں دشمن کی نقل و حرکت کا شبہ ہوا۔ تھوڑی دیر مزید غور سے دیکھنے کے بعد ان کو یقین ہو گیا' کہ دشمن اس جگہ رات بھر بارود ڈمپ کرتا رہا ہے۔ آنے جانے والے سپاہیوں اور گاڑیوں سے نشان دہی ہوتی تھی۔ مقام کا رینج دے کر توپ خانہ کو گولہ باری کا حکم دیا۔ ڈیوٹی پر متعین دشمن کی ایک سیکشن تو وہیں بھسم ہو گئی اور بارود کو آگ لگ گئی۔ اس جگہ بارود کی اتنی زیادہ مقدار تھی کہ ڈمپ گھنٹوں جلتا رہا۔ اس کی اطلاع ڈویژنل ہیڈ کوارٹر دی گئی۔ چنانچہ ہمارے مشاہداتی طیارے (ایئر او پی) نے اس پر پرواز کر کے اس کا پورا منظر دیکھا۔ اس کے پیچھے کچھ فاصلہ پر دشمن کے ٹینک بھی کھڑے نظر آئے۔ ان پر بھی گولہ باری کرائی جس سے دشمن کے سارے ارادے خاک میں مل گئے۔

دشمن اپنی اس ''عظیم'' ناکامی پر بوکھلا گیا۔ اس نے توپ خانہ سے اندھا دھند فائرنگ کرائی اور ایئر فورس کو پھر امداد کے لیے طلب کیا۔ جونہی دشمن کے طیارے نمودار ہوئے ہمارے طیارے عقابوں کی طرح ان پر جھپٹے۔ دشمن کے ہوائی جہازوں کو حملہ بھول کر اپنے بچاؤ کی فکر دامن گیر ہوئی۔ الٹے پاؤں بھاگے' مگر ہمارے جانباز ہوا باز بھلا ان کو کب جانے دیتے۔ ان میں سے ایک کو آگے جا کر مار گرایا۔

بارہ بجے کے قریب حوالدار محمد اکرم کھانا لے کر پہنچ گیا۔ میجر بھٹی نے خود نہیں کھایا دوسرے ساتھیوں سے کہا کہ آپ کھانا کھائیں۔ محمد اکرم سے پوچھا کہ جوانوں کو کھانا مل گیا ہے۔ اس نے بتایا جوانوں تک کھانا پہنچانے کا انتظام کر دیا گیا ہے ان کو کھانا بھجوا کر ادھر آیا ہوں۔ جب اکرم واپس ہوا تو وہ دوربین لگائے بالا خانہ کے برآمدے میں کھڑے تھے۔

دشمن کی پیش قدمی کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو بالا خانہ پر ساتھیوں کو ہدایات دیکر نیچے

اترے اور مورچوں میں جوانوں کے پاس گئے۔ کھانے کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ کھانا انہیں بالکل تسلی بخش طریق سے مل رہا ہے۔ پھر انہیں خطاب کرتے ہوئے کہنے لگے:

"خدا کے شیرو! ڈٹے رہو۔ خدا تمہارا حامی و ناصر ہے۔ انشاء اللہ دشمن کو جرأت نہیں ہوگی کہ آپ تک پہنچ سکے۔ ہم نے اس کی کمر ہمت توڑ دی ہے"۔

مورچوں کے طوفانی چکر کے بعد چوبارہ پر پہنچ کر دشمن کی حرکات و سکنات پر دوربین نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد سترہ اور اٹھارہ میلوں کے درمیان ایک ٹرک اور ایک جیپ ادھر آتے ہوئے نظر آئے۔ میڈیم کا فائر کروایا۔ جیپ تو بچ گئی اور بری تیزی سے واپس جاتی ہوئی نظر آئی' البتہ ٹرک وہیں ختم ہوگیا۔

شام سے ذرا قبل پلاٹون نمبر تین کے کمانڈر حوالدار نذیر سے ٹیلیفون پر بات کی۔ ان سے جوانوں کی خیریت پوچھی اور ان کے کھانے کے متعلق دریافت کیا۔ مزید انہیں ہدایت کی کہ برکی اور بی آر بی نہر کے درمیان بارودی سرنگیں بچھا دیں۔ ویسے انشاء اللہ دشمن کو پیش قدمی نہیں کرنے دیں گے۔

شام کو حوالدار محمد اکرم کھانا لے کر پہنچ گیا۔ اسے کہا کہ سب کو کھانا کھلا دیں اور میرے لیے روٹیاں جھولہ میں رکھ دیں۔ اکرم نے تھیلہ اٹھایا تو حیران ہوا کہ ۶ ستمبر کی شام کو جو روٹیاں تھیلہ میں رکھ گیا تھا وہ جوں کی توں تولیہ میں لپٹی پڑی ہیں۔ اس نے وہ روٹیاں نکالیں اور تازہ روٹیاں اسی تولیہ میں لپیٹ کر رکھ دیں۔ اسے یقین ہوگیا کہ میجر صاحب نے کل سے کھانا نہیں کھایا۔ اس نے میجر بھٹی کے چہرے کو غور سے دیکھا تو ان کی آنکھیں غمازی کر رہی تھیں کہ انہوں نے رات آرام بھی نہیں کیا ہے۔

چاند کی مدھم روشنی تھی۔ کوارٹر ماسٹر محمد اکرم ابھی میجر بھٹی کے پاس ہی تھا۔ دوربین لگاتے ہوئے کہنے لگے: ٹینکوں کی آواز آرہی ہے اور شبہ بھی پڑتا ہے مگر رینج کا صحیح اندازہ نہیں ہو رہا۔ اکرم سے کہا: آپ لوگوں کو بہت زیادہ کام ہوتا ہے اس لیے آپ جائیں۔ محمد اکرم نیچے اتر رہا تھا کہ میجر بھٹی نے صحیح رینج معلوم کر کے فائر کروا دیا۔

آٹھ بجے کے قریب ریزرو پلاٹون نمبر تین کی پیٹرولنگ پارٹی آئی۔ میجر بھٹی بالا خانہ سے اتر کر جوانوں کے پاس گئے۔ مستعدی سے کام کرنے اور حوصلے بلند رکھنے پر انہیں شاباش دی۔ پھر انہیں کھڑے کھڑے ہاتھ کے اشارے سے بتانے لگے کہ وہ دیکھیں ہماری توپوں کے گولے کس تیزی سے جا رہے ہیں۔ یہ دشمن کو ضرور نقصان پہنچائیں گے۔

تھوڑی دیر بعد کچھ شبہ پڑا تو کہنے لگے: آپ اس دیوار کی آڑ میں ہو جائیں۔ وہ سب دیوار کی آڑ میں ہو گئے۔ مگر میجر بھٹی اپنی جگہ کھڑے باتیں کرتے رہے۔ معاً دشمن کی سمت سے بھی گولہ باری شروع ہو گئی اور آسمان پر آگ ہی آگ نظر آنے لگی۔ کہنے لگے: یہ بے ضرر ہیں۔ ذرا دیکھیں یہ کدھر جا رہے ہیں۔ ان کے گولے تو کبھی دن کو بھی نشانے پر نہیں پڑے۔

پیٹرول پارٹی چلی گئی۔ میجر بھٹی چوبارے کے اوپر چڑھ کر دوربین سے جائزہ لینے لگے۔ ساڑھے دس بجے کے قریب اپنے ساتھیوں کو آرام کرنے کے لیے کہا۔ وہ یک زبان ہو کر کہنے لگے: ”صاحب! سب سے زیادہ آپ کو تھکان ہو گی۔ آپ نے بالکل ارام نہیں کیا۔ آپ آرام فرمالیں۔“

کہنے لگے: ”میں ابھی آرام نہیں کروں گا۔ مجھے آپ لوگوں کے آرام کی زیادہ ضرورت ہے۔ آپ آرام کریں۔ میں بھی ضرور کروں گا۔“

نائیک اقیاس اور خانم عالم ساتھ رہے، باقی آرام کرنے لگے۔ محمد اقبال چائے تیار کر لایا۔ کہا: محمد اقیاس اور خان عالم کو پلاؤ اور میرے تھیلے سے روٹی نکال لاؤ۔ اقبال تولیہ میں لپٹی روٹی لے آیا۔ چائے کے ساتھ خشک روٹی کے چند لقمے لیے۔

۶ ستمبر کو صبح بال بچوں کیساتھ ناشتہ کرنے کے چالیس گھنٹے بعد میدان جنگ میں ٹھوس خوراک کے یہ پہلے لقمے تھے جو انہوں نے حلق سے نیچے اتارے۔ احساس فرض کا یہ عالم تھا کہ چائے بھی کھڑے کھڑے پیتے اور آنکھیں سرحد کی طرف لگی رہتیں۔ روٹی نہ کھانے کی وجہ ایک تو وقت کو بچانا تھا دوسرے رات بھر جاگنے کے

لیے بھی خالی شکم کو ترجیح دیتے تھے۔

چائے پیتے ہوئے کہنے لگے: ''یہ خشک ٹکڑے بسکٹوں سے زیادہ مزیدار ہیں۔''

چائے کے بعد بالا خانے کے اوپر والی چھت پر چلے گئے۔ وہاں سے دشمن کی نقل وحرکت اور اس کے ٹھکانوں کا جائزہ لے کر اکا دکا فائر کرواتے رہے۔

ایک بجے کے قریب چاند ڈوب گیا تھا۔ میجر بھٹی نے اقیاس اور خان عالم کو بھی آرام کرنے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر بعد کیپٹن انور اور ان کی پارٹی کو جگا دیا۔ خود بھی سیمنٹ کے شہ نشین پر ستانے کے لیے گھنٹہ بھر لیٹے۔ ذرا جھپکی لی اور پھر مستعد ہو کر بیٹھ گئے۔

۸ر ستمبر

دشمن نے آٹھ ستمبر کو صبح نو بجے چھنک ونڈی کی طرف سے ایک بھرپور حملہ کیا۔ میجر بھٹی نے ایئر برسٹ، توپ اور فیلڈ گنوں کے فائر سے دشمن کو بھاری نقصان پہنچایا۔ تھوڑی دیر بعد برکہ کلاں کی طرف سے دشمن کی ایک کمپنی نے پیش قدمی کی۔ ان پر ایک بیٹری کا ایئر برسٹ فائر کرایا لیکن کافی جانی نقصان کے باوجود دشمن تازہ کمک لے کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ البتہ میل نمبر سترہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کی ہر کوشش کو بری طرح ناکام بنا دیا گیا۔

ایک سکھ رجمنٹ نے چاند ماری بٹ کی طرف سے پیش قدمی کی کوشش کی۔ ان کو توپ خانہ رجمنٹ کے فائر سے خاصا نقصان پہنچایا۔ اپنی بھرپور کوششوں کے باوجود دشمن کا قدیم برکہ کلاں سے آگے نہ بڑھ سکا اور اس کا بیشتر حصہ موقعہ پر ہی ختم کر دیا گیا۔ مگر اتنے نقصان کے باوجود آج دشمن نے ہمت نہ ہاری کیونکہ دشمن تین دن سے متواتر جس کوشش میں اپنا شدید نقصان کروا چکا تھا، اس کوشش کو وہ ترک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دشمن نے دو مرتبہ اور پیش قدمی کی جان توڑ کوشش کی، مگر دونوں دفعہ اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ دونوں مرتبہ ایک ایک بیٹری کا ایئر برسٹ ان کے لیے کافی ثابت ہوا۔

دشمن بھی اندھا دھند گولہ باری کروا رہا تھا، مگر ہمارے جوان علیحدہ علیحدہ مورچوں میں اپنا دفاع کر رہے تھے۔ اس لیے کوئی نقصان نہ ہوا۔

دشمن کی گولہ باری ذرا تھمی۔ میجر بھٹی نے مورچوں پر چکر لگایا۔ انہیں یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ کسی جوان کو خراش تک نہیں آئی۔ ان کو تسلی دی اور کہا: ''اسلام کے شیرو! خدا تمہارا حامی و ناصر ہے۔ کفر تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا''۔

مورچوں پر چکر لگانیکے بعد بہ سرعت تمام واپس آئے۔ محمد اقبال کو وردی اور دوسرا سامان

لینے کے لیے نہر کے پار بٹالین ہیڈ کوارٹر بھیج دیا۔

اتنے میں کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل محمد ابراہیم قریشی نے میجر بھٹی سے وائرلیس پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ آپ تین دن سے اس محاذ پر ہیں اور ذرا بھی آرام نہیں کر سکے۔ آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔ آپ کچھ دن واپس جائیں۔ میں آپ کی جگہ دوسرا آفیسر بھیج رہا ہوں

۔

میجر بھٹی نے کمانڈنگ آفیسر سے کہا سر! یہ بڑا نازک محاذ ہے' میں یہاں دشمن کی چالوں سے پورا واقف ہو گیا ہوں ۔ نئے آفیسر کو ان چالوں کو سمجھنے میں کچھ نہ کچھ وقت لگے گا۔ ہمارا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ میری انتہائی آرزو ہے کہ مجھے اس محاذ سے واپس نہ بلایا جائے۔ میں واپس جانے کے لیے میدان جنگ میں نہیں آیا ہوں۔ آپ میرے متعلق کوئی تشویش نہ کریں اور نہ کسی آفیسر کو بھیجیں۔ ان نازک لمحات میں مجھے کسی آرام کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اتنے میں کھانا آ گیا۔ کوارٹر ماسٹر محمد اکرم کل میجر صاحب کے تھیلہ میں پرسوں کی پڑی ہوئی روٹیاں دیکھ چکا تھا۔ آج وہ تہیہ کیے ہوئے تھا کہ ہر قیمت پر انہیں اپنے سامنے کھانا کھلا کر رہے گا۔ جب اکرم اوپر گیا تو وہ حسب معمول دوربین لگائے دشمن کی حرکات کا جائزہ لے رہے تھے

۔

حوالدار اکرم نے میجر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا: ''صاحب! آپ جانتے ہیں کہ میں ایک اچھا آبزرور بھی ہوں' انٹیلی جنس سیکشن میں رہ چکا ہوں۔ آپ کھانا کھائیں' میں اتنی دیر آپ کی جگہ ڈیوٹی دیتا ہوں۔ چنانچہ مان گئے اور دوربین اس کے حوالے کر کے کھانا کھانے لگے۔ اتنے میں اکرم کو ایک جیپ اور دو ٹرک نظر آئے۔ اسے کہا ٹھیک ڈگر پلاٹ کر کے گولہ لگواؤ۔ گولہ نشانہ پر نہ لگا ۔جھٹ کھانا چھوڑ کر خود فائر کرایا دونوں ٹرک تباہ ہو گئے ۔ البتہ جیپ جھاڑیوں سے نکل کر بڑی تیزی سے واپس جاتی ہوئی نظر آئی۔ مسکرا کر کہنے لگے ''یار! کھانے کے یہ دو لقمے بہت مہنگے پڑے ۔دشمن کی جیپ بچ گئی ہے!''

دشمن کی حرکات کا جائزہ بھی لیتے جاتے تھے ۔ اور اکرم سے گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا:

''اکرم بھئی! آج میں جوانوں کے پاس گیا تو ان کو پہچاننے میں دقت پیش آئی۔ان کی داڑھیاں کافی بڑھی ہوئی ہیں۔اس لیے آپ جب کھانا لے کر آئیں تو حجام کو بھی ساتھ لائیں''۔اکرم نے کہا بہت اچھا صاحب! اکرم نے ایک تجویز پیش کی کہ دن کو کھانا تقسیم کرنے سے دشمن کو نشانہ ہی ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔اگر آپ اجازت دیں تو ایک وقت کا کھانا دن نکلنے سے پہلے دے جایا کروں اور دوسرے وقت کا شام کی تاریکی میں۔میر صاحب اس پر متفق ہو گئے۔کہنے لگے تجویز تو معقول ہے مگر اس طرح آپ لوگوں کو رات میں دو دفعہ کشتی پر آنا جانا پڑے گا۔سامان بھی کافی ہوتا ہے یہ مناسب رہے گا کہ آپ میری جیپ لے جائیں اور پل پدھر کے راستہ آیا جایا کریں۔سرور ڈرائیور کو بلایا اور کہا کہ تم آج سے کوارٹر ماسٹر محمد اکرم کے ساتھ ڈیوٹی دینا ہو گی۔ابھی تم ان کے ساتھ جاؤ پھر کوارٹر ماسٹر کو کہا کہ سالن تو دوپہر تک خراب ہو جانے کا خدشہ ہے۔کیا یہ اچھا نہیں رہے گا کہ سالن روٹی کی بجائے جوانوں کو صرف میٹھی پوریاں دیا کریں۔

اردلی محمد اقبال رات کو بتالین ہیڈ کوارٹر سے میجر صاحب کی وردی' چائے' چینی اور خشک دودھ لے کر واپس آ گیا۔

رتات حسب معمول ساتھیوں کو باری باری آرام کرواتے رہے۔آدھی رات کے بعد کہنے لگے میں ذرا اونگھ لوں۔قریب پون گھنٹہ بعد اٹھ کھڑے ہوئے اور جو ساتھی جاگ رہے تھے ان سے کہا' اب آپ سب بے شک آرام کریں' میں انشاءاللہ اکیلا نگرانی کروں گا۔

اڑھائی تین بجے کے قریب کوارٹر ماسٹر محمد اکرم جیپ پر کھانا اور حجام لے کر آیا۔جیپ کی آواز سنتے ہی سنتری نے ہالٹ پکارا۔محمد اکرم کو اتفاق سے اس دن کا ''پاس ورڈ'' یاد نہ رہا۔جلدی میں کہہ دیا کہ اکرم کوارٹر ماسٹر ہوں۔سنتری نے کہا کوئی اور نشان دو۔اکرم کہنے لگا سرور ڈرائیور بھی میرے ساتھ ہے اور حجام بھی لایا ہوں۔چنانچہ آنے کی اجازت دی گئی اور اوپر بلا لیا۔آج وہ سالن روٹیوں کی بجائے میٹھی پوریاں لایا تھا۔میجر عزیز نے پوری چکھی۔بڑی مزیدار تھی۔ہاتھ میں لے کر اسے کھانے لگے۔اکرم سے پوچھا ''سب جوانوں کے لیے ایسی ہی پوریاں لے جا رہے ہو نا!'' اکرم نے کہا ''سر! معاف کرنا۔آج سارے جوانوں کے لیے تو انتظام نہیں ہو سکا کل سے

انشاءاللہ سب کے لیے انتظام ہو جائے گا۔ آج صرف آپ ہی کے لیے بنا کر لایا ہوں۔''

میجر عزیز نے اسی وقت پوری ہاتھ سے رکھ دی اور کسی جوان کو دے دینے کے لیے کہا۔

''میرے لیے آج وہی خشک چپاتیاں دے جائیں۔ میں کل سب کے ساتھ ہی پوریاں کھاؤں گا''۔ چنانچہ اکرم ایک جوان کے ساتھ کھانا تبدیل کر کے میجر صاحب کو چپاتیاں دے گیا۔

مجھے یہاں تاریخ اسلام کے ایک عظیم جرنیل ابو عبیدؓ کا طرز عمل یاد آ رہا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں عراق میں بارسماء کی فتح کے بعد جالینوس مدائن بھاگ گیا تو سپہ سالار ابو عبیدؓ نے اپنی فوج کے افسروں کو سرزمین عراق کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا دیا' جس سے اہل عراق کے دلوں پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گوی اور ان کے ذہنوں میں خالدؓ بن ولید اور ان کے کارناموں کی یاد ایک بار پھر تازہ ہو گوی۔ وہاں کے جاگیرداروں نے ابو عبیدؓ سے اپنی مخالفانہ کاروائیوں کی معافی چاہی۔ ابو عبیدؓ نے ان سے صلح کر لی۔ یہ لوگ طرح طرح کے لذیز اور پر تکلف کھانے لے کر ابو عبیدؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابو عبیدؓ نے پوچھا:

''کیا سارے لشکر کے لیے ایسے ہی کھانوں کا انتظام کیا گیا ہے؟ جواب نفی میں ملا تو ابو عبیدؓ نے یہ کہہ کر کھانے سے انکار کر دیا کہ جب تک سارے لشکر کو یہی کھانا نہیں ملے گا میں اس کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کتنا برا ہو گا ابو عبیدؓ! اگر وہ اکیلے یہ کھانا کھا لے اور اپنے ساتھیوں کو نہ پوچھے جو اس کی خاطر اپنا خون بہا رہے ہیں''۔ چنانچہ جب سارے لشکر کے لیے اس قسم کے کھانے کا انتظام ہو گیا تو ابو عبیدؓ نے ان کی دعوت قبول کر لی۔

۹ ر ستمبر

اب تک دشمن کے دل و دماغ پر برکی کی مشاہداتی چوکی کا کابوس پوری طرح چھا چکا تھا۔ وہ ہر قیمت پر اس چوکی کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔ ۹ ر ستمبر کو صبح دس بجے کے قریب دشمن کے دو ہوائی جہاز آئے اور انہوں نے بالا خانے پر بم پھینکے مگر بم نشانے پر نہ لگے اور اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے۔ میجر بھٹی نے دیکھا کہ تھوڑے وقفوں بعد درختوں کے جھنڈ میں بڑی تیز رفتاری سے ٹرک آتے تھے اور وہاں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد تیزی سے واپس ہو جاتے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دشمن پھر وہاں گولہ بارود اکٹھا کر رہا ہے۔ اتنے میں ایک کانوائی آئی جس میں تیرہ گاڑیاں تھیں۔ اس کا جائزہ لیتے رہے۔ جب وہ کانوائی سترہ اٹھارہ میل کے جھنڈ کے پاس پہنچی تو فائر کا حکم دے دیا۔ کانوائی پوری کی پوری تباہ ہو گئی اور دھوئیں کا ایک بہت بڑا بادل بھی وہاں سے اٹھتا ہوا دکھائی دیا جو وہاں بارود کے یک لخت جل اٹھنے کی علامت تھی۔ دوپہر کے بعد دشمن کے جہاز پھر آئے جو اس بالا خانہ کا جائزہ لیتے رہے، مگر ایک دو چکر لگانے کے بعد بغیر کسی کاروائی کے بڑی پھرتی سے واپس چلے گئے۔ اب قدرے سکون ہو گیا تھا۔ دشمن کی کوئی گاڑی نظر نہ آتی تھی اور نہ کوئی مزید حرکت ہوئی۔ آج فرصت کے لمحات میں اپنے والد کو ایک خط لکھا (خط کا مضمون صفحہ ۳۳ ملاحظہ کریں) محمد علی حجام کو بلا کر حجامت بنوائی، مگر حجامت کے بعد نہائے نہیں۔ اور نیچے اتر کر پلاٹون نمبر دو کے پلاٹون کمانڈر نائب صوبیدار محمد کے پاس گئے اور جوانوں کو بتایا کہ آج انہوں نے دشمن کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ مزید کہا کہ گاڑیاں تو آپ تو نہیں دیکھ سکے ہوں گے، البتہ اٹھتا ہوا دھواں آپ نے ضرور دیکھا ہوگا۔ بڑے خوش ہو کر کہنے لگے: آج دشمن کا بہت نقصان ہوا ہے۔ اب مشکل سے ہی ادھر کا رخ رکنے کی ہمت کرے گا۔

نائب صوبیدار محمد سلیمان کے ہمراہ واپس آ رہے تھے کہ باغ میں سے گزرتے ہوئے

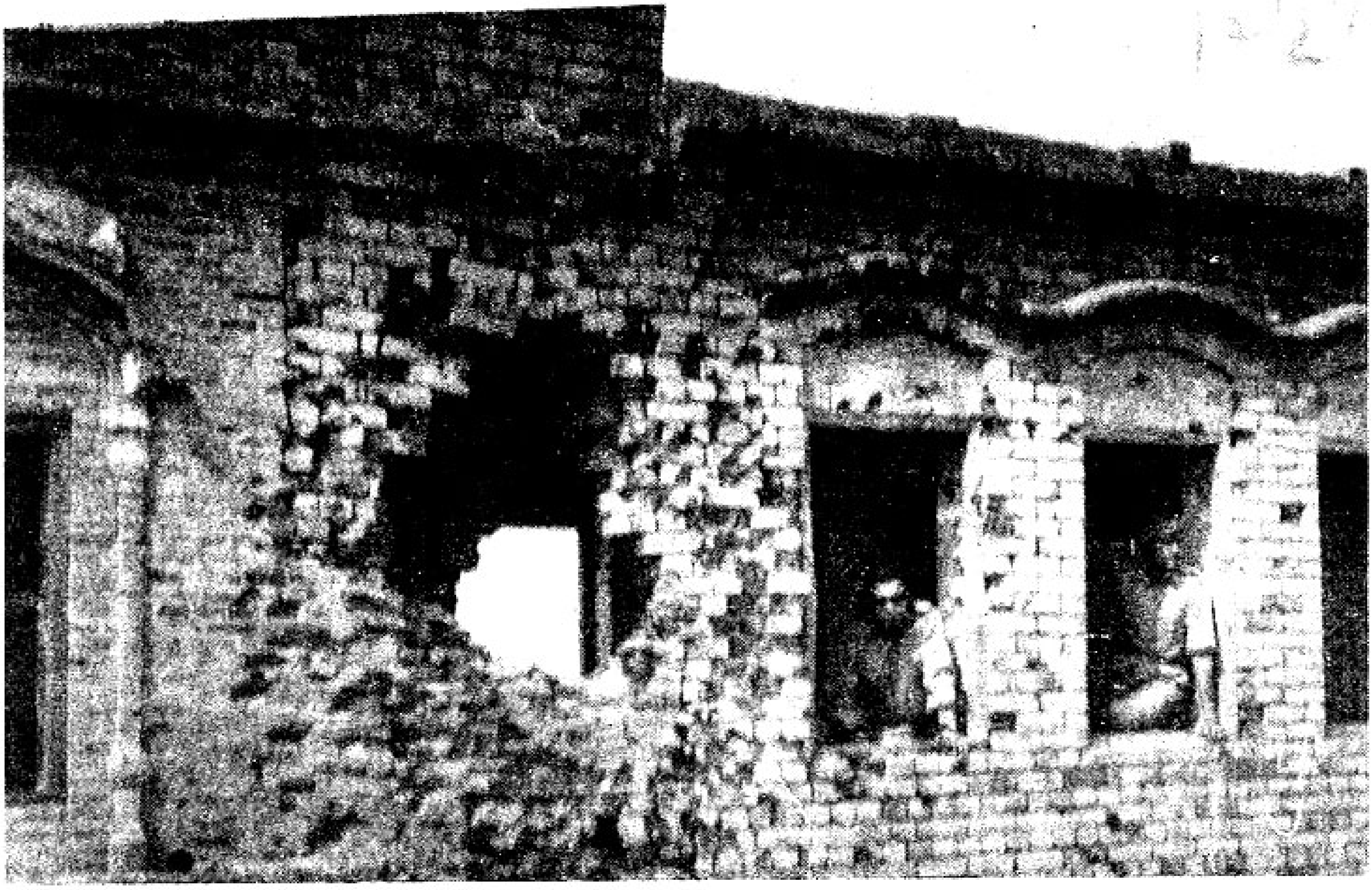

ایک پکے ہوئے امرود پر نظر پڑی ۔ کہنے لگے ''یہ امرود کتنا پیارا ہے ۔وہ امرود توڑا اور نائب صوبیدار محمد سلیمان سے پوچھا: ''آپ امرود کھائیں گے؟'' محمد سلیمان نے کہا ''صاحب آپ شوق فرمائیں''۔امرود کھایا۔یہ ان کی زندگی کا آخری پھل ثابت ہوا۔

نائب صوبیدار محمد سلیمان سے کہا: صاحب جوانوں کو اگلے مورچوں پر آئے دو دن ہوگئے ہیں' اب ان کو پیچھے لے جائیں۔لیفٹیننٹ عبدالرحمٰن سے میں نے کہہ دیا ہے وہ چار بجے اپنی پلاٹون کو لے کر آ جائیں گے اور ان مورچوں کو سنبھال لیں گے۔

یہ ہدایات دے کر پھر بالا خانے پر پہنچ گئے۔تھوڑی دیر بعد توپ کے دو گولوں نے یکے بعد چبارہ کو ہٹ کیا۔جس سے چبارہ کا کچھ حصہ گر گیا مگر میجر عزیز بھٹی اور ان کے ساتھیوں کو خراش تک نہ آئی۔

میجر عزیز بھٹی نے اپنے ساتھیوں سے کہا: دشمن نے ہماری مشاہداتی چوکی بڑا صحیح رینج لے کر نشانہ پر گولے برسائے ہیں اب وہ مطمئن ہوگیا ہوگا کہ ہماری او پی و پوسٹ تباہ ہوگئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اب دشمن زبردست حملہ کردے اس لیے ہمیں بے حد محتاط ہوکر حالات کا جائزہ لینا چاہیے۔چنانچہ وہ دوربینیں لے کر دشمن کی حرکات کا بغور جائزہ لینے لگے' مگر دشمن کی طرف سے شام

تک کوئی حرکت نہ ہوئی۔ اتنے میں اکرم کھانا لے کر پہنچ گیا۔ کیپٹن انور کے ساتھ بیٹھ کر چند لقمے لیے اور اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ انور اور اکرم نے کہا کہ آپ نے بہت تھوڑا کھانا کھایا ہے' تھوڑا سا اور کھا لیجئے۔ کہنے لگے زیادہ کھانے سے نیند آ جائے گی۔ اس کمی کو چائے سے پورا کر لیں گے تاکہ رات کو نیند نہ آئے۔ اقبال کو آواز دی' وہ چائے لے کر آ گیا۔ سب نے مل کر چائے پی۔ اقبال سے کہا: ایک تھرموس بھر کر رکھ لو۔

تھوڑی دیر بعد اقبال کو ساتھ لے کر بارہ پنجاب کی بارہ پلاٹون کے کمانڈر صوبیدار عالم زیب کے پاس گئے۔ وہ کھجور ایریا میں ایک گن لے کر مورچہ سنبھالے ہوئے تھے۔ ان کے کام کی داد دی۔ جوانوں کی تعریف کی۔ تھرموس سے جوانوں اور صوبیدار عالم زیب کو چائے پلائی۔ وہاں بیٹھے تھے کہ دشمن کی حرکت کا شبہ پڑا۔ فرمانے لگے۔ آپ لوگ اپنے اپنے مورچے سنبھال لیں۔ وہاں سے لیفٹیننٹ عبدالرحمٰن کے پاس گئے۔ ان کو چینی خشک دودھ اور چائے کی پتی دی اور کہا۔ جب ضرورت پڑے چائے تیار کر لینا۔ اس سے نیند اور تھکان دور ہو جاتی ہے۔ انہیں تاکید کی کہ جوانوں کی بھی چائے سے تواضع کرتے رہنا۔ البتہ اس بات کی سخت احتیاط رکھیں کہ چائے پکاتے وقت روشنی نظر نہ آئے۔

حوالدار اللہ دتہ بھی لیفٹیننٹ عبدالرحمٰن کی کمپنی میں تھا۔ وہ میجر عزیز بھٹی کے گاؤں لادیاں سے قریب ھنج بھدر کا رہنے والا۔ اس کے مورچہ کے پاس گئے۔ کہنے لگے! میرے بہادر شیر! دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا اور کسی صورت میں بھی اپنے مورچہ سے نہیں ہٹنا۔ اللہ دتہ نے جواب دیا: صاحب! آپ دیکھ لیں کہ دشمن خواہ مجھ پر چڑھ بھی آیا تب بھی یہاں سے نہیں ہٹوں گا اگر آپ حکم دیں تو اور بات ہے ورنہ یہیں دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان دے دوں گا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا وقت آ گیا تو یہاں پڑی ہوئی میری لاش آپ کو میرے قول کی صداقت کا ثبوت دے گی''۔

خوش ہو کر کہنے لگے: ''مجھے اپنے جوانوں سے اسی جذبہ کی توقع ہے''۔

پون گھنٹہ اگلے مورچوں پر ٹھہرنے کے بعد واپس اپنی جگہ پر پہنچ گئے۔ ساتھیوں سے دشمن

کی نقل وحرکت کا پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ آج دشمن کی خاموشی معنی خیز ہے۔ انہوں نے خود بھی چاندنی میں جائزہ لیا مگر دشمن کی نقل وحرکت کے مطلقاً کوئی آثار نظر نہ آئے۔ تین بجے کے قریب آرام کرنے کے لیے شاہ نشین پر لیٹ گئے۔ لیٹے ہی نیند نے دبا لیا۔ لیکن بمشکل پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ یک لخت اٹھ کھڑے ہوئے اور ساتھیوں سے کہنے لگے: یہ میرے کان بج رہے ہیں یا دشمن کے ٹینکوں کے چلنے کی آواز ہے۔

کیپٹن انور نے کہا: جی ہاں! ٹینکوں کی آواز ہے۔ میں بھی ان کا کھوج لگا رہا ہوں۔ میجر بھٹی نے بھی دوربین لگا لی۔ بڑی مشکل سے ایک مقام پر دشمن کے دو ٹینک نظر پڑے ان پر فائر کروایا۔ اور وہ دونوں ختم ہو گئے۔ مزید جائزہ لینے پر کچھ نظر نہ آیا۔ لیکن میجر عزیز بھٹی اس کے بعد مستعد رہے۔ صبح تک اور کوئی خاص حرکت نوٹس میں نہ آئی۔ کوارٹر ماسٹر محمد اکرم حسب معمول سحری کے وقت کھانا لے آیا۔ آج میجر صاحب کی ہدایت کے مطابق سب کے لیے گھی میں تلی ہوئی میٹھی پوریاں لایا۔ میجر بھٹی نے بڑے شوق سے چائے کے ساتھ پوریاں کھائیں۔

پیارے ابا جان!

السلام علیکم! ہم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بخیریت ہیں اور دشمن کا مقابلہ کر رہے ہیں، جس کو بلاشبہ ہم نے شکست دے دی ہے۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔ آپ صرف یہ کریں کہ جنگ کے دوران بھی بچوں کو پڑھاتے رہیں تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔

میں جنگ کے شور وغل کا عادی ہوں۔ مجھے اس کا ذرا بھر بھی خوف نہیں ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ فضل ایزدی نے آپ کو ہمت دے رکھی ہے کہ مہا ماں جی کو تسلی دیتے رہیں۔

زرینہ اور بچوں کو سلام اور پیار

آپ کا فرزند...... عزیز

۱۰ر ستمبر

صبح کی روشنی میں برکہ کلاں کی سڑک کے بائیں طرف دو سپاہیوں کی حرکت نوٹ کی گئی جس کو انہوں نے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اس کے سوا محاذ پر دشمن کی اور کوئی حرکت نوٹس میں نہ آئی۔ دشمن کی خاموشی پراسرار تھی۔ البتہ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب چند گاڑیاں جھاڑیوں میں آ کر رک گئیں۔ دشمن کی یہ حرکت اس کے خطرناک ارادوں کی غمازی کر رہی تھی۔ اور سات ستمبر کی صبح کی طرح کسی بڑے حملے کی تیاری معلوم ہوتی تھی اور میجر بھٹی نے بلاتوقف اس مقام کا رینج لے کر توپ خانہ کو فائر کا حکم دے دیا۔ دوسری ساعت میں وہاں آگ کے شعلے بلند ہوئے اور گاڑیاں ختم ہو گئیں اور بارود کے ذخیرہ سے ڈیڑھ گھنٹہ تک دھوئیں کے بادل اٹھتے رہے۔ معلوم ہوا کہ دشمن راتوں رات ایک بہت بڑے حملہ کی تیاری کر چکا تھا۔

دشمن کے حملے کی تیاری اور اس کی بروقت سرکوبی کی اطلاع ڈویژنل ہیڈ کوارٹر پہنچی تو ایئر او پی نے آج پھر دشمن کے آتش بہ لب سامان حرب و ضرب کا نظارہ کیا۔ ایک کمانڈو پلاٹون نے آگے جا کر دشمن کے نقصان کی پوری تفصیل کا جائزہ لیا۔ میجر بھٹی نے توپ خانہ کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل محمد نواز سیال کو بھی آج کی روئیداد سے آگاہ کیا۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب میجر شفقت بلوچ اور کیپٹن محمد ارشد میجر عزیز بھٹی کے پاس بالا خانے پر آئے۔ وہ برکی محاذ پر ان کے جنگی کارناموں کی تفصیل جاننا چاہتے تھے۔ میجر بھٹی نے دشمن کے پے در پے حملوں اور اپنی دفاعی تدابیر کے چند واقعات مختصراً بیان کیے۔ انہیں اشاروں سے وہ مقامات دکھائے جہاں دشمن کا زور اور اجتماع تھا اور جہاں جہاں اس

کی گاڑیاں، ٹینک اور ایمبولینس تباہ کیا گیا۔ میجر بلوچ اور کیپٹن ارشد کو یہ دیکھ کر حیرت آمیز مسرت ہوئی کہ میجر بھٹی کی کمان میں مختصر سی جماعت اس محاذ پر تاریخ ساز کردار ادا کر رہی ہے۔ وہ گذشتہ ایک سو گھنٹوں سے اس حالت میں دشمن کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں کہ ان کے پیچھے بی آر بی نہر کا پل بھی چھ ستمبر سے توڑ دیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے سے کئی گنا زیادہ طاقتور دشمن کی ہر چال کو بے اثر اور ہر حملے کو ناکام بنا دیا ہے۔ تاریخ حرب وضرب میں یہ واقعہ اپنی مثال آپ تھا۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز امر یہ تھا کہ میجر عزیز بھٹی اپنے اس عظیم کارنامے پر چنداں مطمئن نہ تھے۔ وہ برکی میں بیٹھ کر صرف کامیاب دفاع پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے تھے، وہ تو دشمن پر جوابی حملہ کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ دشمن کی کمر ہمت توڑنے کے بعد اب وہ اس پر شب خون مار کر اسے پاک سرزمین پر اپنا ناپاک قدم رکھنے کی پوری سزا دینا چاہتے تھے۔ ان کی ہمتوں کی بلندی اس امر سے بے نیاز تھی کہ نہر کا پل توڑ دینے کے بعد بوقت ضرورت کمک یا گولہ بارود ان تک پہنچانا قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے اور شکست کی صورت میں دشمن ان میں سے ایک کو بھی نہر عبور کرنے کی مہلت نہیں دے گا۔ مگر ان کے حوصلے بڑے بلند تھے۔ وہ ایسے خدشات اور خوف کو دل میں جگہ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ فتح یاب ہو کر سرزمین پاک اور حصار دین کو بچانے یا اس راہ میں ہدیہ جان پیش کر کے شہادت عشق میں قدم رکھنے کے سوا کچھ اور نہ سوچتے تھے۔ دشمن کے مقابلے میں انہیں اپنی قلت تعداد کی بھی پرواہ نہ تھی۔

انہوں نے دیکھا کہ سو گھنٹہ مسلسل سخت ڈیوٹی دینے کے باوجود میجر عزیز مستعد اور چاق وچوبند ہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اعصاب فولاد سے بنے ہوئے ہیں۔ البتہ ان کی موٹی موٹی خوبصورت اور نشیلی آنکھیں سوج کر موٹی اور سرخ ہو چکی تھیں، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس

دوران استراحت سے نا آشنا رہی ہیں۔

میجر شفقت بلوچ اور کیپٹن ارشد سے ملاقات کے دوران میجر عزیز بھٹی کی عقابی نگاہیں مسلسل دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتی رہیں۔ اتنے میں چائے آ گئی۔

میجر شفقت بلوچ اور کیپٹن ارشد کے جانے کے بعد میجر بھٹی نے توپ خانہ ہیڈ کوارٹرز پیغام دیا کہ نائیک محمد اقیاس کی جگہ کسی اور آدمی کو ڈیوٹی پر بھیج دیں کیونکہ وہ پانچ دن سے یہاں مسلسل سخت ڈیوٹی دے رہا ہے۔ دو بجے کے قریب علی محمد اس کی جگہ آ گیا۔ میجر بھٹی نے اقیاس کے کام کی بہت تعریف کی اور اسے واپس بھیج دیا۔

تین بجے کے قریب برکہ خورد کے دائیں جانب دشمن کے چھ ٹینک نظر آوے۔ ان پر فائر کروایا۔ پانچ تو ختم ہو گئے البتہ چھٹا بچ نکلا۔

برکہ خورد کے نزدیک ایک ٹیوب ویل کے پاس بھی دشمن کے سپاہی جلدی جلدی آتے اور واپس ہو جاتے تھے۔ بارود کے ذخیرہ کا شبہ ہوا۔ توپ کا فائر کروایا اور بارود جل اٹھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی دشمن نے وہاں بارود جمع کرنا شروع کیا ہی تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد فوجی ٹرک اور ایک جیپ کو بھی نشانہ بنایا۔

محاذ پر بظاہر خاموشی تھی۔ ساڑھے چار بجے کے قریب اقبال سے نہانے کے لیے پانی منگوایا۔ کل بال کٹوانے کے بعد نہائے نہیں تے۔ غسل کی تیاری کر رہے تھے کہ اگلے مورچوں سے حوالدار اللہ دتہ کا پیغام موصول ہوا کہ برکی تھانہ کے سامنے دشمن کا ایک سیویلین ٹرک آ گیا ہے۔ حوالدار اللہ دتہ اور بہادر خاں سپاہی نے ٹرک کو روکا اور امانت سپاہی نے اس کے ٹائر میں گولی مار کر اسے پنکچر کر دیا اور ٹرک میں سے دو فوجی انجینئر ز اور دو سویلین (ڈرائیور اور کلینر) گرفتار کر لیے۔ ٹرک میں کانٹے دار تار اور دوسرا سامان تھا۔ محمود اور امانت سپاہی ان قیدیوں کو پیچھے ہیڈ کوارٹر لے گئے۔

نذیر پلاٹون کمانڈر نے میجر بھٹی کو پیغام دیا کہ ہم نے چاروں آدمیوں کو قید کر کے پیچھے ہیڈ کوارٹر بھیج دیا ہے۔ سن کر کہنے لگے وہ تو خود ہی تمہارے پاس آ گئے تھے مزا تو تب ہے کہ دشمن کے ایریا سے اس کے فوجیوں کو قید کر کے لاؤ۔ ہم انشاء اللہ آج ہی حملہ کریں گے اور اس کے علاقہ سے

فوجیوں کو قید کر کے لائیں گے۔ میں نے ابھی صوبیدار عالم زیب کو بھی بلایا ہے۔ بارہ پنجاب ایک اور پلاٹون کو بھی امداد کے لیے بلا رہے ہیں۔ آپ بھاری سامان وہیں رہنے دیں اور اپنی پلاٹون کے ہمراہ تیار ہو کر آ جائیں۔ حوالدار مہر خان ۱۰۶ آر۔ آر کو بھی ساتھ لائیں۔

صوبیدار عالم زیب آئے۔ ان کے ساتھ حملہ کے متعلق مشورہ کیا اور کہا کہ میں پلاٹون نمبر تین کو لے کر اوپر والی طرف سے ہو کر آؤں گا اور اپنی پلاٹون اور بارہ پنجاب کی ایک اور پلاٹون کو جو آپ کی امداد کے لیے آ رہی ہے' ساتھ لے کر دشمن کے ایریا چاند ماری بٹ کی طرف سے حملہ آور ہوں۔ ہم انشاء اللہ ان پر اچانک حملہ کریں گے اور ان کو بہت زیادہ نقصان پہنچائیں گے۔

ساڑھے چھ بجے کے قریب شہزاد شاہ کے پاس گئے جو آر آر ۱۰۶ لے کر برکی سے دو تین سو گز آگے (جانب مشرق) ایک اہم مورچہ سنبھالے ہوئے تھا۔ شہزاد شاہ کے کام پر بڑے خوش ہوئے اسے شاباش دی۔ شہزاد شاہ سے کہا کہ برکہ کلاں کے اس بالا خانے میں دشمن کا او پی ہے۔ اس کے نیچے ایک ٹینک بھی کھڑا ہے اس پر فائر کروایا۔ گولہ ٹھیک نشانے پر لگا۔ بہت خوش ہوئے۔ دوسرا فائر کروایا تو سپاہی وزیر سے کہنے لگے: اس کو دو ڈگری اور درست کرو تا کہ ٹینک ہٹ ہو سکے۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ہی ٹینک تباہ ہو گیا۔

شہزاد شاہ سے کہا آپ واپس بی آر بی نہر پر چلے جائیں۔ آپ کی جگہ حوالدار مہر خاں ۱۰۶ آر آر لے گا۔ نائیک منظور حسین ڈرائیور کو شاباش دی اور کہا: آج آپ واپس نہر پر چلے جائیں گے۔

وہاں سے واپس اپنی جگہ پر آئے۔ تاریکی چھا چکی تھی۔ طلوع قمر کے آثار نمایاں تھے۔ کیپٹن انور کی بجائے نائب صوبیدار شیر دل او پی پوسٹ پر آ چکے تھے۔ مگر تھوڑی دیر بعد دشمن نے زبردست گولہ باری شروع کر دی۔ بمباری اتنی شدید تھی کہ کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ شیلنگ میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ دشمن اپنے ٹینک' توپ خانہ اور مشین گنیں حرکت میں لے آیا تھا۔ خان عالم' الیاس' محمد علی اور محمد اقبال کو کہا کہ نیچے اتر کر مورچے میں چلے جائیں۔ یہ مورچہ نچلی منزل کی مشرقی دیوار کے ساتھ کوٹھڑی کے اس دروازہ پر کھودا گیا جہاں چائے تیار ہوتی تھی۔ نائب صوبیدار شیر دل اور اکرم ساتھ ہی رہے۔ اگرچہ چاند اوپر آ چکا تھا لیکن دھوئیں کی وجہ

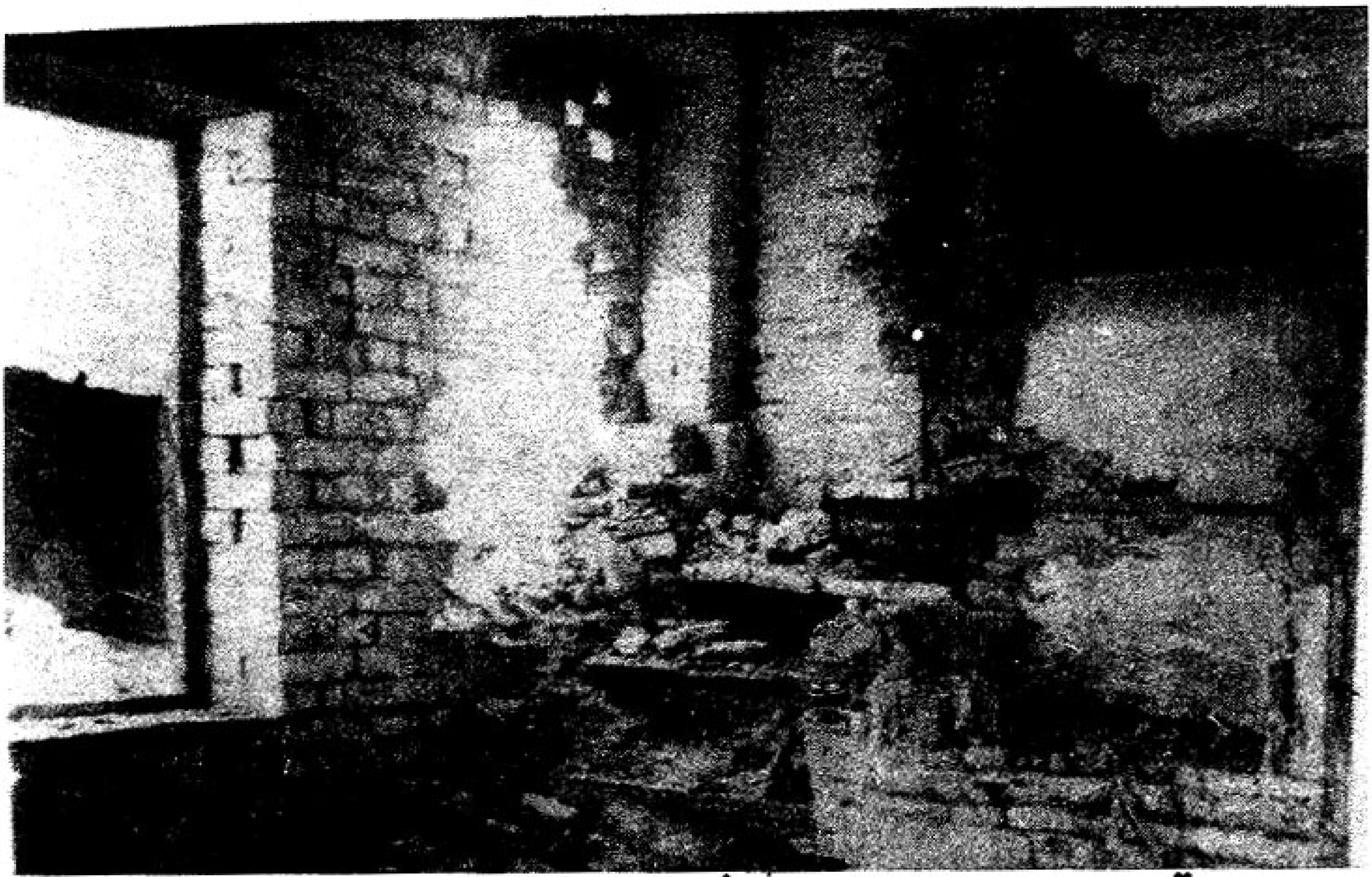

سے فضا مکدر تھی۔ سامنے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ دشمن کا جائزہ لینا مشکل ہو گیا۔ اکرم اور نائب صوبیدار شیر دل کو بھی نیچے مورچہ میں بھیج دیا' خود اکیلے بالا خانہ میں رہے۔ شدید گولہ باری کے باعث کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اکرم نے سیڑھیوں پر آکر زور سے آواز دیتے ہوئے کہا: "صاحب !حملہ ہو گیا ہے۔ آپ نیچے آ جائیں"۔ کہنے لگے: میں بھی اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں اور ابھی نیچے آتا ہوں۔ آپ فکر مت کریں"۔ یہ کہہ کر برآمدے سے کھلی چھت پر چلے گئے۔ اتنے میں ان سے چار پانچ گز کے فاصلے پر جانب جنوب اور سیڑھیوں سے قدرے شمال کی طرف گولہ آکر پھٹا مگر وہ بال بال بچ گئے۔ میجر بھٹی نیچے آئے اور ساتھیوں سے کہا: حملہ ہو رہا ہے۔ مگر شیر و ڈٹو رہو' گھبراؤ مت ۔ہم انشاءاللہ ان کو مار بھگائیں گے۔ دس منٹ بعد پھر دس منٹ بعد پھر چوبارہ پر چلے گئے۔ اوپر گئے تو صوبیدار عالم زیب نے پیغام دیا۔ صاحب! دشمن نے حملہ کر دیا ہے۔ اگر آپ حکم دیں تو میں مشین گن لے کر آپ کے پاس پہنچ جاؤں۔ کہنے لگے یہاں مت آئیں۔ توپ لے کر آہستہ آہستہ فائر کرتے بی آر بی کے کنارے شکستہ پل کے قریب پہنچ جائیں اور پلاٹون کا فائر جاری رکھیں ۔جوانوں سے کہہ دیں کہ وہ مورچے چھوڑ دیں اور فائر کرتے ہوئے بچتے بچاتے ایک منظّم سکیم سے نہر کے کنارے پہنچ جائیں وہاں دوسرے جوان بھی آپ کی امداد کے لیے موجود ہوں گے۔

محاصرہ

حالات قابو باہر ہو گئے تھے۔ پیدل فوج کے ایک بریگیڈ جس میں (بھارت کی) ۱۶۔پنجاب رجمنٹ اور ۴سکھ رجمنٹ بھی شامل تھیں اور کرنل جوشی کی کمان میں ایک ٹینک بٹالین اور بھاری توپ خانہ کے ساتھ حملہ کیا گیا تھا۔کرنل جوشی کو رن کچھ کی لڑائی میں فوجی اعزاز ملا تھا۔رات کے دس بج چکے تھے۔میجر بھٹی دوبارہ اوپر گئے۔فائر ختم چکا تھا۔باقی سب کو بھی اوپر بلایا۔بالا خانے میں آگے کھلی چھت پر کھڑے تھے کہ دشمن نے برکی تھانہ کے قریب روشنی کا گولہ پھینکا جس سے وہ گردونواح کے حالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

دن کو دشمن کا جو ٹرک پکڑا تھا۔گولہ باری سے اس کو آگ لگ گئی۔وہ کافی دیر جلتا رہا اور اس کی روشنی میں دشمن کی نقل وحرکت کا پتہ چلتا تھا۔اس کے ساتھ ہی جے ہند کے نعروں کی آواز بھی آتی تھی۔دشمن کے ٹینک اور پیدل فوج تھانہ برکی کے پاس پہنچ گئے تھے۔میجر بھٹی نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لیں اور دشمن کے سپاہیوں کے ساتھ مل کر ہی اپنی کمپنی میں جا شامل ہوں۔ٹرانزسٹر اور تھرموس اٹھانے لگے تو کہا: انہیں چھوڑ دیں۔صرف وائرلیس سیٹ لے لیں۔اس وقت آپ کے پاس صرف ہتھیار ہی ہونے چاہئیں۔خود نائب صوبیدار شیر دل کے ہمراہ بالا خانہ پر ہی رہے۔

دشمن کی فوج برکی تھانہ اور سکول کے علاوہ برکی سے شمال کھجور ایریا میں بھی پھیل چکی تھی۔ اب آمنے سامنے کی چوٹ تھی۔میجر بھٹی نے دو میڈیم بیٹری اور دو فیلڈ بیٹری سے فائر کرا دیا۔ان گولوں کے صحیح صحیح نشانے پر پڑنے سے قیامت کا سماں بپا ہو گیا۔دشمن کا بے شمار جانی نقصان ہوا اور بہت سے ٹینک بھی تباہ ہوئے۔ٹینک کمانڈر کرنل جوشی بھی اسی گولہ باری میں مارے گئے۔(فائر بندی کے بعد میجر ہیرا سنگھ نے اس حملہ میں کرنل جوشی کی موت کی توثیق کی تھی)۔

تھوڑی دیر بعد نائب صوبیدار شیر دل نے کہا: اب تو ہم محاصرہ میں آ گئے ہیں۔بہتر یہ ہو گا یہاں سے نکل جائیں اور بی آر بی کے کنارے اپنی پوزیشن لیں۔چنانچہ بالا خانہ سے اتر کر

بیرونی دروازہ پر پہنچے تو سامنے دشمن کا ایک سیکشن پوزیشن لیے کھڑا تھا۔ ان کے کمانڈر سکھ حوالدار نے میجر بھٹی اور شیر دل دونوں کو دیکھتے ہی کہا: ’’ہینڈز اپ‘‘ اور اپنی اسٹین گن کی نالی شیر دل کے بائیں کولہے کے ساتھ رکھ دی۔ میجر بھٹی شیر دل کے پیچھے تھے۔ شیر دل کے پاس اسٹین گن تھی۔ بائیں ہاتھ سے اس نے سکھ حوالدار کی اسٹین گن کی نالی پکڑ لی اور اسے ایک طرف کھینچنا چاہا۔ میجر بھٹی نے پیچھے سے شیر دل کے دائیں کندھے کو چھوتے ہوئے اسے اشارہ کیا۔ چند سیکنڈ میں میجر بھٹی کے پستول اور شیر دل کی اسٹین گن کی گولیوں سے دشمن کی چار لاشیں زمین پر تڑپ رہی تھیں اور باقی فوجی بھاگ گئے۔ سیکشن کمانڈر مر چکا تھا اور اس کی اسٹین گن نالی شیر دل کے ہاتھ میں تھی۔ اسکے ہاتھ میں جلن سی محسوس ہوئی۔ اسنے اسٹین گن میجر بھٹی کے حوالے کر کے دیکھا تو ہاتھ زخمی تو ہاتھ زخمی ہو چکا تھا۔ جب سیکشن کمانڈر گولی کا نشانہ بنا تو اس کا ہاتھ ٹریگر پر تھا۔ اور گرتے ہوئے غیر ارادی طور پر ٹریگر دب گیا۔

دشمن کا جو سیکشن دروازہ پر پوزیشن لیے کھڑا تھا اس کے لیے ان دونوں کو نشانہ بنانا شاید اتنا مشکل نہ تھا لیکن تعجب ہے کہ انہوں نے انہیں زندہ پکڑنے کی کوشش کیوں کی؟

فائر بندی کے بعد نائب صوبیدار شیر دل (جواب صوبیدار ہو چکے تھے) رکھ نواں پنڈ گوجراں کے مقام پر صوبیدار کرتار سنگھ اور لانس نائیک دولہا سنگھ کو ملے تو اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے دولہا سنگھ نے بتایا کہ وہ بھی اس سیکشن میں شامل تھا۔ ’’ہمارے کرنل نے اس مقصد کے لیے خصوصی انتخاب کے بعد اس سیکشن کو او پی پوسٹ پر بھیجا تھا اور کمانڈر کی یہ خاص ہدایت تھی کہ اس او پی پوسٹ کے انچارج کو زندہ قید کر کے لایا جائے۔ ورنہ ہم آپ کو جان سے مار سکتے تھے۔ آپ نے ہمارے چار آدمی مار دیئے‘ میں نے بھی بھاگ کر جان بچائی۔‘‘ (دولہا سنگھ کا تعلق ۴ سکھ پنجاب رجمنٹ سے ہے)۔

میجر بھٹی اور شیر دل وہاں سے روانہ ہوئے تو راستے میں ایک باریش فوجی جوان ملا۔ ان پر فائر کرنے لگے تو اس نے پہچان کر کہا۔ مجھے مت ماریں۔ میں مسلمان ہوں اور ۱۲ پنجاب کا پٹھان ہوں اور آپ کے پاس ہی جا رہا تھا کہ آپ کو اطلاع دوں کہ ہمارے کمانڈر صوبیدار عالم زیب شہید ہو گئے ہیں۔ میجر بھٹی نے اسے ہدایت کی کہ وہ جلدی سے نہر کی جانب اپنے ساتھیوں سے جا ملے اور خود وہاں سے کھجور اریا کا رخ بدل لیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید صوبیدار عالم زخمی ہو‘ اسے

اٹھا کر اپنے ساتھ لے چلیں گے۔ جب کھجور ایریا میں اس کے مورچہ میں پہنچے تو وہاں ان کا کوئی نام ونشان نہ ملا' صرف کچھ سامان ادھر ادھر پڑا ہوا تھا۔

صوبیدار عالم زیب شہید پاکستان کے ان نامور فرزندوں میں سے ہیں جنہوں نے پہلے کھیل کے میدان میں اپنے وطن کی شہرت کو چار چاند لگائے اور پھر جنگ کے میدان میں اپنے وطن کی آن پر جان قربان کردی۔ ان کے والد نے صوبیدار عالم زیب کے کمانڈنٹ کو ایک خط میں لکھا ہے کہ مجھے ایک شہید کا باپ ہونے پر فخر ہے۔

وطن پاک کا یہ مایہ ناز محافظ سب سے ہلسنکی کے اولمپک مقابلوں میں ۵۳ء میں منظر عالم پر نمودار ہوا تھا۔ صوبیدار عالم زیب ۸۸۰ میٹر کی دوڑ میں پاکستان کے بہترین کھلاڑی تے۔ انہوں نے ۵۴ء میں سیلون کے قومی کھیلوں کے علاوہ منیلا میں ایشیائی مقابلوں میں حصہ لیا۔ ۵۵ء میں انہوں نے بین الاقوامی فوجی کھیلوں میں شرکت کی۔ اسی سال وہ بھارتی کھلاڑیوں سے مقابلہ کے لیے دہلی بھی گئے تھے۔

صوبیدار عالم زیب شہید کو ان کی بے مثال شجاعت و بہادری پر صدر پاکستان کی طرف سے ستارہ جرأت کا اعزاز دیا گیا ہے۔

صوبیدار عالم زیب شہید

کھجور ایریا سے پھر نہر کا رخ کیا۔ جا بجا دشمن کے سپاہی تھے۔ اس پر مستزاد راستہ بھی بڑا خطرناک تھا۔ جگہ جگہ خود ہی بارودی سرنگیں بچھائی ہوئی تھیں۔ بڑی احتیاط کے ساتھ اور کئی جگہ پانی کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ راستے میں ایک دفعہ دشمن کے سپاہیوں کے پاس سے بلا جھجک آگے بڑھ گئے۔ کچھ فاصلہ پر انہیں اپنے وہ ساتھی بھی مل گئے جن کو انہوں نے برکی کے بالا خانے سے بھیجا تھا۔ ان سب کو آتا دیکھ کر پلاٹون نمبر ۲ نے فائر کھول دیا۔ میجر بھٹی نے

برکا کا کھجور ایریا

اکرم سے کہا کہ وائرلیس پر انہیں پیغام دو کہ فائر نہ کریں۔ ہم خود آ رہے ہیں۔ وہیں سے پلٹ کر دیکھا تو تھانہ کے پاس دشمن کی نقل و حرکت اور اس کا جوش و خروش عروج پر تھا۔ وہیں سے وائرلیس پر توپ خانہ کو ڈائریکشن دے کر فائر کروائے جس سے دشمن کے بہت سے سپاہی مارے گئے اور حملہ رک گیا۔ میجر بھٹی پل کی جانب روانہ ہونے لگے تو دشمن کے ٹینک چونگی کے پاس پیش قدمی کرتے ہوئے دیکھے ان کو ہٹ کرایا۔ کچھ تو بے کار ہو گئے اور باقی آڑ کے لیے پیچھے بھاگے اور آگے نہ بڑھے۔

اپنے ساتھیوں سمیت میجر بھٹی وہاں سے نہر کی طرف آئے۔ جب پل سے پچیس تیس گز کے فاصلے پر تھے تو حوالدار اولیاء خاں کو جلدی جلدی چلتے دیکھا۔ اسے پکارا اولیاء خاں کہاں جا رہے ہو؟ اولیاء خاں نے جواب دیا: صاحب! پلاٹون کمانڈر نذیر کے پاس ایمونیشن لینے جا رہا ہوں۔ دشمن نزدیک آ گیا ہے میرے پاس ایک گرینیڈ رہ گیا تھا وہ بھی دشمن پر پھینک کر آیا ہوں۔

حوالدار نذیر ایمونیشن لیے وہاں پہنچ گیا اور کہا ہمارے پاس بھی اب صرف یہی رہ گیا ہے۔ اتنے میں دشمن سو گز پر پہنچ گیا۔ میجر بھٹی نے حکم دیا کہ اپنی اپنی پوزیشن میں چلے جاؤ۔ حوالدار نذیر نے کہا صاحب! مورچے تو گولہ باری سے ختم ہو گئے ہیں' یہیں پوزیشن لے لیتے ہیں۔ حوالدار نذیر' حوالدار اولیاء خان اور ان کے ساتھی چھ جوانوں اور میجر بھٹی کے او پی پوسٹ کے ساتھیوں نے پوزیشن سنبھال لی اور فائر کھول دیا۔ میجر بھٹی نے نئے وائرلیس سیٹ سے جو انہوں نے بی آر بی پر پہنچ کر حوالدار نذیر سے لیا تھا' توپ خانہ کو پیغام پاس کیا۔ توپ خانہ نے اپنی روایتی مستعدی کے ساتھ اس کی تعمیل کی۔ پندرہ منٹ کی گولہ باری کے بعد وہاں سے دشمن کا صفایا ہو چکا تھا اور کشتوں کے پشتے لگ چکے تھے۔

اس کامیابی پر خوش ہو کر جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''خدا آپ کا حامی و ناصر ہے' یہ اسلام اور کفر کا معرکہ ہے۔ آخری گولی اور آخری آدمی تک مقابلہ کرتے رہوں۔ نتیجہ اللہ تعالٰی کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری دونوں طرف سے جیت ہے' ہم زندہ رہے تو غازی اور راہ وفا میں جان دے دی تو شہید۔ انشاء اللہ فتح حق کی ہو گی۔ اور دشمن کی راہ میں آگ کی دیوار کھڑی کر دی

جائے گی۔ آپ تک اس کا پہنچنا بہت مشکل ہے۔ آپ دشمن پر کڑی نظر رکھیں ۔ جہاں دشمن سر اٹھائے آپ فوراً گولی سے اس کا سر اڑا دیں''۔ میجر عزیز خود اس سٹین گن سے فائر کر رہے تھے جو دشمن سے چھینی تھی۔ اتنے میں ان کے اردلی محمد اقبال سپاہی نے سٹین گن سے ۱۸۔ گولیوں کا راؤنڈ نکالا تو سر سے ٹوپ اتار کر اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔ دیکھو شیر! ہمارے پاس اتنا ایمونیشن نہیں کفایت شعاری سے کام لو اور ایک ایک گولی نکالو۔

پھر حوالدار نذیر سے پوچھا کہ شہزاد شاہ کہاں ہے؟ اس نے بتایا کہ نہر کے کنارے کے ساتھ ۱۰۶۔ آر۔ آر لگائے بیٹھا ہے مگر اس کے پاس ایمونیشن نہیں ہے اور پیچھے سے کمک بھی نہیں پہنچ رہی ہے۔ میجر بھٹی نے جواب دیا ''ہمیں یہاں امداد کیسے پہنچے۔ ہمیں کافی دیر سے نہر کے پار پہنچنے کا حکم آیا ہوا ہے۔ وہاں انہوں نے کافی سامان بھیج دیا ہوگا۔ تو میں نے حالات کے مطابق بہتر سمجھا ہے کہ ہم دوسرے کنارے پہنچنے کی عجلت نہ کریں۔ بلکہ ساتھ ساتھ دشمن کی سرکوبی بھی کرتے جائیں۔ میں یہ تصور نہیں کر سکتا کہ دشمن ہم پر حملہ آور ہو اور ہم نہر کے دوسرے کنارے پہنچنے کے لیے بیتاب ہوں۔ یقیناً ہماری گنتی اور ایمونیشن کی قلت دشمن کے ٹڈی دل لشکر ور کے بے پناہ سامان حرب کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی' مگر ہماری تاریخ گواہ ہے کہ مومن فقط تعداد اور ساز و سامان پر بھروسہ نہیں رکھتا۔ مومن کا بھروسہ اللہ پر ہے' ہم حق پر ہیں۔ آپ نے دیکھا لیا ہے کہ تائید ایزدی سے ہمیں ہر مقابلہ میں فتح و نصرت حاصل ہوئی۔ سامان جنگ کی بہتات اور کثرت تعداد کے باوجود ہمارا دشمن ہمیں مغلوب نہیں کر سکا۔ آپ نے جس شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کیا ہے اس سے اسلامی تاریخ کی شاندار روایات پھر زندہ ہو گئی ہیں۔ ہم دشمن کو حملے کا پورا مزہ چکھا چکے ہیں' اب ہمارے پاس ایمونیشن قریب قریب ختم ہو رہا ہے۔ ہم نہر کے دوسرے کنارے اپنی جدوجہد کو جاری رکھیں گے۔ اور دشمن کو ہرگز آگے نہیں بڑھنے دیں گے''۔

حوالدار نذیر سے کہا کہ شہزاد کو کہے کہ وہ اوپر پدھری پل کے راستے پار ہو کر نہر کے دائیں کنارے برکی کے سامنے پوزیشن لے لے۔ وہاں سامان پہنچ چکا ہوگا۔ ان سے بارود حاصل کر لے اور ساتھ ہی جتنے جوان جیپ میں آ سکتے ہوں انہیں ہمراہ لے جائے۔ شہزاد شاہ نے ڈرائیور

منظور حسین سے پوچھا کہ جیپ میں زیادہ سے زیادہ کتنے آدمی آسکتے ہیں۔انہوں نے کہا کہ موجودہ مجبوری کے پیش نظر میں پندرہ آدمی تک بھی لے جا سکتا ہوں۔شہزاد شاہ نے میجر بھٹی سے کہا :صاحب! دس جوان ہمارے ساتھ اور بھیج دیں جب جوانوں کو حکم دیا تو کوئی بھی جیپ کا رخ نہیں کرتا تھا۔سب یہی کہتے تھے کہ صاحب! ہم آپ کے ساتھ یہیں رہیں گے۔میجر بھٹی نے انہیں سمجھایا کہ ہم سب پار جا رہے ہیں اس لیے میں جن دس جوانوں کے نام پکاروں وہ بلا توقف جیپ پر چلے جائیں۔

پھر حوالدار مہر خاں ۱۰۶ آر۔آر کے متعلق پوچھا تو نذیر نے بتایا کہ اس نے ایمونیشن لیا ہوا ہے اور وہ ابھی کچھ دیر کام دے جائے گا۔کہنے لگے اچھا تو اسے کہو کہ جب ایمونیشن ختم ہو جائے تو وہ بھی جیپ لے کر پدھری پل کے راستے نہر کے دوسرے کنارے پہنچ جائے۔یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دشمن نے پھر حملہ کر دیا۔کہنے لگے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن نے یہاں فوج کی بہت بڑی طاقت جھونک دی ہے۔ہمیں جلد سے جلد دوسرے کنارے پہنچ کر دشمن کی کماحقہ مدافعت کرنا چاہیے۔مگر دشمن دونوں طرف سے آگے بڑھ چکا تھا۔تھوڑی دیر پھر توپ خانہ سے فائر کرائے۔جن جوانوں کے پاس ایمونیشن تھا وہ برابر فائر کر رہے تھے۔میجر بھٹی خود بھی سٹین گن سے فائر کرتے رہے۔اس صورت حال نے دشمن کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

میجر بھٹی نے حوالدار اولیاء خاں‘ حوالدار محمد عارف اور سپاہی غلام سرور کو کہا کہ کشتی پر جوانوں کو باری باری پار لے جائیں۔خود حوالدار محمد نذیر‘ محمد اکرم اور نائب صوبیدار محمد سلیمان‘ نائب صوبیدار شیر دل اور نائیک ذوالقرنین شاہ کے ہمراہ تمام مورچوں‘ سرکنڈوں اور جھاڑیوں کو دیکھا کہ کوئی زخمی جوان پیچھے نہ رہ جائے۔مشتاق احمد (گجرات) اور فتح محمد (راولپنڈی) دو زخمی ملے۔ان کو اٹھا کر نہر پر لائے۔نائب صوبیدار شیر دل اور نائیک ذوالقرنین نے اپنی فولادی ٹوپیوں سے زخمیوں کو پانی پلایا۔

اتنے میں سامنے سے دشمن کے دس ٹینک نظر آئے۔حوالدار مہر خاں نے ان پر گولے برسانے شروع کر دیے۔ان میں سے کچھ تباہ ہوئے باقی وہیں رکنے اور محفوظ جگہ کی آڑ لینے پر مجبور

ہو گئے۔ اس لمحہ ستم ظریفی یہ ہوئی کہ مہر خاں کے پاس ایمونیشن بالکل ختم ہو گیا۔ مہر خاں کہنے لگا کہ اب توپ واپس بھی نہیں جا سکتی۔ اس لیے کہ پدھری پل کے راستہ میجس شمال کی جانب دشمن نہر کے کنارے پہنچ چکا ہے۔ میجر بھٹی نے کہا اس کو کسی طرح ضائع کر دیا جائے تاکہ یہ دشمن کے کام نہ آسکے۔ تمہارے پاس کوئی گرینیڈ ہے تو اس پر مارو اسے ناکارہ کر دو اور جلدی جلدی دوسروں کے ساتھ کشتی میں پار نکل جاؤ۔ مہر خاں نے توپ اور جیپ کو اپنے ہاتھوں سے تباہ کیا اور آ کر کشتی پر سوار ہو گیا۔ جب دوسرے جوان کشتی پر پار جا رہے تھے تو میجر عزیز بھٹی ہاتھ میں سٹین گن لیے زخمیوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ کشتی واپس آئی تو زخمیوں کو کشتی میں سوار کیا اور خود ان کا اسلحہ لے کر کشتی میں رکھا۔ اب کمپنی کے آخری آدمی نے کشتی میں قدم رکھا اور وہ خود کمپنی کمانڈر میجر راجہ عزیز بھٹی تھے۔

کشتی میں ایک گولہ پڑنے کی وجہ سے پہلے ہی ایک سوراخ تھا اور ایک جوان کو کشتی میں سے ساتھ ساتھ پانی بھی نکالنا پڑتا تھا۔ دو جوان کشتی چلا رہے تھے۔ میجر عزیز بھٹی نے برکی کی جانب رخ کر کے پوزیشن لے لی تاکہ دشمن کشتی پر حملہ نہ کر دے۔ کنارے پہنچ کر کشتی کے رسے کاٹ دیے اور اسے ڈبو دیا تاکہ دشمن کے کام نہ آسکے۔ زخمیوں کو ایمبولینس پر کمبائنڈ ملٹری ہسپتال لاہور بھیج دیا۔

نہر سے پار آنے کے بعد ہر چیز کو اپنی اپنی جگہ آراستہ کیا۔ جوانوں کو نہر کے کنارے کے نیچے اپنی اپنی پوزیشن سنبھالنے کا حکم دیا۔ خود نہر کی پٹڑی پر چڑھ کر دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے لگے۔

رجمنٹ اڈجوٹنٹ انور منیر الدین آئے۔ انہیں دشمن کے زبردست حملے' اس کی سرکوبی اور اپنے اسلحہ ختم ہو جانے کے بعد کامیابی کے ساتھ نہر کے اس کنارے پہنچنے کی داستان سنائی۔ انور منیر الدین سے کہا میری یہ انگوٹھی لے لیں۔ میری شہادت کی صورت میں یہ انگوٹھی میرے گھر پہنچا دینا۔ انور نے انگوٹھی لے کر پہن لی۔ میجر عزیز کی یہ طلائی انگشتری ہانگ کانگ کے زمانے سے ان کے ہاتھ میں تھی۔

پھر انور سے کہا: آپ نوجوان افسر ہیں' آپ اپنی رجمنٹ کی ہسٹری لکھیں' بھٹی شاید

آپ میں نہیں ہوگا۔ لیکن میری یہ بات یاد رکھیں کہ اس جنگ میں توپ خانہ کے تاریخی کردار کو نہ بھول جانا۔ پاس کھڑے نائب صوبیدار شیر دل نے کہا: صاحب! ہمارا یہ کون سا احسان ہے۔ یہ تو ہمارا فرض ہے جسے ہم ادا کر رہے ہیں۔ فرمانے لگے۔ بھئی! اپنے فرض کو خوش اسلوبی سے ادا کرنے والے ہی تاریخ کے صفحوں میں جگہ پاتے ہیں۔

اتنے میں نہر کی دوسری جانب سے ایک زخمی کی آواز میجر بھٹی کے کانوں میں پڑی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"۱۷۔ پنجاب کا کوئی ہے تو پانی پلا دے"

میجر بھٹی نے اپنی کمپنی کے جوان کی آواز پہچان لی اور سن کر تڑپ اٹھے، اسے پکار کر کہا۔

"مسکین علی! میرے بچے فکر نہ کرو میں پہنچا"۔

میجر بھٹی کو مسکین علی سپاہی (ضلع راولپنڈی) کے ادھر رہ جانے کا شدید قلق تھا۔ کشتی ڈبوئی جا چکی تھی۔ رات کا تھوڑا سا حصہ باقی تھا۔ انہوں نے ساتھیوں سے کہا صبح ہوتے ہی پہلا کام زخمی مسکین علی کو نہر کے اس کنارے لانا ہے۔

آواز دے کر کہنے لگے: میرے بچے! گھبرانا نہیں۔ ہم انشاءاللہ صبح تمہیں اس طرف لے آئیں گے!" یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں غمناک ہوگئیں۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے؟

۱۱ر ستمبر

۱۱ر ستمبر کا سورج طلوع ہونے والا تھا۔ میجر بھٹی نے جوانوں کو بلایا اور پوچھا آپ میں سب سے اچھا پیراک کون ہے۔ دو جوان جائیں اور اپنے ساتھی مسکین علی کو پار سے لائیں۔ بہادر علی اور غلام سرور نے اس خدمت کے لیے خود کو پیش کیا۔ انہوں نے کپڑے اتارے اور پار جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ دشمن کی پوزیشن بالکل سامنے تھی ۔بھٹی کہنے لگے ابھی ذرا ٹھہر جائیں پوزیشن ہٹ جائے تو پھر جائیں۔ وہ کپڑے اتارے کافی دیر انتظار کرتے رہے مگر کوئی بات بنتی نظر نہ آئی۔ دشمن کی طاقت بڑھ رہی تھی۔ میجر بھٹی نے کہا: اب آپ کپڑے پہن لیں اور ہتھیار سنبھال لیں۔ ابھی پار جانا خطرناک ہے۔ ہم انشاء اللہ مسکین کو ضرور لائیں گے' ورنہ مجھے اس کا عمر بھر قلق رہے گا۔

پھر میجر عزیز بھٹی نے وائرلیس سے توپ خانہ کو پیغام دے کر دشمن کو مسکین علی کے بالمقابل پوزیشن پر فائر کرایا۔ دشمن کی توپ بے کار ہوگئی۔ مگر اس نے ہر طرف پوزیشن لی ہوئی تھی۔ دوسری پوزیشنوں پر بھی فائر کرائے۔ دشمن کے کافی جانی نقصان کے علاوہ بہت سا اسلحہ اور ٹینک بھی بیکار ہوئے۔

تھوڑی دیر بعد مسکین علی کا پھر ذکر کیا۔ اسی دوران میں دیکھا کہ دشمن کی تازہ دم فوج اگلے مورچے سنبھالنے کے لیے آرہی ہے۔ ان پر ایئر برسٹ مارا۔ دشمن کی طرف سے بھی برابر گولہ باری ہورہی تھی۔ بایں ہمہ میجر بھٹی نہر کے اوپر کھڑے پوری مستعدی سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ دشمن کی گولہ باری' سے جوان نذر محمد (جہلم) شہید ہوگیا۔ میجر عزیز اس کے قریب گئے اور رومال چہرے پر پھیلا دیا۔ اس وقت صوبیدار غلام محمد' میجر عزیز بھٹی کے پاس آئے اور کہنے لگے'' صاحب! پٹڑی کے

اوپر آپ بالکل دشمن کی زد میں ہیں۔ دشمن سامنے ہے آپ پٹڑی سے نیچے ہو جائیں۔ میجر بھٹی کہنے لگے ''یہ درست ہے کہ پٹڑی کے اوپر خطرہ زیادہ ہے لیکن میں مجبور ہوں اس لیے کہ یہاں اس سے زیادہ اونچی جگہ نہیں ہے جہاں سے دشمن کا مشاہدہ کرسکوں۔ مجبوراً پٹڑی کے اوپر چلنا پڑتا ہے۔ صوبیدار صاحب اس وقت وطن عزیز کا تحفظ ہر قابل لحاظ امر سے مقدم ہے۔ اگر جان عزیز اس راہ میں کام آئے تو اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہوسکتی ہے؟''

صوبیدار غلام محمد نے چائے منگوائی۔ میجر بھٹی نے کھڑے کھڑے چائے پی۔ دوربین سے سامنے دشمن کا جائزہ بھی لے رہے تھے اور صوبیدار غلام محمد سے باتیں بھی کررہے تھے۔ کہنے لگے مجھے اپنے بیٹے ذوالفقار کی بات کئی دفعہ یاد آئی ہے۔ جب ایمرجنسی کے تحت مجھے چھٹی سے واپس بلایا گیا تو جنگ کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ ذوالفقار کہنے لگا ''ابا جان! خوب بہادری سے لڑنا اور بزدلی نہ دکھانا''۔

صوبیدار غلام محمد سے باتیں کررہے تھے کہ کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل ابراہیم قریشی کا پیغام آیا کہ ایک ضروری کانفرنس کے لیے فوراً فیلڈ ہیڈ کوارٹر پہنچ جائیں۔ نائب صوبیدار شیر دل کو بلا کر کہا۔ صاحب! اب آپ کو میرے بعد سارا کام خود ہی کرنا ہوگا۔ میرے واپس آنے تک دشمن پر کڑی نظر رکھیں اور ضرورت کے مطابق فائر کرواتے رہیں۔ میں ذرا فیلڈ ہیڈ کوارٹر جا رہا ہوں۔

آج قائداعظمؒ کی سترھویں برسی منائی جارہی تھی:۔
ریڈیو پر قائداعظم علیہ الرحمتہ کی تقریروں سے اقتباسات پڑھ کر سنائے جارہے تھے۔ وہ فرمارہے تھے:۔
''.........خدائے عظیم و برتر کی قسم! جب تک ہمارے دشمن ہمیں اٹھا کر بحیرہ عرب میں نہ پھینک دیں ہم ہار نہ مانیں گے۔ پاکستان کی حفاظت کے لیے میں تنہا لڑوں گا' اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے ہاتھوں میں سکت اور میرے جسم میں خون کا ایک بھی قطرہ موجود ہے۔ حفاظت کے لیے جنگ لڑنی پڑے تو کسی صورت میں ہتھیار نہ ڈالیں اور پہاڑوں' جنگلوں' میدانوں اور دریاؤں میں جنگ جاری رکھیں۔''

پاکستان ہمیشہ سلامت رہے گا

''آج جبکہ ہم قائداعظم مرحوم کا سترھواں یوم وفات منا رہے ہیں' میرے دل میں اسی زمانہ کی یاد تازہ ہوگئی ہے جب قوم ان کی کامیاب قیادت اور رہبری میں ایک آزاد اور خود مختار مملکت کے حصول پر منزل مقصود پر پہنچی۔ قائداعظمؒ دس کروڑ مسلمانوں کی امیدوں اور امنگوں کا مرکز تھے۔ اس برصغیر کے دس کروڑ فرزندان کو اپنے قائد کی ذات پر پورا اعتماد اور بھروسہ تھا اور قائد اعظمؒ کا دس کروڑ مسلمانوں پر اعتماد تھا۔ قائداعظمؒ اور مسلم قوم دونوں ایک دوسرے پر ایسا دلی اعتماد رکھنے میں حق بجانب تھے اور یہی قائداعظمؒ کی اس حیرت انگیز طاقت اور قوت کا راز تھا جس کی مدد سے انہوں نے زبردست مخالفتوں کے تمام طوفانوں کو شکست دے کر اس برصغیر کی روندی ہوئی مسلم قوم کے لیے آزادی کی جنگ جیتی۔ دنیا کی تاریخ میں کسی ملک کے باشندوں کے مزاج اور رجحانات اور اس ملک کے معمار کی زندگی اور خیالات میں اتنا قرب کہیں نظر نہ آئے گا جو قرب دنیا نے پاکستان مانگنے والے مسلم عوام اور بانی پاکستان قائداعظمؒ کے مابین دیکھا۔ اگرچہ قائداعظمؒ کو جسمانی طور پر ہم سے جدا ہوئے سترہ سال گزر گئے ہیں لیکن وہ ابھی پاکستان کی روح رواں ہیں اور خواہ ہم پر خوشی کے لمحے گزر رہے ہوں یا رنج اور پریشانی کی گھڑیاں' قائداعظمؒ کے اقوال و افعال ہمارے لیے ہمیشہ ولولے اور جوش کا موجب بنے رہے ہیں۔ مسلمان مخالفتوں کے بڑے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کر چکے ہیں جو ان کا جداگانہ آزاد وطن قائم کرنے کے مطالبہ کے خلاف بپا کیے گئے۔

آزادرائے شماری کشمیریوں کا بنیادی حق ہے۔ یاد رہے کہ نوآبادیاتی نظام ان سامراجی طاقتوں کو بھی راس نہ آسکا جس کے اقتدار کا زمانہ کافی طویل ثابت ہوا اور اس سامراجی کھیل کے نئے کھلاڑیوں کو بھی یہ نظام فائدہ مند ثابت نہ ہوگا۔ ماضی قریب کی تاریخ رائے عامہ کو دبا دینے کی

بھونڈی کوشوں کی مثالوں سے بھرپور ہے۔ آج جو لوگ بھی اپنی طاقت رائے عامہ کو دبانے پر ضائع کر رہے ہیں انہیں تقدیر کا نوشتہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔ اہل پاکستان اور اہل کشمیر کے مابین وہ رشتہ استوار ہے جسے نہ سونا چاندی خرید سکتا ہے اور نہ گولیاں ہی توڑ سکتی ہے۔ ہم اپنی منزل مقصود کی طرف برابر بڑھتے رہیں گے۔ خواہ ہمارے راستے میں کتنی ہی دشواریاں اور حالات کتنے ہی ناسازگار کیوں نہ ہوں ہم اپنے حقوق حاصل کر کے رہیں گے۔

ہم پر جبراً جنگ ٹھونسی گئی ہے۔ ہم پر فضائی حملے کیے گئے ہیں۔ لیکن مسلمان کی یہ فطرت ہے کہ اسے جتنا دبایا جائے وہ اتنا ہی ابھرتا ہے۔ بھارتی فوج پاکستان کی سرحد توڑ کر اس پاک سرزمین میں گھس آئی تھی' لیکن اسے دندان شکن جواب دیا جاچکا ہے۔ اب جب کہ بھارت نے ایک مرتبہ ہماری پاک سرزمین کو اپنے قدموں سے ناپاک کرنے کی کوشش کی ہے' مجھے پوری امید ہے کہ قائداعظمؒ کی قائم کردہ اس مملکت کا ہر فرزند توحید جارحانہ حملہ کرنے والے دشمن کا سر پاش پاش کر کے یقین محکم اور جرأت ایمانی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ جو آج پاکستان کو ختم کردینے کے خواب دیکھ رہے ہیں' ان کے ناپاک ارادے کبھی پورے نہ ہوسکیں گے۔ پاکستان ہمیشہ سلامت رہے گا۔ قائداعظمؒ زندہ باد"۔

دشمن کو پے در پے کاری ضرب لگائی جائے

صدر محمد ایوب خاں نے آج اعلان کیا کہ پاکستانی عوام نے نہ صرف اپنی سرزمین کو دشمن کے ناپاک وجود سے پاک کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے بلکہ وہ دشمن کے علاقے میں جنگ جاری رکھنے کا آہنی عزم بھی کیے ہوئے ہیں۔ قائداعظمؒ کی سترھویں برسی پر قوم کے نام صدر ایوب نے ایک نشری پیغام میں کہا ہے کہ آج قائداعظمؒ کی روح کو سکون پہنچانے کا اس سے احسن تو طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ دشمن کو پے در پے کاری ضرب لگائی جائے۔ انشاءاللہ بھارت کے موجودہ حکمرانوں کو آج بھی پاکستان کے خلاف اس جارحانہ جنگ میں اسی طرح ناکام و نامراد ہونا پڑے گا جس طرح بھارت والے آج سے پہلے قائداعظمؒ کی قیادت میں اٹھنے والی تحریک قیام پاکستان کو ناکام بنانے میں مایوسی سے دوچار ہوئے تھے۔ آج اہل پاکستان اپنے وطن عزیز کی حفاظت کے لیے جو شاندار قربانیاں دے رہے ہیں وہ ہرگز رائیگاں نہیں جائیں گی۔ پاکستان کے قیام کے وقت بھی دنیا کی رکاوٹ کی رکاوٹ ہمارے عزم صمیم کو ناکام نہیں بنا سکی آج بھی وہ کسی کڑی سے کڑی آزمائش کی پرواہ نہیں کریں گے۔ بھارت کے ساتھ موجودہ معرکے میں ہماری فتح دراصل حق و انصاف کی فتح ہوگی۔ انشاءاللہ ہم اپنے معبود حقیقی کی ذات پر بھروسہ کر کے عظمت اور سربلندی کی منزلوں پر منزلیں طے کرتے چلے جائیں گے۔ آج پاکستان پر بھارتی جارحیت کے عریاں حملے سے دنیا کی بہت سی اقوام کی دلی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہیں اور جارحانہ حملے نے پاکستان کو یہ جانچنے کا موقع فراہم کر دیا ہے کہ کون کون اس کا دوست اور حلیف ہے۔

پاکستان جنگ بندی کے خلاف نہیں ہے لیکن..........

آج اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھان راولپنڈی میں صدر پاکستان اور وزیر خارجہ پاکستان کے ساتھ گفت وشنید کے راولپنڈی سے دوپہر کے وقت بمبئی پہنچ گئے۔ کل بمبئی سے نئی دہلی جائیں گے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو آج چک لالہ کے ہوائی اڈے پر اوتھان کو الوداع کہنے آئے تو اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ہم نے اوتھان پر واضح کر دیا ہے کہ پاکستان ہمیشہ امن پسند رہا ہے۔ پاکستان جنگ بندی کے خلاف نہیں ہے لیکن مستقل اور پائیدار امن کے ضروری ہے کہ کشمیر میں رائے شماری کی ضمانت ایک عام سمجھوتہ میں جنگ بندی بھی شامل کی جائے۔

آج پاکستان کی طرف سے برصغیر میں مستقل امن کے لیے تین نکاتی منصوبے کا اعلان بھی کیا گیا۔

حکومت پاکستان کے ایک ترجمان نے اس منصوبہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:
پاکستان کوئی جھگڑا فوجی طاقت سے حل کرنا نہیں چاہتا۔ ہم جنگ بند کر دینے کے حق میں ہیں، لیکن اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ اہل کشمیر کے حقوق کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھا جائے اور جنگ بندی صحیح معنوں میں جنگ بندی ہو جس سے بھارت اور پاکستان کے باہمی نزاع کی اصل وجہ دور کر کے برصغیر میں مستقل طور پر امن قائم کیا جا سکے۔ لازمی ہے کہ جنگ بندی کے معاہدے کے فوراً بعد کشمیر سے بھارتی اور پاکستانی فوجوں کا اقوام کی نگرانی میں مکمل انخلاء شروع ہو جائے۔ اس کے بعد کشمیر میں اقوام متحدہ کی فوج متعین کی جائے جو افریشیائی فوج کے دستوں پر مشتمل ہو تا کہ وہ اقوام متحدہ کی

جنوری ۱۹۴۹ء کی قرارداد کے مطابق کشمیر میں جنگ بندی کے معاہدہ سے ٹھیک تین مہینوں کے اندر اندر آزادانہ اور منصفانہ رائے شماری کی فضا پیدا کرنے کے لیے امن قائم رکھ سکیں۔ ترجمان نے کہا کہ اس کے سوا برصغیر میں امن بحال کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں۔

....

گزشتہ شب برکی محاذ پر ایک دوسرے کمپنی کمانڈر میجر عبدالحبیب اپنے جوانوں کو اگلے مورچوں میں ایمونیشن تقسیم کرتے ہوئے دشمن کے ٹینک کے گولے سے شدید زخمی ہوگئے اور فوجی ہسپتال لاہور میں جام شہادت نوش کیا۔ یہ نوجوان شہید (سابق وکیل) ضلع راولپنڈی، تحصیل گوجر خاں کے اس شجاعت آفریں خطہ کے رہنے والے تھے جس نے کیپٹن محمد سرور شہید (نشان حیدر) جیسے بہادروں کو جنم دیا۔

ہر محاذ پر پاک فوج کے جوان داد شجاعت دے رہے تھے۔ بریگیڈیئر شامی، کرنل عبدالرحمٰن، سکواڈرن لیڈر رفیقی اور کتنے ہی افسر بڑھ چڑھ کر جام شہادت لبوں سے لگا چکے ہیں۔

عوام بے پناہ قربانیاں دے رہے ہیں۔ صدر پاکستان نے نیشنل فنڈ کے قیام کا اعلان کیا تو دو دن میں ۴۵ لاکھ روپیہ جمع ہوگیا۔ غریب عورتیں اپنی بچیوں کے جہیز کی رقوم تک قومی فنڈ دفاعی فنڈ میں جمع کرا رہی تھیں۔

قوم کے دلی جذبات شعراء کے کلام اور مغنیوں کے نغمات میں ڈھلتے جا رہے ہیں۔

”والله ! میں تو اس راہ میں” جان عزیز“
کی قربانی بھی حقیر سمجھتا ہوں “

(عزیز بھٹی)

میرے لیے آرام وراحت محاذ پر ہے

کمانڈنگ آفیسر محمد ابراہیم قریشی' میجر محمد اصغر' کیپٹن انور منیر الدین اڈجوٹنٹ اور کیپٹن دلشاد کوارٹر ماسٹر' فیلڈ ہیڈ کوارٹر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ میجر عزیز بھٹی کی تیز رفتار جیپ ان کے پاس آ کر رکی۔ ۱۲۰ گھنٹے' برکی کے انتہائی نازک محاذ پر تاریخی کردار ادا کرنے والا مجاہد پوری مستعدی کے ساتھ جیپ سے اترا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ساتھی افسروں کی جانب بڑھا۔ سب نے اٹھ کر میجر بھٹی کو گلے لگایا اور ان کے عظیم الشان کارنامے پر انہیں مبارکباد دی۔

میجر بھٹی کی حیرت انگیز مستعدی' ان کے چہرے کے تاثرات اور گل لالہ کی مانند سرخ آنکھیں ان کی بے تاب سرگرمیوں' ان کی بے خواب راتوں اور عسکری تاریخ میں ان کے لاجواب کارناموں کی داستانیں سنا رہی تھیں۔

میجر بھٹی مجوزہ کانفرنس سے جلد فارغ ہونے کے بعد بعجلت تمام واپس جانے کے لیے بے قرار تھے' مگر انہیں معلوم ہوا کہ انہیں کسی اہم کانفرنس کے لیے نہیں بلایا گیا بلکہ ان کے کمانڈ آفیسر انہیں آرام پہنچانا چاہتے ہیں۔ کرنل قریشی نے صاف الفاظ میں کہہ دیا: ''بھٹی صاحب! میں

آپ کو مبارکباد دیتا ہوں آپ نے س محاذ پر ایک تاریخی جنگ لڑی ہے۔آپ کے پاس جوانوں کی انتہائی کم نفری کا مجھے شدید احساس رہا۔آپ کے کارنامے حیرت انگیز ہیں۔آپ نے لاہور کو دشمن کے ناپاک قدموں سے بچالیا ہے۔آپ نے مسلسل چھ یوم سے مطلق آرام نہیں کیا۔اپ اپنے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔میں نے پہلے بھی آپ کو واپس بلایا تھا۔مگر آپ ٹال گئے تھے' مجھے ڈر تھا آج بھی آپ ٹال نہ جائیں۔اس لیے آج بہانے سے بلایا ہے۔میں آپ کی جگہ دوسرا افسر بھیج رہا ہوں آپ آرام کرلیں۔آپ کو پچھلے مورچوں پر بھیج دیتے ہیں"۔

میجر بھٹی نے کہا "سر! جس احساس اور جذبے کے تحت آپ نے مجھے واپس بلایا ہے میں اس کے لیے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور تہہ دل سے اس کی قدر کرتا ہوں۔لیکن...... آپ یقین مانیں! میرے لیے آرام وراحت محاذ پر ہے۔حقیقت میں تکلیف اور آرام صرف جسمانی نہیں ہوتے' ان کا تعلق انسان کے احساسات سے ہے۔مثلاً مجھے اگر محاذ سے واپس بلالیا جائے تو میرے لیے یہ ایک روحانی عذاب ہوگا۔ بلاشبہ ان دنوں میں نے اپنے جسمانی آرام وآسائش اور استراحت کی پرواہ نہیں کی۔لیکن.......... آپ باور کریں کہ مجھے اس کا بہت زیادہ صلہ ملا ہے۔جذباتی طور پر یہ لمحات میرے لیے انتہائی روحانی مسرت اور اطمینان کا باعث ہوئے ہیں۔مجھے فخر ہے کہ میرے جوانوں نے اپنی قوت ایمانی اور کوہ پیکر عزم سے دشمن کی یلغار کو روک دیا ہے اور ہر مقابلے میں اسے شکست دی ہے' مگر مجھے یہ احساس ہے کہ پاکستان کے پاس اتنی زیادہ فوج نہیں کہ ہم ہر محاذ پر تازہ دم فوج بھیج کر سب مجاہدین کو آرام دلاسکیں۔دریں حالات میرے لیے یہ امر ناقابل تصور ہے کہ میں اپنے جوانوں کو محاذ پر چھوڑ کر یہاں آرام کرنے بیٹھ جاؤں! ملک کا بچہ بچہ برسرپیکار ہے' یہ صرف لاہور کے تحفظ کا سوال نہیں ہے' پاکستان بلکہ

اسلام کے تحفظ کا سوال ہے۔

محترم قریشی صاحب! ملک وملت پر موجودہ نازک وقت ہم سے عظیم قربانیوں کا تقاضا کرتا ہے۔ واللہ! میں تو اس راہ میں جان حقیر کی قربانی بھی حقیر سمجھتا ہوں۔ خدا کے لیے آپ میرے لیے تشویش نہ کریں۔ میرے اعصاب بڑے مضبوط ہیں۔ مجھے کوئی تکان محسوس نہیں ہوتی۔ میں آرام نہیں کرنا چاہتا۔ میں پچھلے مورچوں پر نہیں جاؤں گا بلکہ وطن پاک کی حفاظت کرتے ہوئے جام شہادت نوش کرنا چاہتا ہوں۔"

کرنل قریشی، میجر بھٹی کے دلائل ان کے جوش جہاد اور ملک وملت کے لیے جذبہ ایثار سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ میجر بھٹی کو محاذ سے واپس بلانا ان کے ساتھ ظلم کے مترادف ہوگا۔ البتہ انہوں نے میجر عزیز کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ چند گھنٹے آرام کرلیں لیکن میجر بھٹی وہاں ایک گھنٹہ سے زیادہ نہ رکے۔

فیلڈ ہیڈ کوارٹر میں جہاں آفیسرز بیٹھے تھے، اس کے قریب نہر سے ایک راجباہ نکل کر گزرتا ہے۔ میجر عزیز کو پیراکی کا بے حد شوق تھا۔ رن کچھ کے دنوں میں ان کی کمپنی نہر کے قریب متعین تھی۔ وہ اکثر اپنا یہ شوق نہر میں تیر کر پورا کرلیا کرتے تھے۔ آج بھی میجر عزیز کپڑے اتار کر اس راجباہ میں اترے اور کئی منٹ تک اس میں الٹے سیدھے تیرتے رہے مگر آج فرض کا احساس اس شوق کی تکمیل کی راہ میں حائل تھا۔ وہ جلد ہی باہر آ گئے اور کپڑے پہن لیے۔

خالد اقبال نائیک کلرک کو بلایا اور کہا: برخوردار کوئی کاغذ لا کردو۔ میں چند خطوط لکھنا چاہتا ہوں۔ خالد اقبال نے میسیج پیڈ Message Pad کا کاغذ لا کر دیا۔ انہوں نے اس کے پانچ ٹکڑے کیے اور بال پنسل سے ان پر مختصر پیغامات لکھے اور اپنے عزیزوں کو اپنی خیر وعافیت کی اطلاع دی۔ یہ خطوط والد صاحب کو لادیاں، ظفر کو کوئٹہ، بھائی جان کو پیکنگ، کیپٹن شریف اور آپا طاہرہ کو کراچی اور چھوٹے بھائی رشید کو ڈھاکہ بھیجنا چاہتے تھے۔ لفافے تلاش کیے تو وہاں صرف پاکستان سٹیٹ سروس کے لفافے میسر تھے۔ زندگی میں پہلی اور آخری دفعہ سرکاری سٹیشنری کو ذاتی کام کے

لیے استعمال میں لائے۔

سٹیٹ سروس کے چار لفافے ملے۔ خالد اقبال کے پاس ریڈ کراس کے Gifth Humanity لفافے ملے۔ ان میں سے بھی ایک لفافہ استعمال کیا۔ جلدی جلدی خطوط بند کر کے خالد اقبال کے حوالے کیے۔ اس دن ڈاک کی ترسیل کا کوئی انتظام نہ تھا' دوسرے دن ہی ڈاک جاسکتی تھی۔

پھر کیپٹن کوارٹر ماسٹر دل شاد کو چھ سو روپے دیے کہ ''میرے گھر بھجوادیں''۔ خالد اقبال اور کیپٹن دلشاد کو کراچی کا ٹیلی فون نمبر ۵۴۹۷۰ نوٹ کروایا کہ ''میری شہادت کی صورت میں سب سے پہلے اس ٹیلی فون پر اطلاع دے دیں''۔

واپس جانے لگے تو اڈجوٹنٹ انور منیر الدین نے میجر بھٹی سے کہا ''آپ اپنی انگوٹھی واپس لے لیں۔ رات تو میں آپ کو انکار نہ کر سکا مگر میں سوچتا ہوں ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ ہماری موت وحیات مشترک ہے اس لیے اسے اپنے ہی پاس رکھیں یہ آپ ہی کے ہاتھ میں سجتی ہے''

منیر کے کہنے پر میجر عزیز نے خاموشی سے اپنی طلائی انگوٹھی (جو ہانگ کانگ کے زمانے سے ان کی رفیق تھی) پھر پہن لی' اتنے میں چائے آ گئی۔

کرنل قریشی اور دوسرے دوستوں سے رخصت ہو کر میجر بھٹی واپس محاذ پر پہنچ گئے۔ جاتے ہی نائب صوبیدار شیر دل سے کہا: صاحب! اب آپ آرام کریں اور میں دشمن کی خبر لیتا ہوں ۔ دشمن کی پوزیشن کا جائزہ لے کر اس پر فائر کا حکم دیا۔ مگر دشمن کی ایک مشین گن جو بالکل سامنے لگی ہوئی تھی وہ کسی طرح تباہ نہیں ہو رہی تھی' اس لیے مسکین علی کو پار لانے کا کوئی موقعہ نہیں مل رہا تھا۔ کہنے لگے: ایک سیکشن پار بھیجنا چاہتا ہوں مگر اس نامراد توپ کا بہت زیادہ خطرہ ہے۔ اس توپ کا رینج دے کر متعدد بار فائر کرائے مگر وہ توپ کچھ اس طرح نصب تھی کہ گولہ باری اسے کوئی نقصان نہ پہنچاسکی۔ گولہ باری دونوں جانب سے ہو رہی تھی۔ لانس نائیک محمود زخمی ہو گیا۔ ایمبولینس میں اے سی ایم ایچ لاہور بھیج دیا گیا۔

شام ہو چکی تھی۔ حولدار کوارٹر ماسٹر محمد اکرم کھانا لے کر آیا۔ میجر بھٹی کے پوچھنے پر اسنے

بتایا سب جوانوں میں کھانا تقسیم ہو چکا ہے۔ اپنے متعلق کوارٹر ماسٹر اکرم سے کہنے لگے کہ میں فیلڈ ہیڈ کوارٹر سے چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ کھا چکا ہوں' اب کھانا نہیں کھاؤں گا۔

میجر بھٹی پٹڑی پر چڑھ کر دائیں بائیں دشمن کا جائزہ لے رہے تھے' جہاں ضرورت سمجھتے فائر کرواتے رہے۔ دوسری طرف سے بھی گولہ باری ہو رہی تھی۔ ایک گولہ پٹڑی کے قریب پڑا' اس سے نقصان تو کوئی نہیں ہوا مگر میجر بھٹی کو کوئی خیال آیا تو مورچوں میں جا کر جوانوں سے کہنے لگے :مورچوں میں جہاں کہیں اینٹیں ہیں انہیں نکال دیں' ان پر بم آ کر گرے تو یہ بھی بم بن جاتی ہیں اور نقصان پہنچاتی ہیں۔

آج دوسری طرف دشمن کا بہت زور تھا۔ اس محاذ پر دشمن کو تازہ کمک پہنچ رہی تھی۔ میجر بھٹی کا قیاس یہ تھا کہ دشمن نہر پر عارضی پل بنانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ پٹڑی پر چڑھنے والی دشمن کی ہر پارٹی کا بڑی احتیاط سے خاتمہ کرنے اور پل کے تمام علاقہ میں پٹرولنگ کا حکم دے رکھا تھا اور خود بھی اس کی کڑی نگرانی کر رہے تھے۔ میجر بھٹی نے توپ خانہ والوں کو پیغام دیکر مزید کمک کا مطالبہ کیا۔

آدھی رات کو پٹڑی پر گزر رہے تھے کہ ایمبولینس کی آواز آئی۔ گاڑی کے قریب گئے اور ڈرائیور سے پوچھا ''انور! کیا بات ہے گاڑی کیوں سٹارٹ کر رکھی ہے؟'' انور نے کہا ''صاحب ! گاڑی کا سلف خراب ہے' جلدی سٹارٹ نہیں ہوتی۔ اگر کوئی ایمر جنسی ہو گئی تو پھر بہت زیادہ مشکل کا سامنا ہو گا اور اسے دھکیلنا پڑے گا۔'' کہنے لگے: ''اگر کوئی ایمر جنسی ہو گئی تو اسے دھکیلنے والے بہت ہوں گے۔ اللہ کا آسرا چاہیے اسے بند کر دیں اور اطمینان رکھیں''۔

انور نے گاڑی بند کر دی۔ پھر اس نے پوچھا ''صاحب !اجازت دیں تو میں صبح اسے ورکشاپ لے جاؤں اور اس کو ٹھیک کرا لاؤں؟''

کہنے لگے: ''ہاں ! لے جائیں۔ البتہ صبح دس بجے تک انتظار کر لیں۔ مبادا کوئی ایمر جنسی ہو جائے''

انور سوچتا رہا کہ یہ دس بجے انتظار میں کیا تک ہے۔ ایمر جنسی تو کسی وقت بھی ہو سکتی ہے ۔بہر حال وہ خاموش رہا۔

پھر پٹڑی پر چڑھ کر جائزہ لیا۔ کوئی نقل و حرکت نہ تھی۔ اتر کر انور سے کہا: ''ایمبولینس سے سٹریچر نکال لیں میں ٹسٹ کرتا ہوں آیا اس پر نیند آتی ہے یا نہیں''۔ انور نے سٹریچر نکال دیا۔ اس پر لیٹ کر کہنے لگے ''بھئی یہ تو بہت آرام دہ ہے''۔ انور سے کہا: اب آپ بھی آرام کر لیں۔ سٹریچر سے اٹھ کر حوالدار اللہ دتہ (مارٹر او پی) سے کہا: ''میں ذرا آرام کر لوں آپ لوگ اتنی دیر خیال رکھیے اور پل کے علاقہ میں خاص احتیاط رکھیں'' خود پٹڑی پر ایک چکر لگا کر واپس آئے اور سٹریچر پر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر اونگھنے کے بعد اٹھ بیٹھے۔ اتنے میں اکرم کوارٹر ماسٹر چائے لے کر آ گیا۔ میجر بھٹی نے چائے کی پیالی ہاتھ میں لی۔ آنکھیں بند تھیں۔ اکرم سے پوچھا کہ جوانوں کو چائے دے دی ہے؟ اکرم نے جواب دیا جوانوں میں چائے تقسیم ہو رہی ہے۔ پھر فرمانے لگے ہاں تو رات توپ خانہ کے ۳۶ آدمی اور آئے تھے، ان کے لیے بھی چائے کا انتظام کیا ہے۔ اکرم نے کہا ان کے لیے بھی انتظام کر دیا ہے۔ اور ان میں بھی چائے تقسیم کی جا رہی ہے۔ چائے کے ساتھ پوریاں بھی تھیں۔ پوری چکھ کر کہنے لگے ''سب کو اسی طرح کی پوریاں تقسیم کی ہیں نا! اکرم نے کہا ''جی ہاں سب کے لیے ایسی ہی پوریاں تیار کروا کر لایا ہوں''۔

کہنے لگے ''بہت مزیدار پوریاں ہیں''۔

چائے ختم کر کے پیالی اسے واپس دی۔ آنکھیں بدستور بند تھیں۔ متواتر جاگتے رہنے کے باعث آنکھیں سوج چکی تھیں۔ جھپکنے میں بھی تکلیف محسوس ہوتی تھی اور بند کر کے کھولنا بھی تکلیف دہ تھا۔ اکرم چلا گیا تو لیٹ گئے۔

پانچ سات منٹ بعد اٹھے اور انور سے کہا۔ سٹریچر اپنی گاڑی میں رکھ لیں۔

....

دنیا کے اخبار لکھ رہے تھے:

''فتح اب پاکستان کے ہاتھ میں نظر آتی ہے''۔

''لاہور کے محاذ پر بھارت کی سخت پٹائی ہو رہی ہے''

''سنڈے ٹیلیگراف''۔ لندن۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء

۱۲ر ستمبر

''تو نہ دانی جاں چہ مشتا قانہ داد''

.........................اقبالؒ

پٹری پر چڑھ کر چکر لگایا' سحر قریب تھی ۔ دشمن نفری اور سامان حرب کی کثرت کے باوجود رات بھر فوجی اہمیت کی کوئی کارروائی نہ کر سکا تھا ۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی کمان میں نہر کے اس کنارے ہمارے جوانوں کی چوکسی ور ہوشیاری تھی ۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ گزشتہ چھ دن کے مقابلوں میں اس محاذ پر انہوں نے دشمن کو اتنا زیادہ نقصان پہنچایا تھا کہ اب وہ نفسیاتی طور پر مرعوب ہو کر ذہنی شکست قبول کر چکا تھا اور اسے پیش قسمی کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔

میجر عزیز نے فوجی تربیت اور سروس کے دوران فنون حرب کے بہت سے کورس پاس کر رکھے تھے ۔ انہوں نے بری فوج کے ہر شعبہ میں بہترین تربیت اور مہارت حاصل کر رکھی تھی ۔ برکی کے نازک ترین محاذ پر بھارت کی ایک بریگیڈ فوج کے مقابلے میں (صوبیدار عالم زیب کے زیر قیادت ۱۲ پنجاب کی ایک پلاٹون سمیت) میجر عزیز بھٹی کی کمان میں صرف ۱۴۸ جوان تے ۔ ان ۱۴۸ انفوس کے ساتھ انہوں نے بھارت کے ٹڈی دل لشکر کا ۱۴۸ گھنٹے تک مقابلہ کیا ۔ انہوں نے اپنے تدبر' عسکری حکمت عملی اور بے پناہ شجاعت سے نہ صرف پہلے ہی روز دشمن کی یلغار کو روک دیا' اسے زبردست جانی نقصان پہنچایا' اس کا بے شمار سامان حرب تباہ کیا اور ان مٹھی بھر جانثاروں کے ساتھ چھ دن اور چھ راتیں مقابلہ کرتے ہوئے میجر عزیز بھٹی کی کمان میں اس محاذ پر صرف گیارہ جوان شہید ہوئے ۔

انہیں پٹڑی پر پھرتے ہوئے' برکی سے شمال کھجور ایریا میں ایک پلاٹون کی نفری نہر کی جانب آتی ہوئی دکھائی دی۔ وائرلیس سے میسیج پاس کیا۔

''برکی ڈراپ ون ہنڈرڈ ون راؤنڈ فائر'' (برکی سے ایک سو نیچے ایک راؤنڈ فائر کریں)۔ اس کی زد میں آنے والے کچھ مر گئے اور کچھ بھاگ گئے' ہائی سکول کی طرف بھاگنے والوں پر گولے پھنکوائے۔ حوالدار نذیر سے کہا: ''اب برباد ہو گئے ہیں''۔ حوالدار اللہ دتہ (مارٹر او پی) کو بلایا' اسے کہا کہ وہ بھی جائزہ لے۔ اس نے جائزہ لے کر کہا کہ دشمن کی کوئی نقل و حرکت نظر نہیں آتی

۔

سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ میجر عزیز بھٹی پٹڑی سے نیچے اتر آئے۔ امان خاں سپاہی سے پانی لے کر وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کی۔

امان خاں چائے تیار کرنے لگا۔ گرم پانی لے کر شیو بنائی تو امان خاں نے کہا: صاحب! میں پانی لا دیتا ہوں۔ آپ غسل کر لیں۔

کہنے لگے نہر سے پانی لانا خطرناک ہے۔

امان خاں سر! میں ابھی بستی سے پانی لے آتا ہوں۔

میجر بھٹی کہنے لگے۔ رہنے دیں اور اسی پانی سے ذرا سر دھلا دیں۔

چنانچہ گرم پانی سے سر منہ دھویا۔ کئی دن بعد بالوں میں کنگھی کی۔

یہ ان کی زندگی کی آخری صبح تھی۔ وہ غیر شعوری طور پر کسی طویل سفر کی تیاری کر رہے تھے ۔ اتنے میں صوبیدار غلام محمد آ گئے۔ صوبیدار غلام محمد کے ساتھ مل کر چائے پی۔

پیالی رکھ کر اچانک غلام محمد کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہنے لگے ''یار! آپ کو پامسٹری میں بڑی دسترس ہے۔ ذرا میرا ہاتھ تو دیکھیں!''

غلام محمد نے ہاتھ کا مشاہدہ کرنے کے بعد کہا ''جناب! آپ کے ہاتھ کی لکیریں دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کی غماز ہیں' ہاتھ کے ابھار بڑے نمایاں ہیں!''

''یہ باتیں تو اپنی جگہ درست ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں آیا میری قسمت میں

شہادت بھی ہے یا نہیں؟''

صوبیدار غلام محمد نے دوبارہ دونوں ہاتھوں کا بغور مشاہدہ کیا اور پوری سنجیدگی سے کہہ دیا ''جناب! آپ کی قسمت میں شہادت تو ہے مگر وقت کے بارے میں کوئی صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا کہ شہادت عمر کے کس حصے میں نصیب ہوگی!''

میجر بھٹی نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور کہا ''صوبیدار صاحب! اگر صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے تو میں آپ کو بتا دوں۔ میری شہادت بہت قریب ہے''

میجر بھٹی نے امان خاں کو نئی وردی لانے کے لیے کہا۔

امان خاں وردی لے کر آیا تو دیکھ کر کہنے لگے یہ میری وردی تو نہیں ہے!

امان خاں نے بتایا۔ ''سر! آپ کی وردی لانے کے لیے فیلڈ ہیڈ کوارٹر گیا لیکن آپ کی وردی نہیں ملی۔ وہیں سے ایک افسر نے اپنی وردی آپ کے لیے بھیج دی ہے''۔

کہنے لگے ''ان کی مہربانی! رہنے دیں ابھی یہی وردی ٹھیک ہے''

میجر بھٹی کی زندگی کا آخری سورج طلوع ہو چکا تھا۔

کمپنی ہیڈ کوارٹر کے پاس حوالدار نذیر کی پلاٹون کی بائیں جانب سے نہر کی پٹڑی کے اوپر آئے اور دوربین کے ساتھ مشاہدہ کرنے لگے۔

حوالدار میجر فیض علی پٹڑی کے نیچے تھا۔ دشمن کی طرف سے فائر آ رہا تھا۔ فیض علی نے میجر بھٹی سے کہا ''سر! فائر آ رہا ہے نیچے آ جائیں!''

میجر عزیز نے جواب دیا ''نیچے سے مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ یہاں خطرہ ہے لیکن موت و حیات اللہ کی طرف سے ہے اور اگر شہادت میرے مقدر میں ہے تو زہے قسمت''۔

اتنے میں برکی سے نہر کی طرف بڑھتے ہوئے چند ٹینک نظر آئے۔ ان کے پیچھے پیدل فوج بھی تھی۔ میجر بھٹی نے ڈگری دے کر فائر کرایا۔ گولہ نشانے پر نہ پڑا۔ دوبارہ میسج پاس کیا۔ اس مرتبہ گولے صحیح نشانوں پر پڑے۔ بڑے خوش ہوئے۔ دشمن کے دو ٹینک تباہ ہوئے۔ توپ خانہ کا انچارج کیپٹن انور فائر کروا رہا تھا' خوش ہو کر کہا:

''ویل ڈن انور!'' یہ الفاظ ان کی زبان پر ہی تھے کہ سامنے سے ایک گولہ آیا جوان کے قریب شیشم کے درخت کو قلم کرتا ہوا اینٹوں کے اس ڈھیر پر گرا جو مورچوں سے نکال کر وہاں اکٹھی کی ہوئی تھیں۔ میجر بھٹی اس جگہ سے بمشکل چند فٹ کے فاصلہ پر کھڑے تھے' پڑی پر گرد وغبار اٹھا ساتھیوں نے سمجھا کہ میجر صاحب زخمی ہو گئے۔ وہ بھاگ کر آگے بڑھے مگر میجر بھٹی کو خراش تک نہیں آئی۔ ساتھیوں سے کہا ''آپ فوراً واپس اپنی پوزیشن لے لیں۔ یہ گولہ میرے لیے نہیں تھا' ابھی وہ گولہ بھارت کے کارخانے میں تیار نہیں ہوا''۔

صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔

تقدیر میجر بھٹی کے ان الفاظ پر مسکرا رہی تھی۔ وہ دوربین لے کر دشمن کا مشاہدہ کرنے ہی والے تھے کہ اسی لمحہ ٹھوس فولاد کا ایک گولہ ان کے سینے کو چیرتا ہوا دائیں پھیپھڑے سے پار ہو چکا تھا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گرے۔

حوالدار میجر فیض علی اور سپاہی امان خاں دوڑ کر ان کے پاس پہنچے تو فرض شناسی اور شجاعت کا پیکر' قربانی وایثار کا مجسمہ اور عسکری تاریخ کا عظیم ہیرو اپنے فرض سے سبک دوش ہو رہا تھا۔

لو وصل کی ساعت آپہنچی پھر حکم حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کیے اور سینے کا درباز کیا

فیض..................

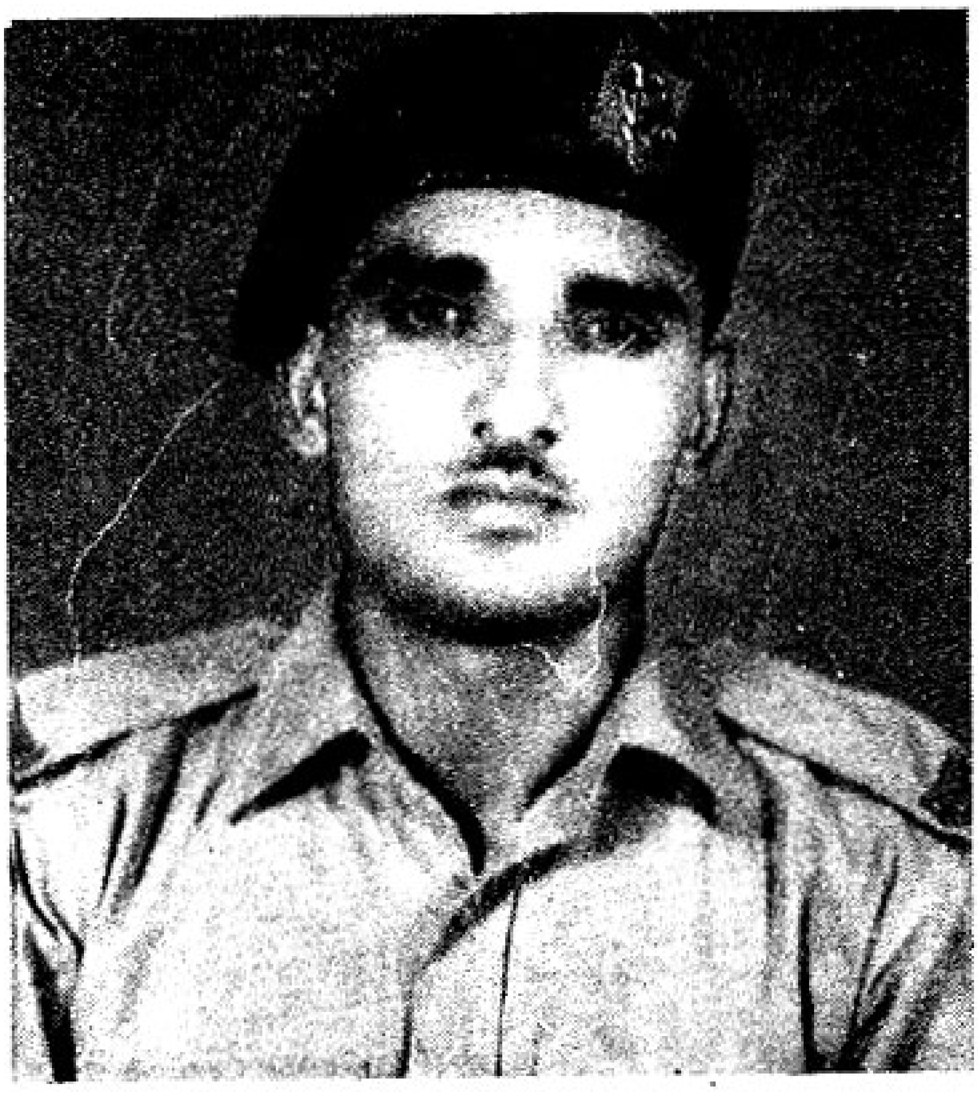

آخری سفر

امان خاں پٹڑی سے اٹھا کر نیچے لایا۔ چہرہ خاک سے پاک تھا۔ بال بدستور جمے ہوئے تھے اور مانگ قائم تھی۔ یوں لگتا تھا کہ طویل صفر سے تھک کر سو گئے ہیں۔ چہرے سے معصومیت اطمینان و مسرت کے جذبات نمایاں تھے۔ جونہی انہیں اٹھا کر پٹڑی کے سلوپ پر لائے زخم کا منہ ذرا نیچے کو ہوا تو وہاں بہت سا خون بہہ نکلا۔ (یہی وہ جگہ ہے جہاں بعد میں اینٹوں سے نشان لگا دیا گیا تھا)۔

سپاہی امان خاں کی وردی بھی خون سے تر ہو گئی۔

میجر عزیز بھٹی کی شہادت کی خبر سارے محاذ پر پھیل گئی۔ جوان مورچوں سے نکل آئے۔ نعش کے قریب آ کر انہوں نے اپنے محبوب کمانڈر کو سلامی دی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سپاہی محمد امان، حوالدار میجر محمد علی اور صوبیدار غلام محمد نے نعش کو ایمبولینس گاڑی میں رکھا۔ رات جس گاڑی کے متعلق ڈرائیور کو یہ تشویش تھی کہ سیلف کی خرابی کے باعث سٹارٹ نہیں ہو سکے گی، وہ بغیر کسی رکاوٹ کے سیلف سٹارٹ ہو گئی۔

جوان اپ...... نے مربی و محسن کے نورانی چہرے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ان چند لمحوں کے بعد اس اعتماد آفریں اور تبسم ریز چہرے کو پھر کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ چہرہ تازہ پھول کی طرح شاداب تھا۔

جوانوں ...... میجر بھٹی کے شیروں ...... نے اپنے رہنما کو الوداعی سلام کیا اور آنسوؤں کو پیتے ہوئے مورچوں کو روانہ ہوئے۔ محاذ پر احساس فرض نے ان کے پاؤں روک لیے،

ورنہ وہ سب کے سب نعش کے ہمراہ ہسپتال جانے کے لیے بے تاب تھے۔

ایمبولینس، شہید کی نعش لے کر بنگالی فارم کے پاس پہنچی۔ بٹالین سیکنڈ ان کمانڈ میجر محمد اصغر وہاں منتظر کھڑے تھے۔ اپنے ساتھی کو بصد احترام سلیوٹ کرتے ہوئے ان کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ ان کی شہادت ساری بٹالین کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھی۔ سپاہی سے لے کر آفیسر کمانڈنگ تک ہر ایک نے اسے شدت سے محسوس کیا۔

کیپٹن ڈی ایس حکیم، صوبیدار غلام محمد اور لانس نائیک قطب الدین نعش لے کر سی ایم ہسپتال لاہور روانہ ہوئے۔

نائیک کلرک خالد اقبال نے کیپٹن کوارٹر ماسٹر دلشاد اور میجر محمد اصغر سے پوچھا کہ ان خطوط کا کیا جائے جو میجر بھٹی شہید نے کل لکھے تھے اور جو آج پوسٹ کیے جانے تھے۔ دونوں نے یہی مشورہ دیا کہ ان کو ارسال کر دو۔ شہید کے عزیزوں کے پاس آخری نشانی کے طور پر یادگار رہیں گے۔ شہید کی ایک دن پہلے کی ہدایت کے مطابق ٹیلیفون نمبر ۵۴۹۷۰ پر کراچی ان کی ہمشیرہ طاہرہ اور ان کے بہنوئی نیول کیپٹن محمد شریف کو سب سے پہلے ان کی شہادت سے مطلع کر دیا گیا۔

''آنسو''

جنگ کے دنوں میں موت اور نعشیں روزمرہ کا معمول بن جاتی ہیں۔ ملک وقوم کی خاطر قربانیاں دینے والے جوان بڑھ چڑھ کر جام شہادت نوش کرتے ہیں۔ میدان جنگ سے نعشوں کے ہمراہ آنے والوں کو اپنے ساتھیوں کی جدائی اور موت کا صدمہ ضرور ہوتا ہے مگر ان کے پاس بہانے کے لیے آنسو نہیں ہوتے۔ وہ تو خود موت سے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ البتہ ۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء ساڑھے دس بجے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال لاہور میں اپنی نوعیت کا انوکھا واقعہ ہوا۔ ایک فوجی افسر کی نعش کیساتھ آئے ہوئے ساتھی دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ ہسپتال کے ڈاکٹروں کے لیے یہ بڑی عجیب سی بات تھی۔ انہوں نے جوانوں سے پوچھا کہ کس شہید کی نعش ہے؟ ان سب نے بے ساختہ جواب دیا:

''جناب یہ ایک نعش نہیں۔ پوری کمپنی کی میت آپ کے سامنے پڑی ہے۔ شہید پوری کمپنی بلکہ بٹالین کی جان تھے۔ ان کا نام میجر راجہ عزیز بھٹی ہے اور یہ ۱۷ پنجاب کی ایک کمپنی کے کمانڈر تھے۔ سی ایم ایچ لاہور کے ایم آئی روم کے انچارج ضلع جھنگ کے معمر ڈاکٹر محمد رفیع چوہدری نے ایک ملاقات میں بتایا: میری زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ کسی فوجی افسر یا ساتھی کی شہادت پر میدان جنگ میں اس کے ماتحتوں یا ساتھیوں نے یوں آنسوؤں سے خراج عقیدت پیش کیا ہو۔ میں یوں محسوس کرتا تھا جیسے وہ ان کے خونی رشتہ دار ہیں۔ ان کے الفاظ اور آنسوؤں میں عجیب طرح کی اپنائیت تھی۔

ڈاکٹر محمد رفیع چوہدری نے نعش کا معائنہ کیا تو انہوں نے دیکھا کہ شہید کے سینے پر دائیں پھیپھڑے کی طرف سینے پر ۱۹ انچ لمبا ۴ انچ چوڑا اور ۶ انچ گہرا گھاؤ ہے۔ یہ کچلا ہوا زخم براہ راست شیل لگنے سے واقع ہوا ہے۔ سامنے سے زخم کا منہ کھلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے لاش کے معائنے کے بعد

کہا:

نعش بغیر پوسٹ مارٹم کے مردہ خانے بھیج دی گئی۔ مارچری انچارج ڈاکٹر میجر افتخار نے نعش کو دیکھا۔ میجر عزیز بھٹی کی طلائی انگشتری اتار کر کیپٹن ڈی ایس حکیم کے حوالے کی۔ انگشتری اتارتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ابھی چند ہفتے قبل کرنل ابراہیم قریشی کے پاس ان کا میجر بھٹی شہید کے ساتھ تعارف ہوا تھا اور وہ شہید کی پیاری شخصیت سے بڑے متاثر ہوئے تھے۔

ڈریسنگ اور متعلقہ کاغذات کی تکمیل کے بعد نعش واپس کیپٹن ڈی ایس حکیم کے حوالے کر دی گئی۔

لانس نائک قطب الدین جو اس وقت تک میجر شفقت بلوچ کی کمپنی میں تھا مگر فوج میں شامل ہونے سے قبل میجر کا ذاتی ملازم رہ چکا تھا' ٹرک پر ان کی نعش لے کر ان کے آبائی گاؤں ....لادیاں..........روانہ ہوا۔

موت کو آخری شکست

پاکستان کا ہیرو اور تاریخ اسلام کا یہ عظیم مجاہد ایک نرالی شان کے ساتھ محاذ جنگ سے گھر لوٹ رہا تھا۔ سی ایم ایچ لاہور سے نکل کر اس نے داتا کی نگری کو اپنا الوداعی سلام کیا۔ سات سال قبل ایک خطرناک حادثہ میں جب وہ سی ایم ایچ لاہور کی طرف آ رہا تھا تو بظاہر اس کے جسم پر کوئی نشان نہ تھا مگر وہ درد کی شدت سے بے تاب تھا اس کے برعکس آج اس کا سینہ فگار تھا۔ چھاتی پر ۹" لمبا ۴" چوڑا اور ۶" گہرا گھاؤ منہ کھولے ہوئے تھا' مگر وہ درد و کرب سے بالکل بے نیاز بڑا مطمئن نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر پھول کی سی شادابی' مسرت اور طمانیت کے اثرات تھے۔

جب بھی وہ امتحان کے کمرہ سے تاریخ کا پرچہ دیکر نکلتا تھا تو اس کے چہرے پر ایسی ہی مسرت کھیلتی تھی۔ آج بھی تو وہ بی آر بی نہر کے کنارے اپنے خون سے تاریخ کا ایک ناقابل

فراموش باب تحریر کر کے ہی آ رہا تھا۔

آج وہ یوں خوش تھا جیسے کبھی ہانگ کانگ میں کرکٹ کے میدان میں ڈبل سینچری مکمل کرنے کے بعد مداحوں اور تماشائیوں کی تالیوں کی گونج میں ''ناٹ آؤٹ'' واپس آیا کرتا تھا۔

موت جو سات سال قبل ایک آسان ''کیچ'' چھوٹ جانے کے باعث پریشان ہوئی تھی ۔آج بالکل مایوس نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے اپنی قطعی شکست کا احساس ہو چکا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کا شکار اسے شکست دے کر ''ناٹ آؤٹ'' جا رہا ہے' اسے حیات جاوداں مل گئی ہے اور وہ اس پر کبھی غالب نہیں آ سکے گی۔

سات سال قبل بھٹی کو حادثہ کے وقت یہ احساس ہوا تھا گویا اس کے اندر کوئی قوت یہ کہہ رہی ہے ''بھٹی! تجھے ابھی نہیں مرنا ہے'' اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ نہ صرف وہ اس حادثہ میں بچ نکلا ہے بلکہ ابھی اس کی زندگی کا کوئی مشن باقی ہے۔ مگر آج اسے یہ بشارت اور نوید مل چکی تھی کہ زمین پر اس کا مشن ختم ہو چکا ہے' وہ اپنے آدرش اور نصب العین کو پا چکا ہے۔ اب اس کے آرام کا وقت ہے ۔تو کس خوشی کے ساتھ وہ سو گیا۔ وہ یوں کھڑے کھڑے سو جایا کرتا تھا۔ اس نے آرام دہ بستر کی کبھی پروانہ کی تھی۔ نیند اس کی زندگی کا دل پسند مشغلہ بھی تو تھا۔ جب وہ کام سے بالکل فارغ ہو تو پہروں مزے لے کر سویا کرتا تھا۔

آج بھی وہ گہری اور پرسکون نیند کے مزے لے رہا تھا۔

میجر عزیز بھٹی' گوئٹے اور دوسرے جرمن شعراء کا کلام بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ جان کرسچین گسہر کا یہ شعر وہ اکثر گنگنایا کرتے تھے:

انگریزی ترجمہ حسب ذیل ہے:

(Oh, tell me, I beg for you, how can I find the machine wich can arrest time and youth).

اردو ترجمہ: میں التجا کرتا ہوں للہ! مجھے بتایئے وہ مشین کیسے دستیاب ہو سکتی ہے جو وقت اور جوانی کو

قید کر لے"۔

آج وہ اپنے خون کا ایک ایک قطرہ اپنی قوم اور وطن پر نثار کر کے نہ صرف حیات جاوداں حاصل کر گیا بلکہ اس نے اپنی معصوم اور بے داغ جوانی کو بھی امر بنا لیا۔ اس جواں سال مجاہد کی جرأت وشجاعت، فرض شناسی وجواں مردی، قربانی وایثار، حب الوطنی وملی حمیت اور بے مثال قیادت کے معجزانہ کارناموں کے انمٹ نقوش اس وقت تک زندہ وتابندہ رہے گے جب تک پاکستان زندہ ہے اور جب تک دھرتی پر اسلام کے نام لیوا زندہ ہیں۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن

شہادت وہ موت ہے جس پر زندگی ہمیشہ رشک کرتی رہی ہے۔ یہ وہ موت ہے جس میں راز حیات جاوداں مضمر ہے۔ یہ وہ لازوال زندگی ہے جو عظمت انسانی کی معراج ہے، جو صبح نو کی نقیب ہے اور گھپ اندھیاروں پر نورانی اجیالوں کی جیت کی آشا ہے۔ اسی موت سے انسان نے موت اور فنا پر فتح پانے کا راز پایا ہے۔ میدان جنگ میں موت کی تو اپنی ایک عظمت ہے۔

تاریخ عالم کا عظیم فاتح .... نپولین .... ساٹھ جنگوں میں حصہ لینے کے بعد جب جزیرہ سینٹ ہیلینا میں زندگی کے آخری سال گزار رہا تھا تو مایوسی کے عالم میں کئی بار پکار اٹھتا تھا۔

> ''اے کاش! میری زندگی کے ڈرامے کا ڈراپ سین ماسکو کے معرکہ میں ہو جاتا۔ کاش! کریملن میں مجھ پر آسمان سے کوئی گولہ ہی آن پھٹتا۔ اس وقت تک میری شہرت عروج پر تھی، مگر مجھے آج اس جزیرہ میں موت کا انتظار کرنا پڑ رہا ہے۔

مگر ایک مومن کی تمنائے شہادت نپولین کی تمنا سے مختلف ہے۔ یہ مقام دنیاوی شہرت اور کشور کشائی کے شوق سے بلند تر ہے۔ یہ تو ایک فرض کی تکمیل ہے، یہ ایک بلند نصب العین کا حصول ہے۔

> یہ وہ تمنا ہے جس کے لیے اسلام کے عظیم عسکری ہیرو خالدؓ بن ولید کے دل میں آخر دم تک حسرت رہی اور جب ان کا آخری وقت آیا تو اس محرومی کے تصور سے ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاط بل احیاء عند

ربھم یرزقون ○فرحین بما اتا ھم اللّٰہ من فضلہ و یستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم الا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (القرآن ۳:۱۷۰)

اس مجاہد نے جان دی تا کہ اس کا وطن پاکستان زندہ رہے۔ اس نے اپنے مقدس خون سے اس سرزمین کو تر کیا تا کہ اس پر اسلام کا جھنڈا سرنگوں نہ ہو اور یہ ہلالی سبز پرچم ہمیشہ سر بلند رہے۔

اس کی جاں نثاری' فرض شناسی' حب الوطنی اور شجاعت ہماری ملی تاریخ اور قومی ادب کا ایک غیر فانی حصہ بن چکی ہے۔ ہمارے شعروں اور لوگ گیتوں میں اس کا نام گونجتا رہے گا۔ ہماری مائیں اس کی جانبازی کی غیر فانی داستانوں سے اپنے بچوں کی تربیت کیا کریں گی اور ہمارے مغنی اس کی شجاعت کے نغمے سنایا کریں گے۔

لادیاں میں

۱۲ ار ستمبر کو محترمہ آمنہ بی بی شام کی نماز کے لیے وضو کر رہی تھیں کہ لادیاں سے قریب موضع سدھ کا ایک شخص ان کے فرزند کی شہادت کی خبر لے کر پہنچا۔ شہید کی ماں نے قرون اولیٰ کے بہادر غازیوں کے سے صبر و سکون کے ساتھ اس خبر کو سنا۔ پیغام رساں نے انہیں بتایا کہ شہادت کی اطلاع کراچی سے ان کی صاحبزادی طاہرہ نے بذریعہ ٹیلی فون لالہ موسیٰ دی ہے جہاں سے یہ خبر لایا ہوں۔

میجر عزیز بھٹی کی شہادت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے گاؤں میں پھیل گئی۔

ماسٹر محمد عبداللہ شام کی نماز پڑھ رہے تھے کہ مسجد میں بھی یہ خبر پہنچ گئی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

نماز ادا کرنے کے بعد وہ گھر آئے تو ان کے گھر میں بہت سے مرد عورتیں جمع ہو چکے تھے۔ ان سب کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ میجر عزیز تو لاہور کے محاذ پر لڑ رہے تھے' ان کی شہادت کی خبر کراچی سے کیونکر آئی ہے؟ وہ اس معمہ کو حل نہ کر سکے۔ لالہ موسیٰ سے شہید کی ہمشیرہ اور ان کے بچے بھی پہنچ چکے تھے۔ مکمل بلیک آؤٹ اور باجرے کی اونچی اونچی فصلوں کی وجہ سے ٹرک ڈرائیور کافی دیر تک راستہ بھولتا رہا۔ اسے لادیاں کے دو نوجوان محمد حسین اور عالم نے راستہ دکھایا ......قطب الدین اس گاؤں میں رہ چکا تھا۔ اس نے دونوں کو پہچان لیا اور ان کے ساتھ گاؤں پہنچا۔

ٹرک کی آواز سے گاؤں میں شام کی خبر کی تصدیق ہو گئی۔ لاش دیکھ کر سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بعض خواتین نے رونا اور بین کرنے شروع کیے تو شہید کی بہادر ماں نے ان کو یہ کہہ کر سختی سے منع کر دیا کہ میرا بیٹا شہید ہوا' شہید مرا نہیں کرتے اور نہ شہیدوں کو اس طرح بین کر کے روتے ہیں۔

زرینہ کچھ دیر شوہر کے چہرے پر نظریں جائے کھڑی رہی۔ شاید وہ حیرت سے سوچ رہی تھی ایک ہفتہ بھر کی طویل اور صبر آزما جدائی کے بعد وہ آئے ہیں لیکن اس کی طرف پیار بھری نظر سے دیکھ کر ایک دفعہ بھی ''زرینہ!'' کہہ کر نہیں پکارتے ...... معاً اسے خیال آیا کہ اس پیار بھری آواز کو سننے کے لئے تو اب اس کے کان ہمیشہ کیلئے ترستے رہیں گے۔

اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

ذوالفقار قریب کھڑا تھا۔ امی کی آنکھوں سے آنسو بہتے اور انہیں سسکیاں بھرتے دیکھا تو انہیں یاد دلایا کہ ابا جان نے آپ سے کیا کہا تھا؟ کہ اگر میں شہید ہو جاؤں تو رونا نہیں مگر آپ رو رہی ہیں؟ آنسوؤں سے زرینہ کے جذبات آسودہ ہو رہے تھے مگر اپنے عظیم شوہر کے الفاظ کو یاد کر کے وہ آنسوؤں کو پی گئیں۔

۱۳ ار ستمبر

میجر عزیز بھٹی کو قرب و جوار میں سب لوگ جانتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ہر دلعزیز تھے۔ ان کی شہادت کی خبر سارے علاقے میں پھیل گئی اور نزدیک و دور سے ہزاروں لوگ نمازِ جنازہ میں شرکت کیلئے پہنچ گئے۔

اِسی دن بیگم میجر عزیز بھٹی کے نام پہلا تار یہ ملا: لاہور چھاؤنی ۱۲ ار ستمبر ا بجے دن

''ہم افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتے ہیں کہ میجر راجہ عزیز بھٹی جنگ میں شہید ہو گئے ہیں۔ اُن کی لاش گھر بھیجی جا رہی ہے۔ (۱۷۔ پنجاب)

لادیاں میں شہید کی آخری آرام گاہ

ان کی والدہ کی خواہش کے مطابق شہید کو ان کے مکان کے بائیں باغ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ جہاں وہ محوِ استراحت ہیں۔

''بٹالین کو فخر''

۱۵ ستمبر کو بیگم عزیز بھٹی کو دوسرا تار یہ ملا:

''تمام افسر اور جوان آپ کے شوہر کی شہادت پر آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور ان کی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔

بٹالین ان کی شجاعت اور بہادری پر فخر کرتی ہے۔

(۱۷۔ پنجاب)

”ساتھیوں میں سب سے آگے“

27 ستمبر کو ریڈیو پاکستان سے مسٹر الطاف گوہر مرکزی سیکرٹری اطلاعات کا محاذ کے دورہ کے بعد ایک انٹرویو نشر کیا گیا جس میں پہلی دفعہ اہل پاکستان کو معلوم ہوا۔ کہ:۔

”......میجر بلوچ نے اپنے دو رفقاء کا بھی ذکر کیا۔ میجر راجہ عزیز بھٹی اور میجر عبدالحبیب خاں ان دونوں کو کی کمپنیاں بھی اسی سیکٹر میں تھیں اور دونوں نے آخر دم تک لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا میجر بھٹی کا سابقہ ریکارڈ بھی بڑا قابل فخر ہے۔ 1950ء میں انہوں نے شمشیر اعزاز حاصل کی تھی۔ دشمن کے فائر کا سامنا کرتے ہوئے وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے آگے تھے ۔میجر عبدالحبیب خاں اپنے جوانوں کو گولے دے رہے تھے کہ ایک ٹینک کی گولی سیدھی انہیں آ کر لگی اور وہ اس اطمینان کے ساتھ اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے کہ......کا دلے کروم!

اس سیکٹر میں انہی بہادر غازیوں کی جانبازی سے واہگہ روڈ پر دشمن کی پیش قدمی کی راہ میں آہنی دیواریں حائل ہوگئیں۔ اس علاقہ میں دشمن اٹھارہ دن اور اٹھارہ راتیں برابر دھاوے کرتا رہا۔ یہیں پر اس کے سارے ارادے' سارے پروگرام دھرے کے دھرے رہ گئے' ہمارے ان جانبازوں کو ایک لمحہ آرام میسر نہ آیا۔ آرام کی انہیں ضرورت بھی نہ تھی۔ آرام انہیں کرنا ہی کیا ہے ۔کمانڈر انچیف نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا' ہمارا ٹھکانہ ہماری خندقیں ہیں۔ وہیں ہم رہتے ہیں' وہیں ہم مرتے ہیں۔

میں اس علاقہ کو پہلی بار قریب سے دیکھا ہے۔ جس کا ذرہ ذرہ بہادری اور شجاعت کی داستانیں لئے ہوئے ہے۔ شاعر اور مغنی اس سرزمین کو شعر و نغمہ سے زندۂ جاوید بنا دیں گے۔ یہ وہ کارنامے ہیں جن سے ہم نے اپنی روح کو پالیا۔ اور جن پر ہماری آئندہ کی تاریخ لکھی جائیگی!“

(الطاف گوہر)

داستانِ شجاعت

28 ستمبر کو صدر پاکستان کی طرف سے جن جوانوں کو ان کی شجاعت کے کارناموں پر فوجی اعزازات دیئے گئے۔ ان میں پاکستان کا سب سے بڑا اعزاز ''نشان حیدر'' میجر عزیز بھٹی کو ملا۔ ان کی شجاعت و بہادری کے کارنامے کا سرکاری ریکارڈ حسب ذیل ہے۔

''جس روز ہندوستانیوں نے باقاعدہ اعلانِ جنگ کئے بغیر حملہ کیا۔ میجر راجہ عزیز بھٹی لاہور کے محاذ پر برکی کے علاقہ میں پنجاب رجمنٹ کی ایک کمپنی کی کمان کر رہے تھے۔ ان کے دو پلاٹون بی آر بی نہر پر چھ سو گز پیچھے تھے۔ مگر انہوں نے برکی میں اگلے پلاٹون کے ساتھ ہی رہنے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ وہ اپنے جوانوں کی رہنمائی خود کر سکیں۔ بی آر بی نہر کے سامنے سارا علاقہ برکی سے زد میں آتا تھا۔ لہٰذا دشمن کے لئے ضروری تھا کہ وہ نہر پر حملہ کرنے سے پہلے برکی پر قبضہ کر لے۔ 7 ستمبر سے دشمن کا بریگیڈ ٹینکوں کی مدد سے پے در پے حملے کر رہا تھا۔ توپوں اور ٹینکوں سے برابر گولہ باری جاری رہی۔

دشمن نے چھ بڑے حملے کئے۔ ہر بار وہ تازہ دم فوج میدان جنگ میں جھونک دیتا مگر برکی میں ہماری جو فوجیں وطن کی سرحدوں کا دفاع کر رہی تھیں ان کے قدم نہ اکھڑ سکے۔ اس ثابت قدمی کا سبب محض یہ تھا کہ میجر بھٹی اپنی جان کی پروا کئے بغیر سارے حملوں کے دوران ہر وقت اگلی صفوں میں رہے۔ وہ جوانوں کو برابر ابھارتے رہے کہ وہ جم کر لڑتے رہیں۔

10 اور 11 ستمبر 1965ء کی درمیانی رات کو دشمن نے سارے محاذ پر ایک بڑا حملہ کیا۔ دشمن کی ایک بٹالین برکی پر برابر دباؤ ڈالنے لگی۔ ہماری سپاہ ڈٹی رہی۔ مگر آخر دائیں پہلو کی صورت حال کے پیش نظر میجر بھٹی کو ہدایت کی گئی کہ وہ پیچھے ہٹ کر بی آر بی نہر کے اس طرف آ جائیں۔ وہ خود آخری سیکشن کے ساتھ واپس ہوئے۔ اس دوران دشمن برکی اور بی آر بی نہر کے ایک حصے کو اپنے نرغے میں لے چکا تھا۔ میجر عزیز بھٹی اپنے سیکشن کے ہمراہ لڑتے بھڑتے نہر کے کنارے کشتیوں والی جگہ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ اس پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ ان کی کمپنی کی کچھ گاڑیاں اور

سپاہی ابھی تک دشمن کے علاقہ کی طرف تھے۔ بڑا ضروری تھا کہ نہر کے کنارے سے دشمن کو ہٹایا جائے۔ میجر بھٹی کے اردگرد دو سیکشن تھے۔ انہیں انہوں نے اکٹھا کیا اور اپنی رہنمائی میں دشمن پر ہلّہ بول دیا۔ وہ خود سٹین گن سے پورا کام لیتے رہے۔ وہ بالآخر دشمن کو وہاں سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے۔ اب انہوں نے اپنی گاڑیوں اور سپاہیوں کو بحفاظت نکال کر دوسری طرف پہنچانے کا کام شروع کیا۔

> گاڑیوں اور سپاہیوں کو سلامت نکالنے کی خاطر انہوں نے خود اپنی جان خطرے میں ڈالے رکھی۔ وہ برابر فائر کرتے رہے۔ سب واپس پہنچ گئے تو وہ خود سب سے آخر میں نہر کے اس طرف آئے اور اس نازک صورت حالت میں اگر وہ جرأت و شجاعت اور مثالی قیادت کا ایسا مظاہرہ نہ کرتے تو کمپنی کی تین گاڑیاں اور ایک پورا پلاٹون ضائع ہو جاتا۔

نہر کے اس کنارے پہنچنے کے بعد میجر بھٹی نے اپنی کمپنی کی پھر سے جمعیت بندی کی اور خود آگے ہو کر دشمن پر برسانے لگے۔ اس دوران نہر کی دوسری طرف کے علاقہ کو دیکھنے کیلئے وہ بار بار اپنا سر بی آر بی نہر کے کنارے سے اٹھاتے‘ اس طرح وہ صاف طور پر دشمن کے سامنے آ جاتے۔ اس کنارے پر دشمن کا توپ خانہ سارا دن اور ساری رات گولوں کی بوچھاڑ کرتا رہا۔ اس حالت میں اس کنارے سے دشمن کی نقل و حرکت اور کارروائی کو دیکھنا مشکل کام تھا۔ میجر بھٹی یہ خطرناک کام خود ہی کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ دشمن کے آگے بڑھتے ہوئے ٹینکوں اور پیادہ فوج پر گولہ باری کر کے انہیں پریشان کرتے رہے۔ اس طرح انہوں نے دشمن کے بہت سے حملوں کا زور توڑ دیا۔ ہر بار وہ دشمن کی توپوں‘ خودکار اسلحہ اور ٹینکوں کے فائر کی زد میں آتے تھے۔ 12 ستمبر کو صبح نو بجے وہ دشمن کے ان ٹینکوں اور پیادہ فوج پر گولہ باری کرا رہے تھے جو ان کی کمپنی کی پوزیشن کے لئے سخت خطرہ ثابت ہو رہے تھے۔ اسی دوران دشمن کے ٹینک کا ایک اے پی گولہ آیا اور میجر عزیز بھٹی کے دائیں کندھے پر لگا جس سے وہ سنبھل نہ سکے اور وہیں شہید ہو گئے۔

> میجر عزیز بھٹی حب الوطنی‘ جاں سپاری اور فرض شناسی کے پیکر تھے۔ انہوں

نے ایک لمحہ بھی ذاتی سلامتی یا آرام کی پروانہ کی۔ انہوں نے اپنے سپاہیوں کی قیادت بری شجاعت سے اور پوری اہلیت کے ساتھ ذاتی مثال پیش کر کے کی۔ شہادت سے ایک روز پہلے ان کے کمانڈنگ افسر نے کہا کہ آپ مسلسل اتنے دن اور اتنی راتیں برسر میدان رہنے سے سخت تھک گئے ہوں گے۔ آپ کی جگہ اب کسی اور کو بھیج دیا جاتا ہے مگر میجر بھٹی نے کہا "نہیں، میں اس جگہ کی حفاظت کرتے کرتے جان دے دوں گا۔" ان کا یہ جذبہ اور بہادری کا اعلیٰ کارنامہ آرمی کے خون کو ہمیشہ گرم رکھے گا۔

ناقابل تسخیر فوج

”جس نے اپنے خون سے تاریخ کا ایک سنہری باب تحریر کیا ہے“
صدر محمد ایوب خاں

”آیئے، ہم عزیز بھٹی شہید کو خراج عقیدت پیش کریں“
جنرل موسیٰ

29 ستمبر

جنرل موسیٰ خاں آج شالا مار باغ کے تاریخی مقام پر فوج کے افسروں اور شجاعت کے اعزاز پانے والوں سے خطاب کر رہے تھے۔ اس انتہائی سادہ مگر پروقار تقریب میں اعلیٰ سول حکام اور کچھ خواتین بھی موجود تھیں۔ تقریر کے دوران فوجیوں نے بار بار پاکستان زندہ باد اور صدر ایوب زندہ باد کے نعرے لگائے اور شالا مار باغ پر جوش تالیوں سے گونجتا رہا۔

پاکستانی فوج کے سربراہ نے کہا کہ دشمن پاکستان کے محافظوں کے آہنی عزم سے واقف نہیں تھا، وہ چوروں کی طرح آیا اور ذلیل ورسوا ہو کر فرار ہو گیا۔ آج بھارتی چیف آف سٹاف جنرل چودھری یہ کہتے ہیں کہ لاہور پر قبضہ کرنا ان کا مقصد نہیں تھا۔ اگر یہ بات تھی تو مروّجہ اصولوں اور بغیر کسی الٹی میٹم کے انہوں نے تین طرف سے حملہ کیوں کیا تھا۔ اس نے تابڑ توڑ حملے کیوں کیے اور فائر بندی کی رات کو بمبانوالہ بیدیاں نہر کو پار کرنے کی کوشش کیوں کی تھی۔

جنرل موسیٰ نے کہا کہ بھارت کو جارحیت کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی ہے۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کی بہادر فوج نے حملہ آوروں کو زبردست جانی و مالی نقصان پہنچایا ہے۔

شجاعت کے تمغے

جنرل موسیٰ خاں نے 37 بہادر فوجیوں کے سینوں پر شجاعت کے تمغے آویزاں کئے۔ نشانِ حیدر پانے والے میجر راجہ عزیز بھٹی دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو چکے ہیں۔

جنرل موسیٰ خاں نے بہادر فوجیوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج وہ صرف انہیں اعزاز دینے یا ملنے نہیں آئے بلکہ ان کی بہادری اور شجاعت پر صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی طرف سے مبارکباد کا پیغام لائے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صدر مملکت نے کہا ہے کہ

"ملک کے بہادر فوجیوں نے اپنے خون سے تاریخ کا ایک سنہری باب تحریر کیا ہے۔"

جنرل موسیٰ نے پاکستان کے دل لاہور کا دفاع کرنے والے بہادروں سے کہا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انہیں سلام پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپ جیسے بہادر فوجیوں کی معیت میں پاکستان کی خدمت کرنا بہت بڑا اعزاز ہے۔ اتنا بڑا اعزاز بہت کم کسی کمانڈر انچیف کے حصے میں آیا ہے۔

انہوں نے کہا کہ قائداعظمؒ نے لاہور کے عظیم شہر کو بجا طور پر پاکستان کا دل کہا تھا۔ لاہور کے بہادر عوام نے عزم وہمت اور دن رات کام کر کے ہمارے حوصلے بلند کر دیئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس شہر میں جو میدان جنگ بنا ہوا تھا' معمول کے مطابق کام ہوتا رہا۔ کسی شہری کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ملک کی بہادر فوج سیسہ پلائی دیوار کی طرح دشمن کی راہ میں حائل ہے۔ اور یہ دیوار عبور کرنا بھارت کے بزدل سپاہیوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

انہوں نے کہا کہ دشمن نے رات کی تاریکی میں محض اس توقع پر حملہ کیا تھا کہ لاہور کو فتح کرنا آسان اور معمولی بات ہے اور اسی امید میں اس نے پہلے ہی اپنی فتح کا اعلان کر دیا تھا۔ جنرل موسیٰ نے کا کہ دشمن کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اسے ناقابل تسخیر فوجوں سے سابقہ پڑے گا۔ شکست کھانے کے بعد اب اس نے خفت مٹانے کیلئے حیلے بہانے تراشنے شروع کر دیئے ہیں۔ اب بھارت کے چیف آف جنرل سٹاف مسٹر چودھری یہ کہہ رہے ہیں کہ لاہور کو فتح کرنا ان کا مقصد نہیں تھا۔ انہوں

نے کہا کہ بھارتی جنرل نے یہ الفاظ اس وقت کہے ہیں جب دشمن پاکستان کی بہادر فوجوں کے ہاتھوں لاہور محاذ پر تیس بار حملہ کر کے پسپا ہو چکا ہے۔

جنرل موسیٰ نے کہا کہ اگر بھارتی جنرل کا مقصد لاہور پر قبضہ کرنا نہیں تھا تو اس نے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر جنگ کا اعلان کئے بغیر پاکستان پر حملہ کس لئے اور کیوں کیا تھا؟ انہوں نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ دشمن کو معلوم تھا کہ وہ جو مقصد زورِ بازو سے حاصل کرنے کا اہل نہیں اسے دھوکہ سے حاصل کرلے گا۔ اس نے لاہور کو فتح کرنے کیلئے تین اطراف سے فوجوں کی بھاری تعداد اور جدید ترین اسلحہ سے جو حملہ کیا تھا اس کو پاکستان کی فوج نے مختصر تعداد ہونے کے باوجود پسپا کر دیا۔ پھر بھارتی فوجوں نے فائر بندی کے بعد رات کی تاریکی میں بی آر بی نہر کو عبور کرنے کی ناکام کوشش کی لیکن پاکستان کی بہادر فوجوں نے دشمن کو بھاری نقصان پہنچا کر اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

افسروں کی مبارکباد

جنرل موسیٰ نے کہا کہ دشمن تعداد میں بہت زیادہ ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کیلئے بہادری کے لاتعداد کارناموں کی ضرورت ہے۔ انہوں نے فوج کے نوجوان افسروں کی شجاعت پر انہیں مبارکباد دی اور کہا کہ ان نوجوان افسروں کی بلند حوصلگی نے ان کے ماتحت بہادروں کے حوصلے میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اور یہی بات ان کی فتح کا باعث ہے۔

جنرل موسیٰ نے اعزاز وصول کرنے والوں کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ میں اس موقع پر میجر بھٹی کا نام خاص طور پر لینا چاہتا ہوں جو ملک کا دفاع کرتے ہوئے شہید ہو گئے ہیں انہیں اس شجاعت پر سب سے بڑا انعام نشانِ حیدر دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آیئے! ان کو خراج عقیدت پیش کریں اور ان مغفرت کے لئے دعا کریں۔

جب تک پاکستانی فوج میں:

عزیز بھٹی شہید جیسے لوگ موجود ہیں......

ــــــــــــ اعجاز حسین بٹالوی

(29 ستمبر رات کو ریڈیو سے اعجاز حسین بٹالوی کی ولولہ انگیز اور اعتماد آفریں آواز گونج رہی تھی جس میں وہ آج کی مبارک تقریب کا آنکھوں دیکھا حال سنا رہے تھے)

لاہور میں باغبان پورے سے ہو کر جو سڑک واہگے کی طرف جاتی ہے اس پر شاہ جہان کے بنائے ہوئے باغ شالا مار نے آج پاکستان کی قومی تاریخ کے ایک حسین اور عظیم نظارے کا مشاہدہ کیا۔

قیام پاکستان کے بعد اس باغ میں بہت سی قومی تقریبات منعقد ہو چکی ہیں۔ بیرونی ملکوں کے بادشاہ' صدر' امیر اور سفیر جب آتے ہیں تو لاہور کے شہری اسی باغ میں ان کی میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مگر آج اس باغ کے در و دیوار اور سبزہ و گل نے جو دیکھا ہے وہ کسی بادشاہ کی استقبالیہ دعوت نہ تھی۔ پاکستان کے سپاہیوں کی اعزازی تقریب تھی۔

خوش قسمت ہیں وہ آنکھیں جنہوں نے پاکستان کی قومی تاریخ کا یہ منظر دیکھا۔

باغ کے فوارے چل رہے تھے۔ درخت ایستادہ تھے۔ اور سبزہ بچھا جا رہا تھا۔ اور باغ کے پہلے تختے پر پاکستانی فوج کے وہ سپاہی صف بہ صف کھڑے تھے جنہوں نے موجودہ جنگ میں دادِ شجاعت دے کر فوجی اعزازات حاصل کئے۔ ان اعزاز پانے والے فوجیوں کے ساتھ ان کی رجمنٹوں کے چند جوان اور افسر بھی موجود تھے۔ تقریب سادہ مگر پر شکوہ تھی۔ میں نے بھی اس باغ میں بڑے بڑے مقرروں کی تقریریں سنی ہیں۔ سوچی ہوئی' تیار کی ہوئی۔ مؤثر کرنے والے حربوں

سے آزمائی ہوئی' سیاسی اور سفارتی تقریریں' مگر آج میں نے یہاں جو تقریر سنی وہ صورِ اسرافیل کی طرح پاکستان کے وجود کو زندہ و تابندہ کرنے والی تھی۔

پاکستان کا کمانڈر انچیف اپنے سامنے صف بہ صف کھڑے مردانگی' دلیری اور شجاعت کے نونوں سے کہہ رہا تھا۔ ''آپ نے دشمن کو بتایا ہے کہ لڑنا کیا چیز ہے۔ لڑنا کس کو کہتے ہیں۔ آپ کی ایک کمپنی نے ایک ایک بریگیڈ اور ایک بریگیڈ نے ایک ایک ڈویژن کا مقابلہ کیا ہے۔

''بغیر اعلان کے حملہ کرنا مردوں کا کام نہیں' دشمن کیا کیا ارادے
لے کر حملہ آور ہوا تھا۔ مگر اس کے سامنے پاکستان کے سپاہی تھے
اور اسے معلوم نہ تھا کہ یہ کس بلا کی چیز ہیں''۔

یہ لوہے کی دیوار تھے۔ اب دشمن کہتا ہے کہ وہ لاہور کی طرف اس لئے آگے نہیں بڑھ سکا کہ لاہور کا دفاع بہت مضبوط تھا۔ سیالکوٹ میں اس لئے آگے نہیں بڑھ سکا کہ دائیں فلینک کی طرف سے خطرہ تھا۔ تو پھر کوئی پوچھے کہ تم کیا سمجھ کر حملہ کرنے آئے تھے۔ حملہ کرنے آئے تھے کہ سیز فائر کرنے آئے تھے۔

''جب ایک ایک بریگیڈ کو ایک کمپنی نونو گھنٹے تک روکے تھے تو ہم لوگوں کو یقین ہو جانا چاہئے کہ ہم اکیلے نہیں لڑ رہے خدا کی مدد ہمارے شامل حال ہے''۔

تقریر ختم ہوئی اور تاریخ نے عزت و منزلت کی حاضری پکارنا شروع کی۔ اعزاز حاصل کرنے والوں کو نام لے کر پکارا گیا اور وہ ایک ایک کر کے آگے بڑھے اور کمانڈر انچیف نے ان کے سینوں پر شجاعت اور بہادری کے پھول کھلا دیئے۔

اس قافلے میں بریگیڈیر بھی تھے۔ کرنل' میجر' کیپٹن بھی' صوبیدار اور حوالدار بھی' نائیک اور سپاہی بھی۔ مگر اس قافلے کا ہر شخص اپنی ہمت اور شجاعت کے کارنامے سے اس صف میں شامل ہوا تھا۔ جونہی کوئی جوان اپنا اعزاز لینے کیلئے آگے بڑھتا میرے اردگرد کھڑے ہوئے فوجی سرگوشیوں میں اس کے کارناموں پر تبصرہ شروع کر دیتے۔ ''اس جوان نے اکیلے دشمن کے چار ٹینک تباہ کئے۔''

''اس نائیک نے میدانِ جنگ میں توپ سے دشمن کا ہوائی جہاز گرا لیا''۔

''اس میجر کی کمپنی نے پاکستان کے دفاع میں سب سے پہلے گولی چلائی''۔

''اس کمپنی کمانڈر نے دشمن کے سات حملے پسپا کیے''۔

میں یہ سرگوشیاں سنتا اور شجاعت کے ان پیکروں کو دیکھتا جو دیکھنے میں عام سپاہی تھے مگر جن کی شجاعت غیر معمولی اور جن کی دلاوری کی داستانیں حیرت انگیز تھیں۔

میرے اردگرد کھڑے لوگ اعزاز پانے والوں سے اپنا قریبی رشتہ دریافت کرتے تاکہ اس افتخار میں ذرا قریب کی نسبت سے شرکت کر سکیں۔ ''یہ جوان ہماری کمپنی کا ہے''۔ کوئی سرگوشی سنائی دیتی: ''یہ افسر ہماری رجمنٹ کا ہے''۔ کوئی شہری کہتا ''یہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا''۔

کوئی کسی کا ہم وطن نکلتا کوئی کسی کا ہم جماعت۔ مگر ایک رشتہ ان سب رشتوں سے عظیم تر تھا۔ یہ پاکستان کے سپاہی تھے اور ہر پاکستانی جس نے انہیں دیکھا ہے یا نہیں دیکھا جوان سے کبھی ملا ہے یا نہیں ملا۔ ان پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ انہیں کے کارناموں کے باعث آج لاہور اپنی جگہ خوش و خرم آباد ہے۔ انہیں کے باعث دنیا میں پاکستان کا نام اونچا ہوا۔ یہ عہدہ گواہ ہے کہ پاکستان نے کسی ہمسائے پر حملہ نہیں کیا لیکن جب پاکستان پر حملہ کر کے اس کی غیرت و حمیت کو للکارا گیا تو پھر پاکستان کا ہر سپاہی جرأت کی ایک داستان بن گیا۔

آج جب تاریخ کی حاضری پکاری جا رہی تھی تو ایک سپاہی غیر حاضر تھا مجھے یقین ہے وہ آج ہم خاک نشینوں سے کہیں زیادہ بلند مرتبے پر سرفراز ہوگا۔ وہ آج جسمانی طور پر اپنے ساتھیوں میں موجود نہ تھا۔ میدان جنگ میں شجاعت کا اعلیٰ ترین اعزاز ''نشانِ حیدر'' حاصل کرنے والا میجر عزیز بھٹی جو شجاعت کے نئے معیار قائم کرتا ہوا میدان جنگ میں شہید ہوا۔

وہ شہید ہوا کہ ہم زندہ رہیں وہ شہید ہوا کہ پاکستان زندہ رہے۔

اب یہ پریڈ برخواست ہو چکی تھی اور لوگ اعزاز پانے والے دوستوں اور عزیزوں کو مبارکباد دے رہے تھے۔ کمانڈر انچیف جوانوں اور

افسروں کے پاس جا جا کر ان سے باتیں کر رہے تھے اور میں اس سپاہی کی شجاعت کی داستان سننا چاہتا تھا جو پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز حاصل کرنے پر آج جسمانی طور پر اس پریڈ میں موجود نہ تھا۔

میں ہم عصر تاریخ کے اس خوشہ چین بھکاری کی طرح تھا جو ان شجاعت کی داستان کے ایک ایک ٹکڑے کو اٹھا کر یادوں کی جھولی میں محفوظ کرنا چاہتا تھا۔

میں شہید میجر بھٹی کے دوستوں سے ملا۔ اس کے ساتھیوں سے ملا جو میدان جنگ میں اس کے شانہ بشانہ لڑ رہے تھے اس کی کمپنی کے سپاہیوں اور اس کے افسروں سے ملا۔ ان سے ملا۔ جنہوں نے اسے میدان جنگ میں لڑتے دیکھا ہے۔ ہر شخص جب اس کا نام لیتا تھا تو مجھے اس کی آنکھوں میں احترام کی ایک جھلک نظر آتی تھی۔

شہید میجر بھٹی چھ دن اور چھ راتیں مسلسل لڑتا رہا۔ اس کے افسر نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ میجر بھٹی چند گھنٹے آرام کر لے' مگر ان چھ دنوں اور چھ راتوں میں وہ شاید دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں سویا اور تمام وقت اگلے مورچے سنبھالے رہا اور دشمن کے پے در پے حملوں کو پسپا کرتا رہا۔ جب وہ شہید ہوا تو وہ سینہ تانے کھڑا تھا۔ میدان جنگ میں اکثر سپاہی کھڑے ہو کر نہیں مورچے میں بیٹھ کر لڑتا ہے۔ مگر جنگ میں ایک ایسا وقت آ گیا تھا کہ دشمن پر پچھلی صفوں سے گولہ باری کرانے کے لئے دشمن کی حرکت پر نظر رکھنا ضروری تھا تا کہ توپچیوں کو نشانے کی ہدایات دی جا سکیں۔ میجر بھٹی بی آر بی نہر کے اس کنارے پر تھے اور مقام ایسا تھا کہ دشمن کی حرکتوں پر نظر رکھنے کے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ ہدایات دینے والا کھڑا ہو کر دشمن پر نظر رکھے۔ میجر بھٹی وہ پاکستانی جوان تھا' جو

اس جنگ کے اگلے مورچوں میں سینہ تانے کھڑا تھا اور اس کی ہدایت سے ہمارے توپچی دشمن کے دائیں بائیں پر حملہ کر رہے تھے۔ میجر بھٹی آج اس پریڈ میں موجود نہ تھا مگر وہ لوگ جنہوں نے اس کی شجاعت کی داستان سنی ہے۔ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ پاکستان کی تاریخ میں زندہ رہے گا۔

اعزاز پانے والوں میں ایک سپاہی کو سٹریچر پر لایا گیا' لاہور سگنلز کا حوالدار محمد انور ۔۔ میں نے ان کی مزاج پرسی کی اور انہیں مبارک باد دی۔

حوالدار محمد انور جنگ کے سب سے اگلے مورچے پر تھا۔ گھمسان کا رَن پڑا ہوا تھا اور لڑائی اپنے زوروں پر تھی۔ سگنلز کا ایک پیغام پچھلے مورچوں تک پہنچنا ضروری تھا۔ اس پیغام ترسیل اور رسید سے جنگ کا پانسہ پلٹ سکتا تھا مگر پیشتر اس کے کہ یہ پیغام بھیجا جاتا' ایک گولہ قریب آ کر پھٹا جس سے سگنلز کی گاڑی کا ریڈیئٹر تباہ ہو گیا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ جب تک ریڈیئٹر کی مرمت نہ کی جائے' یہ ضروری پیغام بھیجا نہیں جا سکتا۔ حوالدار محمد انور گاڑی سے نیچے اترا اور اس نے گاڑی میں نیا ریڈیئٹر لگانا شروع کیا۔

حملہ زوروں پر تھا۔ فائرنگ مسلسل ہو رہی تھی۔ دائیں بائیں گولے پھٹ رہے تھے۔ حوالدار محمد انور اپنی گاڑی کی مرمت میں ہمہ تن مصروف تھا۔ ایک گولہ اس کے بہت قریب پھٹا جس سے اس کی ایک ٹانگ ضائع ہو گئی۔ خون بہتا رہا مگر جب کام مکمل کر کے حوالدار محمد انور رینگتا ہوا اپنی گاڑی میں پہنچا تو گاڑی سٹارٹ ہو چکی تھی۔ سگنلز کا ضروری پیغام بھیجا جا چکا تھا اور جنگ کا پانسہ پلٹ رہا تھا۔

میں نے سٹریچر پر لیٹے ہوئے حوالدار محمد انور سے ہاتھ ملایا۔ ان کے چہرے پر بکھری ہوئی مسکراہٹ دیکھی۔ ان کے سینے پر کھلے ہوئے فوجی اعزاز کو دیکھا اور سوچا کہ:

جب تک پاکستانی فوج میں شہید میجر بھٹی اور حوالدار محمد انور جیسے لوگ موجود ہیں ہم زندہ ہیں' قوم زندہ ہے' پاکستان زندہ ہے۔''

کیا ''بی آر بی'' ناقابل عبور ہے؟

بھارتی وقائع نگار کی حیرت

''نراد۔سی چودھری کا شمار بھارت کے ممتاز وقائع نگاروں میں ہوتا ہے۔وہ جنگوں اور جنگی چالوں کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں اور گزشتہ پچاس برسوں سے اس موضوع پر تحقیق اور اظہار خیال کرتے آئے ہیں۔کلکتہ کے ہفت روزہ ''ناؤ'' میں ان کے مضمون سے اقتباسات''

''پاک بھارت جنگ مختصر ثابت ہوئی لیکن کچھ اہمیت اور سنگینی کا اور کچھ مستقبل کا تقاضا ہے کہ اس کے اسباب و محرکات کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے۔بالخصوص جنگ کے کسی سیاسی پہلو کے پیش نظر تمام عوامل کا تجزیہ و تنقیح کیا جائے۔کیونکہ یہ طے ہے کہ جب تک کسی جنگ کی محرک حکمت عملی جاندار اور مثبت نہ ہو۔بڑی سے بڑی فوجی فتوحات بھی بے معنی ثابت ہوتی ہیں۔اس کا ناقابل تردید ثبوت دو عالمی جنگوں میں جرمنی نے' دوسری عالمگیر جنگ میں جاپان نے اور ان سے بھی پہلے فن حرب کے دو باکمالوں ...... نپولین اور ہنی بال نے فراہم کر دیا تھا۔ان کی فتوحات کا کیا نتیجہ نکلا۔ساری دنیا اس سے آگاہ ہے اس موضوع پر تفصیل بحث کے لئے آج کی فضا شاید سازگار نہ ہو۔جذباتیت کا دور گزر گیا تو اس پر کھل کر بات کی جاسکے گی۔تاہم جنگ کے خالصتاً فوجی پہلو پر اظہار خیال میں کوئی قباحت نہیں۔بھارت کے وہ لوگ جو جنگ کے مؤید اور حامی رہے ہیں۔انہیں تو بطور خاص اور بغور اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ انہیں اس جنگ سے کیا حاصل ہوا اور آیا یہ جنگ ہر ممکن مہارت اور مستعدی سے لڑی گئی تاکہ زیادہ سے زیادہ مطلوب نتائج مرتب ہو سکتے؟

جنگ کے دوران میں فوجی مہمات کا جائزہ لیتے وقت' عام لوگ' حکومت یا کمانڈروں

کے موقف کو من وعن تسلیم کرنے کے پابند نہیں ہوتے۔ تاریخ میں کسی ایسی جنگ کا تذکرہ نہیں ملتا' جس میں اس کلیے کی اصابت سے انکار کیا گیا ہو۔ پاک بھارت جنگ کی تمام تر تفاصیل اور جزئیات ابھی منظر عام پر نہیں آئیں۔ اس لئے ظاہری واقعات و نتائج ہی کو ملحوظ رکھ کر بات آگے بڑھائی جاسکتی ہے۔

جنگ کے واقعات کے بارے میں بھارتی حکومت کی طرف سے اعلامیے اور ہینڈ آؤٹ جاری ہوتے رہے ہیں اور تو اور چیف آف دی سٹاف جنرل جی این چودھری بھی اظہار خیال کرتے رہے ہیں اور ان کے بارے میں تو کہا جاسکتا ہے کہ جنگ کا منصوبہ بنانے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں وہ عملاً شریک رہے ہیں۔ 24/مارچ 1966ء کو انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں پنجاب کے بھارتی حملے کے مقصد کی وضاحت کی۔ اس کے بارے میں روزنامہ 'سٹیٹس مین' دہلی نے جو خبر دی اس میں کہا گیا تھا کہ...... ''جنرل چودھری نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ لاہور یا سیالکوٹ پر قبضہ کرنا' بھارتی فوج کا مقصد کبھی نہیں رہا۔ ان دونوں مقامات کے دفاع کا نہایت عمدہ انتظام تھا۔ ان میں داخل ہونے یا ان میں سے کسی پر قبضہ کرنے میں ہمیں انسانی جانوں اور فوجی سامان کی صورت میں بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی۔ اور اس کے صلے میں بہت ہی حقیر فائدہ ہوتا...... ہمارا سب سے بڑا مقصد پاکستانی توپ خانے اور فوج کو الجھانا اور پابند کرنا تھا۔ سو بھارتی فوج اس مقصد میں کامیاب رہی۔''

فوجی تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے میرے لئے جنرل چودھری کا بیان حد درجہ حیران کن اور استعجاب انگیز تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ آیا جنرل چودھری نے اپنے بیان کے اثر و مضمرات کو محسوس بھی کیا ہے...... کسی جنگ کو کسی ایک علاقے میں محدود اور غنیم کی فوج کو الجھائے اور پابند رکھنے کا تصور فن حرب میں دیوالیے پن کی علامت ہے ...... اور اگر باہر مجبوری ایسی جنگ لڑی بھی جائے تو یہ نہ صرف از حد مہنگی پڑتی ہے بلکہ قطعاً بے نتیجہ بھی رہتی ہے۔ دنیا بھر میں اس نوع کی جتنی بھی جنگیں لڑی گئیں' ان کی ناکامی اس کا بیّن ثبوت ہے۔

یہ بات ناقابل فہم ہے کہ اس قسم کا غیر معمولی عذر کیوں پیش کیا گیا۔ جہاں

تک میں سمجھ سکا ہوں۔ جنرل موصوف غالباً اس خیال میں ہیں کہ فوج کے تمام سپاہیوں کو ایسی مہم کا کوئی نہ کوئی جواز ضرور پیش کرنا چاہئے جو معینہ خطوط پر آگے نہیں بڑھ سکی اور ناکام ہوئی۔ ظاہر ہے اس کے لئے حقائق کی بجائے بہانے تلاش کرنے کے سوا اور کوئی راہ نہیں رہ جاتی۔

اب آیئے ذرا پاک بھارت جنگ پر ایک نظر کریں۔ جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں جزئیات اور تفصیلات عنقا ہیں۔ واقعات کا ایک عمومی خاکہ ہی سامنے ہے۔ سو اسے ہی بنیاد بنانا پڑے گا۔ میں جنگوں کی تاریخ کا پچاس برس سے بالاستیعاب مطالعہ کر رہا ہوں۔ پاک بھارت جنگ میں (بھارت کی طرف سے) جو جنگی چالیں چلی گئیں اور جس طرح واقعات رونما ہوئے ہیں ان کو دیکھ اور سن کر ششدر رہ گیا۔ بعض معلومات سے میری الجھن ضرور کم ہوئی لیکن ان معلومات کی تصدیق کا اہتمام نہیں ہے۔ اس لئے ان کی بنیاد پر کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اور نہ حتمی رائے ہی قائم کی جا سکتی ہے۔ اس لئے میں جنگ کے بارے میں نقد و نظر یا تجزیئے کے باب میں جو کچھ کہوں گا اس میں استفسار کا عنصر زیادہ ہوگا۔ تاہم میرے سوالات فوجی معاملات میں میرے درک پر مبنی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے میرے ''غیر فوجی'' ہونے کی بنا پر جنگ پر میرے اظہار خیال کی قدر و قیمت کم کرنے کی کوشش کی جائے اور کہا جائے کہ بھلا فوجی اور جنگی معاملوں کو میں کیا سمجھوں لیکن یہ صحیح نہیں ہوگا۔ ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ غیر فوجیوں کی آراء اور نظریات زیادہ بہتر اور صحیح نکلے۔ اور ان کے کہے کو سب نے تسلیم کیا۔ ابراہام لنکن نے آخر دو کمانڈر انچیف میک کلیلان اور ہالیک اور کئی دوسرے کمانڈروں کو برطرف کر دیا تھا۔ چرچل نے ڈیول اور آکنیلک کو مشرق وسطیٰ سے ہٹا دیا۔ حالانکہ دونوں نے شاندار فتوحات حاصل کی تھیں۔

پاکستان سے جنگ کرنے کا خیال رن آف کچھ کی جنگ کے دوران میں پیدا ہوا۔ (آنجہانی) مسٹر شاستری نے کہا تھا کہ اگر اس قسم کی صورتحال جاری رہی تو بھارت اپنی پسند اور مرضی کا محاذ منتخب کرے گا اور حملہ کر دے گا۔ حکومت امریکہ نے مسٹر شاستری کی اس دھمکی پر ایک گونہ اضطراب اور تشویش کا اظہار کیا تھا لیکن مسٹر شاستری نے اعلان کیا کہ بھارت اپنے داخلی

معاملات میں خارجی مداخلت برداشت نہیں کرسکتا۔ چنانچہ اس کے بعد سے کسی اشتعال انگیزی کے نتیجے میں جنگ چھڑ جانے کا امکان پیدا ہوگیا تھا۔

خط متارکۂ جنگ کی خلاف ورزی

پاکستان کے خلاف جنگ چھیڑنے کے لئے چار جواز قائم کئے گئے۔ سب سے پہلا مقبوضہ کشمیر میں مسلح افراد کا چوری چھپے داخلے کا عذر تھا۔ میرے نزدیک یہ ناقابل فہم اور نہایت کمزور عذر تھا۔ بھاری تعداد میں مسلح افراد کے کشمیر کے قلب تک گھستے چلے آنا اور ہماری فوج کی طرف سے ان کی راہ نہ روک سکنا ایک ایسی بات ہے جسے کوئی ذی فہم باور نہیں کرسکتا۔ مشرقی اور مغربی جرمنی' شمالی اور جنوبی کوریا اور شمالی اور جنوبی ویت نام بھی تو ایک دوسرے کے خلاف معاندت رکھتے ہیں۔ اور ان کے درمیان طویل سرحدیں لیکن ان کے ہاں مسلح افراج کے چوری چھپے گھس آنے کے واقعات کبھی رونما نہیں ہوئے۔ اگر ہوئی ہے تو براہِ راست جنگ ہوئی ہے۔ دوسرے پوچھنا چاہئے کہ مسلح افراد کے گھس آنے کے تدارک کیلئے آخر پاکستان سے تعاون کی درخواست کیوں کی گئی۔ ایسے ہنگامی حالات سے نمٹنے کا ہر ملک کو حق اور اختیار حاصل ہے۔ بھارت نے اس حق اور اختیار سے کیوں فائدہ نہ اٹھایا' پھر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مسلح افراد کی مداخلت کی روک تھام کیلئے خط متارکۂ جنگ کو پار کرنے اور پاکستان کی چوکیوں پر قبضہ کرنے کی کیوں ضرورت محسوس کی گئی۔ میرے نزدیک خط متارکۂ جنگ کو پار کرنا سلامتی کے تحفظ کیلئے نہیں بلکہ صریحاً ایک جوابی کارروائی تھی۔

چھمب پر پاکستان کا حملہ

چھمب پر پاکستان کے حملے کو جنگ کا ایک واقعہ کہا جاسکتا ہے کیوں کہ بعد کے واقعات کا اس سے گہرا تعلق ہے۔ بھارت کی طرف سے پنجاب میں عام حملے کے جواز میں کہا جاتا ہے کہ کشمیر میں بھارت کے مواصلات کو خطرہ پیدا ہوگیا تھا اور یہ کہ بھارتی فوجیں پاکستانی حملے کو روکنے کی اہلیت نہ رکھتی تھیں۔ سو دوسرے محاذ کھولنا ناگزیر ہوگئے۔ میں اس دلیل کو تسلیم نہیں کرتا۔ اولاً یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ مواصلات کو خطرہ کیسے ہو پیدا ہوا اور پھر ہماری بھارتی فوج حملہ کو کیوں نہ روک

سکی۔ یہ کہنے سے بھی بات نہیں بنے گی کہ پاکستان کی بکتر بند فوج خصوصاً پیٹن ٹینکوں کے مقابلے میں ہمارا دفاع چنداں مضبوط نہ تھا۔ اگر ہم بعد میں سینکڑوں پیٹن ٹینکوں کو تباہ کرنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں تو پہلے کیوں نہ تباہ نہ کیے گئے ۔ پھر اس صورت میں کہ بعد کے مقابلے میں اس وقت بہت کم تعداد میں ٹینک استعمال میں لائے گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم سیکٹر میں جہاں پیش بینی اور دور رسی کا فقدان رہا وہاں نہ دفاع کا کوئی مؤثر انتظام تھا۔ نہ ضروری تعداد میں فوج موجود تھی۔ اگر کشمیر میں اپنی پوزیشن کو قائم رکھنا مقصود تھا۔ تو پٹھان کوٹ سے جموں تک کے اہم ترین علاقے کا دفاع کیا جاتا۔ جموں کے جنوب کا علاقہ تو اس باب میں اور بھی زیادہ اہم تھا۔ اٹھارہ برس میں یہاں مناسب دفاعی انتظامات کیوں نہ کیے گئے۔؟

لاہور پر قبضہ؟

چھ ستمبر کی شام کو میں سیر سے واپس آیا تو میں نے یہ خبر سنی کہ ہماری فوجوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے لیکن دوسری صبح کو اخبارات سے پتہ چلا کہ کوئی قابل اعتناء واقعہ نہیں ہوا۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ ایک سو میل لمبے محاذ پر ہماری فوجیں حملہ کر رہی تھیں۔ اس حملے میں اور جرمنوں کے اس حملے میں جو انہوں نے ستمبر 1939ء میں پولینڈ پر کیا تھا۔ بڑی مماثلت تھی لیکن جہاں (پاک بھارت جنگ میں) فوجیں ایک جگہ اکٹھی ہو کر حملہ آور نہ ہوئیں۔ بلکہ طویل محاذ پر بکھری ہوئی تھیں۔ حملے اور دفاع دونوں حالتوں میں فوجوں کا ارتکاز ہمیشہ سود مند رہا ہے لیکن یہاں اس اصول کو بھلا دیا گیا۔ مئی 1940ء میں جرمنوں نے فرانس پر حملہ کیا تو چین سے موسیل تک 80 میل کے محاذ پر 44 ڈویژن فوج جنگ میں شریک تھی، یہی حال دوسرے محاذوں کا تھا۔

بھارتی حکومت نے ان مقامات تک کو اخفاء میں رکھا جہاں حملہ کیا گیا تھا اس ضمن میں "فوجی مقاصد" کو راز میں رکھنے کا بہانہ پیش کیا گیا۔ پاکستان کو علم نہیں تھا کہ حملہ کہاں کہاں ہو رہا ہے؟ پھر اخفاء کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے تو ریڈیو پاکستان کے نشریے سے پتہ چلا کہ امرتسر، فیروز پور اور گورداسپور کے علاقوں سے حملہ کیا گیا ہے۔ ان علاقوں کے باہمی بعد اور فاصلے

جنرل موسیٰ بی آر بی نہر کے کنارے بری محاذ دیکھ رہے ہیں

کو ملحوظ رکھیں تو حملوں کا منصوبہ بنانے والوں کی مہارت کا پول کھل جاتا ہے۔

یہی نہیں کہ حملوں کا منصوبہ غلط تھا بلکہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر انہیں روک دیا گیا۔ بھارتی حکام کی طرف سے اپنی فوج کی ناکامیوں کی پردہ پوشی کے لئے ہر قسم کے عذر پیش کئے گئے ہیں کہیں میدانی قلعہ بندیوں کو سدِراہ بتایا گیا اور کہیں نہروں کو۔ لیکن جنہوں نے حملوں کا منصوبہ بنایا تھا انہیں پاکستان کے دفاع کے بارے میں صحیح معلومات تو حاصل کر لینی چاہئیں تھیں اور پھر تاریخ میں یہ کوئی پہلا موقع تو نہیں تھا کہ کسی فوج کو میدانی مورچوں اور نہروں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

ہالینڈ کے وزیر اعظم نے چرچل سے کہا تھا کہ وہ ایک بٹن دبا کر دشمن کی راہ میں آبی رکاوٹیں کھڑی کر سکتا ہے لیکن جرمنوں نے ایک دن میں اس منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ انہوں نے نہروں پر پل باندھ لئے اور پانی چھوڑنے کے مراکز پر قبضہ کر لیا۔ بلجیم میں البرٹ نہر کو نہایت مؤثر حفاظتی مورچہ تسلیم کیا جاتا تھا لیکن جرمنوں نے صرف پانچ سو چھاتہ سپاہیوں کی مدد سے اس نہر پر قبضہ کر لیا لیکن پنجاب میں صورت مختلف رہی۔

اسی پر بس نہیں کی گئی بلکہ ایک کمزور حملے کے بعد دوسرے کمزور حملے کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ بھارتی عوام اور پارلیمنٹ کے ارکان ان حملوں پر بغلیں بجاتے رہے اور شیخیاں بگھارتے رہے کہ ہم نے پاکستان کو مزہ چکھا دیا ہے اور جیسی بڑی جنگ اسے چاہئے تھی ہم نے اس کے سر پر تھوپ دی ہے۔ جنگ واقعی بڑی لیکن قطعاً غیر مؤثر تھی۔ میں ان حملوں کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ البتہ سیالکوٹ کی جنگ کے متعلق چند باتیں کہنا بے محل نہ ہوگا۔ جنرل چودھری کا کہنا ہے کہ بھارتی فوج کا ارادہ سیالکوٹ پر قبضہ کرنا کبھی نہیں تھا لیکن بھارتی اخبارات اور محکمہ اطلاعات نے اس ضمن میں جو خبریں شائع کیں ان سے تو اس ''ارادے'' کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ 11ر ستمبر کو ایک خبر کی سرخی تھی...... ہمارے جوانوں کی سیالکوٹ کی طرف پیش قدمی...... 12 ستمبر کو...... سیالکوٹ کے علاقے میں بھارت کی مزید کامیابیاں۔ 14ر ستمبر کو...... لاہور' سیالکوٹ کے

علاقے میں ہماری کئی فتوحات...... 16 ستمبر......کو ہمارے جوانوں نے ریلوے لائن پر قبضہ کر لیا' سیالکوٹ کی طرف پیش قدمی جاری ہے...... 18 ستمبر کو...... سیالکوٹ کے علاقے میں گھمسان کی جنگ...... 20 ستمبر کو...... سیالکوٹ نصف سے زیادہ گھیرے میں لے لیا گیا...... 22 ستمبر کو...... سیالکوٹ کے علاقے میں 48 گھنٹے کا تعطل ختم ہو گیا......اور اس کے بعد جنگ بند ہو گئی۔

اب میں جنگی کارروائیوں کے نتائج کا اجمالی جائزہ لیتا ہوں۔

"جنگ میں ہم کوئی نتائج مرتب نہیں کر سکے۔ کوئی فائدہ تو رہا ایک طرف الٹا ہم پر دباؤ اور بوجھ بڑھ گیا ہے۔ سپاہیوں اور عوام کے لئے' بے نتیجہ جنگ سے زیادہ کوئی دوسری بات یا واقعہ حوصلہ شکن نہیں ہو سکتا۔

جنگ کے اثرات اور بوجھ کو صرف اسی صورت میں برداشت کرنے کی ہمت پیدا ہوتی ہے جب کوائف و واقعات پوری طرح آئینہ ہوں۔ پاکستان کو خواہ کتنا ہی نقصان پہنچا ہو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس کا جنگ جاری رکھنے کا عزم ماند نہیں پڑا۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پاکستان کے خلاف عام جنگ شروع کرتے وقت جنگی منصوبہ بندی سے لے کر جنگی چالوں تک کہیں بھی فکر و فہم کا شائبہ تک کارفرما نہیں رہا۔ ہر فیصلہ اور ہر قدم غلط تھا ان میں کوئی حکمت عملی نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہر فیصلہ جھنجھلاہٹ کے عالم میں محض انتقام لینے کی غرض سے کیا جا رہا ہے۔"

نہر کے کنارے

☆ایک منظر

☆چند ملاقاتیں

نہر...... کتنے ہی تاریخ ساز حقائق اور شجاعت کی کتنی داستانیں سینے میں لئے ...... خراماں خراماں چل رہی تھی۔ اس کے دائیں کنارے پر کچھ لوگ چلتے چلتے اینٹوں سے نشان زدہ ایک مقام پر آ کر رک گئے۔ ان میں ایک باوقار بزرگ نے سب سے پہلے بڑھ کر وہاں سے مٹی اٹھائی۔ سرخی مائل مٹی کو ہاتھ میں لے کر پیار سے بوسہ دیا۔ اسے اپنی آنکھوں سے لگایا۔ تو ان کی آنکھوں سے آب دار موتی گر کر مٹی میں جذب ہونے لگی۔

یہ بزرگ پاکستان کے اس عظیم فرزند کے عظیم باپ تھے۔ جس نے وطن مقدس کی حفاظت کرتے ہوئے اپنے جوان خون کا ایک ایک قطرہ اسی خاک پاک کے ذروں کی نذر کر دیا تھا اور اس مٹی کو اور مقدس بنا دیا تھا۔

چشم فلک جو تاریخ عالم کے اس عظیم مجاہد کی شجاعت اور جاں بازی کے کتنے ہی ولولہ انگیز معرکے اور روح پرور منظر دیکھ چکی تھی۔ مگر آج اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لا رہی تھی۔

وہ بزرگ آنکھیں نیم وا کیئے بے حس و حرکت وہاں کھڑے رہے۔ شاید بیٹے کی زندگی کے مختلف واقعات فلم کی طرح ان کے ذہن میں آ رہے تھے۔ دیکھنے والوں کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے اور سب نے مل کر دعا کی۔ نومبر 1965ء کی 21 رتاریخ تھی۔ ماسٹر محمد عبداللہ بھٹی پہلی دفعہ اپنے بیٹے کی شہادت گاہ دیکھنے کیلئے بی آر بی نہر پر تشریف لائے تھے۔

بٹالین کے افسروں نے انہیں وہاں پہنچانے کے لئے خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ نائک محمد افضل جیپ لے کر 8 بجے '54' نیئر ہوٹل پہنچ گیا۔ ایک دن قبل مجھے اس پروگرام کی اطلاع دی گئی

تھی۔ میں بھی اسی لمحہ نپیئر ہوٹل پہنچا تھا۔ 8:30 بجے جیپ روانہ ہوئی اور 9:25 بجے کے قریب ہم بٹالین ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔ بٹالین کے افسر چشم براہ تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل محمد ابراہم قریشی، میجر شفقت حسین خاں بلوچ، کیپٹن انور منیر الدین اڈجوٹنٹ، کیپٹن ارشد اور دوسرے افسروں نے شہید کے والد کا پرتپاک استقبال کیا۔

کرنل قریشی کے ساتھ ماسٹر جی نے میرا تعارف کرایا تو کرنل قریشی مسکرا کر کہنے لگے ''ان سے غائبانہ تعارف ہے۔ میجر عزیز بھٹی شہید کے متعلق ان کے دلچسپ مضامین 'امروز' میں نظر سے گزرتے رہتے ہیں''۔

میجر شفقت بلوچ کہنے لگے ''گزشتہ اتوار کا 'امروز' نہیں مل سکا۔ ہفتہ کے روز 13 نومبر کے اخبار میں یہ اعلان پڑھا تھا کہ سنڈے ایڈیشن میں میجر عزیز بھٹی شہید کی زندگی کے ایک دلچسپ واقعہ کے متعلق آپ کا ایک مضمون چھپے گا۔ مگر افسوس یہاں اتوار کا اخبار نہ مل سکا۔''

میں نے اخبار کا تراشہ ڈاک کے ذریعے بھجوانے کا وعدہ کیا۔

اتنے میں بی آر بی نہر کے لئے دو جیپیں تیار ہوئیں۔ ایک میں میجر بلوچ تھے اور دوسری میں کیپٹن انور منیر۔

کرنل قریشی شہید کے والد سے کہنے لگے۔ ابھی بریگیڈ کمانڈر تشریف لا رہے ہیں۔ میں ان کے ہمراہ رہوں گا۔ ورنہ مجھے آپ کے ساتھ نہر پر جانے میں خوشی ہوتی۔ آپ لنچ واپس آ کر یہیں تناول فرمائیں۔

ہم ذرا بڑھے ہی تھے کہ شفقت بلوچ کی جیپ کا پہیہ خراب ہو گیا۔ انہوں نے منیر سے کہا ۔آپ ان کو لے چلیں، میں بعد میں پہنچ جاؤں گا۔

10:30 بجے ہم بی آر بی نہر کے ٹوٹے ہوئے پل کے قریب پہنچ گئے۔ سامنے برکی نظر آ رہا تھا۔ لاہور سے 14 میل دور یہ تاریخی اور سندر آب جو پاک و ہند تاریخ کے چند اوراق لئے ہولے ہولے چل رہی تھی۔

نہر کی دوسری پٹڑی پر چند سکھ سپاہی ٹہل رہے تھے۔ برکی روڈ پر بھارتی باشندے آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔ اتنے میں بھارتی سپاہیوں اور ہمارے جوانوں کے مابین تکرار شروع ہو گئی۔ او پی پوسٹ کے سلسلے میں جھگڑا تھا۔ سٹینڈ ٹو ہو گیا۔ کشیدگی بڑھ گئی مگر معاملہ زیادہ نہ بڑھا۔ ٹوٹے ہوئے برکی پل کی سے شمال کی طرف نہر کے دائیں کنارے ایک فرلانگ کے قریب میجر عزیز کی شہادت گاہ ہے۔

شہادت گاہ پٹڑی کے اوپر ہے' جہاں شیل لگنے کے بعد پہلے گرے تھے۔ البتہ انہیں اٹھا کر جب ڈھلوان پر لایا گیا تو وہاں بھی کافی خون گرا تھا۔ دونوں مقامات پر خون سے مجرد آرٹ کے نمونے بنے ہوئے تھے۔ جہاں سے عقیدت مند لوگ وہ مٹی تبرکاً اٹھا کرے جاتے رہے ہیں جسے شہید نے اپنے مقدس خون سے شرف یاب کیا تھا اینٹوں سے ان جگہوں کو محفوظ کر دیا گیا تھا' شیشم کا ٹنڈ منڈ درخت پاس کھڑا تھا جو ٹینک کے پہلے گولے کا نشانہ بنا تھا۔ اینٹوں کا وہ ڈھیر بھی دیکھا جو گولہ باری سے پس گیا تھا۔ ماسٹر محمد عبداللہ نے پرنم آنکھوں سے بیٹے کے خون سے عطر بیز مٹی کو

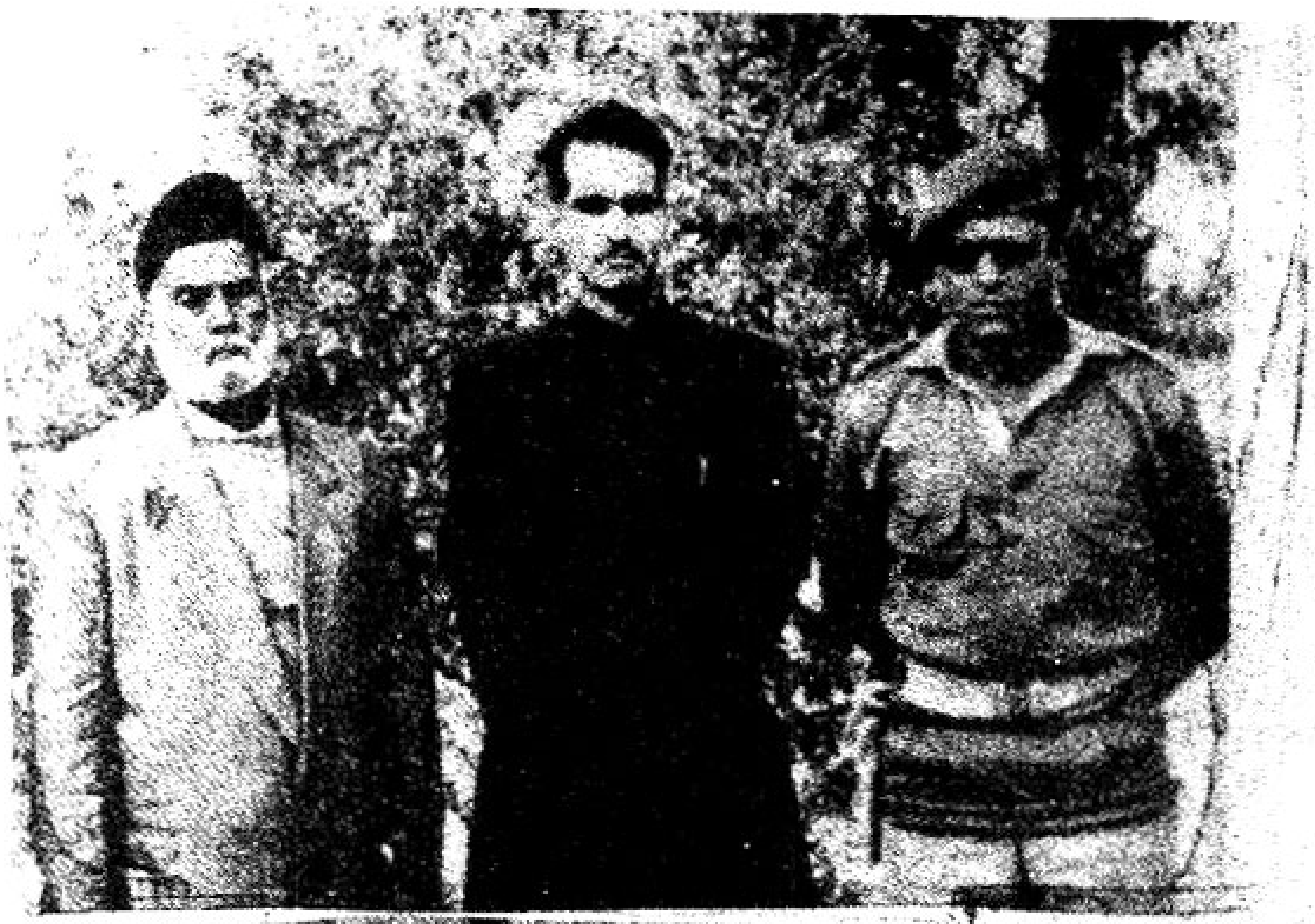

بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگاتی اور تبرک کے طور پر رومال میں باندھ لی۔

میجر عزیز بھٹی کے والد کی تشریف آوری کا سن کر سارے جوان اور افسر وہاں جمع ہو گئے' وہ شہید کے والد بزرگوار سے بڑے احترام کے ساتھ آ کر ملتے تھے۔ ان میں میجر بھٹی کی کمپنی کے نئے کمانڈر میجر سید علمدار حسین' صوبیدار غلام محمد' حوالدار اللہ دتہ' حوالدار محمد نذیر' حوالدار میجر فیض علی' نائک محمد اکرم اور سپاہی محمد امان بھی شامل تھے۔

وہ سب کے سب میجر شہید کی قائدانہ صلاحیتوں اور شجاعت کے عظیم کارناموں کی داستانیں سنا رہے تھے۔

میجر علمدار حسین نے کہا جب میں اس بٹالین میں آیا تھا تو شہید ابھی کیپٹن تھے۔ ان کی صلاحیتوں کا ہر کوئی معترف تھا۔ میں نے انہیں بطور سینئر آفیسر اور بطور دوست قریب سے دیکھا ہے۔ ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

صوبیدار غلام محمد نے میجر بھٹی کا آخری دن ہاتھ دکھانے کا واقعہ سنایا۔ اس نے کہا میجر شہید کو عین الیقین ہو چکا تھا کہ وہ جام شہادت پینے والے ہیں اور وہ اس یقین سے از حد مسرور تھے۔ سپاہی امان خان نے اپنی وہ وردی دکھائی جو شہید کی نعش کو نہر کی پٹڑی کے اُوپر سے نیچے ڈھلوان پر

لاتے ہوئے خون سے تر ہوئی تھی ۔اس نے ان کے آخری لمحات کی ادستان بھی سنائی کہ شہادت کے استقبال کیلئے انہوں نے کیونکہ تیاری کی تھی، کیپٹن انور منیر الدین انگشتری کا واقعہ سنا رہے تھے۔

اتنے میں میجر شفقت بلوچ بھی پہنچ گئے کاروں پر اور لوگ بھی میجر بھٹی کی شہادت گاہ کی زیارت کے لئے آ رہے تھے۔ وہ شہید کے والد بزرگوار سے ملی کو بہت خوش ہوئے' ان میں کچھ ریٹائرڈ فوجی افسر بھی تھے۔

کیپٹن انور منیر نے شہادت گاہ پر اور جوانوں کے ساتھ شہید کے والد کے فوٹو لیے جوانوں نے فوراً چائے کا انتظام کرلیا اور چائے اور فروٹ سے ہماری تواضع کی۔ ماسٹر محمد عبداللہ نے انہیں خطاب کرتے ہوئے ان کے کارناموں پر انہیں مبارکباد دی اور کہا ''آپ لوگوں کے نام تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ درخشاں رہیں گے' آپ وطن کے دفاع اور تحفظ کے لئے لڑ رہے ہیں۔ قدرت نے آپ کی مدد کی ہے۔ اور آپ نے ہر محاذ پر دشمن کو شکست دی ہے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر رہے''۔

شہید کے ساتھیوں ان کے شیروں اور جوانوں سے فروغ ہو کر واپس بٹالین ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے' کرنل قریشی ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ میجر شفقت بلوچ' شہید کی زندگی کے مختلف

واقعات اور جنگ میں ان کے کارناموں کی داستانیں سنا رہے تھے۔ وہ گھنٹوں ان کی تعریف میں رطب اللسان رہے۔

میجر شفقت بلوچ نے بتایا کہ مئی میں "رن کچھ" کے معرکے کے باعث دونوں ملکوں کی فوجیں محاذ پر تھیں۔ ہم بھی بر کی محاذ پر ڈٹے ہوئے تھے۔

اُن دونوں میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اطلاع ملی' میں اسی لمحہ چھٹی لے کر ہسپتال گیا۔ بچے کو جا کر دیکھا۔ خود ہی اس کے کان میں اذان دی اور واپس آ گیا۔

چند دنوں بعد (5 مئی کو) میجر عزیز بھٹی کے ہاں بھی لڑکا پیدا ہوا' یہ ان کا سب سے چھوٹا لڑکا جاوید اقبال ہے۔ میجر بھٹی کا اپنے بال بچوں کے ساتھ پیار مثالی تھا۔ اُسی دن انہیں بچے کی ولادت کی اطلاع ملی۔ مگر وہ چند میل دور اپنے بچے اور بیوی کو دیکھنے کیلئے لاہور تک نہ گئے۔ ہمیں معلوم ہوا' تو کمانڈنگ آفیسر نے ان کو بلا کر کہا کہ آپ گھر سے ہو آئیں اور بچے کو دیکھ آئیں مگر اُن کا احساس فرض دوسرے احساسات پر ہمیشہ غالب رہتا تھا۔ چند دن اصرار کے بعد بمشکل وہ گھر تک جانے پر آمادہ ہوئے۔

ان کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل ابراہیم قریشی نے بھی یہ واقعہ انہی الفاظ میں سنایا۔

کرنل قریشی

کرنل قریشی تشریف لے آئے۔ تر کھانا لگایا گیا۔

کھانے کی میز پر کرنل قریشی نے شہید کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ کھانے کے بعد ان کا دلچسپ پیرایہ بیان جاری تھا۔ انہوں نے اس امر کی تصدیق کی کہ انہوں نے شہید کو دو دفعہ واپس بلایا تھا۔ تاکہ آرام کر سکیں اور اُن کی بجائے کوئی اور افسر بھیج دیا جائے۔ ایک دفعہ تو وہ ٹال گئے' لیکن دوسری دفعہ میں نے ایک اہم کانفرنس کے بہانے انہیں بلا لیا۔ یہاں میں نے انہیں صاف صاف بتایا کہ انہیں آرام کرنے کیلئے بلایا ہے۔ مگر وہ آرام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کی باتیں سن کر اور ان کا شوق جہاد دیکھ کر میں انہیں پیچھے رہنے پر مجبور نہ کر سکا اور واپس جانے کی اجازت دے دی۔ ان

کے آخری الفاظ بھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اوران کی ملکوتی شکل نظروں کے سامنے ہے۔

میں آرام نہیں کرنا چاہتا۔ میں واپس نہیں آؤں گا۔ بلکہ اپنے پیارے وطن کی حفاظت کرتے ہوئے جام شہادت پینا پسندوں کروں گا۔

میں نے پوچھا کرنل صاحب! آپ نے شہید کے لئے نشان حیدر کی سفارش کی تھی تو کیا اُن کی شجاعت کا کوئی ایک یا زیادہ واقعات آپ کے پیش نظر تھے۔ یا برکی محاذ پران کی سارا کردار۔ اور کیا اُن کی سروس کے سابقہ شاندار ریکارڈ کا بھی اس اعزاز سے کوئی تعلق ہے۔

کرنل قریشی نے کہا: نشانہ حیدر کی سفارش کرتے وقت ان کی شجاعت کا کوئی ایک یا چند واقعات نہیں بلکہ اس محاذ پران کا سارا کردار میرے پیش نظر تھا۔ البتہ اس کا ان کی سروس کے سابقہ ریکارڈ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس محاذ شہید کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے کرنل قریشی نے کہا مجھے تاریخ سے بڑی دلچسپی ہے۔ کرنل قریشی مصنف بھی ہیں انہوں نے پنجاب رجمنٹ کی تاریخ لکھی ہے۔ جس کا پیش لفظ فیلڈ مارشل آکنلیک نے لکھا ہے۔

میں نے اس جنگ میں اپنے جوانوں اور بالخصوص میجر بھٹی کے کردار کا بغور مطالعہ کیا ہے

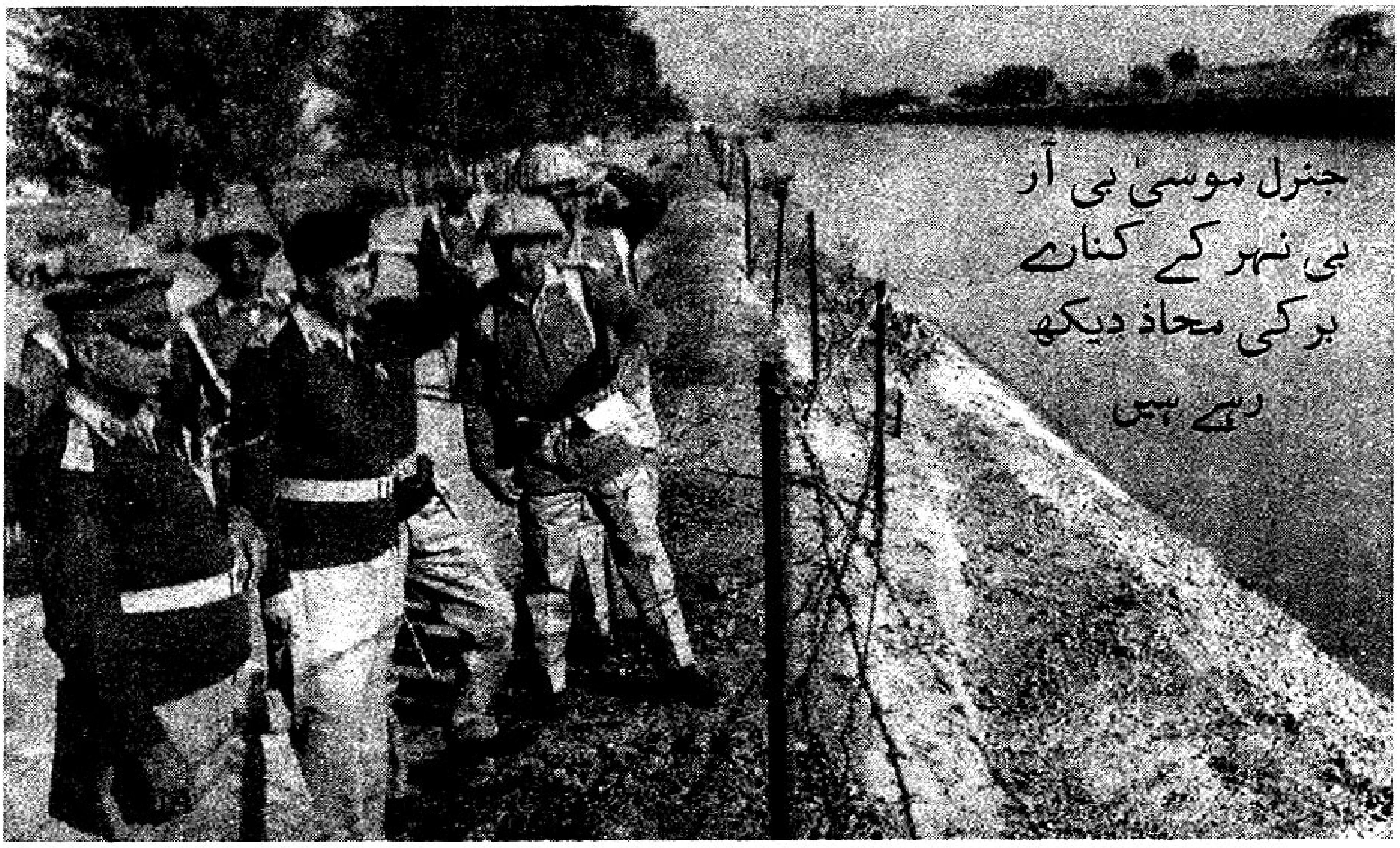

اوراس سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ عارضی جذبات کے تحت انسان ذاتی خظ سے بے نیاز ہو کر اپنے کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ یا ایسی حالت میں کہ اسے خطرے کی حقیقت کا پورا علم نہ ہو۔ انسان خطرناک سے خطرناک کارنامے سرانجام دے دیتا ہے۔ لیکن خطرے کی حقیقت کا بخوبی علم بھی ہو پھر انسان سوچ سمجھ کر جان ہتھیلی پر رکھ کر کسی بلند مقصد کیلئے اپنی جان کی قربانی پیش کرے۔ یہ بہت بڑی بات ہے ہمیں فخر ہے کہ ہماری فوج کا ایک ایک جوان اس معیار پر پورا اترا ہے۔ لیکن میجر عزیز بھٹی تو اس میدان جانبازی کا شہسوار نکلا ہے۔ اس نے چھ دن اور چھ راتیں اپنے تحفظ' اپنے آرام اور خوراک کی قطعی پرواہ نہ کرتے ہوئے شجاعت کے رہ کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ جو رہتی دنیا تک یاد رہیں گے۔ لیکن اُس نے اپنی کمان میں جوانوں کے آرام وراحت اور تازہ کھانے کا پورا انتظام رکھا۔ اس محاذ پر ہمارے پاس فوج کی اتنی کمی تھی کہ دشمن کی تعداد کے مقابلے میں ہماری کوئی نسبت ہی نہ تھی۔ ایسی حالت میں اگر ہمارے پاس عزیز بھٹی ایسی قائدانہ صلاحیتوں کے جانباز مجاہد نہ ہوتے تو دشمن کو روکنا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے پانچ دن نہ صرف دشمن کو برکی سے بہت آگے روکے رکھا۔ اُسے شدید نقصان پہنچایا۔ اور جب نہر سے ادھر آنا ناگزیر ہو گیا' تو اپنی جان خطرے میں ڈال کر جوانوں کو بحفاظت تمام ادھر لے آئے۔ کرنل قریشی نے میجر بھٹی کا ذکر کرتے ہوئے مزید کہا تاریخ میں شاز و نادر ہی ایسے حسین امتزاج دیکھنے میں آتے ہیں۔ کہ ایک انسان بیک وقت اتنا جانباز اور شجاعت بھی ہو۔ ذہین اور منتظم بھی۔ صاحب سیف بھی ہو اور صاحب قلم بھی ہو' عظیم قائدانہ صلاحیتوں کا مالک بھی ہو اور ایثار کا بلند جذبہ بھی رکھتا ہو۔ بلاشبہ شہید کو تاریخ عالم کے عظیم مجاہدین میں جگہ ملے گی۔

ماسٹر جی نے اپنے میزبانوں سے واپس جانے کی اجازت لی۔ بڑے احترام کے ساتھ سارے افسر ساتھ ہوئے اور دور تک الوداع کہنے آئے پرتپاک مصافحوں کے بعد ہم جیپ میں واپس ہوئے۔

صوبیدار میجر محمد شریف

دوسری دفعہ بی آر بی نہر پر گئے تو بٹالین ہیڈکوارٹر پر صوبیدار میجر محمد شریف سے بھی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ میں ملازمت کے دوران عموماً میجر بھٹی کے قریب رہا ہوں۔ جب وہ کاکول سے کمیشن حاصل کر کے ایبٹ آباد آئے تو میں وہاں انسٹرکٹر تھا کاکول کے زمانہ سے اُن کی بڑی شہرت تھی۔ مگر ان کی سادگی دیکھ کر حیرت ہوئی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ کمبل اوڑھ کر مسجد میں جایا کرتے تھے۔ اور نماز باجماعت ادا کیا کرتے تھے۔

ان میں کسی طرح کا احساس کمتری نہ تھا۔ برما سے ہمارے پاس دو وردیاں آزمائش کیلئے آئیں جنہیں پہن کر آدمی کا حلیہ عجیب سا بن جاتا ہے اور کوئی جوان انہیں پہننے کیلئے تیار نہیں تھا۔ نوجوان لیفٹیننٹ عزیز بھٹی نے سب سے پہلے اپنا نام پیش کیا۔ اور وردی پہنتے رہے۔

جب بٹالین اڈجوٹنٹ تھے تو اتفاق سے میں وہاں جمعدار اڈجوٹنٹ تھا۔ بٹالین کے سارے جوان اُن سے بڑے خوش تھے۔ وہ بلا تامل اپنی معروضات اڈجوٹنٹ بھٹی کے روبروپیش کرتے تھے۔ وہ جوانوں کی معمولی شکایات کا بھی باقاعدہ نوٹس لیتے تھے۔ اور جہاں مطمئن ہو جاتے ضروری اور فوری اقدامات کرتے تھے۔

کوئٹہ میں مجھے ان کے قریب رہنے کا موقعہ ملا۔ اسلامی شعائر کی انتہائی شدت سے پابندی کے باوجود انہوں نے زہد و تقویٰ کا لبادہ کبھی نہیں اوڑھا۔ وہ بڑے زندہ دل تھے۔ وہ انسانوں کی کمزوریوں کو سمجھتے اور انہیں درگزر کرتے تھے۔ وہ ذاتی معاملات میں دوسروں کو خطاؤں کو معاف کر دیتے تھے۔ مگر فوجی ڈسپلن کے بڑے پابند تھے۔

۱۲ ستمبر کو شہادت سے ایک دن قبل بٹالین ہیڈکوارٹر میں ان سے آخری ملاقات ہوئی۔

کرنل قریشی صاحب نے انہیں بلایا تھا کہ وہ پیچھے آ جائیں۔ آرام کرلیں۔ اور ان کی جگہ دوسرا افسر محاذ پر بھیج دیا جائے مگر وہ نہ مانے اور کرنل قریشی صاحب کو قائل کرلیا کہ انہیں برکی محاذ سے واپس نہ بلایا جائے۔

اس دن نذر محمد سپاہی کی نعش آئی تھی۔ میرے پاس تشریف لائے۔ مجھے کہنے لگے تجہیز و تکفین اور جنازہ وتدفین میں تاخیر نہ ہو۔ جنگ ہے کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ کس لمحہ کتنی لاشیں آ جائیں۔ وہ بظاہر بالکل مستعد اور چاک و چوبند تھے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ اُن کی آنکھیں اور جسم تکان سے چکنا چور ہے۔ میں نے پہلی دفعہ ان کے شیو بڑھی ہوئی دیکھی جب وہ کرسی پر بیٹھنے لگے تو مسلسل کھڑا رہنے کے باعث کمر اکڑی ہوئی تھی کرسی کے ساتھ پیٹھ لگاتے ہوئے ان کے چہرے کے خطوط سے دور کی ہلکی سی کیفیت نمایاں ہوگئی۔ مگر دوسرے لمحے اور اس تاثر پر قابو پا چکے تھے۔

وہاں سے اُٹھ کر تھوڑی دیر خیر اڈسٹری بیوٹری کے نیم گرم پانی میں نہائے تو بالکل تازہ دم نظر آ رہے تھے۔

قید سے واپسی

اس کے بعد کئی دفعہ نہر پر گئے ۔ معاہدہ تاشقند کے بعد ۹ مارچ کو پہلی دفعہ برکی گاؤں دیکھا......رات بھی وہیں گزاری ۔ چاندنی رات میں اس چوبارے پر چڑھ کر دیکھتے رہے کہ میجر عزیز شہید وہاں سے کیونکہ مشاہدہ کرتے تھے ۔ اتفاق سے اُن کے چوبارہ کے ساتھی بھی ابھی تک وہی تھے ۔ وہ دوربینوں سے ہمیں محاذ کا ایک ایک مقام دکھاتے رہے جہاں پر وہ دشمن پر گولہ باری کرواتے تھے ۔ ہم اس شہ نشین پر بیٹھے رہے جس کے ساتھ شہید کی یادیں وابستہ ہیں ۔

ہم ۱۸ گھنٹے وہاں رہے برکی ابھی سنسان پڑا تھا ۔ اس وقت تک سول آبادی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی ۔

اس دفعہ ان جوانوں سے بھی ملاقات ہوئی جو ۱۱/۱۰ ستمبر کی رات کو برکی محاذ پر دشمن کے گھیرے میں آ گئے تھے اور معاہدہ تاشقند کے بعد بھارت کی قید سے رہا ہوئے ۔ ان سے معلوم ہوا ۔

حوالدار اللہ دتہ' نائیک غلام حیدر ۔ لیس نائیک قطب شاہ' سپاہی عبدالعزیز' سپاہی عبداللہ خاں اور سپاہی عبدالرحمٰن ۱۱/۱۰ ستمبر کی رات کے حملے میں دشمن کے گھیرے میں آ گئے وہ آخری وقت تک مورچوں میں ڈٹے رہے تھے ۔ حوالدار اللہ دتہ اور سپاہی عبداللہ خاں اسی رات اور سپاہی عبدالرحمٰن دوسرے دن دشمن کے قابو میں آ گئے ۔ اور قید کر لیے گئے ۔ ہوا یوں کہ جہاں شہزاد شاہ ریکائل لیس رائفل لگائے ہوئے تھے ۔ اس کے دائیں بائیں دو باریں تھیں جن کا درمیانی فاصلہ 150 گز تھا ۔ میجر بھٹی' شہزاد شاہ کو حکم دے آئے تھے کہ وہ پیچھے چلا جائے اور مہر جاں 102 آر آر لے کر اس کی جگہ آ جائے گا ۔ چنانچہ شہزاد شاہ پیچھے چلا گیا لیکن مہر خاں ابھی نہیں پہنچا تھا کہ زبردست

بمباری شروع ہوگئی اور حملہ ہوگیا۔حتیٰ کہ برکی گھیرے میں آ گیا۔اور دشمن تمام ایریا میں پھیل گیا۔
دشمن کی ایک یونٹ برکہ کلاں کے اُوپر سے ہوکر آئی جس کی ایک کمپنی کھجور ایریا پہنچی اور دوسری کمپنی نے ان متذکرہ باروں کے اردگرد مورچے کھودنے شروع کیے' ان باروں میں 17 پنجاب کا ایک سیکشن تھا۔دائیں بار میں نائیک غلام حیدر' لیس نائیک قطب شاہ اور سپاہی عبدالرحمٰن تھے اور بائیں بار میں حوالدار اللہ دتہ' سپاہی عبداللہ خاں اور سپاہی عبدالعزیز تھے۔ان کا سیکشن کمانڈر حوالدار اللہ دتہ تھا۔ان میں سے نائیک غلام حیدر' لیس نائیک قطب شاہ اور سپاہی عبدالعزیز تو شدید بمباری اور حملہ کے دوران شہید ہوگئے اور سپاہی عبدالرحمٰن شدید زخمی ہوا۔
حملہ تھم گیا تو ساڑھے گیارہ بجے کے قریب حوالدار اللہ دتہ نے چاہا کہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی خبر لے۔ دوسری بار کی طرف جاتے ہوئے اس نے ابھی نصف فاصلہ طے کیا ہوگیا۔ کہ اردگرد مورچے کھودنے والے دشمن نے دیکھ لیا۔ دشمن کی وردی ہری تھی سکھ کمپنی تھی جن کے سروں پر پگڑیاں تھیں۔خاکی وردی اور ٹوپی دیکھ کر آواز آئی۔ ہینڈز اپ'' اور فوراً ہی آس پاس سے دشمن کے آٹھ دس سپاہی اس پر ٹوٹ پڑے۔انہوں نے اللہ دتہ کو قید کرلیا۔اور آنکھیں باندھ کر لے گئے' عبداللہ خاں اپنے مورچے میں ہی بیٹھا رہا۔ اللہ دتہ کی گرفتاری پر دشمن کو شک گزرا کہ یہاں مورچوں میں اور آدمی بھی ہیں۔ چنانچہ عبداللہ خاں بھی بارہ بجے کے قریب گرفتار ہوگیا۔عبدالرحمٰن شدید زخمی تھا۔لیکن اللہ دتہ کی گرفتاری کے وقت وہ دشمن سے آنکھ بچا کر نکل گیا۔زخموں سے بری طرح نڈھال تھا۔آگے جانے کی ہمت نہ تھی۔ چنانچہ برکی گاؤں میں ہی ٹھہر گیا۔مگر صبح دشمن نے اُسے بھی گرفتار کرلیا۔یہ تینوں ساتھی دہلی میں اکٹھے ہوگئے تھے۔
12 پنجاب کا نائب صوبیدار غلام قادر قید ہوکر ان کے بعد دہلی پہنچا۔اُس نے ان سب کو بتایا تھا کہ میجر بھٹی شہید ہوگئے ہیں' اور ان کو بعد شہادت' نشان حیدر کا اعزاز ملا ہے۔
نائیک غلام حیدر' لیس نائیک قطب شاہ اور عبدالعزیز کی نعشیں 25 فروری کے بعد برکی سے ملی گئی تھیں۔نائیک غلام حیدر کی جیب سے 62 پیسے' 102 روپے نکلے اور قطب شاہ کی جیب سے ایک

تسبیح، ایک پنجسورہ اور 50 پیسے۔ 56 روپے نکلے۔

میجر شبیر بخاری

صبح میجر شبیر بخاری سے ملاقات ہوئی۔ وہ عزیز شہید کے بڑے مداح تھے مگر سروس میں اکٹھے رہنے کا کبھی موقع نہ ملا۔ البتہ انہوں نے بتایا" مجھے ایک دفعہ سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹیکس کوئٹہ سے چارج دے کر فارغ ہونا تھا۔ کوہاٹ جو پوسٹ مجھے مل رہی تھی۔ وہ تبھی مل سکتی تھی کہ میں فوری طور پر جا کر چارج لے لوں۔ دوسری طرف ایک انسٹرکٹر سے دوسرے انسٹرکٹر کو چارج لینے میں چھ ہفتے لگتے ہیں۔ اس لیے کہ پہلے انسٹرکٹر نے اسے باقاعدہ ساتھ ساتھ تربیت دینا ہوتی ہے۔ مگر میں تو فوراً چارج دینے کے لیے بے قرار تھا۔ میری خوش قسمتی سے میری جگہ میجر عزیز بھٹی کی پوسٹنگ ہو گئی۔ میں فوراً کرنل (موجودہ بریگیڈیئر) امیر عبداللہ خاں نیازی کے پاس گیا۔ اور عرض کی کہ میں عزیز بھٹی کو کیا سمجھاؤں گا۔ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہو گا۔ عزیز بھٹی کی ذہانت اور صلاحیتوں سے کون واقف نہ تھا۔ انہوں نے مجھے اجازت دے دی کہ ہاں تم جس وقت چاہو چارج دے کر جا سکتے ہو۔ چنانچہ وہی چارج جسے کسی دوسرے افسر کے حوالے کرنے میں مجھے کم از کم ڈیڑھ ماہ لگ جاتا۔ میں صرف چھ گھنٹے کے اندر میجر عزیز بھٹی کے حوالے کر کے کوہاٹ کا ٹکٹ لے رہا تھا۔"

میجر شبیر بخاری کے پاس میجر شمیم علوی بھی موجود تھے۔ عزیز شہید کا ذکر سن کر کہنے لگے:

۱۹۵۰ء میں مَیں کالج کا طالب علم تھا۔ میرے والد میجر بشارت اللہ ۴/۱۶ پنجاب میں تھے اور عزیز بھٹی نئے نئے اس رجمنٹ میں شامل ہوئے تھے۔ ان کا بڑا شہرہ تھا۔ میں انہیں بالخصوص ملنے کے لیے گیا۔ وہ خاموش طبع ضرور تھے۔ مگر ان کی شخصیت میں ایک سحر تھا۔ ایک جادو تھا۔ اور کوئی شخص ان کی موجودگی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

(کتاب کی طباعت کے دوران یہ معلوم کر کے افسوس ہوا۔ کہ میجر غلام شبیر بخاری، مشہد کے قریب ایک حادثہ میں جاں بحق ہو گئے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

جنرل ٹِکّا خاں سے مُلاقات

میں نے پاکستانی فوج کی اس افسانوی شخصیت سے اس سلسلہ میں ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔تو جنرل صاحب نے مجھے 11 فروری 1966ء کو 11 بجے کا وقت دیا۔بعد میں میرے اپنے پروگرام میں کچھ ردوبدل ہوگیا۔اور میں 11 بجے کی بجائے ایک بجے بعد دوپہر سیالکوٹ پہنچا۔ڈویژنل ہیڈکوارٹرز کے باہر ایک بارڈ نے مجھے ہدایت کی کہ مَیں ٹیلی فون پر جنرل صاحب سے رابطہ قائم کرکے ان سے ملاقات کی اجازت لے لوں۔میں ٹیلی فون کرنے خیمہ کے اندر گیا۔تو آپریٹر نے پوچھا:

آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

گجرات سے۔

آپ وکیل صاحب ہیں؟

جی!

آپ بے شک ٹیلی فون نہ کریں۔جنرل صاحب دودفعہ آپ کا پوچھ چکے ہیں اور انتظار کر رہے ہیں۔آپ ان کے پاس تشریف لے چلیں۔ان کے اے،ڈی،سی کیپٹن رضا سے ملا۔تو وہ افسوس کرنے لگے کہ آپ کا بہت انتظار کیا ہے۔جنرل صاحب پابندیٔ وقت کا بہت خیال رکھتے تھے۔اب ایک بج رہا ہے ایک

بجے وہ کھانے کے لیے اُٹھ جاتے ہیں۔ اور آج اُن کی بچی بھی بیمار ہے۔ وہ بس جانے ہی والے ہیں۔ میں ان کو اطلاع تو کر دیتا ہوں مگر وہ شاید آپ کو زیادہ وقت نہ دے سکیں۔

اتنے میں جنرل صاحب کی چھوٹی بچی نسرین کا ٹیلی فون آیا وہ بیمار تھی اور کیپٹن رضا سے صابر کا پوچھ رہی تھی۔ حوالدار صابر، جنرل صاحب کا بٹ مین دس دن کی رخصت پر گھر گیا ہوا تھا۔ وہ اس سے بہت مانوس تھی اور ٹیلی فون پر بار بار صابر کا پوچھ رہی تھی۔

جنرل صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ ابھی تک وہ جنگ کے زمانے کے دفتر ـــــ پرانے کانفرنس روم ـــــ سے واپس امن کے زمانہ کے دفتر میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ (دوسرے دن منتقل ہوئے) میز پر فائلوں کے انبار کام کی کثرت کی غمازی کر رہے تھے۔

وہ اپنی مخصوص دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ اُٹھ کر بڑے تپاک سے ملے، مجھے تاخیر کا افسوس تھا۔ اس کے لیے معذرت کرنے لگا تو انہوں نے روک کر کہا ''کوئی ایسی بات نہیں، تاخیر ہو ہی جاتی ہے۔'' مجھے عزیز شہید کی سوانح حیات قلم بند کرنے کے ارادے پر دلی مبارکباد دی۔

اب جو عزیز بھٹی شہید کا ذکر شروع ہوا تو انہیں کھانا یاد رہا اور نہ اپنی پیاری بچی کی بیماری یاد تھی۔ انہوں نے بڑے احترام کے ساتھ عزیز کا نام لیتے ہوئے فرمایا۔ ''مجھے صرف پی ایم اے میں عزیز کا پہلا کمپنی کمانڈر رہونے کا ہی فخر حاصل نہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ عمر بھر تعلقِ خاطر رہا۔''

کوئٹہ سے آنے سے قبل ان سے وہاں اکثر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ میں جی او سی کوئٹہ تھا وہ بچوں سمیت ہمارے ہاں تشریف لاتے رہتے تھے۔

مجھے یاد آ رہا ہے ایک دن دونوں میاں بیوی کنٹین شاپ سے شاپنگ کے بعد پیدل ہی گھر جا رہے تھے اور میں کار پر باہر نکلا۔ تو میں نے گاڑی ٹھہرا کر ان کو لفٹ دی۔ راستہ میں مَیں نے عزیز سے پُوچھا۔

''عزیز آپ کا لڑکا بھی آپ کی طرح ذہین ہے؟''

کہنے لگے، ''نہیں، وہ اتنا ذہین نہیں ہے ______ !''

میں نے انہیں گھر کے قریب گاڑی سے اُتارا۔ افسوس وہ ہماری آخری ملاقات ثابت ہوئی۔

پی ایم اے کا ہیرا

جنرل ٹکا خاں نے کاکولو کا زمانہ یاد کر کے بتایا۔ پی ایم اے میں عزیز بھٹی ایک ہیرا تھا۔ اُس میں قدرت نے دل و دماغ کی بے پناہ صلاحیتیں یکجا کر دی تھیں۔ وہ بے حد ذہین تھا مگر نسبتاً خاموش تھا۔ تعلیم کے لحاظ سے وہ صرف میٹرک تھا۔ اور یہ اس کی بلکہ پاکستان کی خوش قسمتی ہے کہ اُس کورس میں میٹرک کو داخلہ کی اجازت تھی۔ اس کے ساتھ گریجویٹ اور ڈبل گریجویٹ بھی تھے۔ مگر وہ ہر میدان میں اپنے ساتھیوں کو مات کرتا چلا جاتا تھا۔ وہ بڑا سادہ، خاموش اور رعونت نا آشنا تھا۔ ان باتوں سے اُس کے سر میں احساسِ برتری کی ہوا نہیں بھرتی تھی۔ اس میں تعاون و ایثار کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اس کی شخصیت پیاری بھی تھی اور بارعب بھی۔

ابتدائی امتحان میں وہ تمام کیڈٹوں سے تعلیم میں اول رہا۔ عسکری تربیت میں بھی وہی اول تھا لیکن ہنوز اس کے پورے جوہر کھلے نہیں تھے۔ چنانچہ میں نے دو اور کیڈٹوں کو بھی اس کے ساتھ بریکٹ کر دیا۔ عزیز تو بعد میں بٹالین انڈر آفیسر بنا اور دوسرے دونوں کمپنی انڈر آفیسر بنے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہ لقمان محمود اور ظفر تھے۔ میرے بعد میجر عبدالحمید خاں دوسری ٹرم کے لیے ان کے کمپنی کمانڈر رہے۔ پاسنگ آؤٹ پریڈ پر عزیز کو دونوں اعزازات ملے تو مجھے بحیثیت اس کے پہلے کمپنی کمانڈر کے بے حد مسرت ہوئی۔

بہترین سٹاف آفیسر

پی ایم اے کے بعد عزیز کو انفنٹری کی کمان ملی۔ میں توپ خانہ میں تھا۔ البتہ جب میں جی ایچ کیو میں ڈائریکٹر آف سٹاف ڈیوٹیز مقرر ہوا۔ تو عزیز بھٹی فسٹ کور میں سٹاف آفیسر تھے۔ یہاں

اُن کی اَور بھی صلاحیتیں اُجاگر ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ وہ صرف بہترین کمپنی کمانڈر اور بہترین اڈجوئنٹ ہی نہیں ہیں۔ بحیثیت سٹاف آفیسر اُن کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ عزیز بھٹی کی ذہانت، معاملہ فہمی اور تجربہ کا صرف وہی لوگ صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ جنہیں ان کے ساتھ کام کرنے یا اس کا کام دیکھنے کا موقع ملا ہے۔

یہ باتیں کرتے ہوئے جنرل ٹکا خاں کو یاد آیا کہ بریگیڈیئر امیر عبداللہ خاں نیازی سیالکوٹ سیکٹر میں یہاں سے صرف گیارہ میل دور بڈیانہ ریسٹ ہاؤس میں ہیں۔ عزیز بھٹی، بریگیڈیئر نیازی کے پاس پانچ سال کوئٹہ میں رہے تھے اور نیازی صاحب اُن کے متعلق بہت کچھ جانتے ہیں۔

پونے تین بج رہے تھے، جنرل صاحب کا کھانا بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ دو دفعہ بچی کا ٹیلی فون آیا۔ اسے تکلیف تھی۔ اے ڈی سی کیپٹن رضا نے گزارش کی۔ ''میں بریگیڈیئر نیازی صاحب کو ٹیلی فون کر دیتا ہوں۔'' مگر جنرل صاحب نے کہا:

''نہیں! میں خود ٹیلی فون کرتا ہوں۔''

چنانچہ بڈیانہ ریسٹ ہاؤس ملا کر کہا ''ٹائیگر! کیا حال ہے...... گجرات سے ہمارے پاس ایک وکیل صاحب تشریف لائے ہیں...... یہ میجر عزیز بھٹی شہید کی زندگی پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں____ آپ سے بھی ملنا پسند کریں گے...... ساڑھے تین بجے تک آپ کے پاس پہنچ جائیں گے......

ریسیور رکھ کر جنرل صاحب نے کیپٹن رضا سے کہا۔ ان کے لیے ابھی جیپ تیار کراؤ اور آفیسرز میس میں کھانا لگواؤ۔ پھر معذرت کرتے ہوئے اُسی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ملایا اور کار میں بیٹھ کر تشریف لے گئے۔

بریگیڈیئر نیازی سے مُلاقات

تین بج کر دس منٹ پر جیپ بڈیانہ کے لیے تیار ہوگئی۔ فاصلہ تو صرف گیارہ میل تھا مگر سڑک بڑی خراب تھی۔ طویل خشک سالی کے بعد آج صبح سے بُوندا باندا ہو رہی تھی اور سڑک پر کیچڑ اور پھسلن تھی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ آج کرنل احمد خاں جی ا کی جیپ اس سڑک پر پھسل کر الٹ گئی تھی۔ کرنل صاحب کو تو معمولی خراشیں آئی ہیں۔ البتہ گاڑی وہاں خراب پڑی تھی۔ کپتان رضا نے ڈرائیور ____ عطا محمد ____ کو ہدایت کی کہ جیپ آہستہ آہستہ چلا کر بڈیانہ لے جائے۔

جیپ خراماں خراماں بڈیانہ روڈ پر جا رہی تھی۔ راستے میں مَیں نے دیکھا۔ کچھ لوگ گڈوں پر اپنا سامان رکھ کر گھروں کو واپس آرہے تھے۔ یہ ان دیہات کے رہنے والے تھے۔ جو میدانِ جنگ بنے رہے، لیکن جنگ بندی لائن سے پاکستان کی طرف واقع ہیں۔ اعلانِ تاشقند کے بعد 25 فروری کو تو سیالکوٹ کے وہ علاقے بھی خالی ہونے والے تھے۔ جو سرِ دست بھارت کے قبضہ میں تھے۔

دھرتی پر سیراب کھیتوں میں سے گاڑیاں اور ٹینک گزرنے کے نشانات ہنوز جوں کے توں قائم تھے۔ جنگ کے بعد نہ تو ان کھیتوں کو پانی دینے والے یہاں رہے اور نہ اب تک بارش ہوئی تھی۔ مجھے وہ نشانات پاکستان کے ماتھے پر غصہ کی سلوٹوں کی مانند نظر آرہے تھے۔ یوں

معلوم ہوتا تھا کہ بڑیانہ اور چونڈہ کے میدانوں میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد ایشیا کی سب سے بڑی ٹینکوں کی لڑائی میں بھارت ایسی طاقت کا سرِ پُرغرور توڑنے، لاہور پر قبضہ کرنے والوں کے سہانے خوابوں کے اونچے محلوں کو بی آر بی کے کنارے زمین بوس کرنے، کھیم کرن کے میدان اور راجستھان کے ریگ زاروں میں دشمن کے گھر جا کر اس کی گوشمالی کرنے اور چھمب جوڑیاں کے سبزہ زاروں اور کوہساروں میں اپنی برتری کا سکہ منوانے کے باوجود پاکستان کی پیشانی پر ابھرتی ہوئی یہ سلوٹیں اس امر کی آئینہ دار تھی کہ بھارت نے اعلانِ جنگ کیے بغیر بین الاقوامی سرحد عبور کر کے پاک سرزمین پر اپنا ناپاک قدم رکھنے کی جو جسارت کی ہے پاکستان اسے کبھی فراموش نہیں کرے گا!

ٹھیک ساڑھے تین بجے ہم بڑیانہ ریسٹ ہاؤس پہنچ چکے تھے۔ اندر اطلاع بھجوائی بریگیڈیئر نیازی ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوئے تھے۔ اسی لمحہ اندر بلوا لیا۔ ملیشیا کے شب خوابی کے لباس میں پلنگ پر دراز تھے۔ بڑی بے تکلفی سے ملے اور پوچھنے لگے ''آپ کو باہر انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔ میں ابھی سو کر اٹھا ہی ہوں۔''

''میں! میں بھی ابھی پہنچا ہوں۔''

سادگی

مشاہدہ میں آیا ہے کہ جو لوگ جتنے عظیم ہوتے ہیں اتنے ہی زیادہ سادگی پسند ہوتے ہیں اور تکلفات سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ جہاں تک مختلف محکموں کا تعلق ہے۔ موجودہ جنگ سے قبل فوج کے شعبہ سے کچھ ایسے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ البتہ اس جنگ میں اور اس کے بعد فوجیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ پاکستان میں سول افسروں اور اہلکارون سے ملنے والے لوگ اگر فوج کے افسروں اور جوانوں سے ملیں تو انہیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جون کے مہینے میں ملتان یا جیکب آباد میں رہتے ہوئے چند دنوں کے لیے مری یا ایبٹ آباد جانے کا اتفاق ہو جائے۔

مگر بریگیڈیئر نیازی صرف سادگی پسند ہی نہ تھے۔ ان کی تکلفات سے مطلق بے نیازی

میرے لیے خوشگوار حیرت کا باعث ہوئی۔ وہ شخص جس نے دوسری جنگِ عظیم میں کوہیما (برما) کے معرکہ میں ملٹری کراس حاصل کیا، موجودہ جنگ میں چونڈہ بڈیانہ محاذ پر دادِ شجاعت دیتے ہوئے ہلالِ جرأت حاصل کیا اور جس کی عسکری زندگی کا سارا ریکارڈ قابلِ فخر اور درخشاں ہے اس کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ پہلی نظر میں یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہی صاحب "بریگیڈیئر نیازی" ہیں!

پلنگ کے پاس چند آرام کرسیاں پڑی تھیں اردلی میز پر چائے کا سامان رکھ گیا۔ بریگیڈیئر نیازی چائے بنا رہے تھے اور باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ میرے مشن ...... میجر عزیز بھٹی کی سوانح حیات مرتب کرنے کے کام ____ سے تو جنرل ٹکا خاں نے ٹیلی فون پر انہیں آگاہ کر ہی دیا تھا۔ عزیز کا نام آتے ہی ان کی آنکھوں میں شہید کے لیے نہایت محبت و احترام کی جھلک دیکھ رہا تھا۔

"ٹائیگر" - "TIGER"

سب سے پہلے میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو "ٹائیگر" کیوں کہتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ خطاب انہیں پانچویں انڈین ڈویژن کے جنرل وارن Gen Warren نے برما کی جنگ میں دیا تھا۔ وہ ان کی بہادری اور شجاعت کے جنگی کارناموں سے بے حد متاثر تھے۔ اسی جنگ میں انہیں ملٹری کراس بھی ملا ____ نیازی صاحب میجر عزیز بھٹی کے متعلق باتیں کرنے کے لیے بے تاب تھے۔

کہنے لگے عزیز میرا بچہ تھا۔ عزیز میرا بھائی تھا۔ ہم پانچ سال تک اکٹھے رہے ہیں۔ اور جب کبھی مفارقت ہوئی۔ تو ایک دوسرے کو خط و کتابت کے ذریعے ملتے رہتے تھے۔

کیپٹن بھٹی

نوجوان کیپٹن عزیز بھٹی جنوری 1954ء میں پہلی دفعہ انسٹرکٹر بن کر سکول آف انفنٹری

قید سے واپسی

اس کے بعد کئی دفعہ نہر پر گئے۔ معاہدہ تاشقند کے بعد ۹ مارچ کو پہلی دفعہ برکی گاؤں دیکھا...... رات بھی وہیں گزاری۔ چاندنی رات میں اس چوبارے پر چڑھ کر دیکھتے رہے کہ میجر عزیز شہید وہاں سے کیونکہ مشاہدہ کرتے تھے۔ اتفاق سے اُن کے چوبارہ کے ساتھی بھی ابھی تک وہی تھے۔ وہ دوربینوں سے ہمیں محاذ کا ایک ایک مقام دکھاتے رہے جہاں پر وہ دشمن پر گولہ باری کرواتے تھے۔ ہم اس شہ نشین پر بیٹھے رہے جس کے ساتھ شہید کی یادیں وابستہ ہیں۔

ہم ۱۸ گھنٹے وہاں رہے برکی ابھی سنسان پڑا تھا۔ اس وقت تک سول آبادی کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

اس دفعہ ان جوانوں سے بھی ملاقات ہوئی جو ۱۱/۱۰ ستمبر کی رات کو برکی محاذ پر دشمن کے گھیرے میں آ گئے تھے اور معاہدہ تاشقند کے بعد بھارت کی قید سے رہا ہوئے۔ ان سے معلوم ہوا۔

حوالدار اللہ دتہ' نائیک غلام حیدر۔ لیس نائیک قطب شاہ' سپاہی عبدالعزیز' سپاہی عبداللہ خاں اور سپاہی عبدالرحمٰن ۱۱/۱۰ ستمبر کی رات کے حملے میں دشمن کے گھیرے میں آ گئے وہ آخری وقت تک موروچوں میں ڈٹے رہے تھے۔ حوالدار اللہ دتہ اور سپاہی عبداللہ خاں اسی رات اور سپاہی عبدالرحمٰن دوسرے دن دشمن کے قابو میں آ گئے۔ اور قید کر لیے گئے۔ ہوا یوں کہ جہاں شہزاد شاہ ریکائل لیس رائفل لگائے ہوئے تھے۔ اس کے دائیں بائیں دو باریں تھیں جن کا درمیانی فاصلہ 150 گز تھا۔ میجر بھٹی' شہزاد شاہ کو حکم دے آئے تھے کہ وہ پیچھے چلا جائے اور مہر جاں 102 آر آر لے کر اس کی جگہ آ جائے گا۔ چنانچہ شہزاد شاہ پیچھے چلا گیا لیکن مہر خاں ابھی نہیں پہنچا تھا کہ زبردست

تھیں۔ایک دن عزیز بھٹی نے شکایت کی کہ حبیب اللہ اور ظفر دونوں فیٹ 500 میں جا رہے تھے۔ حبیب اللہ کھڑے ہو کر چلا رہا تھا۔ میں نے کہا بھئی! تم نے ان کو وہیں روک کر ان کو ان کی گوشمالی کیوں نہ کی۔ کہنے لگے "میرے پاس آٹو سائیکل (پھٹپھٹی) تھی بھلا میں ان کو کیسے روک سکتا تھا۔" دوسری دفعہ میں نے بھٹی کو بتایا کہ حبیب اللہ کچے پر کار چلا رہا تھا۔اور ظفر بانٹ کے اوپر بیٹھا ہوا تھا اور دونوں شور مچاتے جاتے تھے۔ بریگیڈیئر نیازی نے بتایا۔عزیز بچوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ انہیں پڑھانے کے لیے خود وقت دیتا تھا۔ان کی تربیت کی طرف پُورا دھیان رکھتا تھا۔اور اُن کی شخصیت کو متوازن طریقہ سے ابھرنے کے مواقع فراہم کرتا تھا! وہ بچوں پر زیادہ سختی کے قائل نہ تھے البتہ وہ بچوں کے ساتھ مضبوط اور دوستانہ رویہ رکھتے۔ ان کے نزدیک بچوں کے بہتر کردار کی استواری کے لیے ڈسپلن کے ساتھ انہیں بے پناہ محبت اور افہام و تفہیم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

میری بچی گل رُخ اب تک کہتی ہے کہ "میرے لیے نائیلون کا جیسا کپڑا چچا جان بھٹی کینیڈا سے لائے تھے۔ مجھے فراک کے لیے ایسا ہی کپڑا لا کر دو۔" مگر ویسی نائیلون پھر نہیں ملی۔ سالہا سال تک وہ پھٹتا ہی نہیں تھا۔اب اس نے چچا کی یاد کے طور پر وہ فراک سنبھال کر رکھ دی ہے۔

جب انہیں ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کا خوفناک حادثہ پیش آیا تو عزیز بھٹی نے جس استقامت اور استقلالِ مزاج کے ساتھ اس حادثہ کو برداشت کیا۔ وہ ایک معجزہ سے کم نہیں۔ اُن دنوں اُن کے بچے آ کر ہمارے ہاں ٹھہرتے تھے۔

بھٹی نے تقسیمِ اوقات خوب کر رکھی تھی۔ نماز اور تلاوتِ قرآن ان کے روزانہ لائحہ عمل کے جُزو تھے۔ کلب میں کم جاتے تھے۔ البتہ کوئی ساتھ بُلا لے تو چلے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ مختلف افسر اُن سے مختلف زبانیں سیکھتے تھے۔ وہ ان کو بھی وقت دیتے تھے۔ انہیں جرمن، چینی اور جاپانی پر عبور تھا۔ ان کی انگریزی کا یہ عالم تھا کہ کینیڈ اسٹاف کالج کورس کرنے گئے۔ تو ایک خط میں لکھا "میری کاپی پر سُرخ نشان سب سے کم لگتے ہیں۔ یہاں انگریزوں کی انگریزی میرے برابر

نہیں۔"

ہانگ کانگ میں انگریزوں کے ساتھ رہنے کے باعث ان کا تلفظ بھی بالکل انگلش تھا۔ حافظہ بلا کا پایا تھا۔ ایک دفعہ اُنہیں کچھ نوٹ لکھوا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کاغذ پر تو کچھ نہیں لکھ رہے تھے۔ پوچھا بھئی لکھ نہیں رہے، ہو یاد کیسے رکھو گے؟ کہنے لگے "آپ بولتے جائیں میں نوٹ کر رہا ہوں۔" جب میں بول چکا تو انہوں نے سارا مضمون زبانی دہرا دیا۔ میں اُن کی ذہانت اور حافظہ پر حیران رہ گیا۔

بطور انسٹرکٹر وہ سب سے زیادہ کامیاب تھے۔ ان کے شاگرد افسران ان سے محبت کرتے تھے۔ اور جو کچھ وہ پڑھاتے وہ ان کے ذہن نشین ہو جاتا۔

وہ بڑے نام تھے مگر ان کی نرمی کبھی کمزوری کی حدود میں داخل نہیں ہوتی تھی۔ نرم ہونے کے باوجود وہ بڑے بارُعب تھے۔ ان کے کردار میں عجیب توازن تھا۔ "F" سے شروع ہونے والے یہ تین الفاظ WE WAS FAIR, FIRM AND FRIENDLY ان کے کردار کے مظہر تھے۔ وہ بے عیب ثابت قدم اور دل دار تھے۔ دوسروں کے ساتھ ان کا سلوک دوستانہ، مضبوط، منصفانہ اور مخلصانہ تھا۔

بظاہر یوں لگتا تھا کہ وہ بالکل لاپرواسے انسان ہیں۔ ان کی موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں ہر وقت خمار اور مستی رہتی تھی۔ میں نے شروع شروع میں ازراہِ مذاق پوچھا "بھئی! شراب تو نہیں پیتے ہو" کہنے لگے:

"یہ چھوٹے موٹے گناہ مَیں نے کبھی نہیں کیے۔"

دوست انہیں زندگی بیمہ کے لیے کہتے تھے۔ شروع شروع میں اس کی مخالفت کرتے تھے کہتے تھے اس خیال سے ایک طرح کے عدمِ توکل کا احساس ہوتا ہے۔ ہم کسی کے رازق نہیں ہیں۔" چنانچہ ایک دفعہ بڑے اصرار سے جب انہیں ایک پالیسی دلوائی تو عمداً اس کی اقساط نہ بھیج کر اس کو ختم کروا دیا۔ البتہ آگے چل کر جب اس مسئلہ پر خود مطمئن ہو گئے تو پھر زندگی بیمہ کروا لیا۔

آخری دفعہ کوئٹہ سے جب آئے تو ابھی اُن کا تھوڑا سا وقت باقی تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اگر وہ اب واپس چلے جائیں تو ان کو اپنی رجمنٹ میں سیکنڈ اِن کمان بننے کا موقع مل جائے گا۔ میں نے انہیں جلدی جلدی فارغ کر کے بھجوا دیا۔ وہ خود ایسی باتوں کی مطلق پرواہ نہیں کرتے تھے۔

"لذیذ بود حکایتے دراز تر گفتم" ____ کے مصداق بریگیڈیئر نیازی ان کی باتیں سنا رہے تھے۔ اور مَیں دامنِ قلب ونگاہ میں ان جواہر ریزوں کو سمیٹ رہا تھا۔ اس دوران میں دو دفعہ چائے آئی۔

سیالکوٹ کی جنگ

جب وہ موضوع ختم ہوا تو بریگیڈیئر نیازی سے اس جنگ میں سیالکوٹ کے محاذ کی داستان بنی سنی۔ میجر جنرل ابرار حسین کی کمان میں فوج نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔ ان کی تفصیلات اور جزئیات سے آگاہی ہوئی۔ پسرور، ظفروال، چونڈہ، بڈیانہ اور رکھ بابا بھورے شاہ کے معرکوں کی داستان سنی۔ جنگ کا پورا نقشہ سمجھے کے لیے ہم دوسرے کمرے میں نقشے کے پاس چلے گئے۔ بریگیڈیئر نیازی نے اس بات کی تصدیق کی کہ دشمن کا حملہ کامیابی کے ساتھ روکنے اور اسے پیچھے دھکیلنے کے بعد اب پیش قدمی ہمارے اختیار میں تھی۔ ہم اب دشمن کی مکاری اور عیاری کا بدلہ لینے کے لیے اس پر عملہ کرنا ہی چاہتے تھے، کہ جنگ بند ہوگئی۔ اور ہماری دلی آرزوئیں دلوں میں ہی رہ گئیں۔

میجر طُفیل مُحمّد شہید

اب شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ بریگیڈیئر نیازی سے بڑی نایاب قسم کی تصویریں حاصل کیں۔ اُن میں ان کی ایک فوٹو میجر طفیل محمد شہید نشانِ حیدر کے ساتھ بھی تھی۔ اس میں دونوں چائے پی رہے تھے۔ پوچھا۔ ''میجر طفیل محمد شہید بھی آپ کے ساتھ رہے ہیں؟'' کہنے لگے ''نہ صرف طفیل محمد بلکہ کیپٹن سرور شہید نشانِ حیدر سے ملنے کا شرف بھی حاصل ہے۔''

نیازی نے بتایا۔ کہ جب عزیز بھٹی شہید کوئٹہ سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹیکس میں انسٹرکٹر تھے۔ تو میجر طفیل محمد شہید بھی وہاں WEAPONS WING ونگ میں انسٹرکٹر تھے۔ وہ بے حد شریف الطبع، منکسر المزاج، بہادر اور شجاع انسان تھے۔ دونوں کی زندگیوں میں بہت سی خصوصیات مشترک تھیں۔

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ خٹک پوچھ رہے تھے۔ اب کہاں جانا ہے۔؟ نیازی ضلع میانوالی کے مخصوص لہجہ میں جواب دے رہے تھے۔ ''16 رفروری پچھوں پتہ لگسی۔ حالاں میانوالی نہیں ونجنا'' (یعنی 16 فروری کے بعد پتہ چلے گا۔ ابھی تو میانوالی جانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔)

بڈیانہ سے سیالکوٹ واپس آیا۔ شام ہو چکی تھی۔ کیپٹن رضا سے ملا تو انہوں نے بتایا کہ گجرات کے میجر شبیر بخاری بھی یہاں ہیں۔ وہ بھی میجر عزیز کے متعلق آپ کی معلومات میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ آج واپس نہ جائیں۔ ان سے تمہاری ملاقات کراتے ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ یہی وہ میجر بخاری ہیں جن کے ہاں 4 دسمبر 1958ء کے حادثہ کے بعد پہلی دفعہ بیگم بھٹی نے قیام کیا تھا۔

کیپٹن رضا کی شیرینی طبع نے آنے نہ دیا۔ کہنے لگے۔ آج رات اُس 'کاروان' گاڑی میں رات بسر کریں گے جس میں جنگ کے دوران جنرل ٹکا خاں دن رات رہتے تھے۔ یہ دو کمروں

پر مشتمل بڑی پُر تکلف گاڑی تھی۔اس میں پلنگ اور آرام کرسیاں لگی تھیں اور دیواروں پر جنگ کے نقشے آویزاں تھے۔

شام کے بعد سیالکوٹ کی سیر کی۔بُخاری رات کو نہ ملے،ان سے صبح ملنے کا پروگرام بنایا۔ رات خوب بارش ہوتی رہی۔طویل خشک سالی کے بعد اس بارش سے قحط کا خطرہ ٹل چکا تھا۔

آنسوؤں کا خراج

یہ 16 دسمبر 1965ء کی خاصی سرد سہ پہر تھی جب ہم اپنے ہیرو کی ابتدائی عسکری تربیت گاہ پہنچے۔ گیٹ پر متعین سنتری نے پوچھا' آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟ ہم نے اسے اپنا مقصد بتا کر دریافت کیا' اب تم ہی بتاؤ کہ ہمیں سب سے پہلے کن صاحب کے پاس جانا چاہئے' اس نے ذرا سوچ کر کہا میں آپ کو بٹالیں صوبیدار میجر کے پاس لے جاتا ہوں۔ رہی آپ کی رہنمائی کریں گے۔

کاکول کی فضاء میں سانس لیتے ہوئے اور ان سڑکوں پر چلتے ہوتے جن پر نوجوان عزیز بھٹی دو سال تک چلتا رہا' دل کی عجیب کیفیت تھی۔

پھرتے پھراتے گیٹ کیپر ہمیں ایک بلند وبالا اور صحت مند جوان کے پاس لے آیا یہی بٹالین صوبیدار میجر اور آنریری لیفٹیننٹ محمد اعظم تھے۔

میجر عزیز بھٹی کا نام سن کر ان کی آنکھوں میں عجیب چمک سی پیدا ہوئی' ان کی آنکھوں اور چہرے کے زاویے شہید کے لئے احترام ومحبت کی گہرائیوں کے آئینہ دار تھے۔

انہوں نے بتایا کہ ”کاکول آنے سے پہلے میں شہید کی بٹالین کا صوبیدار میجر تھا مجھے کافی عرصہ ان کے قریب رہنے کا شرف حاصل ہے“۔

ہمارے مشن پر وہ بڑے خوش ہوئے اور ہر امداد کا وعدہ کیا۔

عزیز بھٹی کی شخصیت ان ان کے ساتھ وابستہ یادوں کا ذکر آیا تو اُن کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ انہوں نے رومال سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا! عزیز بھٹی ان انسانوں میں سے تھے جو دنیا میں روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ میں آپ سے اُن کی کس کس خوبی کا ذکر کروں وہ ایک عظیم انسان تھے۔ ان کے دل میں احترام آدمیت اور دوسروں کے ساتھ ان کا حُسن اخلاق مثالی تھے۔ ان کا دل محبت اور ہم دردی کا سرچشمہ تھا۔ زندگی میں کسی انسان کو ان سے دکھ نہیں پہنچا ہوگا۔ وہ محبت و پیار کے موتی لٹاتے رہتے تھے۔

ان میں درویشانہ سادگی اور تحمل تھا' ہمیں جب ان کا حسن سلوک یاد آتا ہے۔ تو آنسو بے اختیار نکل آتے ہیں۔

رومال میں اپنے آنسوؤں کو جذب کرتے ہوئے لیفٹیننٹ محمد اعظم نے کہا۔ ہم میں سے جب بھی کوئی مشکل مسئلہ ان کے پاس لے کر جاتا تھا اور ان کے ہوتے ہوئے ہر کوئی اپنے سرکاری حتیٰ کہ نجی مسائل کیلئے ان کے پاس جاتا تھا' تو وہ پوری توجہ سے بات سنتے اور مشکل سے مشکل مسائل کا بھی کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیتے' کتنی پریشانی میں ان کے پاس جائیں۔ ان کا بات سنتے ہی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ یہ کہنا ”او صاحب! نیور مائنڈ لیٹ اس ٹرائی“۔

”صاحب! گھبرائیں مت۔ سب ٹھیک ہو جائے گا' آؤ کوشش تو کریں“۔

ہماری آدھی مشکل حل کر دیتا تھا۔ وہ سپاہیوں کے ساتھ اسی اپنائیت کے ساتھ ملتے تھے کہ ان کو برتری یا کمتری کا کوئی کامپلکس“ نہیں تھا۔

میں کئی محاذوں پر لڑ چکا ہوں۔ ان کی بے مثال شجاعت ان کی عظیم شہادت اور اتنا بڑا اعزاز ہم سب کیلئے باعث فخر ہے۔ مگر جب بھی ان کی جدائی کا تصور آتا ہے۔ تو عجیب احساسات ہوتے ہیں اس

جنگ میں میرا ایک عزیز شہید ہوا مگر میں گھر تک نہیں جا سکا مگر میجر عزیز بھٹی کی شہادت کا سن کر رہا نہ جا سکا' میں نے جب تک بی آر بی نہر پر اُن کی شہادت گاہ پر آنسوؤں کا خراج نہیں دیا اور ان کے ساتھیوں اور عزیزوں سے مل کر اظہار ہمدردی نہیں کیا تھا' میرے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا''۔

''سوانح نگاری اور ہمارے ہیرو''

میجر احسان الحق ڈار

جی ایچ کیو میں میجر احسان الحق ڈار نے اُس دن اپنے نئے فرائض کا چارج سنبھالا تھا۔ بڑے تپاک سے ملے' ملاقات کا مقصد سن کر انہیں حیرت ہوئی کہنے لگے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہمارے ہاں تو اس کا کوئی رواج بھی نہیں ہے۔ ہم تو ڈیوک آف ولنگٹن اور لارڈ نیلسن کی سوانح عمریاں پڑھتے ہیں۔

ہم آنے والی نسلوں کو بھی صرف یہی ذہن نشین کراتے رہیں گے۔ کہ واٹرلو کی جنگ کیلئے آرتھر ولزلی نے ایٹن کے کھیل کے میدانوں میں تیاری کی تھی۔ مگر ہم یہ جاننے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کریں گے۔ کہ وہ برق پارے...... شجاعت کے وہ مجسمے جنہوں نے بھارت کے سیلاب آتش کو آگے بڑھ کر نہ صرف روک دیا' بلکہ اُس کا رخ موڑ دیا...... کون تھے؟ وہ کہاں سے آئے تھے؟ شمع وطن پر دہ پروانہ وار کیوں کر نثار ہو گئے؟ ملک وملت کے ساتھ عشق ومحبت کا یہ درس وہ کس مکتب میں لیتے رہے تھے؟ بی آر بی کے کناروں اور چونڈہ کے وسیع میدانوں میں عظیم الشان معر کے سر کرنے کیلئے وہ کہاں تیاری کرتے رہے تھے؟

پھر مسکرا کر کہنے لگے۔ آپ بڑے باہمت لوگ ہیں' تلاش مشرق میں نکلے ہیں۔ بلاشبہ آپ نے ایک عظیم کام کا بڑا اٹھایا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی قومی خدمت ہے۔ ہماری قومی غیرت اور حمیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو پہچانیں۔ اپنے عظیم انسانوں اور اپنے ہیروں کو پہچانیں۔ بلا شبہ ان کی زندگیاں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔

سوانح نگاری کے موضوع پر بات چل نکلی۔ تو میجر ڈار کہنے لگے۔ ہمیں اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہمارے ہاں فن سوانح نگاری مغرب سے بہت پیچھے ہے۔ ہمارے سوانح ادب میں تحقیق کا

عنصر بہت مختصر ہے۔ ہمارے ہاں ابھی تک عظیم شخصیتوں کو یونانی دیوتاؤں کو شکل میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ جن کی تقلید عام انسانوں کیلئے ممکن نہ ہو' فن سوانح نگاری واقعیت پسندی اور ہیرو کی انفرادیت کو اُبھارے بغیر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ قاری کی دلچسپی اپنے ہیرو کے ساتھ بطور ایک انسان کے ہوتی ہے' دیوتا کے نہیں' جب تک قاری موضوع کے دکھوں' غموں اور اس کی خوشیوں میں برابر کا شریک نہیں ہوگا۔ وہ اس کی شخصیت سے اثر پذیر نہیں ہوگا۔

میجر عزیز بھٹی شہید کا ذکر ہوا تو کہنے لگے۔ میری اُن سے پندرہ سال سے زیادہ عرصہ تک رفاقت رہی ہے' ہم ایک رجمنٹ میں اکٹھے ہی فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس دوران میں مجھے انہیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا اور میں اُن کے اعلیٰ سپاہیانہ اوصاف اور بلند انسانی کردار کا معترف ہوں۔

میجر بھٹی میں کچھ باتیں بڑی عجیب تھیں۔ وہ طبعاً شرمیلے اور خلوت پسند تھے۔ کبھی کبھی وہ یک لخت خاموش کے ہو جاتے تھے۔

اسکے باوجود وہ بڑے سوشل اور زندہ دل تھے۔ اور دوسروں کے ساتھ فوراً گھل مل جاتے تھے۔ وہ محفل کی جان تھے اور اپنے لطیفوں اور موسیقی سے محفل کو خوب گرماتے تھے۔

دیکھنے میں ڈھیلے ڈھالے اور غیر حاضر دماغ سے لگتے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں خمار سا رہتا تھا۔ بظاہر وہ لاپرواہ سے دکھائی دیتے تھے۔ مگر حقیقت میں وہ بڑے مستعد بلا کے حاضر دماغ اور ہمیشہ لڑنے متوجہ پائے جاتے تھے' انٹیلی جنس کورس میں ایک دفعہ ایک انسٹرکٹر کو ان کی خمار آلود آنکھوں سے شک گزرا کر وہ سو رہے ہیں' پر چھنے پر بھٹی نے جواب نفی میں دیا' تو انسٹرکٹر کو یقین نہ آیا اور انہوں نے استفسار کیا کہ کیا وہ یہ بتا سکتے ہیں کہ ابھی انہیں کیا پڑھایا جا رہا تھا؟ بھٹی نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے انسٹرکٹر سے اجازت لی اور سٹیج پر آ کر ان دن کا سارے کا سارا سبق دہرا دیا۔ انسٹرکٹر حیرت زدہ ہوئے مجھے یاد ہے کہ کورس کے اختتام پر عزیز بھٹی ہی اس میں بھی اوّل آئے تھے۔

وہ زندگی میں سادگی پسند اور کفایت شعار تھے۔ مگر دوسروں کی امداد اور نیک کاموں پر فراخ دلی سے خرچ کرتے تھے۔ بڑے آزاد خیال تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسلامی شعائر کے سختی سے پابند تھے۔ نماز اور تلاوت قرآن مجید باقاعدگی سے کرتے تھے۔ روزہ کبھی قضا نہیں کیا۔ خواہ کتنے ہی کٹھن دن ہوں۔ شراب سے مکمل اجتناب تھا۔ سگریٹ تک نہیں پیتے تھے۔ اوّل تو ان کے پاس پیسے کبھی جمع نہیں ہوتے تھے، لیکن اگر کبھی جمع ہو جائیں تو پائی پائی کا حساب کر کے زکوٰۃ دیتے تھے۔ وہ مستحق افراد اور اداروں کی امداد کے لئے ہمیشہ کمربستہ رہتے تھے۔

ہانگ کانگ میں جاپانی تسلط کے دوران انہیں جاپانی ڈسپلن کی چکی میں پسنا پڑا۔ اس زمانے کی سختیاں اور کڑا نظم وضبط ان کے دل و دماغ پر اپنے امٹ اثرات مرتسم کر گیا۔ اُن دنوں کی یاد زندگی بھر نہیں بھلا سکے۔ ان کا چہرہ اپنی معصومیت کے باوجود اُن طوفانوں سے آشنا معلوم ہوتا تھا۔ جو ایک نوجوان کو قبل از وقت سنجیدہ بنا دیتے ہیں۔ میجر بھٹی کا انگریزی تلفظ بالکل انگریزوں جیسا تھا۔ اور حافظ بلا کا پایا تھا۔ میں نے دو دفعہ اُن سے شرط باندھی۔ مگر دونوں دفعہ ہار گیا۔

وہ جرمن زبان کے ترجمان تھے۔ اور انہیں اپنی جرمن دانی پر بڑا ناز تھا۔ وہ گرنٹے کا اکثر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

چینی زبان بھی خوب جانتے تھے۔ مگر ایک دفعہ ان کی چینی زبان دانی کا لطیفہ بن گیا۔ چلن کے ایک ملٹری اتاشی آئے۔ میجر عزیز کے ساتھ چینی میں بات کرنے لگے۔ تو نہ میجر عزیز بھٹی ان کی بات سمجھ سکے۔ نہ عزیز بھٹی کی بات وہ سمجھ سکے۔ اس پر ہم سب کو بڑا تعجب ہوا، مگر ترجمان نے ہماری حیرت کو یہ کہہ کر دور کر دیا کہ چین میں شمالی چین اور جنوبی چین کی زبانوں میں اتنا ہی بعد ہے، جتنا مغربی پاکستان کی اُردو اور مشرقی پاکستان کی بنگلہ میں ملٹری اتاشی صرف شمالی چین کی زبان جانتے ہیں۔ جب کہ میجر عزیز بھٹی صرف جنوبی چین کی زبان بول اور سمجھ سکتے ہیں۔

میجر بھٹی کو اپنے بال بچوں سے بے حد پیار تھا۔ اُن کی تعلیم و تربیت کے لئے خاصا وقت دیتے تھے۔

میجر ڈار کہنے لگے۔ مجھے یاد آ رہا ہے کو بھارتی حملہ سے تھوڑے دن قبل لیفٹیننٹ کرنل آر ڈی خاں کے دفتر میں اُن سے ملاقات ہو گئی' بغل گیر ہو کر ملے۔ یہ معانقہ غیر معمولی پر جوش تھا۔ یوں جیسے بچھڑ کر کہیں بہت دور جا رہے ہوں۔ مگر کیا خبر تھی کہ ملاقات ہماری آخری ملاقات ثابت ہو گی!

ان سرسری باتوں کے علاوہ انہوں نے میجر بھٹی کے متعلق مزید یادداشتیں لکھنے کا وعدہ کیا۔

اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ کسی زمانہ میں میجر عزیز بھٹی اور میجر احسان الحق ڈار کے آپس میں کچھ اختلافات ہو گئے تھے۔ میجر ڈار بھی اپنی رجمنٹ میں ایک لائق افسر ہیں' معاصرانہ مسابقت اختلاف کی شکل اختیار کر گئی۔ مگر شکوک وشبہات دور ہونے پر وہ پھر دوست بن گئے۔

میں نے انہیں لکھا کہ وہ میجر بھٹی کی شخصیت کے اُس پہلو پر روشنی ڈالیں کہ بطور مخالف اُن کا کردار کیسا تھا؟ میری مشکل یہ تھی کہ مجھے اس ساری تلاش میں شہید کے مداح بلکہ بے حد مداح تو بہت ملتے تھے۔ مگر ایسا شخص کوئی نہ مل سکا جس کے ساتھ اُن کا اختلاف بھی رہا ہو۔

میجر احسان الحق ڈار کا خط ملا۔ جس میں وہ لکھتے ہیں۔

جی۔ ایچ۔ کیو راولپنڈی ازطرف میجر احسان الحق ڈار

۲۵ رجنوری ۱۹۶۶ء محترمی اصغر صاحب

آپ کے ۲۰ رجنوری ۱۹۶۶ء کے خط کا بہت بہت شکریہ

میرے دل میں میجر راجہ عزیز بھٹی شہید نشان حیدر کیلئے انتہائی عزت واحترام ہے۔ ان معمولی غلط فہمیوں کے باوجود جو پندرہ سال طویل رفاقت میں ناگزیر ہیں' ہماری دوستی کبھی متاثر نہیں ہوئی۔

میری ذاتی رائے یہ ہے سوانح عمری کی بنیاد استدلال اور معقولیت پر ہونی چاہیے نہ کہ

اندھی ستائش اور پرستش پر مثال کے طور پر علامہ اقبال مرحوم کی شخصیت ایسی کوششوں اور اسی طریق عمل کے باعث گم ہو کر رہ گئی ہے۔

ہم انہیں نہیں جانتے۔ ہم ان کی انسان کمزوریوں اور غلطیوں سے آگاہ نہیں ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ بڑے آدمی کی زندگی کے اہم امور اس کی کمزوریوں کی نسبت کہیں بھاری ہوتے ہیں' نیز بڑے آدمی آخرالامر انسان ہی ہوتے ہیں پیغمبر نہیں ہوتے۔

میجر عزیز بھٹی کا سلسلۂ عمل حکمت ربی کے تحت منقطع ہو گیا۔ مگر ان کی زندگی اپنے کمال کو پہنچ گئی۔

جب ہم اُن کی زندگی کا جائزہ ایک سپاہی کی حیثیت سے لیں گے' تو ان کی کمپنی کمانڈر کی پوزیشن ہمارے پیش نظر رہے گی۔ انہوں نے اپنے تئیں ایک غیر معمولی بہادر سپاہی ثابت کیا ہے۔ وہ ہر دلعزیز تھے۔ اچھے معلم تھے اور ایک اچھے اور لائق سٹاف افسر تھے۔

پیشتر اس کے کہ آپ ان کو سوانح حیات لکھنا شروع کریں۔ میری تجویز یہ ہے کہ آپ سوانحی نوعیت کی چند فوجی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ ایسی وہ کتابیں جو میرے ذہن میں آ رہی ہیں' حسب ذیل ہیں:۔

ا۔ مارک آو دی لاتے ان

۲۔ چے شارڈی۔ سی دیہ ہوائی فوج کے ایک افسر کی داستان حیات ہے' یہ کتابیں آپ کو فوجی اصطلاحات سے متعارف کرائیں گی۔ نیز آپ کو ان کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس قسم کی سوانح عمری کو معنوی لحاظ سے کس گہرائی کا حامل ہونا چاہئے۔ بھٹو کی زندگی میں وہ موثرات قومی اور نمایاں تھے۔ ان میں ایک تو ان کا کشمیری النسل ہونا اور دوسرے وہ کشاکش اور جدوجہد جس سے لڑکپن میں اور بعدہ ہوائی فوج کے ایک نوجوان سپاہی کی حیثیت سے انہیں دوچار ہونا پڑا۔

مجھے افسوس ہے کہ اپنی موجودہ مصروفیات کی وجہ سے میرے لئے اس سے زیادہ لکھنا ممکن نہیں ہے۔

آپ کا مخلص ...... احسان

عزیزوں کے تاثرات

”میرے ابا جان“

ستمبر 1965ء کی 20 تاریخ تھی ۔ اور ہمارے سکول کا آخری گھنٹہ تھا کہ بورڈنگ ہاؤس کے ڈائریکٹر فادر گاڈفرے ہمارے کلاس رُوم میں آئے اور مجھے باہر بلایا۔ وہ خاموشی سے مجھے باہر اپنی کار کے پاس لے گئے' اور ہم اس میں سوار ہو کر سکول سے باہر چلے گئے۔

مجھے علم تھا کہ میرے والد بزرگوار لاہور کے محاذ پر لڑ رہے ہیں' اس لئے فادر گاڈفرے کی خاموشی سے میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ صرف اس قدر کہہ سکے: ”میں تمہارے لئے بڑی المناک خبر لایا ہوں' تمہارے ابا لڑائی میں شہید ہو گئے ہیں“۔ اور اتنا کہ کر وہ مجھے حوصلہ دلانے کے لئے شفقت سے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ مجھ پر چند لمحوں تک سکتہ کا عالم طاری رہا اور پھر میں یکا یک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا فادر گاڈفرے مجھے اسی طرح موٹر کار میں بٹھائے کوئٹہ کی ان تمام سڑکوں پر گھماتے رہے جو میں نے پہلے سے دیکھی ہوئی تھیں۔ اس وقت یہ تمام سڑکیں سنسان تھیں۔ انہوں نے آخر موٹر کار ایک درخت کے تلے روک کر جیب سے ایک خط نکالا یہ خط میرے دادا جان کا تھا۔ اور نہایت مختصر اور رسمی سا خط تھا۔ جس میں محض یہ لکھا ہوا تھا کہ تمہارے ابا خدا کو پیارے ہو گئے ہیں ۔ اپنی پڑھائی پوری محنت سے جاری رکھو۔ فادر گاڈفرے نے یہ خط سنا کر میری تسکین قلب کے لئے چند اور فقرے کہے۔

لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اُن کی آواز کہیں بہت دور سے سنائی دے رہی ہے' اور ان کے الفاظ مطلقاً میری سمجھ میں نہ آ رہے تھے۔

میرے دل میں بیک وقت سینکڑوں خیالات اٹھے:

ظفر، فادر گاڈ فرے کے ساتھ

''میری ماں کا اور میرے بھائیوں اور بہنوں کا کیا ہوگا؟ وہ اب کہاں جائیں گے؟'' ان خیالات سے مجھے پھر رونا آنے لگا لیکن میں اپنے آنسو پی کر رہ گیا۔ ہم بورڈنگ ہاؤس واپس پہنچے۔ فادر گاڈ فرے نے مجھے اپنے کمرے میں پلنگ پر لٹا دیا اور خود باہر چلے گئے۔ جب میں تنہا رہ گیا تو جی بھر کر رویا۔ حتیٰ کہ میری آنکھوں کر درد محسوس ہونے لگا اور میں اسی طرح روتا روتا سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو شام پڑ چکی تھی' میں کمرے سے باہر نکلا' باہر مجھے چند لڑکے ملے جنہوں نے میرے ساتھ تعزیت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ مگر میرا جی چاہتا کر انہیں کہوں: نہیں نہیں میرے والد صاحب زندہ ہیں۔ ابھی تو ایک ہفتہ ہی گزرا ہے کہ میں اُن سے مل کر آیا ہوں۔ لیکن میں یہ الفاظ ادا نہ کر سکا۔ میرا سر جھک گیا اور وہ ہمدردی کے جو الفاظ بھی ادا کرتے رہے چپ چاپ سنتا چلا گیا۔ اگلے دو دن تک بھی میں قطعی طور پر خالی الذہن رہا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ اس دوران کیا ہوا یا

میں نے کیا کچھ کیا۔ مجھے بار بار اپنے بھائیوں' اپنی بہنوں اور اپنی ماں کا خیال کھائے چلا جار ہا تھا۔ ان دو دنوں میں ہزار کوشش کے باوجود بھی میں اپنے سکول کے کام میں ذہن نہ لگا سکا اپنی حالت سے مجھے یہ معلوم ہو چکا ہے' میں معمول کے مطابق ایسی صورت میں کام کر سکتا ہوں جب کسی اور کا خیال میرے ذہن میں نہ ہو۔

اسی ماہ کی 29 تاریخ کو میں نے ریڈیو پر یہ خبر سنی کو میرے شہید والد کو بہادری کا سب سے بڑا اعزاز نشان حیدر دیا گیا ہے۔ میں صما بکما ریڈیو کی خبر میں شہید باپ کے شان دار کارنامے کی تفصیل سنتا رہا اور پھر ذہنی طور پر تھک کر چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ تمام لڑکے مجھے میرے شہید ابا کی عدیم المثال شجاعت پر مبارک باد پیش کرنے لگے۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ میں اس وقت کیا کروں' پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دوں یا خوشی محسوس کروں؟ مجھ پر کامل سکوت سا طاری رہا۔ اور میرا چہرہ بھی ہر قسم کے تاثرات سے خالی تھا۔ آہ! ایسی گھڑیوں میں کس قدر بیچارگی اور کسمپرسی محسوس ہوتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ گویا سب کچھ لٹ لٹا گیا ہے۔

میں صرف باپ کی شفقت کے سایہ ہی سے محروم نہیں ہو چکا تھا بلکہ ایسے باپ سے محروم ہو گیا تھا۔ جو میرے حقیقی دوست تھے' جو مجھے ہر پہلو سے سمجھ سکتے اور میرے محسوسات کو خود محسوس کرنے والے تھے جو ایسے موقعوں پر بھی میرے ساتھ اور مددگار ہوا کرتے تھے' جب باقی ساری دنیا میرے خلاف نبرد آزما ہوا کرتی تھی۔

مجھے اپنے شہید باپ کی شجاعت پر بجا طور پر فخر اور ناز ہے لیکن اُن کی مفارقت کا صدمہ اتنا بڑا ہے جس کا ازالہ کسی نعمت سے بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمارے پاس اپنی کئی یادیں چھوڑ گئے ہیں' جو ہمیں ہمیشہ عزیز رہیں گی۔ ان کی شمشیر اعزازی اور نارمن میڈل ہے' جو انہوں نے پاکستان ملٹری اکیڈیمی کی پاسنگ آوٹ پریڈ کے موقع پر بہترین کیڈٹ کی حیثیت سے جیتے تھے۔ اور اب نشان حیدر کا وہ تمغہ بھی ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں۔ جسے جیتنے کی تمنا میں عمریں بیت جاتی ہیں۔

میرے دل میں اپنے باپ کی یاد اس بہادر اور شجاع فرزندِ وطن کی حیثیت سے ہمیشہ تازہ رہے گی' جو اپنے وطنِ مقدس کی حفاظت کرتا ہوا' پروانہ وار نچھاور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی یہ تھی اور ہمیں قادرِ مطلق کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے' اور بچوں کے سر سے بھی تو باپ کا سایہ اٹھ جایا کرتا ہے' مگر میرے ابا تو ایک بڑے رافع و اعلیٰ نصب العین کو پورا کرتے ہوئے شہید ہوئے' انہوں نے مادرِ وطن کی آبرو بچانے کیلئے جان دی اور آج اسی لیے وہ قوم اور ملک کے ہیرو ہیں اور مجھے اس پر فخر ہے۔

(ظفر جاوید سینئر کیمبرج)

زرینہ کا خواب

ہم ان دنوں عیپر ہوٹل میں تھے۔

ایک رات میں سو رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شہید کی عادت تھی کہ اگر دروازہ اندر سے بند ہو تو انگشتری سے دروازے کا شیشہ آہستہ آہستہ بجاتے۔ اور میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ یہ ان کا مخصوص طریقہ تھا۔

اس رات بھی یونہی ہوا' میں اٹھی کہ ان کے لئے دروازہ کھولوں۔ یکا یک مجھے احساس ہوا کہ وہ تو شہید ہو چکے ہیں۔ پھر یہ مخصوص آواز کہاں سے آئی ہے؟ یہ خیال آتے ہی میں ڈر گئی۔ درود شریف پڑھا۔ چھوٹی بہن سرور کو بلایا۔ پھر دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ مگر ہواں ہوا کے جھونکوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں آ کر لیٹ گئی' کچھ دیر تو نیند نہ آئی۔ پھر نہ جانے کس وقت نیم خوابی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ تو دروازہ کھلا۔ ان کی عادت تھی کہ اگر دروازہ کھلا ہو تو وہ جوتے یا سلیپر دروازے میں اتار کر دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتے۔ بچوں کو ایک ایک کی چارپائی پر جا کر دیکھتے اور پھر اپنے کمرے میں جا کر سو جاتے تھے' آج بھی ایسے ہی ہوا' وہ ہم سب کو محو خواب دیکھتے رہے پھر سلیپر پہن کر آہستہ سے دوروازہ بند کیا' اور چلے گئے۔

کیا یہ خواب تھا؟ مگر مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں جاگ رہی تھی اور مجھے یہ بھی احساس تھا کہ وہ شہید ہو چکے ہیں مگر بولتی اس لئے نہیں تھا کہ وہ پھر غائب نہ ہو جائیں' مبادا یہ بیداری بھی خواب ہی بن جائے!

انداز ہو بہو تیری آوازِ پا کا تھا
گھر سے نکل کے دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا

شہید کے بچے

ظفر جاوید

رفعت آراء

ذوالفقار احمد

رفیق احمد

زینت آراء

اقبال جاوید

عزیز بھائی
سے
آخری ملاقات

آپا طاہرہ نے ایک ملاقات میں بتایا:

میں کراچی سے لادیاں جارہی تھی' بذریعہ خط انہیں اطلاع کردی گئی تھی۔ چنانچہ لاہور اسٹیشن پر ملے' مٹھائی کا لفافہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگے' چھوٹے بچے کی پیدائش پر آپ کا حصہ رہ گیا تھا۔ صرف پانچ منٹ کا ہی وقفہ ملا ہے؟ یہ رن کچھ کا زمان تھا' ہماری بھانجی منور جہاں میرے ساتھ تھی۔ اُس نے پوچھا! ماموں جان! آپ ابھی رفیق اور زلفی سے ملنے گھر تو جائیں گے نا؟

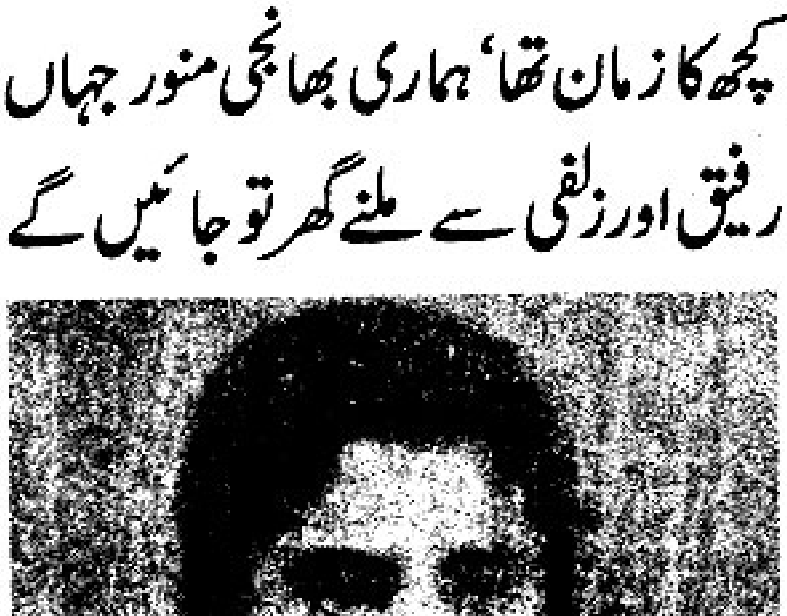

منور جہاں

کہنے لگے "نہیں بیٹی! محاذ سے ہم زیادہ دیر دور نہیں رہنا چاہتے ہیں' صرف یہاں آپ سے مل کر واپس ہی چلا جاؤں گا"۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی' انہیں اپنے بچوں سے بے حد پیار تھا۔ مگر محاذ سے وہ چند لمحات بھی نہیں نکال سکتے تھے۔

انہیں اپنی ڈیوٹی کا بہت احساس رہتا تھا' ورنہ بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ 8 جولائی کو میری واپسی ہے' اُس دن زیادہ وقت لے کر اسٹیشن پر آئیں اور بچوں کو بھی ساتھ لائیں۔

چنانچہ 8 جولائی کو لاہور اسٹیشن پر ہی اُن سے آخری ملاقات ہوئی' سارے بچے بھی ساتھ تھے۔ جب میں عزیز سے باتیں کر رہی تھی' تو انہوں نے محسوس کیا کہ میں دوسروں پر توجہ نہیں دے رہی ہوں۔ میرے شوہر کی ہمشیرہ بھی مجھے ملنے اسٹیشن پر آئی تھیں' مجھے انگریزی میں آہستہ سے کہنے لگے۔

"you pay more attention to them, Apa ,dont wory , about me."

آپ ان کو زیادہ توجہ دیں۔ آپا! میرا فکر نہ کریں:

گاڑی روانہ ہوئی تو ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہیں۔ طاہرہ آپ کی نظریں شاید دور اُفق پر شہید بھائی کو گاڑی کے ساتھ چلتے دیکھ رہی تھیں۔ آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگیں!

"پھر عزیز نے نے ہاتھ اٹھا کر" خدا حافظ کیا' اور گاڑی تیزی سے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر رہی تھی۔

ہائے! اس وقت کیا خبر تھی کہ ہمیشہ کیلئے!

زرینہ کے نام

طاہرہ کے خطوط

2.2اے۔ای۔آئی لائنز کراچی
22 ستمبر 1965ء

میری پیاری زرینہ!
السلام علیکم!

بابو جی کے خطوں سے حالات سے آگاہی ہوئی' خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ دشمن کے ناپاک ہاتھ شہید بھائی کو نہیں لگے۔ مجھے انتہائی دکھ تھا اور میرا دل لرزتا تھا کہ نامراد دشمن کے قابو میں شہید نہ آ گیا ہو اس کی ذات نے ہمارے دکھے دلوں پر یہ بھایا لگا دیا کہ مسلمان کو مسلمان کیلئے ہی رہنے دیا' زرینہ میں تمہیں جتنی بھی تسلی دوں' کم ہے' میں لکھ نہیں سکتی' جو جذبات و خیالات میرے دل و دماغ میں طوفان مچاتے ہیں' لیکن ایک لمحہ کے لئے سوچتی ہوں کہ کیا فائدہ' اگر آنسو اور آہیں جانے والے کو لاسکتیں تو بہنیں' ہوائیں' مائیں اور یتیم بچے اپنے آنسوؤں سے اپنے آپ کو غرق کر لیتے' لیکن سوائے صبر کے ہمیں اور کچھ نہیں سوجھتا اور یہ بھی باری تعالیٰ کی طرف سے ایک بہترین مرہم ہے۔ ہم نے ایک عظیم قربانی کی ہے۔ اس کا صلہ اللہ تعالیٰ ضرور دیگا۔

مسز ایس بی احمد نے مجھے بتایا کہ میجر ظہور جو اُس کی بہن کا داماد تھا۔ عزیز کے ساتھ ہی شہید ہوا۔ وہ کہتی تھی کہ اس کی بیوی بھی تمہیں جانتی ہے۔ اور بڑے اچھے دن کوئٹہ اکٹھے گزارے ہیں' اللہ تعالیٰ سب کو اس آزمائش میں صبر دے۔

ظفر کا مجھے پتہ نہیں کہاں ہے' اسے لکھا ہے یا نہیں میرا خیال تھا کہ لادیاں میں ہے۔ لہٰذا ایک خط اسے وہاں لکھا تھا۔ ضرور پتہ دیں جس وقت بھی حالات بہتر ہوئے میں آپ کے پاس پہنچوں گی۔ مجھے سخت رونا آتا ہے۔ اپنی مجبوری پر' کہ میں اُنہیں سکتی کاش کر پر لگ جاتے۔ اور میں اُڑ کی پہنچ جاتی' بچوں کی پڑھائی کا لکھیں کیا انتظام ہے' اگر پنڈی جا رہی ہیں تو وہاں کا ایڈریس لکھ دینا' ہم سب کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ نذیر و فیروز پرسوں پھر آئے بخیریت ہیں' پرسوں

رشید کا پھر فون آیا۔ وہاں سے آنے جانے کے راستے بند ہیں۔ لہٰذا خط و کتابت نہیں ہو سکتی' فون پر بات ہو جاتی ہے۔ ارادہ ہے' اب فون آیا تو اسے کہوں گی۔ کوشش کرے' حالات بہتر ہونے پر یہاں تبادلہ کروالے۔

بچوں کو پیار' خدا تعالیٰ اُن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اقبال کیلئے میں نے سویٹر وغیرہ بنائے تھے۔ وقت نے مہلت نہیں دی' جیسے بھی ہوا روانہ کر دوں گی۔ اپنے ہاتھ سے خط لکھیں کر تسلی ہو۔ خدا حافظ

آپ کی شریک غم بہن......طاہرہ

کراچی
24 ستمبر 1965ء

میری پیاری دکھی زرینہ!

السلام علیکم!

اس وقت میں تمہیں کیا کہوں جب کہ میرا اپنا جگر خون رو رہا ہے۔ خدا تمہیں صبر اور سہارا دے' تم اب ایک ایسے خاوند کی بیوی ہو جو سید ھا جنت کے دروازے سے گزر کر دائمی زندگی حاصل کر چکا ہے۔ کاش! کہ ہمیں یہ رتبہ نصیب ہوتا۔ پیاری بھابی! اللہ تعالیٰ تمہیں صبر دے' آزمائش کے وقت سوائے اس کے اور کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی سے ہم صبر کی دعا کریں۔ اور اُسی سے اپنی التجا کریں۔

نذیر و فیروز اسی روز آئے۔ آج صبح ٹیلی فون پر فاطمہ اور شید سے ڈھاکہ میں بات ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو صبر دے اور ہماری دعائیں سن کر اس دشمن کو غارت کرے مجھے انتہائی دکھ ہو رہا ہے کہ میں ایسے حالات میں ہوں کہ آ نہیں سکتی' کاش میں تمہیں دیکھ سکتی لیکن مجبوری کا نام صبر ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کا نگہبان ہے' میرے غم کی اس وقت انتہا کوئی نہیں جان سکتا۔ خدا تعالیٰ صبر کی توفیق ہم سب کر دے۔

آپ کی شریک غم دکھی بہن:......طاہرہ

2.2۔اے، آئی، ای لائنز کراچی — میرے پیارے بابوجی و ماماں جی!

28 ستمبر 1965ء — السلام علیکم!

آپ کا خط لاہور سے تحریر کردہ ملا' دیگر خیر خواہوں کے خطوط سے آپ کے حوصلے اور صبر کی مثال سے دل کو قدرے چین آیا' تاہم یہ خیال نہیں جاتا کہ آپ کو مل لیتی تو بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ کاش یہ مجبوریاں حائل نہ ہوتیں' شریف صاحب کی مجبوراً غیر حاضری کے باعث میں ایسے حالات میں کوئی حل نہیں سوچ سکتی' دعا کرتے رہیں یہ کش مکش دور ہو اور اسلام کے حق میں فیصلہ ہو تو موقع پاتے ہی حاضر ہو جاؤں گی۔ زرینہ کا گجرات میں رہنا نہایت موزون ہے' ہر لحاظ سے اُن کا پنڈی والا مکان اچھے داموں کرایہ پر دیا جا سکتا ہے۔ اور یہ ہم سب کے لئے بھی جانے آنے کے لحاظ سے اتنا آسان نہیں تھا۔ خدا تعالیٰ اپنے رحم و کرم سے بہتر کرے۔

بھائی جان کا خط کل ملا' آپ کو بھی اس کی نقل مل چکی ہوگی۔ مجھے سردار کی کوئی خبر نہیں ملی' میں نے اسے خط لکھا ہے۔ رضیہ سے صحیح ایڈریس لے کر تحریر کریں۔ کل شام' اور 10 بجے کی خبروں میں شہید بھائی کی شجاعت کا ذکر ریڈیو پر آیا۔ ہمیں اس بات کا فخر ہے کہ وہ ایک شیر کی حیثیت سے لڑا' اور ایک عظیم رتبہ کے ساتھ خدا تعالیٰ کے حضور میں گیا۔ آج کے اخبار کے مرسلہ کٹنگ سے بھی آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کا بیٹا کوئی معمولی شجاعت سے نہیں لڑا' ہمارا پختہ ایمان ہے' اور ہمیں یقین ہے کہ یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ انشاء اللہ! حالات ابھی نازک ہی ہیں دعا کرتے ہیں کہ ہر جگہ خیریت رہے۔ کل چچا نظام الدین کا خط ملا' تسلی ہوئی کہ شہید کا چہرہ بدستور شاداب تھا اور خواب میں معلوم ہوتا تھا۔ رات کو بھائی رحمت کا فون بھی ملا۔ خیریت سے آگاہ کرتے تھے۔ رشید کو خط روانہ کر دیا ہے اسے لکھا ہے کہ مطلع کرے آیا فاطمہ کو روانہ کر رہا ہے' آپ کے خط میں نے ایک بھائی جان کو اور ایک رشید کو روانہ کر دیئے ہیں۔ وقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ممکن ہے' آپ زیادہ خط و کتابت نہ کر سکیں۔ لہٰذا میں آپ کا خط بھائیوں کو روانہ کر دیا کروں گی۔ شفیع ڈار چند دنوں سے ترکی سے واپس آ گئے ہیں' شام کو ہمارے ہاں آئے ہوئے تھے۔ شریف ان کے پاس واپس چلا گیا ہے'

شاید آغاز اکتوبر میں چھٹی جائے کسی چیز کی ضرورت ہو تو تحریر کر دیں۔ دیگر سب خیریت ہے آپ کی دعاؤں کے خواہاں ہیں۔

ہمارا سب کو سلام بچوں کو پیار   طالب دُعا آپ کی دُختر طاہرہ

وزیر گل کی والدہ S.B صاحبہ اور دیگر بے شمار لوگ آئے اور آپ سے اظہار ہمدردی لکھنے کو کہا۔

نوٹ: بارہ بجے رات رشید آج کراچی پہنچ رہا ہے۔

2.2 اے ای آئی لائنز کراچی   میری پیاری زرینہ!

28 ستمبر 1965   السلام علیکم!

میں آپ کی تسلی کیلئے اخبار کی یہ کٹنگ روانہ کر رہی ہوں کہ آپ کو یقین ہو جائے کہ آپ کا راجہ ایک عام میجر نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک شیر تھا جس نے ہمارے امن وچین کی حفاظت کرتے ہوئے بے مثال مردانگی اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ وہ ہمارے خاندان کی عزت تھا، جس کو یہ ثابت کرنا تھا کہ اس کی مائیں، بیوی، بہنوں و بیٹیوں کی عزت اس کی عزت ہے۔ وہ ایک نہ فنا ہونے والی ہستی تھی جو جان دے کر بھی آئندہ نسلوں کیلئے ایک قابل فخر مثال بن کر رہ گئی، زرینہ ہمارے دلوں میں آپ کی عزت اور بہنوں کی عزت سے بڑھ کر ہے، اور انشاء اللہ ہمیشہ رہیگی۔ ہمارے دل روتے ہیں، لیکن ہم مسکرا کر کہتے ہیں کہ ہمارا راجہ شہید ہوا اور وہ بھی کس شان کے ساتھ! میرا دل تڑپتا ہے آپ کو ملنے کیلئے لیکن ناچار ہوں، اپنی مجبوری پر رونا آتا ہے، لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ مجھے اپنے ہاتھ سے خط لکھو کر تسلی ہو۔

ابھی ابھی رشید کے ایک دوست کا فون آیا ہے کہ رشید آج رات کو بارہ بجے کراچی پہنچ رہا ہے اس کو گاڑی روانہ کر دو۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ رش کی وجہ سے ایک سے زائد سیٹ نہیں ملے گی۔ لہٰذا بال بچہ ساتھ نہیں آ رہا ہے۔ بچوں کو پیار۔

آپ کی شریک غم آپا: طاہرہ

2.2،اے،ای آئی، لائنز کراچی
15 اکتوبر 1965ء

پیارے بابو جی ماماں جی و زرینہ!

السلام علیکم!

امید ہے آپ سب بخیریت ہوں گے۔ آپ کی دعاؤں سے ہم سب بخیریت ہیں' روزانہ ہم ریڈیو اپنے بہادر بھائی کی داستانیں سنتے ہیں اور اخباروں میں اس کے تذکرے پڑھتے ہیں۔ میں نے اخباروں سے تراشے لے لئے ہیں اور آپ کی خدمت میں ارسال کر رہی ہوں۔ یہ زرینہ حفاظت سے بچوں کیلئے رکھ چھوڑے جب بڑے ہوں گے تو ان کو دے دے اور بھی جتنے اکٹھے ہو سکے میں کر رہی ہوں۔ ایک ایک کاپی اپنے پاس رکھی ہے۔ اور دوسری آپ کو روانہ کر رہی ہوں' معلوم نہیں' آپ ریڈیو پاکستان سے اجازت لی ہے' اور ان سب نشریات کی نقل کر دالوں گی۔ بابو جی اور زرینہ کے انٹرویو بھی سنے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے میرے بوڑھے ماں باپ اور دکھی بھابی کی اتنی ہمت وصبر سے نوازا اور یہ کڑا وقت اُن پر آسان کیا۔

بائیس روز ہو گئے ہیں ابھی تک عورتوں کے ہاتھوں مجھے فرصت نہیں ملی۔ آرمی کے اتنے افسروں کی بیگمات آتی ہیں کہ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ یہاں پر اتنی تعداد میں ہیں۔ سب یہی کہتی ہیں کہ وہ صرف تمہاری بھائی نہیں تھا بلکہ پاکستان کی ہر بچی گا باپ اور پر بہن کا بھائی تھا۔ جن کی عزت وہ بچا گیا۔

اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ سب کو غم برداشت کرنے کی ہمت دے۔ گو ہر رضائے الٰہی کے آگے سرنگوں ہیں' لیکن دنیا کے سامنے ہمارے سر بلند ہیں کہ ہم اس غیر فانی ہستی سے تعلق رکھتے ہیں' جو اس وقت کا خالدؓ قاسمؒ ٹیپو اور جانے کیا کیا کچھ تھا! آپ ان مضمونوں سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کیا کچھ تھا' تاریخ پاکستان میں ہمارے بچے اور ان کے بچے کئی پشتوں تک یہ لافانی نام پڑھیں گے۔ اور فخر کر سکیں گے کہ وہ ایک ایسے بہادر کی اولاد اور رشتہ سے ہیں۔

کون اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ ہمارا ننھا بھولا بھالا اسکول کی گھنٹی بجانے والا بھائی سورج بن کے دنیا چمکے گا؟ اس فخر میں ہمارا غم قدرے کم ہو جاتا ہے۔ سڑکوں' بسوں' گھروں' غرضیکہ ہر جگہ آج

یہی نام لیا جاتا ہے۔ قابل فخر والدین! قابل رشک بیوی! تعزیت ناموں کا انبار لگا ہے۔ ان میں سے کئی لکھنے والوں کا مجھے کوئی پتہ نہیں کہ کون ہیں؟ یہ تھا ہمارا راجہ جس کیلئے پاکستان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ آج فخر کی جھلک ہے۔

بچوں کو پیار سب کو سلام　　　　آپ کی شریک غم! طاہرہ

2.2اے، ای۔ آئی لائنز　　　　بخدمت بابو جی بزرگوارم و پیاری زرینہ

کراچی 13 اکتوبر 1965ء　　　　السلام علیکم!

امید ہے آپ سب بخیریت ہوں گے۔ بفضل خدا یہاں پر ہر طرح سے خیریت ہے۔ شریف صاحب بوجہ عدیم الفرصتی خط کا جواب نہیں دے سکے۔ لیکن انہوں نے مجھے یہ عرض کرنے کو کہا ہے کہ وہ ظفر کے انگلینڈ جانے کے حق میں نہیں ہیں۔ مفصل وجوہات وہ کوشش کریں گے۔ آج آپ کو قلمبند کردیں۔ آپ کو ان کی مصروفیات کا اندازہ تو ہوگا ہی۔ کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بھائی جان اور آپ کو ٹائپ شدہ خط کی کاپیاں روانہ کردیں گے۔

صبح وشام یہاں پر کافی ٹھنڈک ہوگئی ہے۔ لیکن دن کو دھوپ کی وجہ سے اچھی گرمی رہتی ہے۔ میرا زیادہ تر وقت زیب کی شادی کی تیاری میں گزر رہا ہے' ہماری کوشش ہے کہ اگر چھٹی مل جائے تو رمضان کے بعد اخیر جنوری کو اس فرض کرنباہ دیا جائے۔ زیب نے کالج چھوڑ دیا ہے کہ اس کو خانہ داری کی کچھ ٹریننگ دی جائے۔ معمولی ہنڈیا روٹی تو پکا لیتی تھی لیکن تنہا کام کرنا اسے تا حال نیں آتا۔ اس کام کر اہم ترین سمجھتے ہوئے اس نے خود خواہش ظاہر کی کہ اس کے لئے یہ زیادہ ضروری ہے۔

ہمیں آپ دونوں کے جذبات کا مکمل احساس ہے' میں اکثر سوچتی ہوں کہ انسان کس قدر بے بس ہو جاتا ہے' اپنے فرائض میں پھنس کر میں آپ کے نزدیک ہو کر آپ کی دل جوئی نہیں

کر سکتی ۔اللہ تعالیٰ سے ہی دعا ہے کہ وہ خود اپنی مرحوم سے ہمارے زخم بھرے آپ یقین نہیں کریں گے ۔ مجھے آج تک کوئی بھی تکلیف بڑی نہ لگی تھی ۔ سب کچھ سمجھتے جانتے اور یقین کرتے ہوئے بھی یہ ایک ایسا کاری زخمی محسوس کرتی ہوں کہ اکثر بالکل شل ہو کر رہ جاتی ہوں' دنیا کے کام چلانے ہیں ۔ لہٰذا دعا کر کے پھر ہمت باندھ لیتی ہوں ۔اس کی عظمت وشان کے آگے بے بس ہو کر رہ جاتی ہیں' اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمت دے ۔

آجکل ظفر کا کیا شغل ہے ۔اسے کہیں وہ ہی چند الفاظ لکھ دیا کرے ۔خدا تعالیٰ برخوردار کو صحت و زرداری عمر عطا کرے ۔ وگر بچوں بچوں کا کیا ہے میرا پیارا ان سب کرا اقبال کیسے ہے ۔ سوائے دعا کے ان کے لئے کیا کروں سرور کو سلام دیگر سب طرح خیریت ہے ۔سب کی طرف سے سلام ۔

آپ کی تابعدار: طاہرہ

زرینہ کے نام اس لئے خط روانہ کرتی ہوں کہ شاید بابو جی گھر پر نہ ہوں ۔ بہر حال میرا خط متفرقہ ہوتا ہے ۔کوئی بھی کھول لے ۔

’’کون سوچ سکتا تھا کہ

خاندان کا سب سے زیادہ بھولا بھالا لڑکا

دس کروڑ انسانوں کا ہیرو بننے والا ہے‘‘

نذیر احمد بھائی جان

پیکنگ 10 اکتوبر 1965ء

سب کو السلام علیکم! آخری ڈاک میں مجھے طاہرہ کا 30 ستمبر کا لکھا ہوا۔ شید کا کراچی سے پوسٹ کیا ہو 68ء ستمبر کا اور شیدی کا خط سب اکٹھے ملے۔

طاہرہ نے مجھے جو اخباری تراشے بھیجے اور اسی طرح کے جو اور تراشے وزارت کے احباب نے ارسال کیے ہیں ان سے اور یہاں پہنچنے والے ’’ڈان‘‘ پاکستان ٹائمز‘ اور جنگ‘‘ کے شماروں سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے محبوب شہید عزیز کو کتنی عظمت اور کتنا بڑا درجہ نصیب ہوا ہے۔ اور سارا وطن ان پر کس قدر فخر کر رہا ہے‘ اس موقع پر خصوصاً بابو جی‘ امی‘ زرینہ اور بچوں نے جس عظیم الشان جرات اور صبر وضبط کا عمل مظاہرہ کیا ہے وہ ہمارے لئے حقیقتاً باعث فخر ہے۔ وزارت خارجہ کے میرے ایک دوست خاتم شیر خاں لکھتے ہیں؟

’’تم لکھتے ہو کہ میجر عزیز بھٹی پر تمہارے سارے خاندان کو فخر تھا میں کہوں گا۔ ساری پاکستانی قوم کو عزیز بھٹی شہید پر بجا طور پر فخر اور ناز ہے‘ خدا اس کی روح کو ابدی سکون بخشے! آج پاکستان کے ہر فرد و بشر کی زبان پر عزیز بھٹی ہی کا غیر قانونی نام ہے۔ آج بچہ بچہ اس کی شجاعت اور بہادری کے کارناموں پر عش عش کر رہا ہے۔ آج ہر جگہ اس کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ اسے مجسم شجاعت اور حب الوطنی کے نام سے یاد کیا جا رہا ہے۔ آج وطن مقدس کی حفاظت کے فریضہ کی ادائیگی میں سب سے بڑا شاندار حصہ عزیز بھٹی ہی کا تسلیم کیا جا رہا ہے۔ اخبارات کے کالم اس شہید وطن کی زندگی کے حالات سے پر دکھائی دیتے ہیں۔ اُس نے شہادت کی موت پائی اور

شہید کبھی نہیں مرا کرتے وہ زندہ جاوید رہتے ہیں اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے وہ اور غیر قانونی ہوتے چلے جاتے ہیں''۔

بابو جی کے پرانے شاگرد مسٹر جہاں داد کراچی سے لکھتے ہیں:

''سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں؟ قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق شہید کبھی نہیں مرتے بلکہ حیات جاودانی پاکر اپنے خالق حقیقی کے پاس خوش وخرم رہتے ہیں۔ لہٰذا اپنے ماں باپ کا فرزند ارجمند عزیز اپنے بھائیوں اور بہنوں کا محبوب بھائی عزیز اور فخر قوم راجہ عزیز بھٹی شہید مرا نہیں بلکہ زندہ جاوید ہو گیا ہے۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ ہر روز بلکہ ہر گھڑی شہید وطن عزیز بھٹی کو ریڈیو پر اور اخبارات میں خراج عقیدت پیش کیا جارہا ہے۔ ان کے والد کے الفاظ بھی قریب قریب ہر روز ریڈیو پر سنائے جاتے ہیں 'عزیز بھٹی شہید نے نہ صرف اپنے آباواجداد کا نام روشن کر دیا بلکہ اپنی آنے والی نسلوں اور اپنی قوم اور اسلام کی عظمت بھی دوبالا کر گیا۔ آج اس کے ہم وطن اس کا نام قرون اولیٰ کے اسلام جرنیلوں کے ناموں کے ساتھ لے رہے ہیں۔ سبحان اللہ! مرحوم نے کیا رتبہ پایا ہے! دنیا سے تو آخر ہر ایک کو ایک نہ ایک دن عدم کا سفر کرنا ہے۔ لیکن یہ سفر جس شان اور سج دھج سے عزیز بھٹی نے اختیار کیا اس کا ذکر ہر زبان پر ہے۔ شہید وطن عزیز کے متعلق دس کروڑ پاکستانیوں کے احساسات کیا ہیں آپکو اس کا اندازہ وہاں بیٹھ کر نہیں ہو سکتا''۔

کراچی میں رفیقہ کی سہیلیوں کو جب معلوم ہوا کہ ملک کا شجاع عظیم اس کا چچا تھا انہوں نے بھی اسے اسی مضمون کے تعزیتی خطوط بھیجے ہیں۔

کارخانہ قدرت کے سب ڈھنگ نرالے ہوتے ہیں کون سوچ سکتا تھا کہ کل کا وہ لڑکا جسے سارے خاندان میں سب سے بھولا بھالا سمجھا جاتا تھا دس کروڑ مسلمانوں کی اس قوم کا ہیرو بننے والا تھا' جو اس وقت تک معرض وجود میں نہیں آئی تھی۔

بابو جی! امی' زرینہ اور بچوں کی دلی تمنا تھی کہ اس گھڑی جبکہ آپ کو اپنے تمام اعزہ واقربا کے پاس ہونے کی ضرورت تھی۔ ہم آپ کے ساتھ ہوتے اور آپ کا غم بٹاتے لیکن ملازمت کی

مجبوری نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ ہم نے تین سال غیر ملکی سروس کی آدھی مدت ختم کر لی ہے' اور ہماری اللہ تعالیٰ سے دلی دعا ہے کہ وہ آپ سب کو سلامت رکھے اور ہمیں آئندہ ڈیڑھ سال کے بعد آپس میں ملنے کی خوشی نصیب کرے۔ آمین!

بابو جی! آپ نے اپنے ایک سابقہ خط میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ہم سب لادیاں میں چل کر رہیں ہیں میں اوروں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا' لیکن آپ اس سلسلے میں میرے خیالات برسوں سے جانتے ہیں۔ ملازمت کے دوران میں تو باہر رہنا ہی پڑیگا لیکن میرا اب بھی ارادہ یہی ہے اور ہمیشہ رہا ہے کہ جب بھی ریٹائرڈ ہوا۔ انشاء اللہ العزیز باقی عمر لادیاں ہی میں بسر کروں گا۔ میں نے اس بارے میں اکثر شریف صاحب سے بھی صلاح و مشورہ کیا ہے اور وہ ہمیشہ میرے ہم خیال رہے ہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد لادیاں میں رہنا ہی سب سے بہتر ہوگا۔

ظفر اور زلفی میں نے تمہارے متعلق اخبارات میں پڑھا ہے۔ ہم سب کو تم پر فخر ہے۔ تم سب بہادر بچے ہو۔ ظفر! مجھے پورا یقین ہے کہ تم اپنی محنت جاری رکھو گے۔ اور اگلے ماہ سینئر کیمرج کے امتحان میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ جب تک تم کوئٹہ میں ہو' جو خط میں دوسروں کو بھیجوں گا۔ اس کی نقل تم کو بھی بھیج دیا کروں گا۔ تاکہ دوبارہ نقل کراچی یا لادیاں سے تم تک پہنچنے میں وقت ضائع نہ ہو۔

11 اکتوبر 1965

مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ ہماری ڈاک کے تھیلے پاکستان کو پندرہ دن کی بجائے اب ہفتہ وار بھیجے جایا کریں گے۔ مجھے امید ہے کہ اس کے بعد میں تم کو ہفتہ وار لکھا کرونگا۔ مجھے توقع ہے آپ لوگ بھی ایسا ہی کیا کریں گے۔ کیونکہ ڈاکیہ صبح سویرے کنتان روانہ ہونیوالا ہے' (پی آئی اے کی پرواز اب صرف کنتان تک ہوتی ہے۔ اور آگے شنگھائی تک نہیں ہوتی اور تھیلہ جلد ہی بند ہو جائے گا۔ اب خط کو ختم کرتا ہوں۔ ہم سب کی طرف سے آپ سب کو السلام علیکم۔ بچوں کو پیار۔

(بھائی جان)

سفارت خانہ پاکستان

پیکن (چین)

29 اکتوبر 1965ء

مائی ڈیر بشیر حسین

السلام علیکم!

آپ کی ایروگرام مورخہ 13 اکتوبر کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جو مجھے چند یوم ہوئے موصول ہوئی۔ آپ نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے ان کے لئے ہم سب آپ کے شکر گزار ہیں۔ آج عزیز شہید ہم میں نہ سہی لیکن اس سے روح کو کتنی تسکین ہوتی ہے کہ اس نے اپنے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے خلد بریں میں اونچی جگہ پالی اور ہم گنہگار بندے ہیں کہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتے کہ ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ ایک وہ وقت تھا جب عزیز شہید ہمارے چھوٹے سے خاندان کا محض ایک فرد تھا۔ آج دس کروڑ کی پوری قوم اسے اپنا کہتی ہے۔

بابو جی باقاعدہ مجھے خط لکھتے رہتے ہیں اور وہ جس پرسکون انداز سے ہر تفصیل حوالہ قلم کرتے ہیں، مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اللہ جل شانہ' نے انہیں اتنا بڑا صدمہ برداشت کرنے کی کتنی توفیق اور ہمت ارزانی کی ہے۔ ورنہ کسی اور ذرا کم ضبط و برداشت والے شخص کو یہی صدمہ پہنچتا تو اس کی کمر توڑ کر رکھ دیتا۔ ہمارے والدین نے اس سانحہ میں جس ردعمل کا مظاہرہ کیا ہے، ہمیں اس پر بجا طور پر فخر ہے، کیونکہ انہوں نے دس کروڑ برادران اسلام کیلئے صبر و ضبط کی قابل تقلید مثال قائم کر کے دکھا دی ہے۔

زرینہ اور بچے 54 نیپیئر ہوٹل، کننگھم روڈ لاہور میں اقامت پذیر ہیں، بچے اپنے سابقہ گیریزن سکول میں پھر سے داخل ہو گئے ہیں، جب تک ظفر کا کوئٹہ میں امتحان ختم نہیں ہو جاتا بابو جی انہیں کے ساتھ رہیں گے۔ ظفر ان کے پاس دسمبر میں لاہور آجائے گا اور پھر بابو جی لادیاں چلے

جائیں گے۔

میں نے یہاں اپنی تین سال کی ملازمت کی معیاد آدھی ختم کر لی ہے' اور انشاء اللہ ہم جون 1967ء میں پاکستان واپس پہنچ جائیں گے۔ البتہ اب کے ہم کراچی میں متعین نہیں ہوں گے۔ کیونکہ ہماری وزارت اسلام آباد منتقل ہونا شروع ہوگئی ہے' آپ کو بھی شاید اخبارات سے یہ بات معلوم ہو چکی ہوگی۔

ہم سب کی طرف سے آپ سب کو سلام

آپ کا مخلص نذیر

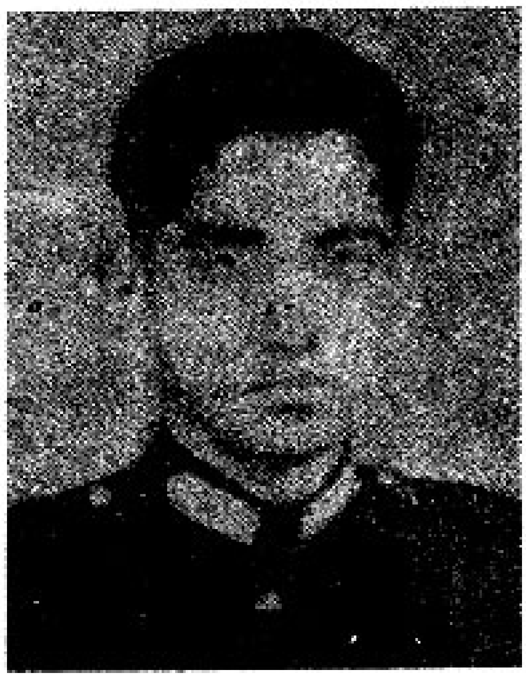

ہمارے پیش نظر ایک ہی اصول ہونا چاہیے کہ

''اس مسئلہ پر شہید بھائی کا نظریہ کیا ہوتا؟''

رشید احمد بھٹی

موتی جھیل۔ڈھاکہ

15 اکتوبر 1965ء

ہر ایک کو سلام علیکم

میں کل یہاں پہنچا ہوں۔گھر میں ہر طرح سے خیریت ہے۔میں 18 اکتوبر کو لادیاں سے لاہور آیا۔شہید کی رجمنٹ کے افسروں اور قطب الدین سے ملاقات ہوئی' لاہور دو چار منٹ کیلئے سکینہ کے گھر بھی گیا۔

کوئٹہ میں ظفر نے مجھے دیکھا تو اسے حیرت ہوئی۔بہرحال یہ ملاقات بڑی مفید رہی' اس کے ساتھ گھر کے مالی حالات اور دیگر تمام مسائل پر بات چیت ہوئی۔اگلے ماہ کی 18 تاریخ کو اس کے امتحانات شروع ہو رہے ہیں۔دسمبر کے پہلے ہفتہ میں وہ فارغ ہو جائیگا۔میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ وہ امتحان کے بعد سیدھا گھر آئے میں نے ظفر کے ریاضی کے ٹیچر سے کہہ دیا ہے کہ وہ اسے ایک مہینہ اور محنت کرائیں۔میں اس کی انگلش ٹیچر مسز کرنل نصر اللہ سے مل کر بہت خوش ہوا وہ ایک عمدہ شخصیت کی مالک ہیں۔

بابوجی! میں نے کراچی میں ''تاروچ یونین انشورنس کمپنی'' والوں سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے مجھے پتا کہ انہوں نے ایک رسیدی فارم آپا زرینہ کے نام بھیج دیا ہے۔جو تصدیق کے بعد واپس بھیج دیں گی۔اس کے آنے پر بلا تاخیر چیک جاری کر دیا جائے گا۔

میں لاہور میں بچوں کے پرنسپل صاحبان سے نہیں مل سکا۔ البتہ کیپٹن دلشاد نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بچوں کے سٹرفکیٹ لے کر جی ایچ کیو بھیج دیں گے۔ کیپٹن بخاری نے تعلیمی وظائف کے کاغذات پہلے ہی یونٹ میں بھیج دیئے ہیں۔ کراچی پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ آپا طاہرہ لالہ دیاں روانہ ہوچکی ہیں' کراچی میں باقی سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ کراچی میں مجھے شاہ نواز صاحب سے بھی ملنے کا موقعہ ملا مجھے امید ہے میرا تبادلہ مارچ تک لاہور ہو جائے گا۔ وہ خود محسوس کرتے ہیں کہ میری نئی ذمہ داریوں کے پیش نظر میرا تبادلہ لاہور ہو جانا چاہئے' اگرچہ منصب اور مال لحاظ سے مجھے نقصان رہے گا۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لئے میرا لاہور ہونا ضروری ہے۔

بھائی جان! مجھے آپ کے 3 اکتوبر کے خط کی تسلی ملی ہے' معلوم نہیں میرا لادیاں سے بھیجا ہوا خط آپ کو ملا ہے' یا نہیں' اس میں' میں نے تفصیل حالات لکھے تھے۔ بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے بے شمار لوگوں کی طرف سے عطیات کی پیش کش ہو رہی ہیں۔ لیکن میں نے حسب ذیل وجوہ کی بنا پر انہیں قبول نہ کرنے کی رائے وہی ہے۔

۱۔ عطیات سے آمدنی میں تقدیس باقی نہیں رہتی اور ان اصولوں کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے' جن کو ہم نے شدت سے اپنا رکھا ہے۔

۲۔ روپیہ پیسہ کی افراط سے بچوں کے بگڑنے کا اندیشہ ہے۔

۳۔ شہید نے بچوں کیلئے جو کچھ چھوڑا ہے وہ ان کی خوددارانہ روزی کے لئے بہت کچھ ہے۔ بالخصوص جبکہ زمین کا مسئلہ بخیر وخوبی طے ہو جائے گا۔

۴۔ ہر مسئلہ کا فیصلہ کرتے وقت ہمارے پیش نظر صرف ایک ہی اصول ہونا چاہیے کہ اس مسئلہ میں شہید بھائی کا طرز عمل کیا ہوتا' کیا وہ ایسی پیش کش قبول کر لیتے؟

اس سوال کا اثبات یا نفی میں جواب ہی اس مسئلہ کا حل ہے۔

۵۔ بابو جی کا یہ خیال کہ ایسی رقوم کو خیراتی اداروں کے نام منتقل کر دیا جائے۔ ذاتی طور پر مجھے پسند نہیں ہے۔ اگر خیرات کرنا ہو۔ وہ تو اپنے ہی (خواہ کتنے قلیل ہوئی) ذرائع سے کرنا چاہئے۔

عطیات قبول کر کے انہیں خیرات میں دینا تو بے معنی ہے۔

جہاں تک ہمارے پیارے شہید بھائی کی یادگار کا تعلق ہے، میں اپنی تجویز پیش کر چکا ہوں۔ مگر اس پر عمل حالات کے معمول پر آنے کے بعد کیا جا سکے گا۔

بھائی جان! میرا خیال ہے کہ باغ میں قبر کا فیصلہ ٹھیک رہا ہے۔ لادیاں جانے تک میری اپنی رائے بھی یہی تھی جو آپ کی ہے مگر گاؤں کے قبرستان کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ قبروں کے اوپر مویشی چرتے رہتے ہیں۔ مگر باغ میں بڑی محفوظ اور پر فضا جگہ ہے۔ سب سے زیادہ تسکین وہ امر یہ ہے کہ مہاماں جی دن میں جتنی بار چاہیں قبر پر آ جا سکتی ہیں جو قبرستان کی صورت میں ممکن نہ تھا۔

بے شمار لوگ تعزیت اور فاتحہ خوانی کیلئے آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کے ساتھ قبر تک جانا پڑتا ہے۔ قبرستان کی صورت میں یہ بڑا مشکل تھا۔

آپ نے لکھا ہے اس طرح صحن شاہراہ بن جائے گا۔ اس کے متعلق بابو جی کی تجویز یہ ہے کہ گھر کے پیچھے سے مشرق میں چچا غلام علی کی زمین میں سے باغ کو بیرونی راستہ سے ملا دیا جائے۔ اس طرح گھر کے پردہ میں بھی خلل اندازی نہیں ہوگی۔

سردار! رضیہ اور بچے بخیریت پہنچ گئے ہوں گے۔ معلوم نہیں۔ آپ کو میرا تار بروقت مل سکا یا نہیں۔ آپ نے ٹائپ شدہ سرکلر خطوط سے ہمیشہ نفرت کا اظہار کیا ہے۔ کیا آپ اپنی ذاتی پسند اور ناپسند کو تھوڑا سا سال دبا کر ان خطوط کے ذریعہ ہی کچھ سننا گوارا کر لیں گے؟ میں بچوں کے خود آپ کے پاس آنا چاہتا تھا مگر وقت کی کمی کے باعث نہ آ سکا۔

آپا زرینہ! میں نے ظفر کی فیس ادا کر دی ہے اور فیروز کے ہاتھ اس کی رسید بھیج دی ہے۔

میں بٹالین کے افسروں سے ملنے گیا تھا مگر کوارٹر ماسٹر مجھے نہیں مل سکے تھا۔ اس لئے درزی کے بل ادا نہ کر سکا۔

میں تاریخی نہر بی آر بی پر بھی گیا اور بھائی جان کی شہادت گاہ کی زیارت بھی کی' وہاں سے مقدس خون آلود و مٹی بھی اپنے پاس بطور یادگار رکھنے کیلئے لے آیا ہوں۔ شہادت گاہ پر اینٹوں کا دائرہ بنا ہوا ہے۔ جہاں بعد میں یادگار تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ وہاں کرنل قریشی' میجر بلوچ' کیپٹن دلشاد' کیپٹن منیر داؤ جوئنٹ' اور صوبیدار میجر محمد شریف سے ملاقات ہوئی' وہ سب کے سب آپ کو تسلیمات بھیجتے ہیں۔

میں اب اس خط کو ختم کرتا ہوں' مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ میرا تبادلہ لاہور ہو جائے گا۔ اور میں ان فرائض کی ادائیگی اور ان مسائل کو حل کرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ جو حالات نے میرے سپرد کیے ہیں۔

خدا حافظ سب کو السلام علیکم۔ (رشید)

اس خط کی نقول...... بھائی جان...... سردار...... بابو جی

ظفر...... طاہرہ اور شیدی کو بھیجی جارہی ہیں۔

مجھے فخر ہے کہ عزیز بھائی نے

اسلام اور پاکستان کیلئے جان دی

___________ سردار

پشاور 19 اکتوبر 1965ء

میرے پیارے ظفر

السلام علیکم۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس سے پہلے تمہیں نہیں لکھ سکا۔ مجھے اپنے عزیز بھائی شہید پر فخر ہے، کہ اس نے اسلام اور پاکستان کے لئے جان دی، جس بہادری سے اس نے مکار دشمن کا مقابلہ کیا۔ اس سے ہمیں بھی شہید کی رفاقت کو صحیح اسلامی رنگ میں استقلال سے برداشت کا سبق سیکھنا چاہیے۔ مجھے اور رضیہ کو آپ سب پر اور بالخصوص تم پر بڑا فخر ہے۔ تم باقی سارے خاندان سے دور تھے، اس کے باوجود تم نے بڑے صبر اور استقلال کا مظاہرہ کیا۔ خدا تم کو ثابت قدمی فرمائے۔

سارا پاکستان شہداء کرام کا زیر بار احسان ہے کہ انہوں نے پاکستان کیلئے اتنی شجاعت سے لڑتے ہوئے جانیں دے دیں تا کہ اہل وطن امن سے رہ سکیں۔

شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور ان کا مقام بہت بلند ہوتا ہے۔

یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ تم نے اپنی تعلیم کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ بہت عقلمندانہ اقدام ہے، میں امید کرتا ہوں کہ ایک بات کو تم کبھی نہیں بھولو گے اور وہ نماز ہے۔ برخوردار نماز باقاعدگی سے پڑھتے رہنا، تمہاری چچی اور بچے سلام بھیجتے ہیں۔

آپ کا: سردار

جس کی بہادری نے

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تاریخ کو دُہرایا ہے

کیپٹن (نیو) شریف ___________

۲-۲، اے ای آئی لائنز۔ میرے پیارے ظفر!

کراچی نمبر ۴ ۶۵-۱۲-۲۰

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ تم کالج میں داخل ہو گئے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے خود کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیا ہوگا۔ اس دنیا میں تمہارا کام مشکل ہے۔ کیونکہ تمہیں یہ ثابت کرنا ہے کہ تم اس ہیرو کے صحیح جانشین ہو جس کا گیت ہمارے ملک میں گلی گلی اور کوچہ کوچہ گائے جاتے ہیں اور جس کی بہادری نے قرون اُولیٰ کے مسلمان جرنیلوں کی تاریخ کو دہرایا ہے۔

ہمیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم اپنے پیارے ابا جان کے نام کو زندہ رکھو گے اپنی تعلیم کے علاوہ تمہارا اولین فرض یہ ہے کہ والدہ کے تابعدار اور فرماں بردار رہو اور دوسرے یہ کہ اپنے بہن بھائیوں کے احساسات، جذبات اور ضروریات کا خیال رکھو۔

زندگی جدو جہد کا نام ہے۔ اور جو لوگ اس کی ذمہ داریوں سے کتراتے ہیں۔ وہ بھر پور زندگی اور اس کی خوشیوں سے کبھی لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وقت سے پہلے ہی تم پر بھاری ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔ لیکن یہ بھی تو ہے کہ تم کوئی عام والدین کے عام فرزند نہیں ہو بلکہ ایسے خاندان میں پیدا ہوئے ہو۔ جس نے تاریخی کارنامہ کیا ہے۔

پس میرے عزیز! سر بلند رہو اور زندگی کو کامیاب بناؤ۔ زندگی کی جدو جہد میں تم ہمیں شانہ بشانہ پاؤ گے اور زندگی کی ناؤ چلانے میں تم کو ہماری محبت خیر اندیشی، روحانی و مالی ہر طرح کی

امداد ملتی رہے گی۔

ہم جنوری ۱۹۶۶ء کے اختتام پر چھٹی نے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ زیادہ وقت تمہارے پاس ٹھہریں گے۔

ہم نے تمہارے تعلیمی مستقبل اور ترقی کے بارے میں سوچ لیا ہے اور تم میرے دیانتدارانہ خیالات پڑھ چکے ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ راہ اختیار کی جائے جو تمہارے لیے نہایت مناسب اور بہترین ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ ایک اچھے عزیز کی طرح ہمارے فیصلے کو خوبی قبول کرو گے۔

جب بھی تمہیں اپنی تعلیمی مصروفیات اور دوسرے فرائض سے جو اپنی والدہ کا ہاتھ بٹانے کے لیے تمہیں ادا کرنے پڑتے ہیں۔ وقت ملے تو ہمیں ضرور خط لکھا کرو۔

تمہاری بہنیں اور بھائی تمہیں بہت زیادہ یاد کرتے ہیں اور سلام بھیجتے ہیں۔

سب کو پیار (آپ کا انکل ______ شریف)

شہید کی والدہ

۲۹۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کو پہلی مرتبہ موصوفہ سے ملاقات ہوئی اور اس وقت انٹرویو کی جو روئداد اخبارات میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس میں مَیں نے لکھا تھا کہ پاکستان کے قابلِ فخر فرزند کی ماں کے دلی تاثرات سن کر اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ عظیم انسانوں کے والدین بھی عظمت کے حامل ہوتے ہیں۔ محترمہ آمنہ خاتون نے اس ملاقات میں کہا تھا:

''میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے بیٹے کی قربانی قبول کر لی۔ میرا بیٹا اللہ میاں کے پاس پہنچ گیا ہے۔ ہم سب کو وہیں پہنچنا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کی قربانی قوم اور وطن کے کام آئی۔''

انہوں نے انتہائی معصومیت سے کہا تھا:

''جب مَیں اُس کے پاس جاؤں گی۔ تو اپنے عزیز کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر اسے شاباش دوں گی۔ کہ تیری قربانی نے پاکستان کی عظمت میں اضافہ کیا ہے۔''

عزیز کی یادوں کو ذہن میں لاتے ہوئے محترمہ کے آنسو چھلک پڑے۔ تو کہنے لگیں۔ ''میرا یہ دوسرا بیٹا شہید ہوا ہے۔'' مگر پھر اس موضوع کو بھی آنسوؤں کے ساتھ ہی پی گئیں۔

اس پہلی ملاقات کے بعد بارہا ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ شروع میں وہ عزیز کی یادوں سے بڑا درد و کرب محسوس کرتی تھیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اس درد میں کسک پیدا ہوتی گئی۔ اور پھر انہی یادوں سے ان کے جذبات کو آسودگی ملتی تھی۔

اگست ۱۹۶۶ء کے دوسرے ہفتے ریڈیو پاکستان راولپنڈی ریجن سے پنجابی پروگرام کے مسٹر خلیل انصاری ریڈیو کے دوسرے کارکنوں کے ہمراہ والدہ میجر عزیز بھٹی شہید کا انٹرویو ریکارڈ کرنے کے لیے لادیاں گئے۔ تو گجرات سے ہمیں بھی ساتھ لے گئے۔

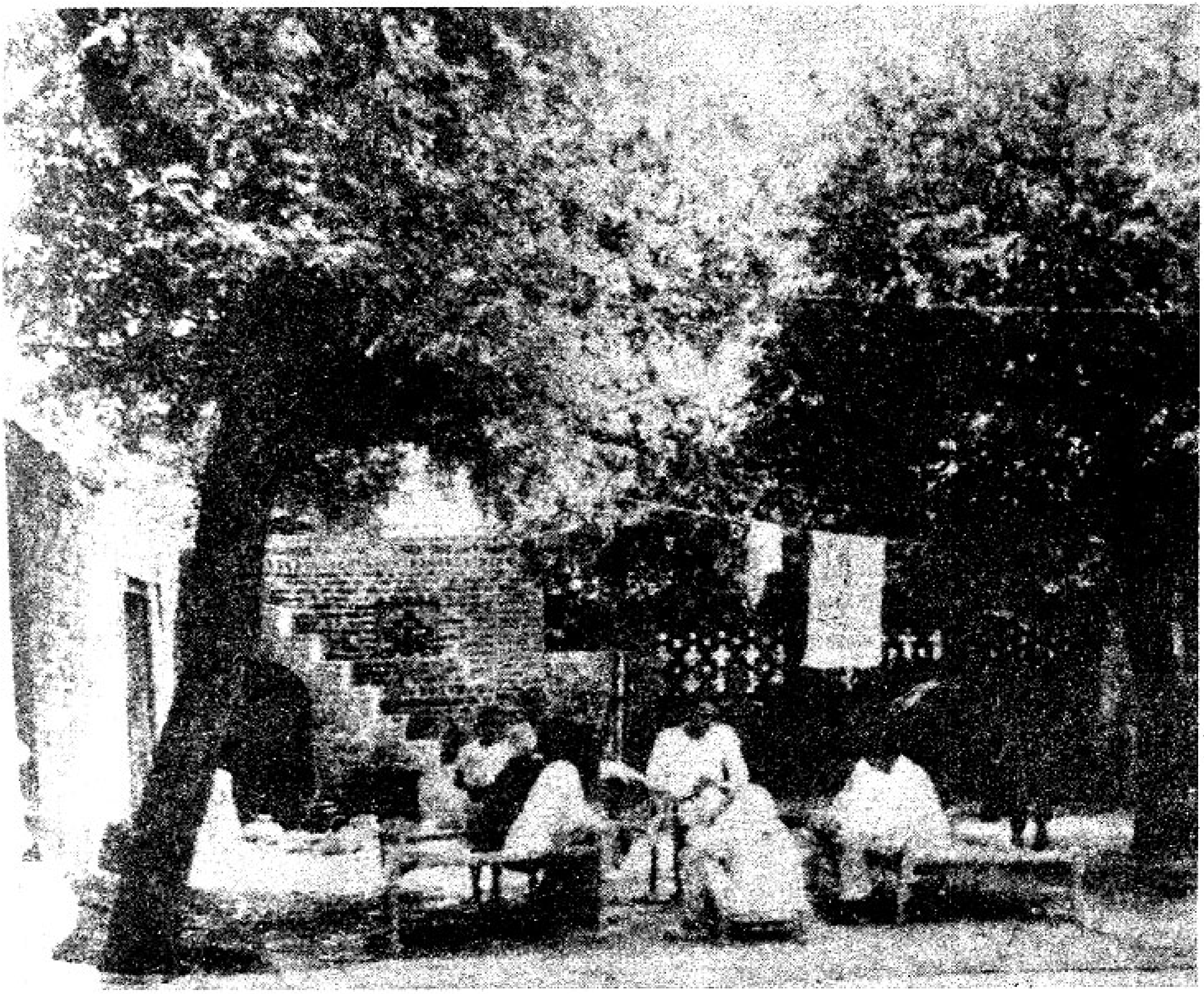

محترمہ مہا ماں جی سے ایک ملاقات

اس وقت تک محترمہ آمنہ خاتون کی یہ حالت تھی کہ انٹرویو کے دوران ان کے جذبات بے قابو ہو گئے۔

ان کا انٹرویو دو دفعہ ریکارڈ کیا گیا۔ دوسری بار انہوں نے جذبات پر قابو پا لیا۔ ان کا پیغام ایک عظیم عسکری ہیرو کی ماں کے شایانِ شان تھا۔ اس پیغام سے پاکستانی مائیں اور پاکستانی فرزند ہمیشہ فیضانِ روحانی حاصل کرتے رہیں گے۔

محترمہ آمنہ خاتون نے بمشکل ہوش سنبھالا تھا کہ ان کی شادی ہو گئی۔ اور وہ اس گھر میں آئیں۔ وہ زمانہ اس جوڑے کی زندگی میں انتہائی جدوجہد کا زمانہ تھا۔ ماسٹر محمد عبداللہ بھٹی کا بیان ہے۔ کہ ان کی ازدواجی زندگی میں بڑے نشیب و فراز آئے۔ مگر عزیز کی والدہ نے ہر مصیبت کو خندہ

پیشانی سے برداشت کیا۔

جس حسن وخوبی سے وہ اپنے خانگی معاملات کو چلاتی ہیں۔اس کے باعث ماسٹر محمد عبداللہ خانگی تفکرات سے بالکل آزاد رہتے ہیں۔

ماسٹر محمد عبداللہ کہتے ہیں۔میرا رجحان شروع سے کفایت شعاری کی طرف ہے مگر عزیز کی والدہ فراخدل ہے۔اور عزیز واقارب کے ساتھ معاملات میں ہمیشہ احسان اور فراخ دلی سے پیش آتی ہیں۔

عزیز کے والدین انتہائی محنتی ہیں۔اور انہوں نے ساری عمر کسبِ حلال اور بچوں کی بہترین تربیت کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کی ہے۔ماسٹر محمد عبداللہ آج بھی ۷۷ سال کی عمر میں چک نمبر ۷۰ بھلوال میں عزیز بھٹی فارم کی خودنگرانی کرتے ہیں (یہ زمین شہید کے بچوں کو''نشانِ حیدر'' کے اعزاز کے ساتھ ملی ہے۔)

اور عزیز کی والدہ ۱۲ سال کی عمر سے لے کر (جب وہ اس گھر میں آئیں) آج ۷۰ سال سے زائد عمر تک دن بھر اپنے ہاتھ سے کام کرتی ہیں۔

دونوں میاں بیوی اسلامی شعائر کی سختی سے پابند ہیں۔

عزیز اپنے والدین کے سب سے چہیتے فرزند تھے۔ان کے دل میں اپنے والدین کے لیے بچپن سے ہی بے پناہ محبت، عقیدت واحترام تھا۔جو عمر بھر قائم رہا۔انہیں اپنی ماں کے نازک جذبات کا حد سے زیادہ خیال رہتا تھا۔چنانچہ شہادت سے تین دن قبل میدانِ جنگ سے اپنے والد کے نام خط میں لکھتے ہیں۔خدا آپ کو اتنی ہمت دے کہ مہاماں جی کو تسلی دیتے رہیں۔

''ماں کے جذبات''

پیارے بچو۔ السلام علیکم

خط تمہارا ۳۰ر نومبر کا مجھ کو مل گیا ہے۔ خدا کا شکر کرتی ہوں کہ آپ سب خیریت سے ہو۔ بچو! میں کیا لکھوں۔ مجھ کو تمہارے اگلے ہی بھائی کی یاد نہیں بھولتی تھی لیکن راجہ صاحب نے مجھ کو ایک اور چوٹ لگائی ہے۔ جو ہر وقت تازہ رہتی ہے۔

میں کیا لکھوں۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ میرا دل ہر وقت اداس رہتا ہے۔ یہی چاہتی ہوں کہ ایک کونہ میں بیٹھ کر گھر کا کام چھوڑ دوں۔ لیکن یہ کب ہو سکتا ہے؟

بجلی آ گئی ہے۔ لیکن مجھے تو کوئی بھی لو (روشنی) نہیں ہوئی۔

روزی کے گھر بھی بجلی آ گئی ہے۔ روزی ابھی تک گھر میں نہیں۔

کامران بھی آیا تھا۔ تین دن ٹھہر کر چلا گیا ہے۔ وہ کراچی سے آیا تھا۔

بی بی جان (طاہرہ) کا بھی خط آیا ہے۔ رشید احمد کا بھی خط آتا ہے۔

کرم الدین آتا ہے جس چیز کی مجھے ضرورت ہو لے کر دیتا ہے اور کوئی فکر نہ کرنا۔ میرے طرف سے تم کو بہت بہت سلام اور بچوں کو پیار۔

جواب کی منتظر: تمہاری دکھیا مہاماں

محترمہ مہاماں جی نے ایک ملاقات میں بتایا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میرا بیٹا زندہ و جاوید ہے۔ مجھے قوم و وطن کے لیے اس کی عظیم قربانی پر بڑا فخر ہے۔ مگر...... مگر...... ایک ماں کے اپنے لختِ جگر کے متعلق جذبات...... آنسوؤں نے گویائی اختیار کی تو لب خاموش ہو گئے۔

شروع دسمبر ۱۹۶۵ کے اِس خط سے ان کی قلبی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۲۳ر مارچ ۱۹۶۶ء کی تقریب

''میں اپنے بیٹے کی شان اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی''

مہاراں جی ____________

ٹیلی ویژن سٹیشن لاہور کے چیف رپورٹر مسٹر مصلح الدین نے ایک ملاقات میں بتایا: مجھے اپنی صحافتی زندگی میں بہت سی خواتین سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان میں محترمہ فاطمہ جناح کے بعد جس خاتون کی پُروقار شخصیت سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ وہ میجر عزیز بھٹی کی والدہ محترمہ آمنہ خاتون ہیں۔ ان کا ایک ایک لفظ ان کے استقلالِ مزاج اور مضبوط قوتِ ارادی کا آئینہ دار تھا۔

مسٹر مصلح الدین نے اکتوبر ۱۹۶۵ء کے پہلے ہفتے لادیاں میں محترمہ سے ملاقات کی تھی۔ اور شہید کے گھر اور گاؤں کی فلم حاصل کی تھی۔

....

۲۱ر مارچ ۱۹۶۶ء کو ماسٹر محمد عبداللہ لاہور سے لادیاں آئے۔ دیکھا کہ عزیز کی والدہ بخار سے پھُنک رہی ہیں۔ گزشتہ تین دن سے وہ بخار میں مبتلا تھیں۔ اور نقاہت کے باعث ہل جُل بھی نہیں سکتی تھیں۔

ماسٹر جی پریشان اور مایوس ہوئے۔ لاہور میں انہیں سرکاری طور پر اطلاع ملی تھی کہ بتاریخ ۲۳ر مارچ یومِ جمہوریہ کی تقریب پر راولپنڈی میں صدرِ مملکت ''نشانِ حیدر'' کا تمغہ شہید کی بیگم کو دیں گے۔

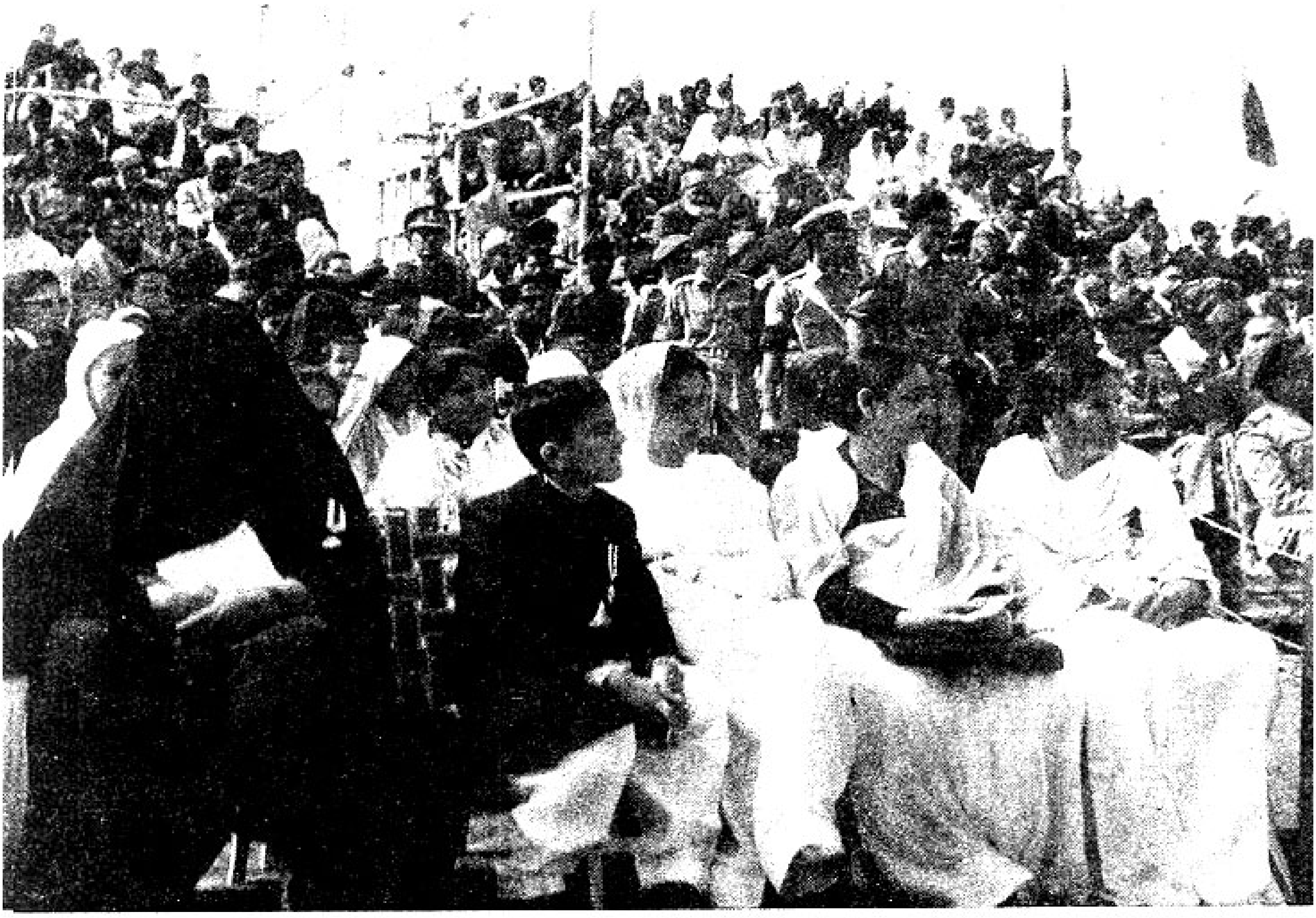

پہلی قطار میں (دائیں سے بائیں) بیگم میجر عزیز بھٹی شہید۔ بیگم بریگیڈیئر شامی شہید۔ بیگم کرنل عبدالرحمٰن شہید، ان کا بچہ۔ بیگم میجر شاہنواز شہید (بُرقعہ میں)

پروگرام کے مطابق ''زرینہ، ظفر، رشید اور فاطمہ تو لاہور سے سیدھے راولپنڈی چلے گئے تھے۔ اور ماسٹر عبداللہ، والدہ عزیز کو لینے لادیاں آئے تھے۔ مگر اس حالت میں تو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ انہوں نے بے دلی سے یہ بات ان کے گوش گزار کردی۔

عزیز کی والدہ نے چہرے سے کپڑا ہٹا کر پوچھا۔ ۲۳/ تاریخ کو راولپنڈی میں ''نشانِ حیدر'' کا اعزاز دیئے جانے کی تقریب ہوگی؟ آج کیا تاریخ ہے؟

صدر ایوب نشان حیدر کا تمغہ آویزاں کر رہے ہیں

انہیں بتایا گیا کہ آج ۲۱ر تاریخ ہے اور ۲۳ر کو تقریب ہوگی۔ مگر ساتھ ہی اس افسوس کا اظہار بھی کر دیا گیا کہ اب وہ نہیں جا سکیں گی۔

۷۰ سالہ محترمہ آمنہ نے فیصلہ کُن انداز میں کہا ''میں تو انشاء اللہ ضرور جاؤں گی۔ میں اپنے بیٹے کی شان اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی۔''

ماسٹر جی حیرت میں ڈُوبے ہوئے تھے کہ یہ کیونکر ممکن ہوگا؟

مگر اس جسمِ ناتواں کے عزمِ آہنی کے سامنے بخار نے سر جھکا دیا۔ بخار کی شدت کم ہو گئی۔ انہوں نے نیم گرم پانی سے ہاتھ منہ دھویا اور اسی لمحہ سفر کی تیاری کرنے لگیں۔

۲۳ر مارچ کو ریس کورس کے وسیع میدان میں تقریب سے فارغ ہو کر ہم واپس آ رہے تھے کہ ان سب سے ملاقات ہوگئی۔ ماسٹر جی نے یہ واقعہ سنایا۔ میں نے دیکھا کہ محترمہ کے چہرے پر نقاہت یا بخار کا کوئی اثر نہ تھا۔ ماسٹر جی کہنے لگے کہ راولپنڈی پہنچنے تک بخار بالکل اُتر چکا تھا۔

ہم ایک دن قبل ۲۲ر مارچ کو ہی راولپنڈی پہنچ گئے تھے۔ ڈائس کے قریب سُرخ انکلوژر میں صحافیوں کی مخصوص نشستوں کے دعوت نامے حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ یوم جمہوریہ کی یہ تقریب ایک تاریخی اجتماع تھا۔ قومی ہیروؤں کے اعزازات اور دوست ملک ''چین'' کے اسلحہ کی نمائش کے باعث بے پناہ رونق تھی۔ ریس کورس کے وسیع میدان میں لاکھوں بچے، بوڑھے اور جوان موجود تھے۔ خواتین کی تعداد مردوں سے کم نہ تھی۔

جب سفید ساڑھی میں ملبوس محترمہ زرینہ اختر بھٹی لاکھوں نگاہوں کے احترام کا مرکز بنی اولین قطار کی اولین نشست پر آ کر بیٹھیں۔ تو لوگ اشتیاق سے ایک دوسرے کو بتا رہے تھے کہ وہ بیگم عزیز بھٹی شہید ہیں۔ پھر جب شہید کا نام پکارا گیا تو وسیع پنڈال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ صدرِ پاکستان مارشل محمد ایوب خاں ''نشان حیدر'' کا سنہری تمغہ آویزاں کرنے کے لیے ان کے قریب آئے تو شدتِ جذبات سے ہزاروں آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

اُنہوں نے اپنی جان دے کر

''مُلک کو زندگی اور عظمت عطا کی''

صدر محمد ایوب خان نے اس عظیم الشان تقریب کو خطاب کرتے ہوئے جنگِ ستمبر کے شہیدوں کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

میرے عزیز بہادرو! السلام علیکم،

آج پورا پاکستان تمہیں مبارکباد دے رہا ہے۔ آج پاکستانیوں کے سر بلند ہیں کہ خداوند کریم نے اُن کو ایک بہت بڑے امتحان میں کامیاب کیا۔ ساری دنیا اس بات کی گواہ ہے کہ تم نے اس معرکے میں بے مثال بہادری اور جرأت دکھائی ہے۔ تم نے اپنے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ خدا کے فضل سے پاکستانی فوجوں کی ہمت اور تنظیم کا مقابلہ آسان نہیں۔

پچھلے اٹھارہ سال میں جس طریقے پر تمہاری تربیت اور ٹریننگ ہوئی ہے اور جس محنت سے پاکستان کی بری، بحری اور فضائی فوج کو منظم کیا گیا ہے۔ دنیا اس کا اعتراف کر رہی ہے۔

ہتھیار بڑی چیز ہیں مگر کمال ان ہاتھوں ہے جو انہیں اٹھاتے اور استعمال کرتے ہیں۔

خدا نے تمہارے ہاتھوں کو وہ قوت دی کہ دشمن کا ہر وار ناکام رہا اور وہ اپنی ساری طاقت کے باوجود پاکستان کی مقدس زمین پر کہیں قدم نہ جما سکا۔ تم نے ہر محاذ پر اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اس کے ہر حملہ کو کچل کر رکھ دیا۔

یہ سب اللہ کی مہربانی تھی اور اس بات کا ثبوت تھا کہ تمہارے ہاتھ حق اور انصاف کی حمایت اور اپنے ملک کی حفاظت کے لیے اٹھے تھے۔

اس جنگ میں پاکستانی قوم نے اپنا مقام پالیا۔ اور ہر شخص خود کو پاکستانی کہنے میں بجا طور پر فخر محسوس کرنے لگا۔

جنگ کی بھٹی سے یہ ملک کندن بن کر نکلا ہے جسے شہیدوں کے لہو نے تب و تاب بخشی ہے اور یہی ان کی قربانی کا صلہ ہے۔ آج میری اور تمہاری طرح ساری قوم تمہارے شہید ساتھیوں کو یاد کر رہی ہے۔ انہوں نے اپنی جان دے کر ملک کو زندگی اور عظمت عطا کی۔ وہ زندگی اور عظمت جو انشاء اللہ ابد تک قائم رہے گی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے جوانوں کے لہو سے جو پھول کھلے ہیں۔ وہ اس ملک کی بقا اور اتحاد کے ضامن ہیں۔

بہادر سپاہیو! آج کا دن ہمارے لیے تاریخی دن ہے۔ آج سے چھبیس سال پہلے اس برعظیم کے مسلمانوں نے پاکستان کا خواب دیکھا اور اپنے لیے ایک علیحدہ وطن قائم کرنے کا اعلان کیا۔ ۱۹۴۷ء میں اس خواب کی تعبیر ملی اور آج اس کی تکمیل ہو رہی ہے۔ ابھی بہت سے مراحل اور مشکلات ہمارے سامنے ہیں۔ ہمیں اپنے وطن کی خوشحالی اور ترقی کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ عوام کی بہبود کے لیے امن کا ماحول ضروری ہے۔ امن ہی کی خاطر ہم نے تمام ملکوں خصوصاً اپنے ہمسایوں سے تعلقات بہتر بنانے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ ہماری یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہوئی۔

تمام دنیا گواہ ہے کہ ہم نے ہندوستان سے اپنے جھگڑے طے کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ جموں اور کشمیر کے عوام کی آزادی کا مسئلہ ہندوستان اور پاکستان میں کشمکش کا اصل باعث ہے۔ اسی کشمکش میں گزشتہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں جنگ کی صورت اختیار کر لی تھی اور کشمیر کا مسئلہ جسے ہندوستان اٹھارہ سال سے دبائے ہوئے تھا۔ ساری دنیا کے امن کے لیے خطرہ بن گیا۔

ان سب واقعات سے ہندوستان کو کم از کم اتنا تو سمجھ لینا چاہئے کہ جب تک اس مسئلہ کو منصفانہ طریقہ پر حل کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ دونوں ملکوں میں حقیقی امن قائم نہیں ہو سکتا اور

جب تک انصاف اور عزت کے ساتھ امن قائم نہیں ہوتا، دونوں ملک اپنے محدود ذرائع ہتھیار بندی پر ضائع کرتے رہیں گے۔

اپنی جگہوں پر واپس آ گئے۔

یہی اصل تنظیم ہے اور اسی سے ملک قائم رہتے ہیں اور ترقی کرتے ہیں۔ آنے والے دنوں میں یہ تربیت اور تنظیم ہر سطح اور قومی زندگی کے ہر شعبے میں زیادہ سے زیادہ مضبوط ہونی چاہیے۔ تاکہ آئندہ کسی کو ہمارے عزیز وطن کی طرف آنکھ اُٹھانے کی جرّت نہ ہو اور وسائل کی کوئی کمی ہماری دفاعی طاقت اور قومی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہونے پائے۔

دراصل تنظیم اور اعلیٰ کارکردگی بجائے خود بہت بڑے وسائل ہیں اور یہ بیش قیمت انسانی وسائل ہی مشرقی پاکستان کے ایک کونے سے لے کر مغربی پاکستان کے دوسرے کونے تک ملک کے دفاع اور ترقی و سلامتی کی مکمل اور بہترین ضمانت ہیں۔

پاکستان امن اور ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ امن پسندی پوری قوم کی خود اعتمادی کی دلیل ہے۔ ہماری افواج کا ہر سپاہی ایک آہنی دیوار کی مانند پاکستان کی حفاظت کے لیے پورے عزم کے ساتھ تیار ہے۔ خدا تمہارے اس عزم کو اور مضبوط اور مستحکم کرے۔ آمین۔

پاکستان پائندہ باد

تقریب کے خاتمہ پر لوگ سڑک پر آ گئے۔ بے پناہ ٹریفک کے باعث سڑک پیدل چلنے والوں کے لیے ڈیڑھ گھنٹہ رُکی رہی۔ لوگ ہر گاڑی اور کار کو غور سے دیکھتے تھے۔ تا آنکہ ۲۵۳ نمبر کی ایک فوجی گاڑی شہید کے عزیزوں ____ بیگم، والد، والدہ، فرزند ____ بھائی (رشید) اور بھاوج (فاطمہ) کو لے کر گزری۔ تو لوگوں نے انہیں پہچان کر پُر جوش تالیاں بجائیں۔

پشاور سے چٹاگانگ تک

'عقیدت کے پھول'

میجر عزیز بھٹی کی شہادت اور عظیم فوجی اعزاز پر ان کے عزیزوں کو پاکستان کے کونے کونے سے ہزاروں خطوط موصول ہوئے۔ چند خطوط یہاں دیئے جاتے ہیں۔ ان سے عوام کی شہید سے عقیدت، محبت اور اپنائیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

عظیم الدین ہائی سکول پوسٹ آفس کشور گنج
ضلع میمن سنگھ (مشرقی پاکستان)
14 اکتوبر 1968ء

پیارے جاوید
تمہارے لئے دعا اور تمہارے دادا جان اور امی کو سلام!

میں تمہیں کس طرح دلاسہ اور تسلی دلاؤں۔ اگر تمہارے لیے یہ امر باعث تسکین ہو سکتا ہو تو میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ پاکستانی بچوں کی موجودہ نسل تمہاری اس ارفع و اعلیٰ حیثیت پر بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔ جو تمہیں اپنے مرحوم ابا جان کی عدیم المثال قربانی کی وجہ سے حاصل ہو چکی ہے۔ تمہارے آبا کی رہ عظیم جانی قربانی جو انہوں نے مادر وطن کی قربان گاہ پر دی' آنے والی نسلیں ہمیشہ اس پر رشک کرتی رہیں گی۔ اور تمہارے ابا کی یہ قربانی ہمیشہ ان میں جوش اور ولولہ پیدا کرتی رہے گی۔ تمہارے عظیم المرتبت ابا نہ صرف تمہارے لیے بلکہ ساری قوم کے لئے ایک ایسا قیمتی ورثہ چھوڑ گئے ہیں۔ جس کی وہ اُسی طرح قدر و منزلت کرتی رہے گی۔ جس طرح وہ خالدؓ بن ولید' طارقؒ بن زیاد اور موسیٰؒ بن نصیر کی عزت و توقیر اُن کے چھوڑے ہوئے جرأت و شہامت کے ورثوں کی وجہ سے کرتی ہے۔ میں جو ایک مدرس ہوں اور تمہارے مرحوم ابا کی عمر ہی کا ہوں' میرے دل میں بھی یہ

تمنا چٹکیاں لیتی ہے' کہ کاش! میں شہید عزیز بھٹی نشان حیدر'' ہوتا اور اسی طرح مجھے یقین ہے کہ میرے بچے بھی دل میں یہی کہتے ہوں گے کہ کاش ہم عزیز بھٹی کے بچے ہوتے!

ہمیں بھارت کے مکارانہ حملے کا ممنون ہونا چاہیے اس لئے کہ بھارتی شیطان نے اسلام کے ''اسرافیلوں'' کو جگا دیا ہے۔ہمیں حالیہ جنگ کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اس نے پاکستانی قوم کو پشاور سے لے کر چٹاگانگ تک متحد ہو کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا۔اس بھارتی جارحیت نے ہم پر توحید کی قوت کا راز ایک بار پھر آشکار کر دیا ہے۔اور اس معرکہ حق و باطل نے چودہ سو سال کے بعد ایک بار پھر دنیا کو بتا دیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم نے کیونکہ تعداد میں دس گناہ بھاری دشمن کو بھی ذلت آمیز شکست دی۔ یقیناً حالیہ جنگ نے ہمیں صحیح معنوں میں مسلمان بنا دیا ہے۔الحمد اللہ!

خدا تمہارا حامی و ناصر ہو اور سب مسلمانوں کو اس جذبے سے سرشار کرے جس کا مظاہرہ تمہارے شہید ابا نے میدان میں کیا۔اور تم پر اور تمام مسلمانوں پر اس کا فضل و کرم ہے۔انشاء اللہ یہ کاروان چلتا رہے گا۔خدا حافظ

دلی دعاؤں کے ساتھ

ہیڈ ماسٹر عظیم الدین ہائی سکول کشور گنج

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابو الاعلیٰ مودودی

اے ذیلدار پارک۔اچھرہ

لاہور(پاکستان)

مورخہ ۱۶/اکتوبر ۱۹۶۵ء

محترمی ومکرمی   السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

میں آپ کے فرزندارجمند میجر راجہ عزیز بھٹی کی شہادت پر آپ کو تعزیت نامہ لکھنے کے لیے بے چین تھا۔ مگر مجھے آپ کا پتہ معلوم نہ تھا۔اب سلطان احمد صاحب امیر جماعت اسلامی ضلع گجرات کے ذریعے مجھے آپ کا پتہ ملا ہے اور پہلی فرصت میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔

آپ کے صاحبزادے نے دارالاسلام کی حفاظت کے لیے اللہ کی راہ میں جہاد کا پورا پورا حق ادا کر کے شہادت پائی ہے۔اس عظیم قربانی پر پاکستان کے تمام مسلمانوں کے دل ان کے لیے قدرو عزت کے جذبات سے لبریز ہیں۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کی اس قربانی کو قبول فرمائے اوران کو شہدائے بدرواُحد کی معیت کا شرف بخشے،اوران والدین کو بھی ان کے ساتھ اجر میں شریک کرے جن کی تربیت نے اسلام کو ایسا جانباز خادم نذر کیا۔آپ کے لیے اوران کی اہلیہ اور بچوں کے لیے میری اور جماعت اسلامی کے تمام کارکنوں کی ہمدردیاں وقف ہیں۔اللہ تعالیٰ آپ سب کو صبر بھی عطا فرمائے اور اجر بھی۔

خاکسار

ابوالاعلیٰ مودودی

سیارہ ڈائجسٹ لاہور۔ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۶۵ء

پیارے ظفر۔ السلام علیکم

تمہارا خط ملا۔ ایک گونہ تسلی ہوئی۔ تمہارے لئے دل کی گہرائیوں سے دعا نکلتی ہے۔ تم ایسے باپ کے بیٹے ہو جس کی شجاعت پر پاکستانی قوم ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔ ان شہیدوں کا صدقہ ہے کہ آج پاکستان قائم ہے' ان شہیدوں کے خون سے پاکستان کی بنیادیں اور مضبوط ہوگئی ہیں۔

یہ قدرتی بات ہے کہ اپنے باپ کا سایہ اُٹھ جانے کا تمہیں افسوس ہے۔ پھر تمہیں ان سے پیار بھی بہت تھا۔ لیکن تاریخ میں ایسے موقعے آجاتے ہیں۔ جب ملک اور قوم کی زندگی کے لئے فرد اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ ایسے افراد شہید ہوتے ہیں اور وہ خود زندہ تر ہو جاتے ہیں اور قوم کی پائندہ تر کر جاتے ہیں' تمہارے والد تمہارے لیے ہی پیارے نہیں تھے ہم سب کیلئے پورے ملک کیلئے پیارے ہو گئے ہیں' تمہارے افسوس میں اور تمہارے فخر میں ساری قوم شریک ہے۔ ظفر' بیٹے تم تنہا نہیں ہو۔

میں تم پر یہ پابندی نہیں لگاؤں گا کہ میرے خطوں کا باقاعدگی سے جواب دیتے رہو لیکن اتنی خواہش ضرور رکھوں گا کہ وقتاً فوقتاً اپنی خیریت سے ضرور آگاہ کرتے رہو اور میں تمہارے کسی کام آسکوں تو بے تکلفی سے کہو ایسے جیسے تم کسی دوست بھائی' چچا یا اپنے باپ سے کہتے۔

لاہور آنا ہو تو مجھ سے ملنے کی کوشش کرنا۔ پاکستان پائندہ باد

دعا گو لاہور۔ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۶۵ء

خورشید عالم ایڈیٹر سیارہ ڈائجسٹ۔ ۴ کوئنز روڈ۔ لاہور

تم اپنی اردو کے متعلق فکر نہ کرو تمہاری تحریر اچھی خاصی ہے' خط بھی اچھا ہے اور لکھنے کا انداز بھی۔ اُردو میں دلچسپی ضرور لیتے ہیں۔ میں نے سیارہ ڈائجسٹ بھجوایا تھا۔ اُمید ہے کہ مل گیا ہوگا۔

لاہور۔12 اکتوبر 1965ء   مادر قوم!

تجھے لاکھوں سلام!

اے ماں! مجھے ایک جنبی بیٹا سلام کہہ رہا ہے' میں جانتا ہوں' اس ماں کا دُکھ جس نے عزیز جیسے بیٹے کو کھو دیا ہے۔ مگر اے مادر عزیز!

وہ فخر وہ شان وہ منزلت وہ سرفرازی جو تیرے حصے میں آتی ہے کب کسی ماں کو نصیب ہوتی ہے!

جنگ شروع ہوئی۔ مجھے ایک دوست نے لکھا۔ فوراً لاہور چھوڑ کر چلے آؤ' میں نے جواب دیا۔ جب تک پاکستان کا آخری سپاہی واہگہ کی سرحد پر موجود ہوگا۔ میں بھی یہیں رہوں گا۔ میرا یہ دعویٰ یونہی نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ عزیز جیسے سپاہی سرحد پر موجود ہیں۔

ہندو...... خون کی وہ نہر کبھی عبور نہ کر سکے گا۔ جو ہماری سپاہ نے اپنے لہو سے رواں دواں کر دی ہے۔

ماں...... تو صرف عزیز ہی کی ماں کیوں ہے' تو میری بھی ماں ہے۔ اے مادر عزیز! تو سارے پاکستان کی ماں ہے۔ تمہیں تمہاری کھوکھ پر فخر ہے۔

کل تمہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ آج سارا ایشیا جانتا ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ تو عزیز کی ماں ہے۔ تو مادر پاکستان ہے!

اماں: تیری مریمؑ جیسی معصوم تصویر دیکھ کر ہی دنیا جان گئی تھی کہ ایسی ہی ماں عزیز جیسے بیٹے کو جنم دے سکتی ہے۔

ماں! میں مکمل خلوص و احساس کے ساتھ اور تمام انسانی سچائیوں کے واسطے سے آپ کے غم' آپ کے فخر اور آپ کی خوشی میں برابر کا شریک ہوں۔

شہید وطن کے بچوں کو پیار' اس کے غم گسار باپ کو سلام اور خود اُس کی روح پر خدا کی رحمتیں۔

والسلام

آپ کا ایک بیٹا   رحیم گل فلم ڈائریکٹر

16 مین روڈ سمن آباد لاہور۔

خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ   30 نومبر 1965ء

میرے پیارے دوست ظفر جاوید

السلام علیکم! دیگر احوال یہ ہے کہ خط دیر سے لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مجھے آپ کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ بہت مدت کے بعد سیارہ ڈائجسٹ کے مطالعے سے آپ کا پتہ معلوم ہوا۔

مجھے آپ کے والد صاحب کی شہادت اور عظیم کارنامے پر بہت زیادہ خوشی ہوئی انہوں نے ایک بلند اور نیک مقصد کیلئے اپنی جان قربان کر دی۔

ان کے اس عظیم کارنامے پر سارے ملک کو فخر ہے۔ بلکہ تمام دنیائے اسلام کو فخر ہے کہ انہوں نے کافروں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا۔

ان کی زندگی ایک عظیم انسان کی زندگی تھی۔ جنہوں نے تاریخ اسلام میں ایک اور سنہری باب کا اضافہ کر دیا۔ جس پر مغربیت انگشت بدنداں ہے اور آئندہ نسلیں فخر کر سکیں گی۔

کون ہے؟ جو اُن کے اس کارنامے سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پاکستان ریڈیو اُن کی بہادری کے نغمے گاتا ہے۔ اخباروں، رسالوں میں ان بہادری کی داستانیں چھپتی ہیں ......

درحقیقت وہ مردہ نہیں وہ تو زندہ ہیں۔ اور شہید ہمیشہ زندہ ہوا کرتے ہیں۔

پیارے دوست! میں آپ کے والد بزرگوار کو نشان حیدر اور اس عظیم مرتبہ پانے پر مبارک باد کے ساتھ اظہار تعزیت بھی کرتا ہوں۔

اظہار تعزیت اس لیے کہ آپ ایک عظیم، بہادر اور شفیق پدر کے سائے سے محروم ہو گئے۔

وہ والدین جو اولاد کے لئے ٹھنڈی چھاؤں ہوتے ہیں اور اپنی اولاد کی خوشیوں پر سب کچھ نچھاور کر دیتے ہیں۔ جو خدائے ذوالجلال کی بہت بڑی نعمت ہوتے ہیں۔

میرے پاس جذبات کی تسکین کے لئے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں وہ آنسو جو ایک محبت کرنیوالے کو حاصل ہوتے ہیں۔ جو کسی کو دینے کے لئے دنیا کا سب سے قیمتی تحفہ ہے۔

وہ ہمارے لیے ایک بہت بڑی مثال چھوڑ گئے۔

والدہ صاحبہ کو سلام اور بچوں کو پیار۔ خدائے پاک آپ حضرات کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ فقط

(فہیم الدین وارڈ نمبر 4 مکان نمبر E/3 خان گڑھ۔ تحصیل و ضلع مظفر گڑھ)

پشاور

19 اکتوبر 65ء

ڈیئر جاوید

السلام علیکم! آپ کے والد محترم کی شہادت کو خبر چند روز پہلے تمام اخباروں میں چھپی تھی۔ میری یہ دلی خواہش تھی کہ آپ کو خط لکھوں کئی روز کی دیرینہ خواہش آج ''حریت اخبار نے پوری کی۔ اور مجھے آپ کا ایڈریس حاصل ہوا۔

میں سوچتا ہوں کہ آپ کو آپ کے والد صاحب کی شہادت کے بارے میں کیا لکھوں۔ اظہار تعزیت کیلئے تین باتیں ضروری ہوتی ہیں۔

1۔ اظہار غم 2۔ تلقین صبر اور 3۔ دعائے مغفرت

اظہار غم میں کیا کروں۔ مجھے تو یہ جان کر خوشی اور رنج ملے جلے جذبات سے سامنا ہوا۔ خوشی اس لئے کہ ایک مرد مجاہد نے اپنے وطن کی سرزمین کیلئے قربانی کا جو عطیہ اپنے ملک کو دیا ہے۔ اس کیلئے ساری قوم اُن کی شکر گزار ہے۔ اور رنج اس لیے ہوا کہ ہم سے ایک مرد آہن بہت جلد رخصت ہو گیا۔ دعائے مغفرت میں کیا کروں۔ کیوں کہ شہید کی مغفرت تو اسی وقت ہو جاتی ہے۔ جب اس نے اپنی جان کا نذرانہ مادر وطن کے پیش کیا۔ ہاں البتہ یہ دعا کر سکتا ہوں کہ خداوند ان کے رتبے میں اضافہ کرے۔ اور تلقین صبر کے وسطے میں اس لیے نہیں کہہ سکتا' کیوں کہ آپ خود نہایت صبر و تحمل کے مالک ہیں۔ اب میں اپنا تعارف کرادوں تو بہتر رہے گا۔ میرا نام جاوید اقبال ہے۔ اور میں نے میٹرک پاس کر کے اسی سال گورنمنٹ کمرشل انسٹیٹیوٹ پشاور میں سی کام (اے) کا داخلہ لیا ہے۔ آپ سے یہ امید ہے کہ آپ میرے ساتھ دوستی کرنا ضرور قبول فرمائیں گے۔ اور یہ میرے لیے نہایت فخر کا باعث ہوگا۔

میرے خیال میں مندرجہ بالا تعارف اس لیے کافی ہے۔

والسلام

آپ کی خوشی کا طالب' جاوید اقبال (سی کام) اے) گورنمنٹ کمرشل انسٹیٹیوٹ متصل رائل ہوٹل۔ پشاور شہر (مغربی پاکستان)

شاید آپ کو خط کا جواب دینے کی فرصت نہ ملے۔

لائلپور

21 اکتوبر 1965ء

عزیز از جان پیارے دوست جاوید!

میں آپ تم کو زندگی میں پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم مجھے جواب سے محروم نہیں کروں گے۔ مجھے فخر ہے کہ میں بھی اسی سکول میں جس سکول میں آپ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کے جی دن سے سٹینڈر تھرڈ تک حاصل کرتی۔ یہ اب سے کوئی 21 سال پہلے کی بات ہے۔ میں نے دو دفعہ ڈبل پروموشن لگاتار لے کر اسکول کی طرف سے کپ بھی جیتا تھا۔ اُس وقت اس سکول کے پرنسپل فادر کپوینا'' تھے۔ اب نہ جانے وہ کہاں ہیں؟ اب آپ یہ سوچیں گے کہ میں نے آپ کا پتہ کہاں سے حاصل کیا۔ میں نے پتہ اخبار ''جنگ'' سے حاصل کیا ہے۔ اور خط لکھ رہا ہوں' مجھے آفس کے پیچھے فٹ بال کا وہ گراؤنڈ بار بار یاد آتا ہے جس میں ہماری اسکول کی ٹیم نے گورنمنٹ کالج کی ٹیم کو صفر کے مقابلے میں چھ گول سے شکست دی تھی۔ جس میں سے تین گول میں نے کیے' دو گول برکت علی نے اور ایک گول ظریف خاں نے کیا تھا۔ اب خدا جانے میرے یہ اسکول فیلو کہاں کہاں ہیں؟ اور میں لائلپور میں ہوں۔ میرے عزیز دوست! جب میں نے آپ کے والد ماجد کی شہادت کی خبر سنی تو جیسے میرے اُوپر آسمان سے بجلی گری۔ ایک ملک ایک عظیم سپاہی سے محروم ہو گیا' ایک دوست کتنے دوستوں کو چھوڑ کر اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ میرے چچا میجر شیخ قمر الدین (ریٹائرڈ) شہید کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ بلکہ آپس میں انکے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ پہلے بھی ان کی بے حد تعریف کرتے تھے۔

میں آپ کو ایک دوست کی حیثیت سے اور ایک سکول فیلو کی حیثیت سے خط لکھ رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے جواب سے محروم نہیں کریں گے۔

(شیخ معین الدین معرفت ملک کریانہ سٹور چنیوٹ بازار۔لائلپور۔پاکستان)

ناظم آباد۔کراچی نمبر 18

5 اکتوبر 1965ء

پیارے جاوید

میں کراچی سے ایک طالب علم ہوں اور ہر پاکستانی کی طرح آپ کے ابا جان شہید کی شجاعت' دلیری اور حب الوطنی سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔انہیں سلام کہتا ہوں۔شہید نے شجاعت کے لفظ کرنئے معانی اور وسعتیں دی ہیں۔وہ وطن پاک پر قربان ہو کر زندہ وجاوید ہو گئے ہیں۔

ساری قوم کو اپنے ہیرو پر فخر ہے اور ان کی قربانی ہمیشہ نا قابل فراموش رہے گی۔ہماری مسلح افواج اس تابناک مثال سے ہمیشہ فیضان روحانی حاصل کرتی رہیں گی۔آپ کے ابا جان شہید اور ہمارے قومی ہیرو کو خراج عقیدت پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے نقش قدم پر چلیں اور زندگی کے جس شعبہ میں بھی ہوں۔قوم کیلئے ہر قربانی کے واسطے تیار رہیں۔

میں ایک دفعہ پھر شہید کو سلام کہتا ہوں۔

پیارے جاوید! میرے اس خط کو کراچی کے طلباء کی طرف سے شہید کیلئے ایک مشترکہ خراج عقیدت سمجھیں۔

آپ کا: سید جمیل احمد 11 ڈی' آر ی 31 نظام آباد کراچی نمبر 18

لاڑکانہ

۶۵_۱۱_۱۵

ہماری قوم کے مستقبل کے ستارے

ظفر جاوید!

السلام علیکم! آپ کا خط سیارہ ڈائجسٹ میں پڑھا۔ بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ میں ایک بہادر اور ملک پر جان دینے والے جانباز کے صاحبزادے کے ساتھ دوستی قائم کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ چاہت بھی میرے لئے باعث فخر ہے۔ میں آپ کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ بھی میری تمنا کو نہیں ٹھکرائیں گے اور جواب دیتے رہیں گے۔ دوسرے میں یہ لکھنا بھول گیا ہوں کہ اُردو میں بھی آپ کی طرح اچھی نہیں جانتا۔ فقط

(قائم خاں۔ محمد پور۔ لاڑکانہ)

گرامی نامے

اپنی تحقیق کے دوران براہِ راست ملاقاتوں کے علاوہ خط و کتاب سے بھی کام لیا گیا۔ ان میں سے چند خطوط شکریہ کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

(مصنف)

10 (سی) ماڈل ٹاؤن لاہور

20 مارچ 1966ء

عزیزم گھرال صاحب!

السلام علیکم! آپ کے 14 مارچ 66ء کے خط کا شکریہ آپ نے مجھے میجر راجہ عزیز بھٹی (شہید) ''نشان حیدر'' کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچانے کیلئے لکھا ہے۔ اس عزیز افزائی کا شکریہ!

میں ہانگ کانگ یونیورسٹی سے گریجوایٹ ہو کر نکلنے کے بعد ہانگ کانگ کے محکمہ تعلیم میں انگریزی کا ٹیچر تھا۔ جب عزیز مجھے پہلی بار ملا۔ اس وقت وہ تیرہ چودہ سال کا ہوگا۔ عزیز بڑا زندہ دل نوجوان تھا۔ وہ ذہین تھا اور درس و تدریس کے دوران ہمہ تن متوجہ ہوا کرتا تھا۔ وہ بڑا حاضر دماغ تھا اور ہر بات بہت جلد سیکھ لیا کرتا تھا۔ مجھے اب بھی اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اپنی جماعت میں درس و تدریس کے وقت کس توجہ سے درس لیا کرتا تھا یوں محسوس ہوتا تھا کہ قدرت نے اس میں داخلی نظم و ضبط کی ایک خاص صلاحیت دویعت کر رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں کی کیفیت کچھ عجیب سی ہوا کرتی تھی' اس کی بڑی بڑی سیاہ اور آب دار آنکھیں گویا ہر وقت دور دراز مستقبل میں کچھ دیکھا کرتی تھیں مگر اس کی آنکھوں کی اس کیفیت کا مطلب ہرگز یہ نہیں لینا چاہیے' کہ وہ اندروں بین تھا یا وہ یوں ہی کھویا کھویا سا رہا کرتا تھا' ہرگز نہیں بلکہ وہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہر آن اور ہر گھڑی نہایت مستعد اور چوکنا پایا جاتا تھا۔ وہ اپنے ماحول اور گردوپیش کی ہر کیفیت اور ہر بات سے پوری طرح باخبر ہوتا تھا اور اپنی خالص مطالعاتی مصروفتیوں کے علاوہ دیگر مشاغل میں بھی بڑے شوق اور زندہ دلی سے حصہ لیا کرتا تھا۔

میں نے عزیز بھٹی میں ایک اور خصوصیت بھی پائی اور وہ یہ تھی کہ وہ نہایت تابعدار اور با

ادب نوجوان تھا لیکن اُس کے اس بظاہر انکسار میں بھی ایک ایسے جوان کا نا قابل تسخیر جذبہ صاف ظاہر ہوتا تھا' جو صرف جان کی آخری بازی لگا دینے والے سپاہی ہی میں ہو سکتا ہے۔ اتفاق سے عزیز بھٹی کا سارا خاندان ہی انتہائی محب وطن افراد پر مشتمل ہے' جب الوطنی اس کی رگوں میں بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس قدرتی چیز کے علاوہ اُس میں جو اور صلاحیتیں تھیں وہی اسے اپنے محبوب وطن پر پروانہ وار فدا ہو جانے کے لئے محرک ثابت ہوئیں۔

عزیز بھٹی سے میرا رابطہ 45-1941 کی جنگ کے خاتمہ کے فوراً بعد اچانک کٹ گیا اس کے کنبہ کے تمام افراد بجز اس کے بڑے بھائی بشیر کے ہانگ کانگ سے اپنے وطن گجرات چلے آئے' حسین وجمیل نیلی آنکھوں والا بشیر بھٹی اسی جنگ میں جاپانیوں کے ظلم کا نشانہ بنا تھا۔ اور جب میں 1949ء میں وقت سے پہلے ریٹائر ہو گیا تو مجھے اس کے سب سے بڑے بھائی نذیر بھٹی سے معلوم ہوا کہ عزیز فوج میں ہے۔ عزیز اور بشیر کی طرح نذیر بھٹی بھی میرے شاگرد رہ چکے تھے اور مجھ سے خط وکتابت کرتے رہتے تھے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں یونیورسٹی اور کالج میں اپنی تدریسی سرگرمیوں میں کچھ اتنا زیادہ مصروف رہتا تھا کہ مجھے ان سے ملاقات کا موقعہ نہ مل سکا' عزیز کی دردناک اور بیوقت موت سے مجھے سخت صدمہ ہوا لیکن شہید نے جس مردانگی اور شجاعت کے ساتھ ایک قومی ہیرو کی شہادت کا درجہ پایا اور اپنے محبوب وطن کی تاریخ میں جو اونچا مقام حاصل کیا اس کے پیش نظر میرے واردات قلب غم اور فخر وناز کے ملے جلے جذبات پر مشتمل ہیں' خدا عزیز شہید کی بہادر روح کو ابدی سکون بخشے۔ آمین۔

آپ کا مخلص

میر عالم خاں

2.2اے۔ای۔آئی لائنز کراچی

25دسمبر 1965ء

محترم گھرال صاحب

اسلام علیکم:۔آپ کا خط اور تراشے موصول ہوئے شکریہ......

جواباً عرض ہے کہ شہید میرا چہیتا بھائی ہونے کی حیثیت سے اس کی بہت سی یادیں میرے دل کے کرنے میں محفوظ لیکن ان دنوں میں اپنی بچی کی رخصتی کی تیاریوں میں مصروف ہوں' لہٰذا انہیں قلم بند کرنے سے قاصر ہوں۔اگر حالات نے اجازت دی تو ہم انشاءاللہ رمضان کے فوراً بعد اس فرض کو سرانجام دینے کی خاطر موضع بھر چھ آئیں گے۔اس موقع پر اگر آپ ملاقات کی تکلیف گوارا کریں تو آپ کی مدد کرنے کی کوشش کروں گی۔

پیشتر ازیں جب موقع ملا یادداشتیں نوٹ کرتی جاؤں گی۔دعا ہے کہ آپ کی یہ کتاب خدا تعالیٰ پایہ تکمیل کامیابی سے پہنچائے۔اور آنے والی نسلیں بھی اس سے مستفیض ہوں۔آمین۔

اپنی آمد کی اطلاع انشاءاللہ میں آپ کو پروگرام بننے پر دوں گی۔

آپ کی بہن

طاہرہ

پی این ایس کراچی
23مارچ1966ء

محترم برادر گھرال صاحب

اسلام علیکم۔ کافی دنوں سے آپ کا گرامی نامہ آیا پڑا تھا لیکن اپنی اور شریف صاحب کی علالت کے باعث جلدی حاضر نہ ہو سکی' ابھی ''فلو'' سے پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے تھے تو بچیاں پڑ گئیں۔ بعد ازاں تبدیلی یہاں پر ہو گئی۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں اتنے عرصہ ایک جگہ رہتے ہوئے کیا کچھ ساز و سامان اکٹھا ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر بمشکل ہر چیز کو ترتیب دے کر ستانے کا وقت ملا ہے۔

میں آپ کو بخوشی عزیز کے متعلق آپ کی حسب خواہش حالات و دیگر مطلوبہ اشیاء روانہ کرتی لیکن افسوس کہ اس کے خطوط و دیگر تعزیت نامے محض نوکر کی بے وقوفی سے ردی میں چلے گئے' جس کا مجھے بھی از حد قلق ہے۔ البتہ ایک پرزہ جو کہ ہر وقت میرے پرس میں رہتا تھا آپ کو روانہ کر رہی ہوں' میرا خداہ ارادہ تھا کہ تعزیت ناموں میں سے چند ایک میں گاہے بگاہے کسی اخبار کو روانہ کرتی رہا کروں گی' کہ اُن حسین خیالات و جذبات سے پڑھنے والے مستفیض ہو سکیں جن کر لکھنے والوں نے صفحہ قرطاس پر رکھا ہے' لیکن کیا کیا جائے۔

فوٹو بچی کو البم سے لی ہیں ان سے وعدہ کیا ہے کہ واپس کر دوں گی' ان میں سے جو آپ کے کام کی ہوں بصد شوق چھپوالیں۔

یہ پرزہ عزیز کی شہادت کے ایک روز بعد ملا بذریعہ ریڈ کراس' اس کے ملنے سے مجھے اُمید لگی کہ شاید عزیز کسی دشمن کے کیمپ میں زخمی ہو اور مجھے غلط اطلاع دی گئی ہو' میں نے بذریعہ ریڈ کراس خبر کی تصدیق کروانے کی کوشش کی لیکن دو روز بعد بابو جی کے خط نے ہی سہی امید پر بھی اوس ڈال دی۔ شکر ہے اس کی ذات کا جیسے رکھے!

آج پیارے بھائی کی شان و شوکت دیکھنے کا دن تھا' لیکن بد نصیب بہن کو کہاں یہ فخر حاصل ہوتا۔ رہ رہ کر خیال آتا کہ سترہ برس پہلے جب ظفر آٹھ' دس ماہ کا تھا تو زرینہ اسے گود میں

لے کر اپنے سرتاج کو طلائی تمغہ اور تلوار حاصل کرتے کاکول دیکھنے گئی' کیسی ابتداء تھی اور آج اقبال کو اسی عمر میں لے کر اس کی ''نشان حیدر'' کی تقریب کی شان کا مظاہرہ دیکھنے پنڈی گئی ہیں' ظفر سے ابتداء اور اقبال سے انتہا!!!

میجر یوسف علی کا مجھے ایڈریس معلوم نہیں۔ البتہ کٹنگ ''ڈان'' کا میں نے محفوظ رکھا ہے' آرمی ایسی وسیع ہے کہ کئی لوگ ایک نام کے ہوتے ہیں' ہر افسر کے پاس فون بھی نہیں ہوتا کہ میں فون پر پوچھ سکوں۔

عزیز کی شہادت کا علم مجھے آدھے گھنٹے بعد فون پر لاہور سے ہو گیا' لیکن آپ اُن دنوں کے حالات کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ شریف صاحب کو فوراً فون کرنے کے باوجود ان کی مصروفیت کی انتہا تھی کہ وہ جلدی میری دل جوئی کے لئے نہ پہنچ سکے۔ 12 بجے دوپہر ان کو علم ہوا لیکن نزدیک ہوتے ہوئے بھی وہ آ نہیں سکتے تھے۔ رات پڑے موقع ملا' ہوائی جہاز اور ٹرین کا سفر بند تھا' چند دن بعد بھی راستے خالی از خطر نہ تھے' پھر ان کی ٹرانسفر جہاز پر ہو گئی تھی' اور بچیوں کو میں اکیلے نہیں چھوڑ سکتی تھی' زندگی میں پہلی دفعہ اپنی بے بسی کا خوفناک احساس ہوا۔

کئی دفعہ دل چاہا ہے کہ میں عزیز کے بارے میں کچھ لکھوں لیکن دماغ ایسا ماؤف ہو جاتا ہے کہ کاغذ پر قلم رکھنا بھی نہیں ملتا۔ خدا کرے آپ کی کتاب پایہ تکمیل تک بصد کامیابی پہنچے' اس کی مقبولیت کا میرے دل میں کوئی شک نہیں۔

اگر کراچی آنے کا اتفاق ہو تو اوپر کے ایڈریس پر آپ بآسانی پہنچ سکتے ہیں' اگر وقت تاریخ سے آگاہ تو کوئی آپ کو لینے بھی آ سکتا ہے ٹرین پر سے۔

شریف صاحب کو بوجہ ان کی علالت کے لائٹ ڈیوٹی پر یہاں پر لگایا گیا ہے مکمل آرام کی یہی ایک پوسٹ ہے۔ چھ ماہ کے لئے انہیں کافی آرام کی ضرورت ہے' لہٰذا یہ جگہ نہایت موزون ہے۔

ان کی طرف سے آپ کو سلام

دعا گو: آپ کی بہن

طاہرہ

محترم بھائی صاحب

اسلام علیکم۔

ملفوف شدہ فوٹو میرے پاس ایک ایک کاپی ہیں' بچی کو البم سے واپسی کے وعدہ کے ساتھ) نکال کرارسال کررہی ہوں۔

یادآیا! بحثیت ایک ہمدردانسان کے اس کاایک واقعہ واقعات میں سے) مجھے یاد ہے کہ ایئرفورس سے وہ چھٹی گھر آئے تو موضع بھرچھ کی ایک بوڑھی غریب بیوہ نے ان کوایک ڈبہ دیا جس میں آدھا گھی اور آدھی پنجیری بھری تھی' کہ اس کے لڑکے کو جو عزیز کے ساتھ تھا واپسی پر دے دے۔ جب عزیز ان دنوں پنڈی تھا' پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ اسے کمیشن کیلئے سلیکٹ کیا گیا ہے اور اسے فوراً امتحان کیلئے کوہاٹ جانا ہے' ایک دوست کے کہنے پر کہ ''یار ڈبے کی فکر کیوں کرتے ہو میں اس صاحب کو پہنچادوں گا۔ وہ اسے دے گیا' شاید ان صاحب نے ہضم کرلیا۔ تو کچھ عرصہ بعد ماں کو پتہ چلا کہ بیٹے کو ڈبہ نہیں ملا' اس دوران میں عزیز کامیاب ہوکر ٹریننگ کیلئے کاکول چلا گیا۔ ماں کئی دفعہ ماماں جی کے پاس گئی کہ میری غریب ماری ہوگئی تو ماماں جی نے عزیز کو لکھا بھیجا کہ ڈبہ کیا ہوا؟ فراخدل عزیز ان دھندوں میں کہاں پڑنے والا تھا فوراً بڑھیا کو 30 روپے منی آرڈر کردیئے' معذرت کے ساتھ دوست سے پتہ نہ کیا) ماماں جی کو پتہ چلا تو خفا ہوئے کہ میرے بیٹے سے ہرجانہ لیا گیا مگر عزیز نے کہلا بھیجا کہ اگر بڑھیا کو آپ نے جتلایا تو میں 30 روپے اور انہیں بھیج دوں گا' یہ تھا عزیز!

آپ کی مساعی کی کامیابی کیلئے دعاگو

آپ کی بہن طاہرہ

۱۸ر مارچ ٦٦ء

لالہ موسےٰ

محترم چچا جان!

آداب! اپنے خط میں آپ نے چند غلطیوں کی نشان دہی کی ہے جو میں نے اپنی کالج میگزین کے لئے ایک مضمون میں کی ہیں۔

آرٹیکل کے آغاز میں جو واقعہ میں نے بیان کیا ہے وہ مجھے رفعت نے بتایا تھا۔ اُس نے صرف مجھے یہ باتیں بتائی تھیں کہ صبح منہ اندھیرے ہی انکل چلے گئے تھے' اور جانے سے پہلے آنٹی زرینہ کو سامان باندھنے کیلئے کہا تھا اور پھر جاتی دفعہ اپنی شہادت کی دعا کی تھی' یہ باتیں مجھے رفعت نے اس وقت بتائیں جب ہم انکل کی شہادت پر لادیاں گئے تھے۔ انہیں کو میں نے ذرا وضاحت سے لکھ دیا تھا وہ بچی ہے ہوسکتا ہے اس نے غلطی سے یہ باتیں کہہ دی ہوں یعنی وقت کا صحیح اندازہ اُسے نہ رہا ہو) خیر اس چیز کی تصحیح میں کیا لوں گی۔

اور وہ ظفر والی جو بات ہے تو اُس نے مجھے غلطی ہوگئی تھی' آنٹی زرینہ دراصل ہم لوگوں کو 4 ستمبر کے واقعات بتا رہی تھیں کہ ساتھ ہی انہوں نے یہ واقعہ بھی بیان کر دیا اور میں سمجھی کہ یہ 6 ستمبر کا ہی واقعہ ہے' چنانچہ میں تاریخوں کو خلط ملط کر گئی۔ آرٹیکل دینے کے بعد مجھے خیال آیا کہ اگر 6 ستمبر کو ظفر نے کوئٹہ جانا تھا تو آنٹی ایسے خطرناک حالات میں اسے کبھی واپس نہ جانے دیتیں ۔ چنانچہ اس کو ٹھیک کرنے کیلئے میں آرٹیکل واپس لینا چاہتی ہی تھی ۔ مگر اپنی اردو پروفیسر محترمہ مس شمیم قریشی صاحبہ سے معلوم ہوا کہ آرٹیکل آپ کو بھیج دیا گیا ہے۔ قطب الدین کا واقعہ میں نے اخبار سے نہیں لیا۔ بلکہ وہ خود یہ باتیں لادیاں میں بھی سناتا رہا تھا۔ جبکہ وہ انکل کی لاش لایا تھا۔

جس وقت ہم لادیاں گئے تھے' تو ماماں جی نے مجھے کہا کہ اگر تم انکل شہید کو زخم دیکھنا

چاہتی ہو تو تمہیں میں دکھاتی ہوں' لیکن شرط یہ ہے کہ تم رونا مت۔ چنانچہ ماماں جی نے مجھے وہ جگہ دکھائی زخم کندھے سے نیچے جیسا کہ آپ نے بتایا دائیں پھیپھڑے پر تھا۔ یہ واقعہ انکل شہید کو دفن کرنے سے تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے کا ہے۔

باقی باتیں جو آپ نے دریافت فرمائی ہیں' مثلاً چھ ستمبر کو جب بابو جی کے ساتھ ہم لادیاں سے واپس آئے تھے۔ اور بابو جی کو لاہور پر حملہ کرنے کی خبر دینا' بابو جی کا لاہور جانا اور بچوں کو واپس لانا نیز انکل شہید کے ساتھ میری ملاقاتوں وغیرہ کے بارے میں۔ تو یہ باتیں کالج میگزین کیلئے ضروری نہیں تھیں۔ صرف آخری ملاقات کا تذکرہ کرنا ضروری تھا کیونکہ اس کا تعلق کافی حد تک اُن کے اوصاف سے تھا۔ ویسے اگر آپ کتاب کے لئے یہ باتیں معلوم کرنا چاہیں تو پھر خوشی سے لکھنے کو تیار ہوں۔

چینی نجومی والی بات بالکل ٹھیک ہے۔ اور ہمیں تقریباً 4 یا 5 سال پہلے بابو جی نے بتائی جبکہ میں لادیاں رہتی تھیں۔

منور جہاں بھٹی (لالہ موسیٰ)

رول نمبر 6 فرسٹ ایئر گورنمنٹ کالج فار ویمن گجرات

27 ایف ایف۔

معرفت بی پی او 3 پاک آرمی

محترمی۔ سلام مسنون

سب سے پہلے اس نیک کام کیلئے جس کا بیڑا آپ نے اٹھایا ہے۔ دلی مبارک باد قبول کیجئے۔ خدا آپ کو توفیق دے کہ جلد از جلد اس کار نیک کی تکمیل کر سکیں۔ اور پھر آپ کو زندگی میں اس کا اجر بھی ملے۔ آمین۔ جواب دیر سے لکھ رہا ہوں جس کیلئے معافی کا درخواست گار ہوں۔ شہید بھٹی کے تعلقات کس کے ساتھ نہیں تھے۔ جو بھی ان سے ملا اس نے یہی سمجھا کہ وہ اُس کے دوست ہیں۔

ایک قابل افسر ہونے کے باوجود وہ متحمل مزاج' بردبار اخلیق اور ملنسار تھے' عام طور پر قابل افسروں میں ایسی خوبیوں کا جمع ہو جانا اور پھر اتنی چھوٹی عمر میں مشکل سی بات ہے مجھے ایک ایسا واقعہ یاد نہیں ہے کہ میں ان کے پاس کسی کام کیلئے گیا ہوں اور مجھے مایوس لوٹنا پڑا ہو۔ مدد کیلئے ہر وقت یار۔ یہ جانباز بظاہر ست لیکن حقیقت میں بلا کا چست اور حاضر دماغ کبھی بھول نہ سکے گا۔ ایک مرتبہ میں نے اپنی کسی انسٹرکٹر سے جو کافی تجربہ کار تھے' پوچھا کہ آپ کو پڑھانے سے پہلے کیا اب بھی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ اُن کا جواب مجھے آج بھی یاد ہے۔

بھٹی جیسے شاگرد ہوں تو پھر تو تیاری کرنا ہی پڑتی ہے''۔

بھٹی صاحب نے یہی کورس ایک ماہ پہلے تھا۔ اُن کی قابلیت کا اندازہ اب آپ خود لگالیں لیفٹیننٹ کرنل بنگش صاحب کو پتہ یہ ہے۔

''لیفٹیننٹ کرنل جہاں زیب بنگش 5 ایف ایف پارک آرمی''

والسلام

آپ کا ایم ایچ بخاری

28 اگست 1966ء

معرفت موٹر کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ
پوسٹ بکس 568 میکلوڈ روڈ کراچی
16 مارچ 1966ء

مائی ڈیر گھرال صاحب!

آپ کے 14 مارچ کے نوازش نامہ کیلئے شکریہ!

راجہ عزیز بھٹی شہید کے متعلق کتاب لکھنے کا عزم...... بلاشبہ آپ نے ایک عظیم کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ شہید اپنے ہم عصروں سے حیات کے ہر شعبہ میں بہت آگے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ انسانوں کے حقیقی رہنما تھے۔

ڈان اور دوسرے اخبارات میں میرے مضامین کو پسند فرمانے کا شکریہ!

میں نے ''مارننگ نیوز'' کے ''یوم افواج'' کے خصوصی ایڈیشن میں ایک اور مضمون لکھا ہے، جس میں واقعات کو زیادہ تفصیل سے تحریر کیا ہے:

میرے پاس اس سلسلہ میں جو بھی معلومات ہیں، وہ آپ کو بہم پہنچا کر مجھے از حد مسرت ہوگی، کیا آپ کبھی کراچی تشریف نہیں لائیں گے۔ اس صورت میں ہم اور بھی کھل کر باتیں کر سکیں گے۔

آپکا مخلص
یوسف علی (میجر)

بی آر بی کے کنارے میجر بھٹی کی شہادت گاہ پر

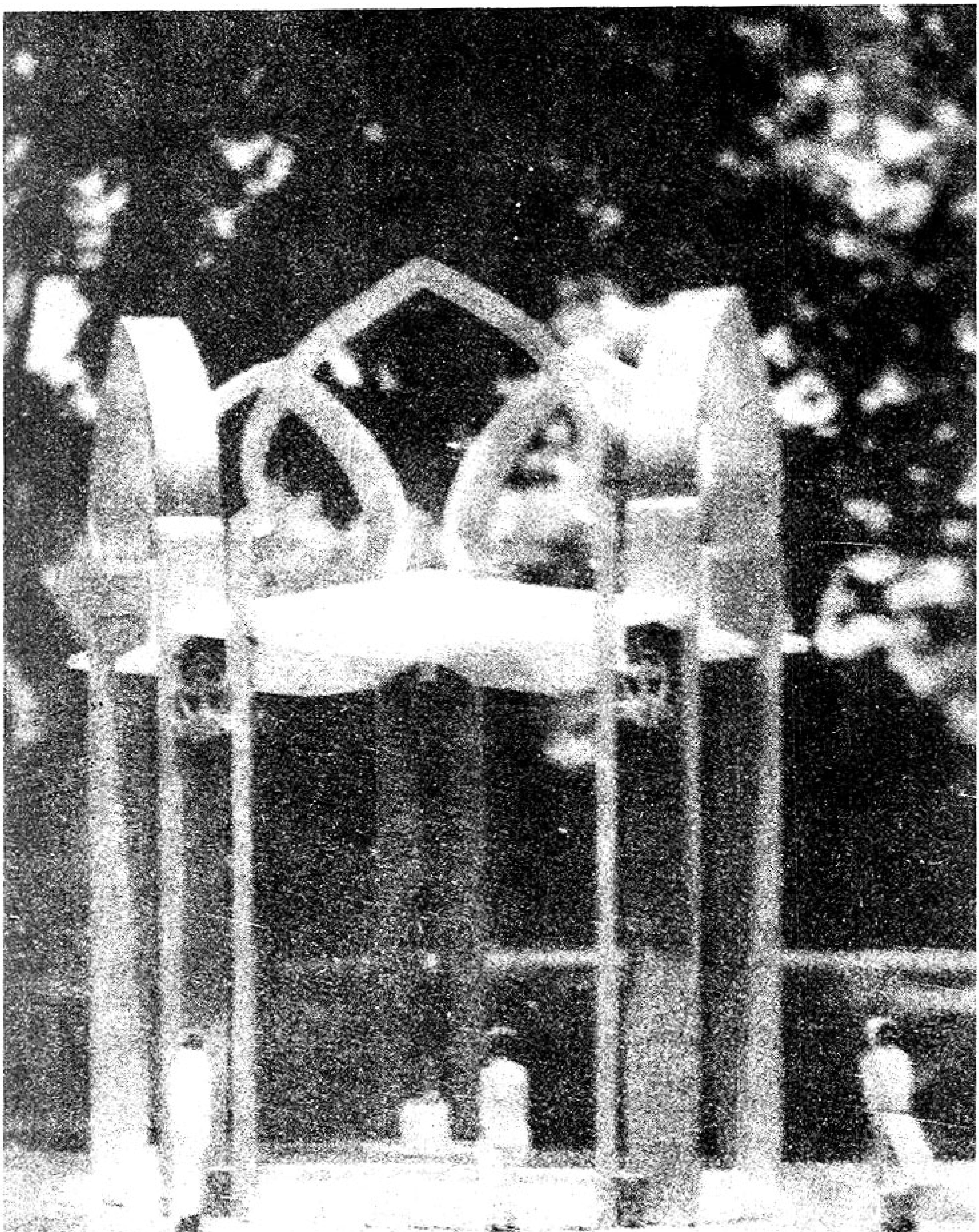

مجوّزہ یادگار کا ماڈل

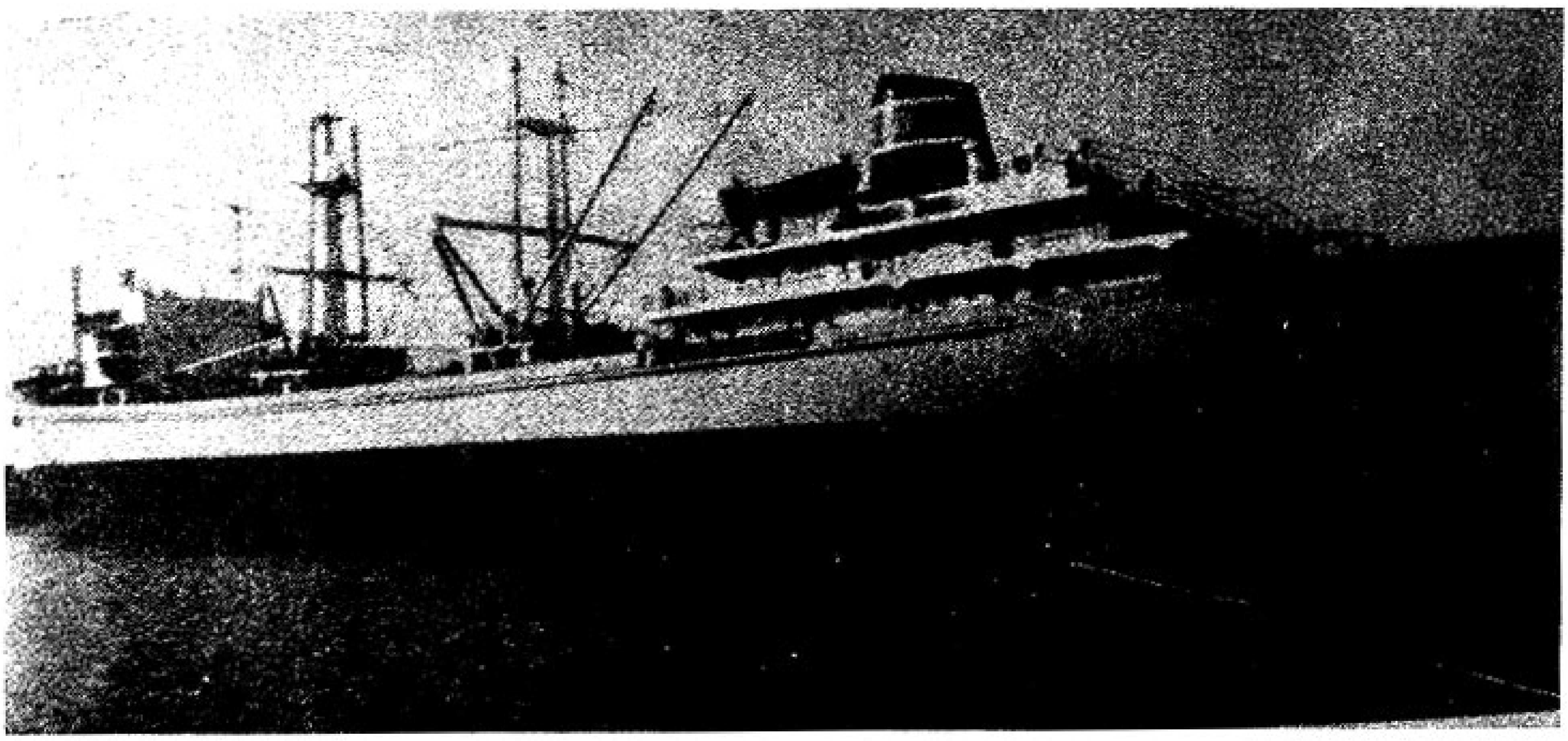

بحری جہاز کا نام عزیز بھٹی

قومی جہاز رانی کی کارپوریشن نے اپنے سب سے اعلیٰ جہاز کا نام قومی ہیرو میجر راجہ عزیز بھٹی کے نام پر ''عزیز بھٹی'' رکھا ہے۔

جنوری 66ء اس بھاری جہاز کو جرمنی کی بندرگاہ بریمیر ہیون سے سمندر میں اُتار دیا گیا اختتامی تقریب بون میں مقیم پاکستان کے سفیر مسٹر عبدالرحمٰن خاں کی صاحبزادی مس امینہ نے انجام دی۔ جہاز بارہ ہزار ٹن وزنی ہے اور بھاری مشینوں کی باربرداری کے کام میں لایا جائے گا۔ اس میں ڈیڑھ سو ٹن وزن تک لادا جاسکتا ہے جہاز میں ملاحوں کی رہائشگاہ پورے طور پر ایئر کنڈیشنڈ ہیں جہاز میں بارہ ہزار کیوبک فٹ جگہ ایسی رکھی گئی ہے جس میں مچھلیاں وغیرہ رکھی جاسکیں گی۔

کراچی میں افتتاحی تقریب

ے جس خاک میں مل کر خاک ہوئے ، وہ سرمۂ چشمِ خلق بنی
جس خار پر ہم نے خُوں چھڑکا ' ہمرنگِ گلِ طناز کیا
(فیض)

روایات کا تحفظ

میجر عزیز بھٹی کی شہادت پر کروڑوں انسانوں نے انہیں خراج تحسین اور نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے' ان کی بھولی بھالی اور اعتماد آفریں تصویر گھر گھر کی زینت بن چکی ہے' وہ صرف کارنس پر ہی سجی ہوئی نہیں ہے' بلکہ ہر پاکستانی کے دل میں اس کی جگہ ہے۔

ان کا بھرپور عمل' ان کا جذبہ ایثار اور جس والہانہ انداز میں انہوں نے ایک عظیم مقصد کیلئے جان دی یہ سب کچھ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں۔

انہیں زندگی میں قریب سے دیکھنے والے پکار اٹھے ''ہمیں عزیز بھٹی سے اس سے کم کی توقع ہی نہیں تھی!

ان کے ایک مداح کے کہا ''اگر وہ زندہ رہتے تو بلاشبہ پاکستان کے ایک نامور جرنیل ہوتے۔ ایسے عظیم جرنیل قوموں کو صدیوں بعد نصیب ہوتے ہیں!

ان کے ایک دوسرے مداح نے یوں تبصرہ کیا: لوگ عزیز کو کیا جانیں' ان کی شخصیت کو اپنے اظہار کیلئے ابھی موقع ہی کہاں ملا تھا۔ ہنوز ان کی کمان کا دائرہ بالکل محدود تھا۔ جب وہ ایک بریگیڈ یا ایک ڈویژن کی کمان سنبھالتے' پھر اُن کی عسکری صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہوتا۔ اُن کی ان صلاحیتوں کے اظہار کے لئے بی۔ آر۔ بی کی ذراسی آبجو کی بجائے محیط بیکراں کی ضرورت تھی!''

اس کے ساتھ ہی انہوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ ''ایسی غیر معمولی ذہانت اور عظیم عسکری صلاحیتوں کے مالک نوجوان افسر کو محاذ پر لڑانے کی بجائے جی ایچ کیو میں رکھنا چاہیے تھا۔

....

اس میں کوئی کلام نہیں کہ عزیز بھٹی ایک عظیم سپہ سالار تھے۔ ان کی ذات میں مختلف

خوبیوں کا حسن امتزاج اور توازن بے مثال تھا۔ وہ صرف عسکری ہیرو ہی نہیں۔ وہ ایک عظیم انسان تھے۔

جو فرد کسی شعبہ حیات میں کمال حاصل کرے، وہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں اکثر نامکمل سا نظر آتا ہے، لیکن اس کے برعکس عزیز شہید کی شخصیت میں عسکری کمال کے باوجود ایک حسین امتزاج اور توازن پایا جاتا ہے۔ ان کے سارے کردار کی بنیاد انسان دوستی پر ہے۔

ایسے انسان، بلاشبہ انسانیت کا بیش قیمت اثاثہ ہوتے ہیں، اور ایسے انمول موتیوں کا تحفظ پوری انسانیت کیلئے بے حد اہم ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ زندگی کے تحفظ سے مراد کیا ہے۔ یہ ممکن کیونکہ ہے؟ زندگی تو حادثات کا لقمہ ہے، موت کیلئے بی آر بی اور جی ایچ کیو کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں! موت تو 4 دسمبر 1958ء کو بھی ان سے بہت قریب آ کر چلی گئی تھی!

حادثات کو بھی چھوڑیئے، انسان کی عمر طبعی کیا ہے؟ وہ 30 برس اور جی لیتے ایک خاص عمر کے بعد تو یہ جسم زندگی کے بوجھ سے سبک دوش ہوتا ہی چاہتا ہے! کیا قدرت اپنے عظیم شاہکاروں کے تحفظ سے بے نیاز ہے؟

زندگی کے تحفظ کا یہ فلسفہ اور موت سے زندگی کے فرار کا یہ نظریہ ہی سرے سے غلط ہے۔

اس غیر محدود زمان و مکان میں ؂

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

(اقبالؒ)

زندگی کی عظمت اور حیات جاوداں، کسی اعلیٰ مقصد سے وابستگی میں ہے، اور اس مقصد کیلئے قربانی ہی زندگی کی معراج ہے، ایک مومن کے نزدیک تو موت بھی قاطع حیات نہیں ہے، پھر شہادت؟ شہادت تو مثالی زندگی کا سب سے بڑا صلہ ہے!!

عظیم انسانوں کی درخشاں' مثالوں سے انسانیت صدیوں تک مستیز اور مستفیض ہوتی رہتی ہے' اس مختصر زندگی میں ایک انسان کا' حلقہ اثر آخر کس حد تک وسیع ہو سکتا ہے؟ قریب تر ہوتے ہوئے بھی دوسروں کی خارجی زندگی یا اس کا کچھ حصہ ہی ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے' باقی انسان آئس برگ کی مانند ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ دوسرے انسان کی داخلی زندگی تک رسائی تو بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ البتہ ایک خاموش اثر دو ضرور دوسروں پر چھوڑتے ہیں لیکن یہی اثر تو اس وزندگی' کے بعد بھی برقرار رہتا ہے' بلکہ اس بظاہر مفارقت سے یہ تعلق اور رشتہ اور محکم ہو جاتا ہے۔

عزیز بھٹی کی حیات ہمارے سامنے ہے' زندگی میں اُن کی احباب اور جاننے والوں کا حلقہ خاصا وسیع تھا' لیکن وہ کتنا وسیع تھا؟ یا اگر وہ اور زندہ رہتے تو زیادہ سے زیادہ کتنا وسیع ہو سکتا تھا ۔ یہ آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مگر جب یہی زندگی ایک عظیم انقلاب سے دوچار ہوئی' ایک عظیم مقصد کے لئے قربان ہو گئی۔ تو چشم زدن میں اس ذات سے کروڑوں انسان متعارف اور متاثر ہوئے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ عزیز کی زندگی کے داخلی یا خارجی پہلوؤں کو بہت کم جاننے کے باوجود شہید کے ایثار کا خاموش مگر گہرا اثر وجدانی طور پر ہر انسان کے قلب و دماغ پر چھا گیا۔

عزیز اور دوسرے شہدا اکرام نے ستمبر کی جنگ میں جو تابندہ مثالیں قائم کی ہیں۔ ان کے اثرات رہتی دنیا تک قائم رہیں گے۔

اس آڑے وقت میں ہمیں اپنے اسلاف کی عظیم تاریخی روایات سے بے پناہ تقویت ملی ہے۔ اور اس جنگ میں ہم نے جو قابل فخر نئی روایات قائم کی ہیں۔ یہ ابد تک ہمارے عمل و ایثار کی راہوں کی روشن کرتی رہیں گی' قوموں کی اپنی عظیم روایات کے تحفظ کیلئے بہت بڑی قربانیاں دینا پڑتی ہیں' اس نکتہ کی وضاحت کے لئے محاصرہ کریٹ کا واقعہ قابل ذکر ہے۔

سر ونسٹن چرچل دوسری جنگ عظیم کی یادداشتوں میں لکھتے ہیں۔

کریٹ میں زبردست مقابلہ اور بھاری نقصان اٹھانے کے بعد جنگ ختم ہوگئی تو بیس ہزار فوجیوں کو وہاں سے بچا کر نکالنے کا سخت مشکل مرحلہ درپیش تھا' سارے راہ سمندر پر دشمن کے ہوائی جہاز بحری جہازوں کو ہلنے نہیں دیتے تھے۔اس کے باوجود امیر البحر کنگھم نے ہرچہ باداباد' کہہ کر بحری بیڑہ بھیج دیا' سب سے پہلے برطانوی بحری بیڑے کا مشہور تباہ کن جہاز ہیری وارڈ نشانہ بنایا گیا۔اس کے بعد دو کروزر اور ایک ڈسٹرائر اور تباہ ہوئے' جب سکواڈرن 29 مئی 1941ء کو آٹھ بجے شام اسکندریہ پہنچا۔تو معلوم ہوا کہ انخلائی گیریزن کا پانچواں حصہ ہلاک زخمی یا قیدی ہوا۔

ایک روایت

ان مایوس کن حالات اور حوصلہ شکن واقعات کے بعد جنرل ویلول اور ان کے ساتھیوں کو یہ اہم فیصلہ کرنا تھا کہ کریٹ سے اپنی فوجوں کے انخلاء کی کوششیں جاری رکھنا کہاں تک ترین مصلحت ہوگا' بری فوج کے سامنے تو موت اور زندگی کا سوال تھا۔فضائیہ یہاں کسی کام نہیں آسکتی تھی ۔ لے دے کر تھکا ماندہ اور تباہ حال بحری بیڑہ ہی تھا' جس پر امداد کے لئے نظر اُٹھ سکتی تھی' ایڈمرل کنگھم کیلئے یہ بڑے نازک لمحات تھے۔مگر انہوں نے بلاتوقف فیصلہ کن انداز میں کہا:۔

> بری فوج کا اس مصیبت اور آڑے وقت میں ساتھ چھوڑ دینا بحریہ کی روایات کے خلاف ہے یہ درست ہے کہ بحریہ کو ایک جہاز بنانے کے لئے تین سال لگ جاتے ہیں مگر یاد رکھیں ۔اس شاندار روایت کو از سر نو قائم کرنے کیلئے تین سو سال درکار ہوں گے' میں اعلان کرتا ہوں کہ نتائج کی پروا کیے بغیر بحریہ انخلاء کا کام جاری رکھے گی۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدرت نے بھی برطانوی بحری بیڑے کا ساتھ دیا۔اور وہ سارے سولہ ہزار (16,500) فوجی جوانوں کو موت کے منہ سے نکال کر بحفاظت تمام کریٹ سے مصر لے آئے۔

....

اس میں کوئی کلام نہیں کہ میجر عزیز بھٹی کی عسکری صلاحیتوں کے کمانڈر اور سٹاف افسر روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ میجر عزیز بھٹی نے کفر کی بے پناہ یلغار اور اسلام پر نازک ترین لمحات میں اپنی عظیم کمان سے اور اپنی عظیم قربانی سے اپنے اسلاف کی جن روایات کو زندہ کیا ہے۔اس کے لئے صد ہا سال درکار ہوتے ہیں۔

اس نے مٹھی بھر جوانوں کے ساتھ اپنے سے بیس گنا بھاری فوج کا 148 گھنٹے تک زبردست مقابلہ کیا۔صرف مقابلہ ہی نہیں کیا۔جنگ کے ہر شعبہ میں انہیں مغلوب کیا اور قدم قدم پر انہیں شکستیں دیں۔اس نے دشمن کی لاشوں اور اس کے شکستہ سامان حرب وضرب کے انبار لگادیئے' اور اس مقابلہ میں کمپنی کمانڈر سمیت صرف ایک درجن جوان کام آئے۔تاریخ عالم میں کوئی اور قوم ایسی مثال تو لائے۔

اس نے صرف داتا کی نگری لاہور کو ہی نہیں بچایا' اس نے پاکستان کو بچایا ہے۔اس نے دارالسلام کو بچایا ہے۔اس نے اپنے اسلاف کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کو زندہ وتابندہ کر دیا ہے۔

وہ خالد بن ولیدؓ طارق بن زیادہ اور محمدؒ بن قاسم کے معجزانہ کارناموں کا مصدق بن کر آیا ہے' بلکہ ان روایات پر امتداد زمانہ سے جو گرد کی تہیں جم گئی تھیں اس نے ان کر جھاڑ کر اور جلا بخشی ہے۔

ہم چاہتے تھے۔وہ زندہ رہ کر پاکستان کی فوج کا ایک نامور جرنیل بنتا۔یا اس کے ذاتی محاسن اور عسکری صلاحیتوں کے اظہار کے بہتر مواقع آتے۔مگر قدرت کے نزدیک میجر بھٹی کی شخصیت کے اظہار کیلئے ایک ڈویژن بلکہ پوری فوج کی کمان بھی محدود تھی۔وہ تو اسے شجاعت و مردانگی اور ایثار وقربانی کے لئے اسلام کے سپاہی کا' نشان بنانا چاہتی تھی' آج عزیز بھٹی محض ایک شخصیت' ایک سولجر یا ایک آفیسر نہیں ہے' بلکہ وہ پاکستان کے سپاہی کی جانبازی اور کوہ پیکر عزم کی

علامت (سمبل) بن چکا ہے۔

اس کا نام لے کر پاکستان کے ہر جوان، ہر بچے اور ہر سپاہی کا سینہ فخر سے تن جاتا ہے۔

اس نے بی آر بی نہر کے کنارے اپنے مقدس خون سے جو باب رقم کیا ہے تاریخ عالم کے اوراق میں یہ ستاروں کی مانند درخشاں اور لازوال رہے گا۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے بحر حیات کی ظلمتوں میں روشنی کا مینار بن کر چمکے گا۔

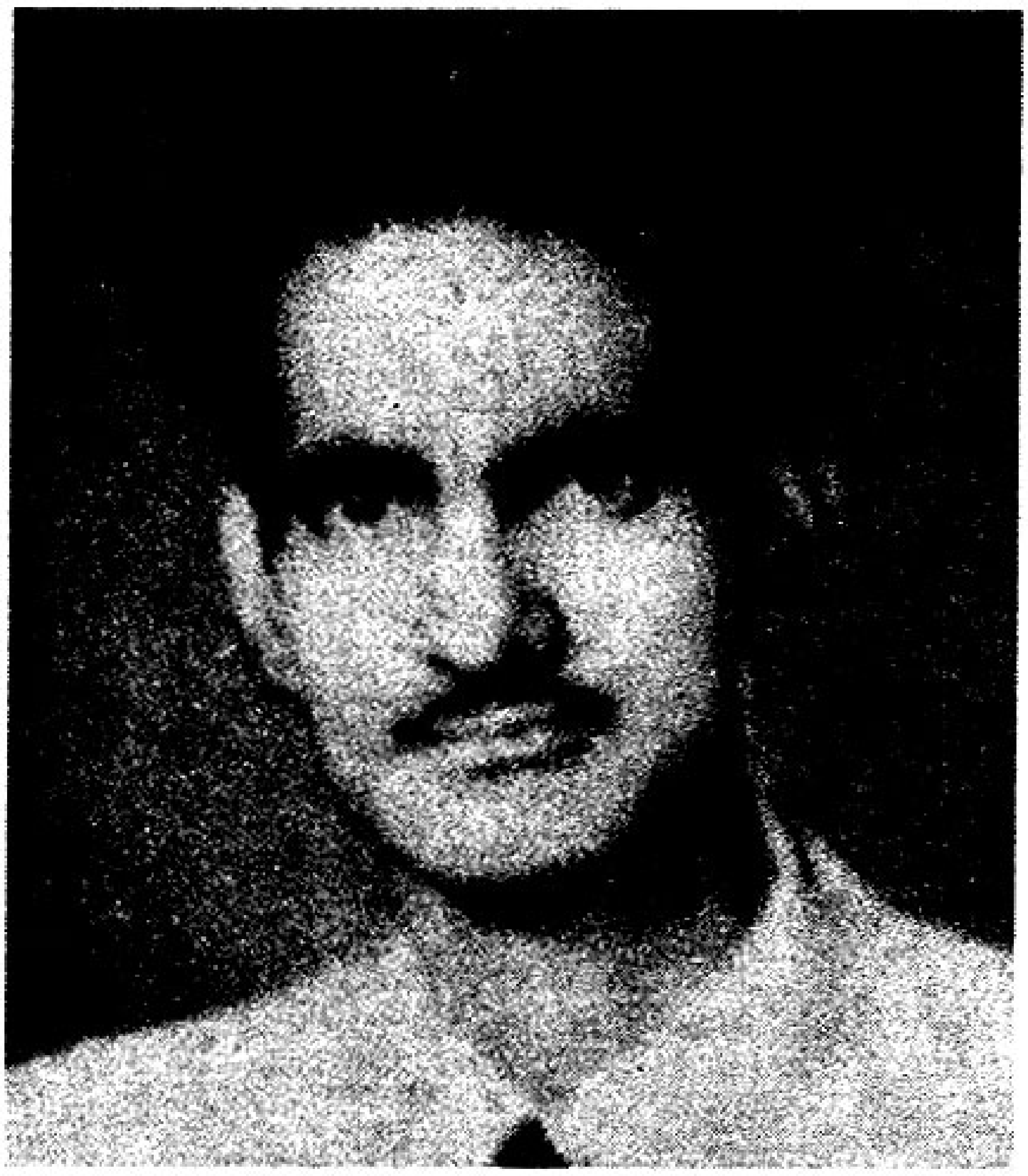

کوششِ ناتمام

عرضِ مصنّف

ستمبر 1965ء ہماری تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔

قومی زندگی میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے صدیوں پر بھاری ہوتے ہیں۔ ستمبر 1965ء میں ہم انہی لمحات سے گزرے ہیں۔ ان لمحات کی تاریخ رقم ہونے میں تو ابھی وقت ہے۔ مگر یہ روح پرور داستان کا یہ درخشاں باب اپنے خون سے لکھا ہے۔

ہمارے عسکری افق پر اس جنگ میں جو مرد انجم جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ ان کی ضیا پاشیوں سے تاریخ اسلام ہمیشہ منور رہے گی۔

ہر پاکستانی کی طرح میرے دل میں بھی اپنے عظیم شہیدوں اور غازیوں کے لئے تشکر کے عمیق جذبات موجزن ہیں، اور میں ان کی زندگی کی تفصیلات اور جزئیات جاننے کے لئے بیتاب ہوں۔

ان تابندہ ستاروں میں عزیز شہید تابندہ تر نظر آتے ہیں۔

عزیز بھٹی شہید سے متعلق میں نے براہ راست بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مجھے صرف ان کے کارنامے ہی جاننے کا اشتیاق نہ تھا۔ میں ان کی دلا دیز شخصیت کے داخلی پہلوؤں سے پردہ اٹھا کر انہیں قریب سے دیکھنے کیلئے بے قرار تھا۔

میری تلاش و جستجو کے کچھ ثمرات اخبارات میں شائع بھی ہوئے، اور پھر وہ پاک بھارت

جنگ کے موضوع پر مختلف کتابوں کا جزو بن گئے، مگر میں نے دیکھا کہ نہ صرف شہید کی سیرت و کردار بلکہ کارناموں سے متعلق بھی کتنے ہی حقائق کے بیش قیمت اور تابناک ہوتی ابھی جا بجا بکھرے پڑے ہیں، اور انہیں کوئی چننے والا نہیں، کل جب ان واقعات کے نقوش مدھم پڑ جائیں گے، یا وقت کے ہاتھوں مٹ جائیں گے تو یہ کام کتنا دشوار ہو جائے گا۔

یہی خیال اس کام کا سر آغاز تھا۔

عزیز کی زندگی میں مجھے ان سے ہلکا سا غائبانہ تعارف تھا۔ لادیاں کے ایک کسان نے بر سبیل تذکرہ اپنے گاؤں کے میجر عزیز کے متعلق ایک چھوٹی سی بات سنائی تھی۔ اکثر ہی چھوٹی باتیں انسان کی داخلی زندگی کی ایسی عکاسی کر جاتی ہیں کہ بڑے سے بڑے کارناموں سے شاید ہی ممکن ہو۔

وہ چھوٹی سی بات بھی عزیزؒ کی انسان دوست طبیعت اور ہمدردی کی آئینہ دار تھی شہادت کے بعد وہ آسمان عظمت پر مہر تاباں بن کر چمکے تو میرے ذہن میں اُس چھوٹی سی خوش گوار یاد کی کرن بھی مسکرائی اور عزیز بھٹیؒ کی سوانح حیات کو کتابی صورت دینے کے خیال سے دل میں مجھے ایک گونہ اطمینان سا محسوس ہوا، مگر اس راہ میں کچھ ابتدائی دشواریاں حائل تھیں۔

پہلی دشواری یہ تھی کہ میرا موضوع عسکری ہیرو تھا، میں تصویر حیات کی کئی جھلکیاں بڑے قریب سے دیکھ چکا تھا۔ مگر زندگی کو عسکری روپ میں قریب سے دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔

دوسری مشکل وہی تھی، جو اس معاشرہ میں اکثر ہماری آرزوں کی حسین کلیوں کو کھلنے سے پہلے ہی پائمال کر کے حسرتوں میں تبدیل کر دیتی ہے...... اس عظیم منصوبہ کیلئے مالی وسائل کی کمی تھی۔ مگر میرا شوق اور موضوع سے محبت ان مشکلات پر غالب آئے۔ میں نے اس کام کو شروع کر دیا تو مشکلات کے بادل چھٹنے لگے۔ تعاون کے ہاتھ بڑھے، اور میں شوق و سرمستی میں معلومات کے سحر انگیز جواہر ریزوں سے اپنا دامن بھرتا رہا، البتہ اس سفر میں ابھی کچھ دشواریاں باقی تھیں۔

ہنگامی حالات کے باعث شہید کے بعض دوستوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ

کہاں کہاں ہیں؟ اگر تلاش و جستجو کے بعد کسی کا اتا پتا مل بھی جاتا تو ضروری نہ تھا کہ انہیں مراسلت کی فرصت ہو۔ یوں بھی میرے نزدیک اصل کام براہ راست ملاقات تھی۔ مگران کی تعیناتی کے اصل مقامات سے متعلق استفسار کی راہ میں فوجی راز کی بھاری بھرکم اصطلاح حائل تھی۔ فوجی راز کی اصطلاح کی وسعت اور گھمبیرتا کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں اس سے کبھی واسطہ پڑا ہو۔

شہید کے کچھ درست ملک سے باہر بھی تھے، جن سے شرف ملاقات حاصل نہ ہو سکا۔

اس تلاش کے دوران اجنبی راہوں پر جہاں ایسے لوگ بھی ملے جن سے ملاقاتوں کی خوش گوار یادیں زندگی میں ناقابل فراموش رہیں گی۔ وہاں چند ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑا جو موضوع کو اس کے تقاضے کے مطابق اہمیت نہ دے سکے۔ یا جن کے نزدیک قومی تاریخ اور سوانحی ادب کی ذرہ بھر اہمیت نہ تھی۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں نے کوشش تو یہ کی تھی کہ اپنے قومی ہیرو کی داخلی اور خارجی زندگی کے سارے ذاریے آپ کے پیش کرسکوں۔ مگر اس میں حسب آرزو کامیاب نہ ہو سکا۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں نے کوشش تو یہ کی تھی کہ اپنے قومی ہیرو کی داخلی اور خارجی زندگی کے سارے ذاویے آپ کے پیش کرسکوں۔ مگر اس میں حسب آرزو کامیاب نہ ہو سکا۔

اس لحاظ سے میں اس کتاب کو مکمل نہیں کہہ سکتا۔ مگران حالات میں مجھے اسی کوشش ناتمام پر ہی قناعت کرنا پڑی۔ البتہ اب میں اس موضوع سے لاتعلق نہیں ہو جاؤں گا۔ بلکہ اپنی تحقیق کو برابر جاری رکھوں گا۔ اور نئی جستجو کے نتائج و ثمرات انشاء اللہ ایک الگ جلد کی صورت میں پیش کر سکوں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے تعلق کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔

اس مرحلہ پر میں شہید کے عزیزوں، دوستوں اور ساتھیوں کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنہوں نے شہید کی کتاب زندگی کے ہر باب کے لئے معلومات کے قیمتی موتی فراہم کئے، ان مہربانوں کے حسن تعاون کی گواہی کتاب کے اوراق دے ہی رہے ہیں۔ مگر ایسے دوست

اورمہربان بھی تھے، جنہوں نے اس مقصد میں تعاون کا جوحق ادا کیا۔اس کا ذکر کتاب میں نہیں ہے۔

ان میں ایک عزیز دوست اور بھائی...... اس دشت نوردی میں مستقلاً میرے شریک سفر رہے، ہم نے دور دراز محاذوں پر جوانوں کے مورچوں میں راتیں بسر کیں ۔ کاکول کی خنک شاہراہوں اور بی آر بی کے مقدس کناروں پر اکٹھے ہی گھومتے رہے اشرف بھائی کی رفاقت میں سینکڑوں ملاقاتوں کو طویل روئدادوں...... بالخصوص معرکہ برکی کے لحہ بہ لحہ واقعات کو مربوط صورت دینے میں آسانیاں پیدا ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس محبت بھری رفاقت اور معاونت کے بغیر یہ کام بہت مشکل تھا۔

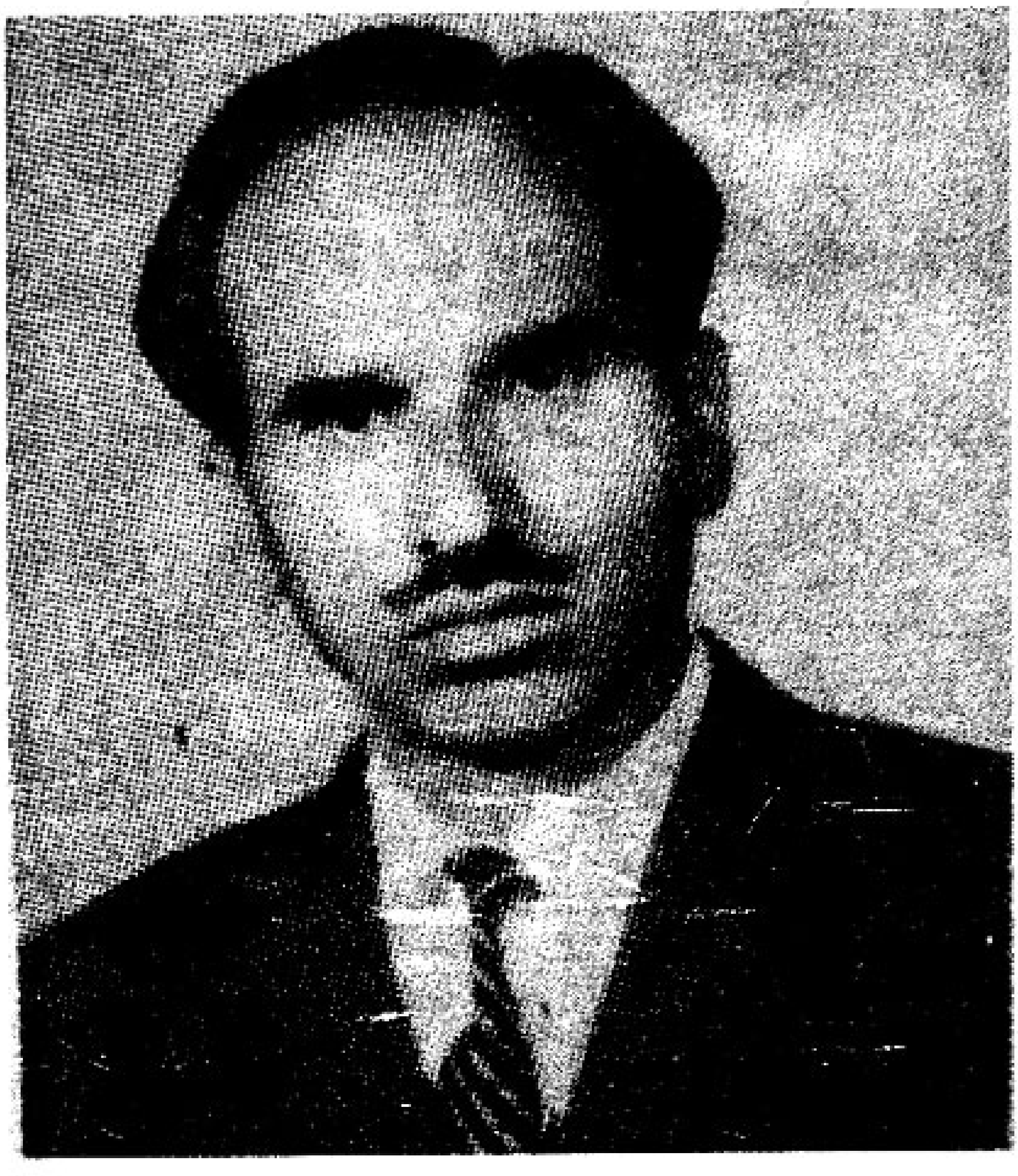

چوہدری
محمد
اشرف
دھریکڑی

اسی طرح ایک عزیز بہن نے رف مسودات کے اُلجھے ہوئے گیسوؤں کو سلجھانے کا کام اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ وہ اس عرصہ میں بڑی جان سوزی سے ان تحریروں کو نظر ثانی کے شانہ سے سنوارتی رہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس سفر کے ہر مشکل موڑ پر اپنے قیمتی اور مخلصانہ مشوروں سے نوازتی رہیں، معنوی لحاظ سے کتاب کے سنوارنے میں ان کا قابل قدر حصہ ہے، محترمہ نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان کا نام لے کر شکریہ ہی ادا کرسکوں۔

تحقیق و جستجو کے اس پر لطف اور لفریب سفر کے دوران ایک بات ضرور میرے لیے ذہنی کوفت کا باعث بنی۔

کچھ دوست جن میں میرے دوستوں کے علاوہ عزیزؒ کے دوست بھی شامل ہیں اس طویل اور صبر آزما طریق کار سے اُکتا سے گئے' واقعات کی گم شدہ کڑیاں ملانے اور مزید معلومات حاصل کرنے کیلئے مجھے بار بار ان سے ملنا پڑتا۔ ہر بار اُن کا ایک ہی تقاضا ہوتا کہ کتاب کی طباعت واشاعت میں تاخیر نہ کی جائے' جزئیات کی تلاش میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔اس مطالبہ میں شہید سے ان کی محبت اور ان کی سیرت پر کتاب دیکھنے کا اشتیاق دونوں محرکات کارفرما تھے۔ایک دوست نے اس خدشہ کا اظہار بھی کیا کہ جوش و خروش کے اس موزوں وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔مبادا مجھے اس محنت' کا پورا صلہ نہ مل سکے۔

بلاشہ ایک سال قبل میرے پاس مواد اتنا جمع ہو چکا تھا کہ اس سے ایک اچھی خاصی ضخیم کتاب مرتب ہوسکتی تھی۔ابتداء میں میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ وسط 1966ء یا زیادہ سے زیادہ ستمبر 1966ء تک عزیزؒ کے یوم شہادت پر) کتاب بآسانی پیش کرسکوں گا۔مگر جہاں شہید کے کارناموں اور خارجی واقعات پر روشنی ڈالنے والا مواد جمع ہو چکا تھا وہاں ان کی حیات کے داخلی محرکات کی نشان دہی کرنیوالے مواد کی ابھی خاصی کمی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ جذباتی تلاطم اور جوش و خروش کی وہ فضا ہی جسے کتاب کی اشاعت کے لئے موزوں' قرار دیا جارہا تھا۔شہید کی سیرت کے عمیق پہلوؤں تک رسائی میں سد راہ تھی۔اور شہید کے عزیزوں اور دوستوں کے تاثرات میں ابھی جذبات کا رنگ غالب تھا۔

مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جذبات میں سکون پیدا ہوا تو انہی عزیزوں اور دوستوں سے ایسے ایسے واقعات اور ان کی دلکش جزئیات حاصل ہوئیں' جن سے موضوع کی سیرت و کردار پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

قاری کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ ایک ایک ساعت کے تعین اور واقعات کی

ایک ایک کڑی کی ترتیب' ہیرو کے لبوں سے جھڑنے والے ایک ایک پھول اور اشکوں کا ایک ایک موتی پرونے کے لئے سوانح نگار کر کتنی صحرا نوردی کرنا پڑتی ہے۔

مجھے اپنے قومی ہیرو کی زبان وقلم سے ادا ہونے والے اُن الفاظ کو بھی تلاش تھی' جن سے موضوع کا انکشاف ذات ہوتا ہے' میرے نزدیک شہید کی تصویریں وہ قیمتی لمحات ہیں' جنہیں کیمرے کی محبت بھری آنکھ نے ہمیشہ کیلئے محفوظ کرلیا ہے' ان سے صرف صوری لحاظ سے کتاب کو آراستہ کرنا مقصود نہ تھا۔ وہ معنوی لحاظ سے بھی کم اہم نہیں۔ کتنی ہی مختصر سہی یہ شہید کی زندگی کی جھلکیاں ہیں' عزیز کے چہرے پر بھولپن۔ معصومیت' محبت اور خود اعتمادی کے عیاں تاثرات کا جو احساس ان مناظر سے ہوتا ہے الفاظ شاید ہی ان اثرات کی اس طرح عکاسی کرنے پر قادر ہوتے۔

....

عزیزوں اور دوستوں کے تاثرات جاننے کے لئے مجھے ان کے ساتھ ملاقاتوں کے علاوہ ایسی تحریروں کی تلاش بھی تھی' جن سے عزیز کے بارے میں ان کے جذبات کا دبے ساختہ اظہار ہو۔

بظاہر اس مواد کو جمع کرنے میں کچھ زیادہ وقت درکار نہیں۔ مگر ان میں سے ایک ایک تصویر اور ایک ایک تحریر حاصل کرنے کی الگ الگ داستان ہے' میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ دیر بلاوجہ نہ تھی

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا

....

رہ گیا یہ خدشہ کہ اس غیر معمولی تاخیر سے عوام میں موضوع کی پہلی سی مقبولیت باقی نہیں رہے گی۔ اور مجھے بھی شاید اپنی محنت کا صلہ نہ مل سکے' تو اس کے لئے میں متردد نہیں ہوں۔ یہ نہیں کہ مجھے صلہ کی خواہش نہیں! میں اس محنت کے لئے (جسے' محنت کہتے ہوئے مجھے ندامت محسوس ہوتی ہے) بہت کچھ صلہ وصول کرچکا ہوں۔ میرے لئے وہ سرور ہی کم نہ تھا' جو مجھے اس تلاش کے دوران حاصل رہا' یہ موضوع میرے لئے دلی جذبات کا ذریعہ اظہار بن گا۔ میں نے اس جستجو میں جو لمحات

گزارے انہیں حاصل زندگی کہہ سکتا ہوں۔ میں تو اسے بھی خوش بختی سمجھتا تھا کہ اتنا بھی کیا کم ہے کہ کچھ گھڑیاں ان مقدس یادوں میں کھو کر جی لیا میں نے مگر میرے جذب وشوق نے اور بھی منازل طے کرلیں۔

پیاری سی یاد کی بھٹکی ہوئی کرن کو اپنے مہر جہاں تاب سے وصل نصیب ہوا۔ جذب شوق نے اپنے محبوب کو بے نقاب ہو کر سامنے آنے پر مجبور کردیا۔

زندگی میں عزیزؒ سے ملاقات کی محرومی جو شکست آرزو یا حسرت میں بدل چکی تھی، پوری ہوئی، شہید سے براہ راست ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی، ایک مرتبہ نہیں، کئی مرتبہ یوں جیسے کوئی اجنبیت ہے ہی نہیں!

میں اس لذت دیدار، شرف ہم کلامی اور سعادت قرب کے بیان کیلئے الفاظ کہاں سے لاؤں؟ اور اپنی زندگی کے ان لمحات کو کس سے تشبیہ دوں؟ ان حسین خوابوں کا کیف وسرور ذہن میں بسا ہوا ہے۔

کیا میں زندگی میں اس سے بڑے صلہ کی آرزو کرسکتا ہوں؟

....

عزیز بھٹی شہید میرے نزدیک ایک کتاب نہیں ہے، ایک مشن کی تکمیل ہے یہ اس قوم اور وطن کے فرزندوں کیلئے ہے، جس سے عزیز بھٹیؒ کو پیار تھا، جس سے سارے شہیدان کرام کو پیار تھا۔ سرزمین پاک کی سرحدوں کی مقدس مٹی گواہ ہے کہ ان کا یہ پیار وقتی اور ہنگامی نہیں تھا!

ابدی محبت کے یہی رشتے گہرے ہوں تو ہماری تقدیر اور کردار کو بدل سکتے ہیں، ہم جن شخصیتوں سے محبت کرتے ہیں، شعوری اور غیر شعوری طور پر انہی کے کردار سے متاثر ہو رہے ہوتے ہیں۔

قومی نقطہ نظر سے ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ آسمان عظمت پر جلوہ گر ہونے والے عظیم انسان روز بروز پیدا نہیں ہوتے۔ وہ حیات انسانی کے گھپ اندھیروں میں سورج

بن کر چمکتے ہیں، قومیں اپنی تاریک راہوں کو ان درخشندہ مثالوں سے روشن کرتی ہیں۔ دنیا میں وہی تو میں سرفراز ہوتی ہیں جو اپنے عظیم انسانوں کی قدر کرتی ہیں۔

میرے نزدیک ان عظیم انسان کی یاد میں مرمری سلوں سے ترتیب پانے والی عظیم الشان یادگاروں سے وہ یادگاریں کم اہم نہیں جو روشنائی کے قطروں سے ترتیب پاتی ہیں، انسانوں کی فکر کے دھاروں کو موڑ دیتی ہیں، اور آنے والی نسلوں پر ایک خاموش، دور رس اور کردار ساز اثر چھوڑتی چلی جاتی ہیں۔

گجرات

5 مئی 1967ء اصغر

عزیزؒ کی زندگی......ایک نظر میں

6 اگست 1923ء: پیدائش (ہانگ کانگ)

1929 سے 1941ء تک: تعلیم (ہانگ کانگ میں)

دسمبر 1941ء سے اگست 1945ء تک: (ہانگ کانگ......جاپان کے تسلط میں)

1945ء: مراجعت وطن (لادیاں ضلع گجرات)

1946ء: شادی (لادیاں)

" : انڈین ایئر فورس میں ایئر مین (آرکنم۔مدارس)

15 اگست 1947ء: پاک ایئر فورس (راولپنڈی)

21 جنوری 1948ء: پی ایم اے کاکول

4 فروری 1950ء: پاسنگ آؤٹ پریڈ (شمیر فاخرہ۔نارمن گولڈ میڈل)

" " : 4/16 پنجاب رجمنٹ میں سکینڈ لیفٹینینٹ (ایبٹ آباد)

1950ء: کورس۔کمپنی ویپنز کورس (کوئٹہ)

" " : جونیئر لیڈر شپ کورس (کوئٹہ)

یکم اکتوبر 1950ء سے 23 جنوری 1951ء تک کمپنی کمانڈر۔16 پنجاب (4 بھوپال) ارجمنٹ میں۔

1951ء : انٹیلی جنس کورس۔مری۔

" : لاء کورس، راولپنڈی

24 جنوری 1951ء سے 11 جنوری 1953ء تک: اڈجوٹنٹ لیفٹینینٹ (ایبٹ آباد)

1952ء (کورس) آل آمرز فیلڈ انجینئرنگ انسٹرکشن کورس (رسالپور)

11 جنوری 1953ء سے 22 فروری 1953ء: مارٹر آفیسر

22 فروری 1953ء سے 4 دسمبر 1953ء : (کیپٹن اڈجوٹنٹ)

1953ء (کورس) مارٹر کمانڈ پوسٹ سٹاف کورس (کوئٹہ)

〃 〃 رینج ٹیکرز کورس

7 جنوری 1954ء سے 11 نومبر 1954ء : مارٹر آفیسر (سی) کوئٹہ

1954ء : ٹیکنیکل کورس۔ کوئٹہ

1955ء : کمپنی کمانڈر۔ ایبٹ آباد

9 جنوری 1956ء سے 16 نومبر 1956ء تک (میجر) سٹاف کالج کنگسٹن (کینیڈا) برائے تربیت۔

فروری 1957ء سے 30 جون 1957ء تک: ڈی۔ کیو سیالکوٹ

یکم جولائی 1957ء، 13 ستمبر 1959: جی ایس او II اوپریشنز (کوہاٹ وجہلم)

4 دسمبر 1958ء کو حادثہ

4 دسمبر 1958ء سے 16 مارچ 1959ء تک: سی ایم ایچ لاہور)

1959ء : مدیر تھنڈر بولٹ۔

〃 : جرمن زبان کا ابتدائی کورس (کراچی)

1960ء سے وسط 1961ء تک: جرمن زبان کا کورس (جرمنی میں)

16 جون 1961ء سے 17 جون 1962ء : کمپنی کمانڈر 17۔ پنجاب رجمنٹ۔

19 جون 1962 سے 8 اپریل 1964ء تک: سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس کوئٹہ میں انسٹرکٹر کلاس (بی)

9 اپریل 1964ء سے 14 جنوری 1965ء تک: جی ایس او II (ٹریننگ) کوئٹہ

16 جنوری 1965ء سے 28 مئی 1965ء تک: سیکنڈ ان کمانڈ 17۔ پنجاب (لاہور)

29 مئی 1965ء کو کمپنی کمانڈر: (لاہور۔ برکی)

(19 جولائی 1965ء سے 18 ستمبر 1965ء تک رخصت)

29 اگست 1965ء کو ہنگامی حالات کے باعث ڈیوٹی پر واپس بلا لیا گیا۔

6 ستمبر 1965ء سے 12 ستمبر 1965ء (یومِ شہادت) تک: کمپنی کمانڈر 17۔ پنجاب (برکی محاذ)

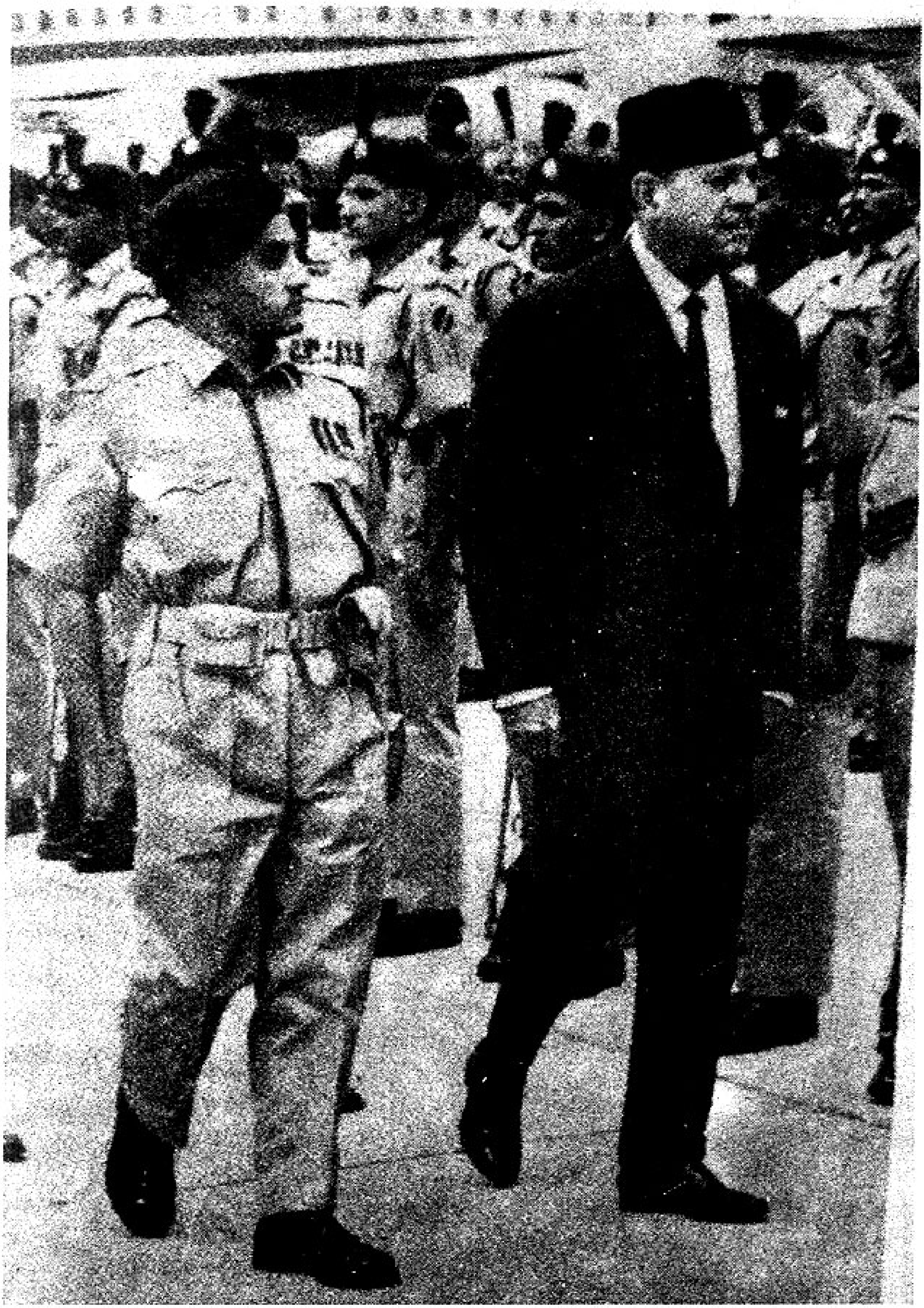

"ہم دشمن کو کچل دیں گے"

اصغر علی گھرال کی دیگر کتب

☆ اسلام یا ملّا ازم (جلد سوم)

☆ کالا باغ ڈیم بنائیں...... پاکستان بچائیں (جلد اول)

زیرِ طبع کتب

☆ کالموں کا انتخاب

☆ پروفیسر چودھری فضل حسین (خطوط کے آئینہ میں)

حکومت مغربی پاکستان کی طرف سے سکولوں اور کالجوں کو لائبریریوں کیلئے منظور شدہ

پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے اوّل انعام یافتہ

عزیز بھٹی شہیدؒ

اصغر علی گھرال

ادارۂ مصنفین پاکستان

پاکستان رائٹرز گلڈ

۶ر ستمبر ادبی انعام

۱۹۶۷ء

تصدیق کی جاتی ہے کہ اس سال کا انعام بدست جناب محبوب الرشید گورنر بنک دولت پاکستان
جناب اصغر علی گھرال کی خدمت میں ان کی تصنیف عزیز بھٹی شہید کے انتخاب پر پیش کیا گیا۔

۱۶ر جون ۱۹۶۸ء
لاهور

جمیل الدین عالی
معتمد اعلیٰ
ادارہ مصنفین پاکستان

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد آپ چند لمحوں کے لئے یہ سوچیں گے کہ کیا کسی زبان میں اس سے زیادہ مکمل سوانح عمری لکھی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے دو چار نام یاد آئیں اور بہت ممکن ہے، باسویل کا نام سرفہرست ہو لیکن باسویل سوانح نگار نہ تھا' روزنامچہ نویس تھا جو اپنے ہیرو کے ساتھ رہا اور روزانہ کے واقعات قلم بند کرتا رہا۔ اصغر علی گھرال اپنے ہیرو کے ساتھ نہیں رہے۔

اردو ادب انہیں مولانا حالی کے بعد دوسرے بہت بڑے سوانح نگار کی حیثیت سے قبول کرلے گا۔"

احسان بی اے...... روزنامہ "کوہستان" لاہور

مورخہ 4رجون 1967ء

....

آپ نے بہت ہی اچھا کیا جو "عزیز بھٹی شہید" کا ایک نسخہ مجھے عطاء فرمایا۔ میں نے اس دلچسپ اور محبوب کتاب کے پچپن صفحے ایک سٹال پر کھڑے ہو کر پڑھے اور جب اسے خریدنے کا ارادہ باندھا تو دکان دار نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ ایک ہی نسخہ ہے اور کوئی صاحب اس کی قیمت ادا کر کے ذرا آگے تک گئے ہیں۔ واپسی پر یہ کتاب اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ آپ کے لئے کل منگوا دوں گا۔ لیکن پھر وہ کل نہ آئی۔

آپ نے یہ کتاب مجھے بھجوا کر مجھ پر واقعی احسان کیا ہے۔ میں جذباتی انسان ہوں۔ اور ایسی کتابیں آنکھوں کے راستے میرے دل میں اتر جاتی ہیں۔

"آپ نے عزیز بھٹی شہید پر کتاب لکھ کر ہم سب پر بڑا احسان کیا ہے۔ پتہ نہیں آپ نے اتنی معلومات کس کس طریقے سے کیسی کیسی لگن کے ساتھ حاصل کی ہونگی۔ یورپ میں تو آپ سے کئی لوگ بستے ہیں لیکن یہاں پاکستان میں کسی سے میرا سابقہ نہیں پڑا۔ بہت ممکن ہے میرا حلقہ شناسائی اور قدر وسیع نہیں ہے۔"

میں ابھی تک گھر نہیں گیا۔قدسیہ اس کتاب کو پا کر یقیناً بہت خوش ہو گی۔کیونکہ میں نے اس سے اس تصنیف کا تذکرہ کیا تھا۔

آگر آپ برا نہ مانیں اور مجھ سے ناراض ہونے کی کوشش نہ کریں تو کیا میں آپ کو اس کتاب کی قیمت بھجوا سکتا ہوں؟ آپ نے اس پر بہت ساری بھاری رقم لگائی ہو گی اور میں آپ پر مزید بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا، امید ہے آپ بہمہ وجوہ خیریت سے ہوں گے۔

والسلام

اشفاق احمد

ڈائریکٹر مرکزی اردو بورڈ لاہور

13 جولائی 1967ء

....

☆ ....مجھے افسوس ہے میں آپ کو جلد تر شکریہ کا خط نہیں لکھ سکا۔"عزیز بھٹی شہید" کا ایک نسخہ بھیج کر آپ نے بڑی نوازش کی ہے۔

میں تبصرہ نگاری کے فن سے بے بہرہ ہوں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ:

آپ پہلے پاکستانی ہیں جنہوں نے اس موضوع پر کام کی کتاب لکھی ہے۔میری طرف سے اس کامیاب کتاب کی اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

ہم نے اپنے تمام یونٹوں سے سفارش کر دی ہے کہ یہ کتاب خریدیں۔علاوہ ازیں اس کی پچیس جلد خرید کر بڑی بڑی لائبریری میں رکھ دی ہیں۔

محمد خاں (کرنل)

ایجوکیشن ڈائریکٹوریٹ۔جی ایم کیو۔راولپنڈی

....

☆......اب یہ کتاب پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سینما کے پردے پر عزیز بھٹی شہید کو چلتا پھرتا' باتیں کرتا' دوستوں سے ملتا جلتا اور میدان جنگ میں عزم وہمت کا ایک بدیع پیکر بنا ہوا دیکھتے ہیں۔ جسے موت زندگی سے بدرجہا زیادہ پیاری ہے۔

مولانا غلام رسول مہر

....

گھرال صاحب نے یہ کتاب لکھ کر ہمارے ادب میں اضافہ تو کیا ہی ہے ان کی کتاب' پاکستان کی احساساتی تاریخ میں وقیع مقام کی مستحق ہے۔

ترجمان القرآن

مدیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

....

☆......جناب اصغر علی گھرال نے ''عزیز بھٹی شہید'' پر ایک مستند کتاب تصنیف کر کے اہل پاکستان کو یہ مژدہ دیا ہے کہ ابھی ہماری قوم میں ایسے افراد موجود ہیں جو تحقیق وکاوش کے کانٹوں پر چلنا جانتے ہیں۔ ان کی ریاضت پر بے محابا رشک آتا ہے اور ان کا قلم چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔

اردو ڈائجسٹ۔ لاہور

....

☆......''عزیز بھٹی شہید'' پر انعام کی دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔ مجھے خدشہ تھا کہ رائٹرز گلڈ کے دوسرے انعاموں کی طرح چھ ستمبر کے ادبی میں بھی بے انصافی ہوگی لیکن ''ریڈیو پر آپ کا نام سنا تو بے حد خوشی ہوئی۔ جنگی تصانیف میں آپ کی کتاب واقعی انعام کی مستحق تھی''۔

سلمیٰ خاص طور پر مبارکباد کہتی ہے۔ اس نے کتاب کا ایک لفظ پڑھا تھا اور نہ صرف کتاب کی بلکہ آپ کی دوسالہ محنت کی داد دیتی رہتی تھی۔ وہ جانتی ہے کہ جنگی وقائع نگاری کس قدر

دشوار کام ہے۔

عنایت اللہ۔ سیارہ ڈائجسٹ۔ لاہور

2 فروری 1968ء

....

☆...... جب قاری کتاب پڑھ کر رکھتا ہے۔ تو وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ تو ''عزیز بھٹی شہید'' کو مدت سے جانتا ہے۔

''اسٹار کراچی''

....

☆...... جناب انتظار حسین نے روزنامہ مشرق میں اپنے مشہور کالم'' لاہور نامہ'' میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی اس تقریب (16 جون 1968ء) کا حال قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''انعام پانے والوں میں چند ایک ادیب تشریف لائے تھے چند ایک تشریف نہیں لائے تھے۔ بہر حال اصل آدمی موجود تھا۔ یہ اصغر علی گھرال تھے جنہوں نے عزیز بھٹی شہید کی سیرت و شخصیت پر کتاب لکھی اور اس کتاب پر بجا طور پر جنگ ستمبر کے نام پر جاری ہونے والا انعام پیش کیا گیا باقی رنگ رنگ کی کتابیں اور رنگ رنگ کے انعام......''۔

انتظار حسین۔ روزنامہ ''مشرق'' لاہور

....

☆...... پیرایہ بیان سلیس، دل نشین اور براہ راست واقعات کی ترتیب میں ایسی خوبی پیدا کی ہے جو ایک ظرف ادبی نگارش کے تقاضوں کو بہ احسنہ پورا کرتی ہے اور دوسری طرف قاری کو ملکی و ملی تقاضوں کا احساس دلاتی رہتی ہے اور اس طرح اسے ایک باشعور محب وطن فرد بنانے میں اہم کردار سرانجام دیتی ہے۔

اصغر علی گھرال کی اس تالیف کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے عزیز بھٹی شہید کی سوانح اتنے جامع، شاندار وسیع، ہمہ گیر اور موثر انداز سے مرتب کی۔ جس کی وہ صحیح معنوں میں مستحق ہے۔ شہید کی پیدائش سے لے کر شہادت تک کوئی بھی گوشہ تشنہ تکمیل نہیں رہنے دیا، یوں قاری کو اس قابل بنا دیا کہ وہ عزیز بھٹی شہید کی سوانح کے مطالعہ سے نہ صرف زندگی کے مقصد سے واقف ہو سکے بلکہ اپنے آپ کو اس مقصد پر پورا اتارنے کی کوشش کا جذبہ بھی اس کے اندر پیدا ہو۔

ابو طاہر فارانی۔ لاہور

....

☆......اس کتاب کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محاذ جو جنگ کے بعد لکھنے والوں کے لیے کھلا تھا اس پر کون کون اور کس طرح داد شجاعت دیتا رہا ہے۔

شفقت تنویر مرزا

....

☆......جناب اصغر علی گھرال نے بڑے اخلاص و عقیدت اور محنت و کاوش کے ساتھ یہ کتاب لکھی جس کیلئے وہ تبریک و تحسین کے مستحق ہیں۔

ماہنامہ فاران، کراچی

....

☆......"آپ نے یقیناً اردو ادب میں سوانح نگاری کی صنف کو ایک نیا وقار بخشا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ہماری آنے والی نسلوں کے دلوں کو گرمائے گی اور تڑپائے گی بلکہ ادب اردو کی تاریخ میں بھی ایک نمایاں مقام حاصل کرے گی"۔

میں دل کی گہرائیوں سے اس تحقیقی اور ادبی کارنامے پر آپ کی خدمت میں ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اردو ادب اور ملت کی خدمت کیلئے بیش از بیش

☆......عیدالاضحیٰ پر گاؤں آیا تو واپسی پر ضلع کچہری (گجرات) میں حاضر ہوا تا کہ آپ کی تصنیف ''عزیز بھٹی شہید'' پر انعام ملنے پر آپ کو روبرو مبارکباد دے سکوں لیکن آپ لاہور گئے ہوئے تھے۔آپ کے ایک ساتھی وکیل کو پیغام دے آیا تھا۔ پتہ نہیں آپ کو ملا ہے یا نہیں۔

کیپٹن محمد صدیق سالک......8 اپریل 1967ء

....

☆......مئولف کی اس محنت و کاوش سے علمائے متقدین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو آمد و رفت کی سہولتوں کی کامیابی کے باوجود کسی روایت اور واقعہ کی تحقیق و تفتیش میں سینکڑوں اور ہزاروں میلوں کا دشوار گزار سفر کر گزرتے تھے۔

سادہ اور دل نشین اسلوب' اس کتاب کی دو ایسی خوبیاں ہیں جو اسے پاکستان کی ہر زبان کے سوانحی ادب میں ممتاز ترین مقام دلواتی ہیں۔ یہی نہیں اس کتاب کو دنیا کی دوسری زبانوں کے سوانحی ادب کے مقابلے پر بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہفت روزہ ''ہلال'' ترجمان افواج پاکستان۔راولپنڈی

....

گلڈ کئی کاروباراداروں سے انعام رقم لیتا ہے جو اب ایک ایک لاکھ 25 ہزار سالانہ تک پہنچ چکی ہے۔مگر چھ ستمبر ادبی انعام اس نے خود قائم کیا چند بڑے امراء نے اس بار خاصی شدت سے پیش کش بھی کہ یار یہ انعام ہمیں دے دو اور یقین کیجئے کہ اس سال گلڈ کے مالی حالات خاصے ناگفتہ بہ تھے مگر ہم نے کہا کہ یہ اعزاز تو ہم اپنے پاس ہی رکھیں گے۔ چنانچہ نہ جانے کس طرح ہم نے اپنے محدود وسائل میں یہ سے یہ دس ہزار کی رقم نکالی اور اسے اپنے وطن کی انفرادیت' سالمیت اور حفاظت کے حضور اپنے نہایت حقیر نذرانے کے طور پر پیش کیا۔

اگر اس خاک سے ایک اصغر علی گھرال اٹھ سکتا ہے تو کیا چند اور لگن والے پیدا نہیں ہو

سکتے جو اپنے شہیدوں پر کام کرنے کیلئے کمر باندھ لیں۔

جمیل الدین عالی

روزنامہ جنگ راولپنڈی۔30 جون 1968ء

....

☆......حال ہی میں اردو ادب نے ایک نیا ادیب دریافت کیا ہے یہ ہیں جناب اصغر علی گھرال صاحب جنہوں نے عزیز بھٹی شہید پر کتاب لکھ کر اپنے نامور ہیرو کی طرح اپنی بقا کا بھی سامان کرلیا ہے نہ صرف یہ کتاب اس موضوع پر لکھی جانے والی دوسری سطحی کتابوں سے یکسر مختلف ہے بلکہ یہ پورے ادب میں اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔

مولانا کوثر نیازی ہفت روزہ 'شہاب' لاہور......20 اگست 1967ء

....

☆......بعض آفیسر قسم کے حضرات کیلئے کتاب کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ اسے پڑھ کر ان کا یہ تاثر ختم ہو جائے گا کہ ہیرو صرف انگلستان یا امریکہ میں پیدا ہوتے ہیں۔

اس شاہکار میں عزیز بھٹی شہید کی شخصیت کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ مستقبل میں اس سے کوئی بھی غلط مواد منسوب نہیں کیا سکتا، اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ مصنف نے قوم پر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اس کتاب کے مصنف جناب اصغر علی گھرال کسی صاحب طرز ادیب کے طور پر معروف نہیں تھے۔لیکن انہوں نے ''ادبی دنیا'' کا ایک یادگار کارنامہ کر کے دکھا دیا ہے۔

کتاب میں بے شمار ایسے مقامات ہیں جہاں قاری بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور بے اختیار آنسو آتے ہیں۔

جہاں تذکرہ وہاں جذبات ارادت کہیں آڑے نہیں آئے اور جہاں جذبات ومحسوسات کی محفل آرائی ہے۔ وہاں حقائق کی روشنی اوجھل نہیں ہونے پائی۔اول سے آخر تک فکر و وجدان کا ایک ولولہ انگیز امتزاج..........''۔

پروفیسر غلام مرتضٰی ترک ''آئین''۔لاہور

....

☆......بلاشبہ ''عزیز بھٹی شہید'' کی زندگی اور کردار کے مطالعہ سے فیضان روحانی حاصل ہوتا ہے۔

روزنامہ ''ڈان'' کراچی

....

☆......''مصنف نے عزیز بھٹی شہید کی ایسی قلمی تصویر پیش کی ہے کہ ہمیشہ لازوال رہے گی''۔

''مارننگ نیوز'' کراچی

....

☆......اپنی تاریخی اور قومی حیثیت کے علاوہ فنی لحاظ سے بھی ایک لازوال کتاب ہے۔ میری رائے میں اردو کے سوانحی ادب میں یہ پہلا موقع ہے کہ مصنف نے ممدوح کی زندگی کے ہر پہلو کو انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں بے نقاب کیا ہے۔

روزنامہ 'حریت'۔کراچی

....

☆......مغرب میں اس نوع کی کتاب کے لیے معلومات وحقائق بلاشبہ ایسی ہی کاوش سے جمع کیے جاتے ہیں لیکن اردو ادب ایسی کاوشوں سے نا آشنا ہو چکا تھا۔

روزنامہ 'پاکستان ٹائمز' لاہور

جناب اشفاق احمد (تلقین شاہ) نے بتایا تھا کہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے سلسلے میں ڈھاکہ میں ایک اجلاس منعقد ہوا۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ نماز تراویح کے بعد سونے لگے تو دیکھا کہ شہاب صاحب کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ میں اٹھا اور بڑے ادب سے وہ کتاب ان سے لے کر یہ کتاب ''عزیز بھٹی شہید'' ان کے ہاتھ میں تھما دی!

جب ہم سحری کیلئے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ شہاب صاحب بدستور محو مطالعہ ہیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو برس رہے ہیں!!

....

16/جون 1968 کو پاکستان رائٹرز گلڈ کے تحت تقسیم انعامات کی تقریب میں جناب قدرت اللہ شہاب مرحوم کو زندگی میں پہلی اور آخری بار قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اول انعام کیلئے میرا نام پکارا گیا تو تالیوں کی گونج میں انہوں نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا، جونہی تقریب ختم ہوئی۔ وہ سٹیج سے اتر کر میرے قریب تشریف لائے۔ بڑی شفقت سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا ''بیٹا! یہ کتاب لکھ کر آپ نے دنیا بھی سنوار لی اور عاقبت بھی!''

قدرت اللہ شہاب

....

جناب احمد ندیم قاسمی......پیش لفظ فرماتے ہیں۔ اصغر صاحب کی اس تصنیف کی ملی اور تاریخی اہمیت تو مسلمہ ہے ہی مگر میری رائے میں یہ اردو کے سوانحی ادب میں بھی ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے اردو کی بہت کم سوانح عمریوں کو اس حد تک مکمل کہا جا سکتا ہے کہ ان موضوع ایک ایسے جیتے جاگتے سانس لیتے کردار کی صورت میں ہمارے قریب آجائے کہ ہم اس کے دل کی دھڑکن بھی بن سکیں۔ اور اس کے جذبے کی گرمی بھی محسوس کر سکیں۔

احمد ندیم قاسمی......6 ستمبر 1966ء......47انارکلی۔ لاہور

....

''ایسی سیرت ساز کتابیں ہمارے نصاب تعلیم میں ہونی چاہئیں''!

فرہادی محنت سے مرتب کردہ' محبت کے آنسوؤں سے تحریر نمودہ اور حسن ذوق کی پاکیزگی کے ساتھ پیش کردہ اصغر علی گھرال کی یہ تالیف درحقیقت اس قرضہ کو چکانے کی کوشش ہے۔جو شہدائے پاکستان کے مقدس لہو کی صورت میں قوم کے سر پر ہے۔

شہید عزیز بھٹی کی پوری زندگی کے متعلق جس قدر معلومات فراہم اور یکجا کر دی گئی ہیں ،انہیں تلاش کرنے میں جس قدر کوہ کنی کرنا پڑی ہوگی اس کا اندازہ کتاب دیکھنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص برکی کے محاذ یعنی شہید کی زندگی کے آخری سات دنوں کے جزیاتی کوائف کے متعلق تو ذہن میں نہیں آتا۔ کہ انہوں نے کہاں اور کس طرح حاصل کی ہیں پھر انہیں پیش کرنے کا انداز اس قدر دلکش اور جاذب ہے کہ قاری اپنے آپ کو عزیز بھٹی شہید کے ہم رکاب چلتا پھرتا محسوس کرتا ہے۔

خدا کرے کہ ہمارے ارباب حل وعقد کی سمجھ میں یہ بات آجائے۔ کہ اس نوع کی سیرت ساز کتابیں ہمارے نصاب تعلیم میں ہونی چاہئیں۔

غلام احمد پرویز.........طلوع اسلام جولائی 1967ء

....

اسی مصنف کے قلم سے دوسری مایہ ناز نگارش

اسلام یا ملّا ازم

☆......ورلڈ کلاسیک ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کتاب قاری کو ذہنی خوراک بھی مہیا کرتی ہے اور قاری کی خوابیدہ حس ادراک کیلئے مہمیز کا کام بھی کرتی ہے نفس مضمون کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو ایسی سنجیدہ موضوع کی کتابیں 'بالعموم خشک اور ''دیر ہضم'' ہوتی ہیں لیکن اصغر علی گھرال کی خوصیت یہ ہے کہ وہ کرخت بات بھی انتہائی دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے ہیں''۔

نوائے وقت۔لاہور

☆......اصغر علی گھرالا ایک روشن خیال اور انسان دوست فرد ہیں اور اسی حوالے سے انہوں نے سماج میں عورت، اقلیت، انسانی حقوق اور اسلام میں اجتہاد جیسے نازک موضوعات کو اٹھایا ہے اور ان پر لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے وہ قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے یہ مضامین اس وقت لکھے اور چھپوائے، جب ایسی باتیں لکھنے والے معتوب اور مغضوب ٹھہرتے تے۔

زاہد حنا۔ روزنامہ جنگ لندن۔ 16 اگست 1989ء

....

طعن وتکفیر کے فتوؤں سے بے نیاز اصغر علی گھرال کو سچ کی راہ پر بڑھتے ہی رہنا چاہیے کہ یہی ہماری تاریخ ہے کہ جنہیں ماضی میں سچ کے جرم پر ''ملائیت وملوکیت'' کے ہاتھوں ذلیل ورسوا کیا گیا۔ مستقبل نے انہیں ''مجتہدین'' کہہ کر ان کے نام اور کام کے آگے سر عقیدت سے خم کیا۔

امن۔ کراچی

....

☆......اسلام یا ملا ازم'' ایسی فکر انگیز کتاب کے مطالعہ سے مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ وطن عزیز میں آج بھی سچ بولنے والے موجود ہیں۔

سید علی عباس جلالپوری

....

☆......اس کتاب کو تاریخ میں حوالے کے طور پر پیش کرنا چاہیے آنے والے دور کا مؤرخ جب گزشتہ گیارہ سو برسوں والے اسلام کی حالت زار کا نقشہ کھینچے گا تو وہ زیر تبصرہ کاوش۔ ''اسلام یا ملا ازم'' کو نظر انداز نہیں کر سکے گا''۔

....

☆......کتاب ''اسلام یا ملا ازم'' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے مدرجات

سے کلی اتفاق نہ کرنے والا بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''

ماہنامہ منادی'۔ لاہور

....

☆...... ''اسلام یا ملاّ ازم'' میں ''ملاّ '' حضرات کے اس طرز عمل کی تفصیلات پیش کی ہیں جن کے نتیجے میں ہمارے ملک میں اسلامی نظام کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا۔

طلوع اسلام۔ لاہور

....

☆...... آپ کا انداز تحریر بڑا ہی مختصر لیکن جامع اور دل نشین ہے۔ آپ کا طنز و مزاح سے بھرپور لیکن حقیقت پر مبنی استدلال زیادہ کتاب اللہ کی روح کے مطابق اور بصیرت افروز ہے!''۔

عبدالحکیم ارشد۔ نواب شاہ

....

☆...... کتاب ایک جملے سے شروع ہوتی ہے کہ ''زیادہ احمق کون ہے۔ وہ بچہ جو اندھیرے سے ڈرتا ہے' یا وہ آدمی جو روشنی سے ڈرتا ہے؟ اور اسی جملے میں کتاب کی پوری روح سمٹ آئی ہے۔ کتاب اسلام یا ''ملاّ ازم'' روشنی سے ڈرنے والے انسانوں کیلئے دعوت فکر ہے اس کا اسلوب بیان عام و فہم دلچسپ اور دلنشین ہے۔ یہ کاوش اسی قومی تحریک کا حصہ ہے جس کا آغاز سر سید احمد خاںؒ نے کیا اور علامہ اقبالؒ نے جسے آگے بڑھایا۔''

اکبر علی ایم اے۔

....

سرٹیفکیٹ ۔۔۔۔انعام

جاوید چوہدری کے کالموں کے پہلے مجموعے زیرو پوائنٹ ''ٹاپ ہنڈرڈ'' کی تقریب رونمائی سید محمد شعیب پرنسپل کے زیر اہتمام 2 مارچ 2000ء کو گورنمنٹ انٹر کالج لالہ موسیٰ میں منعقد ہوئی۔ 12:30 بجے ولیج ایڈریسٹ ہاؤس لالہ موسیٰ پہنچا۔ چوہدری محمد خاں، سید شعیب شاہ اور جاوید چوہدری موجود تھے۔ اتنے میں جناب عطاء الحق قاسمی ان کے صاحبزادے علی اور جناب ہارون رشید تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد جناب امجد اسلام امجد اور ماٹھا کالم والے خالد مسعود بھی آ گئے۔

گپ شپ ہوئی۔ لطیفے ہوئے۔ اچانک قاسمی صاحب مجھے مخاطب کر کے فرمانے لگے۔ آپ بہت مشکل کام کر رہے ہیں۔ جابر سلطان کے روبر کلمہ حق کہنا بھی بڑا مشکل ہے۔ مگر جابر ملاں اور جابر عوام کے معتقدات کے خلاف لکھ کر کلمہ حق ادا کرنا تو اور بھی بے حد دشوار کام ہے۔ جابر سلطان کے روبرو کلمہ حق کہنے والے کو ایک فائدہ ہوتا ہے۔ کہ اس کا نام آنے والے ''جابر سلطان'' کی ''گڈ بکس'' میں درج ہوتا ہے۔ چنانچہ جب Regime بدلتی ہے تو ایسا کلمہ کہنے والے کو نوازا جانے کی امید ہوتی ہے۔

مگر جابر ملاں اور جابر عوام کو ناراض کرنے والے کو تو کوئی ایسی امید نہیں ہوتی۔ پبلک کا کائی سیکشن اور نہ حکومت اس کی پذیرائی کرتی ہے! بڑا مشکل کام ہے!

....

شاہد یہ سرٹیفکیٹ ہی اس کا انعام ہے۔

گذارش احوال واقعی!

کشمیر کی سرحد پر ضلع گجرات کی تاریخی بستی اعوان شریف سے 2 میل جنوب میں گاؤں کے نمبردار چوہدری نوردار کے بڑے بیٹے چوہدری فتح خاں کے ہاں 6 ستمبر 1927ء کو جنم لیا۔ گاؤں کا نام بستی کے بانی کے نام پر ''گھرال'' ہے۔ جو 23 نسلیں اوپر اصغر علی گھرال کے جدامجد تھے۔ اب یہ نام اصغر علی کے نام کا حصہ ہے۔

....

کوآنکھ برانچ سکول سے دو جماعت' اجنالہ سکول سے مڈل اور گرو گوبند سنگھ خالصہ لباب ہائی سکول ٹانڈہ سے کلاس میں اوّل رہ کر 1944ء میں میٹرک کیا۔

....

1945ء میں ملازمت اور پرائیویٹ طور پر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنے کے ارادے سے لاہور چلا گیا۔ وہاں محکمہ نہر میں کلرکی کی۔ تعلیم کے لئے پرائیویٹ ادارے سے استفادہ کیا۔ اس کے ساتھ دیال سنگھ لائبریری سے اپنے ادبی اور صحافتی ذوق کی پیاس بجھائی۔

....

1946ء میں میری پہلی تحری روزنامہ نوائے وقت میں چھپی۔ یہ ایڈیٹر کے نام خط تھا۔ اپنے پسندیدہ جریدہ میں من وعن اپنی تحریر اور اس پر اپنا نام چھپا دیکھ کر ایک نوجوان کو جو خوشی ہوئی۔ اس کا اونچی چھلانگ سے اظہار ہوا۔ وہ لمحہ آج بھی یاد ہے۔!

اس کے بعد میں نے نوائے وقت کو جو کچھ اور جس موضوع پر لکھا۔ وہ ادارتی صفحہ پر مضمون کی شکل میں شائع ہوا۔

1947ء کے ہنگامی دور میں لکھنے لکھانے میں توقف ہوا۔ تو جناب حمید نظامی کی طرف سے ایک دوسطری گرامی نامہ موصول ہوا۔

''اصغر صاحب! آپ کے مضامین دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔'' حمید

نظامی‘‘

آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ کہ آپ نے صحافتی ہیرو کی طرح سے ان دوسروں سے میری جذباتی کیفیت کیا ہوئی۔ اور یہ تحسین کے پھول ’’اصغر صاحب‘‘ کو کتنی خود اعتمادی دے گئے۔

انہی دنوں نوائے وقت میں ایک اشتہار سب ایڈیٹر کی ضرورت کے حوالے سے چھپا جس میں امیدوار کی کم سے کم تعلیمی استعداد گریجویشن تھی۔ میں نے ایڈیٹر کے نام خط لکھا۔ کہ میں بی۔ اے نہیں ہوں (ایف۔ اے تھا) لیکن جرنلزم کے بارے میں آپ میرے شوق سے واقف ہیں۔ مجھے جناب حمید نظامی نے بلا لیا۔ خلاف معمول اپرنٹس شپ کے دوران بھی معقول اعزازیہ سے نوازا۔ تین ماہ بعد ہی سب ایڈیٹر بن گیا۔ اور چند سال نوائے وقت اور قندیل میں مختلف شعبوں میں کام کرتا رہا۔

اس دوران پنجاب یونیورسٹی سے نہ صرف بی۔ اے بلکہ ڈپلومہ ان جرنلزم بھی کر لیا (ابھی جرنلزم کی ایم۔ اے کلاسز شروع نہیں ہوتی تھیں) پھر لاء کالج میں داخلہ لیا اور قانون کی ڈگری لے کر گجرات ڈیرہ لگا لیا۔ وکالت کے ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ مسلم لیگی ذہن کے باعث حلقہ کے فیوڈل وڈیروں سے ہمیشہ مخالفت رہی۔ یہ الگ موضوع ہے۔ تاہم ان سب کے ساتھ صحافت اور ادب سے بھی رشتہ قائم رہا۔

جنگ ستمبر کے ہیرو عزیز بھٹی شہید کی شخصیت اور کارنامے سے متاثر ہو کر باقاعدہ ریسرچ سے دو سال میں ان کی بایا گرافی مرتب کی۔ ملک میں چوٹی کے ادیبوں اور دانشوروں نے نہ صرف اس کی دل کھول کر داد دی۔ اسے عالمی ادب کی چند بلند پایہ سوانح عمریوں میں شمار کیا۔ پاکستان رائٹرز گلڈز نے جنگ ستمبر کے حوالے سے ادبی شاہکاروں کے لئے اپنے ذاتی سرمایہ سے آدم جی پرائز کے برابر جنگ ستمبر ادبی انعام جاری کیا۔ اس کتاب کو یہ اول انعام حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

قومی اخبارات میں مختلف موضوعات پر اظہار خیال کا سلسلہ جاری رہا۔ جنرل ضیاء الحق کی نام نہاد اسلامائزیشن اور شریعت بل پر میرے تنقیدی مضامین روزنامہ جنگ میں اشاعت پذیر ہوتے رہے۔ جناب وارث میر اور بعض اور دوست بھی یہ جہاد جاری رکھے ہوئے تھے۔

1988ء میں میری دوسری کتاب ''اسلام یا ملّا ازم'' شائع ہوئی تو دوسرے مواد کے ساتھ یہ تمام آرٹیکل اس میں شامل تھے۔ کتاب روشن خیال طبقات میں تو مقبول ہوئی۔ مگر حسب توقع ''ملائیت'' نے اس کے خلاف زہر اگلا۔

ایک دفعہ محترم ارشاد احمد حقانی کے ہمراہ جناب میر شکیل الرحمان سے ملاقات کر کے جنگ میں باقاعدہ ''کالم نگاری'' کے حوالے سے مشورہ کیا۔ تو موصوف نے خوشی سے اس کی اجازت دے دی۔ مگر میں خود ہی اس کی جسارت نہ کر سکا۔ تاہم اسی دوران اپنے بے تکلف دوست اور مہربان جناب حمید جہلمی کی ترغیب اور مشورہ سے روزنامہ ''پاکستان'' میں۔

''گپ شپ'' کے عنوان سے ہلکا پھلکا کالم گھسیٹنا شروع کر دیا۔ جسے پسند کیا گیا۔ 1992ء سے کئی سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اتفاق سے ایک دو کالم ایسے آئے جو اکبر علی بھٹی کا اخبار چھاپنے کا متحمل نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے سرکار کے خلاف ذرا سخت تنقید تھی۔ میں نے انہیں ''ہلکے پھلکے انداز میں'' کے نام سے نوائے وقت میں بھجوا دیا۔ چھپ گئے۔ یوں یہ سلسلہ دونوں اخباروں میں جاری ہو گیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر خبریں کے جناب ضیاء شاہد نے ٹیلی فون کیا کہ گھرال صاحب! اگر آپ صرف ایک اخبار میں کالم لکھ رہے ہوتے تو ہم آپ کو تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ لیکن اگر آپ دو اخباروں میں لکھ سکتے ہیں تو تین میں کیوں نہیں؟

اس محبت بھری دلیل کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے جناب ضیاء شاہد کو اسی دن ایک طویل مکتوب لکھا۔ جس میں من جملہ دیگر باتوں کے اخبار کی بعض پالیسیوں پر (جنہیں میں ناپسند کرتا تھا) بڑی شدت سے تنقید کی۔ اور دل کی خوب بھڑاس نکالی۔

مجھے حیرت ہوئی۔ کہ میرا خط جناب ضیاء شاہد نے اخبار میں من وعن چھاپ دیا۔ اسے تصویر کے ساتھ خوبصورت کالم کی شکل دی۔ اور اپنی طرف سے بھی پیارا سا نوٹ لکھا۔

یوں میں تین قومی اخبارات میں بیک وقت کالم نگاری کرنے لگا۔ اور تینوں جریدے مجھے معقول معاوضہ د۔۔ رہے تھے۔

اس مرحلہ پر بیک وقت تین اخبارو‌ں کے حوالے سے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ جناب ضیاء شاہد

گجرات دورے پر آئے ہوئے تھے۔

دوستوں کی ایک محفل میں راحت ملک نے کہا۔ ضیاء صاحب! گھرال صاحب کا کمال دیکھیں۔ کہ تین بالکل مختلف مزاج اور مختلف پالیسیوں کے حامل قومی اخبارات میں بیک وقت کالم نگاری کر رہے ہیں۔

میری طرف سے کوئی جواب دینے سے پہلے جناب ضیاء شاہد ہی بول پڑے۔ کہنے لگے۔ گھرال صاحب' کو اخبارات کے مزاج اور پالیسیوں سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ کالم اپنے مزاج اور اپنی پالیسی کے مطابق لکھتے ہیں۔

ضیاء شاہد صاحب نے میری گوناگوں مصروفیات' جن میں سیاسی' سماجی' وکالتی' عدالتی' صحافتی اور ادبی شامل ہیں کے حوالے سے بھی وہیں ایک لطیفہ سنایا۔ کہنے لگے۔

بس بھر چکی۔ تو ایک نوجوان داخل ہوا۔ اس نے تھیلے سے کھٹی مٹھی ٹکیاں نکال کر بیچنا شروع کر دیں۔ دوسرے چکر میں وہ سرمہ بیچ رہا تھا۔ پھر اس نے نماز اور دوسری چھوٹی چھوٹی اسلامی کتابیں فروخت کیں۔ نئے سال کی جنتری بھی بیچی۔ ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا۔ تو اس نے تھیلا ایک طرف رکھا۔ کیش بک نکالی۔ اور مسافروں سے گذارش کی۔ کہ بہن بھائیو' اپنی اپنی ٹکٹیں لے لو۔

جناب ضیاء شاہد کا مطلب یہ تھا کہ کنڈکٹر اصغر علی گھرال تھا۔

سارے ہی موضوعات پر قلم فرسائی کرتا ہوں۔ مگر اپنے ہاں بنیادی انسانی حقوق کی پامالی پر دل بہت دکھتا ہے۔ کڑھتا ہے اور اظہار کی راہیں بنالیتا ہے۔ مذہبی جہالت پسندی اور کٹھ ملائیت کے خلاف جہاد بھی میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ اردو پریس میں یوں بھی ملائیت کا غلبہ ہے۔ بہت محتاط لکھنا پڑھتا ہے۔ کتاب اسلام یا ملا ازم کے خلاف فتوؤں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ روزنامہ ''دن'' جاری ہوا۔ تو یہ اخبار مذہب کے حوالے سے دوسروں کی نسبت ذرا لبرل محسوس ہوا۔ چنانچہ بعض ایسے کالم جو شاید کہیں اور جگہ نہ پا سکتے تھے۔ اس کو ارسال کر دیئے۔ جو اخبار نے شکریہ کے ساتھ چھاپ دیئے۔ اور مزید کا اصرار کیا۔ بنیادی انسانی حقوق کے حوالے سے پاکستان میں کسی اقلیت کے ساتھ زیادتی ہو۔ تو میرا قلم اسے برداشت نہیں کرتا اور ہر رسک لینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

کالا باغ ڈیم پر بھی سال ہا سال سے متواتر لکھتا آ رہا ہوں۔ کچھ مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ بڑے بڑے کالم نگار دنیا جہاں کے موضوعات پر قلم زنی کرتے رہتے ہیں مگر اس انتہائی اہم موضوع پر ان کی نظر کیوں نہیں جاتی؟ یہ 18 کروڑ عوام کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے!

سیاست میں 1965ء کے جنرل الیکشن بی ڈی نظام کے تحت ہوئے۔ ضلع گجرات سے تھانہ سرائے عالمگیر کو جہلم سے لگا کر باقی ضلع کو قومی اسمبلی میں صرف 2 نشستیں تھیں۔ جن پر قومی سطح کے دو بڑے سیاسی لیڈر چوہدری ظہور الٰہی شہید اور چوہدری فضل الٰہی مرحوم الیکشن لڑ رہے تھے۔ صدر ایوب خان اور گورنر امیر محمد خاں، چوہدری ظہور الٰہی کے سخت خلاف تھے اور ہر قیمت پر انہیں شکست دلانا چاہتے تھے۔ ان کا مقابلہ چوہدری غلام رسول تارڑ سے تھا۔

دوسری نشست پر چوہدری فضل الٰہی نے ایک آئینی ترمیم پر حکومت کو ممنون کر رکھا تھا اور حکومت ہر قیمت پر انہیں جتوانا چاہتی تھی۔ ان کا مقابلہ اصغر علی گھرال سے تھا۔

چوہدری فضل الٰہی کو منصفانہ الیکشن جیتنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

....

پاکستان پیپلز پارٹی کے آغاز سے ہی اس میں شمولیت اختیار کی شیخ محمد رشید صاحب کے ہمراہ آزاد پاکستان پارٹی میں رہ چکا تھا۔ وہ بطور ایک نظریاتی فعال کارکن عزت کرتے تھے۔ پارٹی میں اصغر علی گھرال کا شمار شیخ رشید گروپ میں تھا۔ دو سال تک پیپلز پارٹی ضلع گجرات کا جنرل سیکرٹری رہا۔

بھٹو صاحب مرحوم کے دور میں جاگیرداروں اور نوابوں کے خلاف ان کے بے زمین مزارعین نے ایجی ٹیشن کی۔ اسلام آباد میں جا کر مظاہرے کئے، گھرال صاحب نے ان کی حمایت کی اور اخبارات مین ان کے کاز کو آگے بڑھایا۔ چنانچہ 16 فروری 1974 کو کچہری سے گھر آتے ہوئے ان پر قاتلانہ حملہ کرایا گیا۔ جس میں بال بال بچ گئے صرف ایک ٹانگ ذرا ٹوٹ گئی!

1977ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد آئین معطل رہا اور سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اس تاریک دور میں وکلاء نے ملک گیر کنونشن منعقد کیے۔ بھوک ہڑتالیں کیں۔ جلوس نکالے، سیاہ جھنڈے لہرائے اور ان کے خلاف مارشل لاء ضوابط کے تحت مقدمے قائم کیے گئے اور سزائیں دی گئیں۔ اصغر علی گھرال نے ان اجتماعات میں گجرات بار کی نمائندگی کی۔ ایجی ٹیشن میں بھرپور حصہ لیا اور اگست 1983ء میں اسے گرفتار کر کے 3 ماہ کے لئے نظر بند کر دیا۔

1988ء میں انہوں نے گوجرانوالہ ڈویژن سے پنجاب بار کونسل کا انتخاب لڑا اور نمایاں کامیابی حاصل کی بطور ایک کامیاب مصنف ان کا تعارف پڑھے لکھے طبقے میں ہوا چکا تھا جو ان کی کامیابی پر ممد ثابت ہوا۔

1991ء کے بلدیاتی الیکشن میں نہ صرف فیوڈل نواب صاحب کو جو سابق ایم این اے رہ چکے تھے۔ ضلع کونسل کے الیکشن میں ڈیڑھ ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ بلکہ دونوں خاندانوں کی ''کامن'' یونین کونسل کی چیئرمین شپ پر گھرال خاندان بلا مقابلہ فتح یاب ہو گیا۔ یہ معرکہ بیٹے اسجد جاوید نے سر کیا۔ جس نے اگلے بلدیاتی الیکشن مین نہ صرف نواب خاندان کے نمائندے کو ضلع کونسل کے الیکشن میں شکست فاش دی۔ وہ ضلع کونسل کا وائس چیئرمین منتخب ہو گیا۔

2002ء کے عام انتخابات میں ان کے بیٹے خالد نے صوبائی حلقہ سے الیکشن لڑا اور حریف فیوڈل لارڈ کو 7 ہزار ووٹوں سے شکست دی۔ اور وزیر اعلیٰ چوہدری پرویز الٰہی کی حکومت میں پارلیمانی سیکرٹری سپورٹس رہا۔

حلقہ میں خدمات اور بہتر کارکردگی کی بنا پر 2008ء کے الیکشن میں انہیں حریفوں سے مقابلہ ہوا۔ تو پیپلز پارٹی کے امیدوار کو 23 ہزار اور مسلم لیگ 'ن' کے امیدوار کو 38 ہزار ووٹوں سے شکست دے کر پنجاب میں مسلم لیگ (ق) کے کامیاب امیدواروں میں ٹاپ کیا۔ خالد اصغر گھرال پنجاب اسمبلی میں کالا باغ ڈیم کے حوالے سے مسلسل آواز بلند کرتا رہتا ہے۔

☆☆☆